
گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
مارچ 2016
انجم انصار، درِ ثمن بلال اور نگہت سیما کے قسط وار ناول
معروف لکھاری اور باعمل معلّمہ افسر سلطانہ کی قابل غور باتیں
عقیلہ حق، شیریں حیدر، شمیم فضل خالق و دیگر رائٹرز کی حسین تحریریں

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

نگرانِ اعلیٰ: معراج رسول

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار

معاون: آ[illegible]حماد

MEMBER APNS

CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی



ماڈل: ماریہ رضوی
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی: موسیٰ رضا

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا اے حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

زرِ سالانہ (اندرونِ ملک) 800 روپے...... جلد: 43 شمارہ: 12 مارچ 2016ء

اداریہ

سلسلے وار ناول

منی ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

مجھے کچھ کہنا ہے......!

بچے جب چھوٹے ہوتے ہیں تو ان کے مسائل بھی چھوٹے، چھوٹے ہوتے ہیں۔ کوئی بچہ بیمار ہو گیا کسی کو چوٹ لگ گئی...... کسی کا اسکول دور ہے تو کسی کا پاس اور جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے کام از خود سمیٹ لیتے ہیں...... بظاہر کوئی کام نظر نہیں آتے...... مگر گھر آنے کے اوقات سب کے مختلف ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی ساتھ ناشتا کر پاتا ہے، نہ دوپہر کا کھانا......اور حد یہ ہے کہ رات کا کھانا بھی سب علیٰحدہ، علیٰحدہ کھاتے ہیں۔ تب ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ ایک گھر میں تو ضرور رہتے ہیں مگر سب الگ، الگ رہتے ہیں...... ان میں آپس میں ربط ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی لیے یہ ضروری ہے کہ یہ بات طے کر لی جائے کہ رات کا کھانا سب ایک ساتھ کھائیں گے...... کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی ناگزیر کاروباری مصروفیات کے باعث اسے اپنا روزمرہ کا معمول نہیں بنا سکتے...... ان کے لیے مشورہ ہے کہ وہ ہفتے میں کم از کم تین مرتبہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رات کا کھانا کھائیں، کھانا تو محض بہانہ ہے مل بیٹھنے کا...... ایک دوسرے سے باتیں کرنے، سمجھنے اور سمجھانے کا...... آپ نے اس کو اپنا معمول بنا لیا تو چند ہی دنوں میں آپ کو اس کی افادیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

سب سے پہلے آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اہل خانہ کے درمیان کتنی یک جہتی موجود ہے، وہ ذہنی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں یا دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ساتھ کھانا کھانے کے موقع کو آپس میں قربت بڑھانے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے ہمیشہ کھانے کی تعریف کیجیے...... جس سے پکانے والے کو خوشی ہو گی...... بچوں سے کہا جا سکتا ہے کہ کسی دن وہ اپنے دوستوں کو مدعو کر لیں، بہوؤں سے کہیں کہ وہ اپنے اہل خانہ کو کھانے پر بلائیں...... اس طرح کی باتوں سے گھر کا ماحول نہ صرف خوشگوار ہو گا بلکہ قربتوں کے پھول بھی کھلیں گے...... جی ہاں محبت بھری خوشبو جب آپ کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہو تو آپ اپنے آپ کو فریش سمجھیں گے۔

مدیرہ

انجم انصار

اور وہ اس سے (لوگوں کو) منع کرتے ہیں اور (خود بھی) اس سے علیحدہ
رہتے ہیں اور اپنی ہی جانوں کو ہلاک کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے (۲۶) اور
(اے نبیؐ) اگر تم (ان لوگوں کو) اس وقت دیکھو جب یہ آگ پر کھڑے
کیے جائیں گے اور کہیں گے کہ اے کاش ہم (دنیا میں پھر) واپس
کیے جاتے اور اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین
میں سے ہوتے (۲۷) بلکہ انہیں ظاہر ہو گیا جو یہ پہلے سے چھپاتے تھے
اور اگر یہ (دنیا میں) واپس کیے جائیں تو بے شک جس چیز سے وہ منع
کیے گئے ہیں پھر اسے کریں اور بے شک یقیناً یہ لوگ جھوٹے ہیں
(۲۸) اور کہتے ہیں کہ یہ تو صرف ہماری دنیا کی زندگی ہے اور ہم نہ
اٹھائے جائیں گے (۲۹) اور اگر تم اس وقت دیکھو جب یہ اپنے
پروردگار کے حضور میں کھڑے کیے جائیں گے (اللہ) فرمائے گا کہ کیا یہ
سچ نہیں ہے کہیں گے ہاں قسم اپنے پروردگار کی (سچ ہے اللہ) فرمائے گا
تو تم عذاب چکھو اس سبب سے کہ تم انکار کرتے تھے (۳۰) بے شک جن
لوگوں نے اللہ سے ملنے کو جھوٹ کہا انہوں نے (اپنا ہی) نقصان
کیا یہاں تک کہ جب ان پر ناگہاں قیامت آ پہنچے گی کہیں گے کہ
اے ہماری ندامت اس پر جو ہم نے قیامت میں کمی کی اور وہ اپنے
بوجھ اپنی پیٹھوں پر لادیں گے آگاہ رہو کیا بری چیز ہے جو لادے
ہوئے ہیں (۳۱) اور دنیا کی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ نہیں



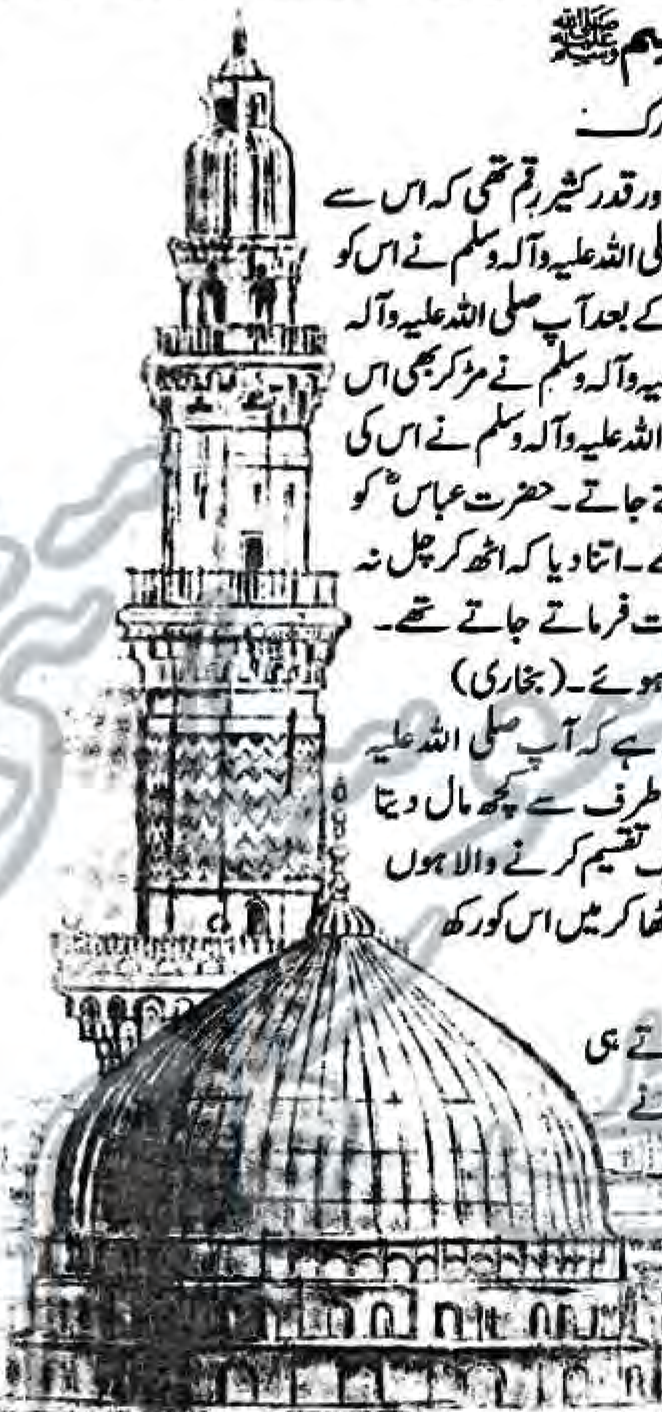
اور بے شک پچھلا گھر (یعنی جنت) پرہیز
گاروں کے لیے (دنیا سے بدرجہا) بہتر ہے
کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے (۳۲) بے شک
ہم جانتے ہیں جو کچھ (تمہاری شان میں) یہ
لوگ کہتے ہیں وہ تمہیں غم زدہ کرتا ہے تو (سمجھ
لو کہ) بے شک یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے
ولیکن (یہ) ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے
ہیں (۳۳) (سورۃ انعام آیت نمبر ۲۶ تا ۳۳)

سیدنا قاسم ﷺ

صفاتی اسم مبارک

۴۔ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا اور قدر کثیر رقم تھی کہ اس سے پہلے کبھی دارالاسلام میں نہیں آئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو مسجد کے صحن میں ڈلوانے کا حکم دیا اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مڑ کر بھی اس پر نظر نہ ڈالی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تقسیم شروع کر دی جو سامنے آتا اس کو دیتے جاتے۔ حضرت عباسؓ کو جو غزوۂ بدر کے بعد دولت مند نہ رہے تھے۔ اتنا دیا کہ اٹھ کر چل نہ سکتے تھے۔ اسی طرح اور لوگوں کو بھی عنایت فرماتے جاتے تھے۔ جب کچھ نہ رہا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ (بخاری)

۵۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”نہ تو میں تم کو اپنی طرف سے کچھ مال دیتا ہوں اور نہ منع کرتا ہوں، میں تو صرف ایک تقسیم کرنے والا ہوں جہاں مجھے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وہاں اٹھا کر میں اس کو رکھ دیتا ہوں۔“ (بخاری)



٦۔ایک روز نماز عصر کا سلام پھیرتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دولت خانے پر تشریف لے گئے پھر جلد ہی نکل آئے۔ صحابہ کرامؓ کو تعجب ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے نماز میں خیال آگیا کہ صدقہ کا کچھ سونا گھر میں پڑا ہے۔ مجھے پسند نہ آیا کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہے اس لیے میں جا کر اسے تقسیم کرنے کے لیے کہہ آیا ہوں۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس



یادوں کی مالا

ڈاکٹر زکیہ بلگرامی



پُرعقیدت روحانی سفر کی حیرت انگیز رُوداد

یہ داستان جو میں رقم کررہی ہوں یہ کوئی عام داستان نہیں...... نہ ہی عام لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ یہ داستانِ عشق ہے۔ اس عشق کی داستان جو اللہ کی کتاب سے کیا گیا۔

چھٹا باب

اس قرآن حکیم کی تکمیل کے بعد میں نے دوبارہ قلم سنبھال لیا اور اخباروں اور رسائل میں لکھنا شروع کیا۔ جسارت اخبار کی خواتین سیکشن کی انچارج محترمہ غزالہ عزیز ایک دن میرے گھر آئیں (یہ حج پر جانے سے پہلے کی بات ہے) اور انہوں نے مجھ سے انٹرویو کے لیے کہا۔ انہوں نے نہ صرف میرا انٹرویو شائع کیا بلکہ کئی افسانے بھی چھاپے...... پھر میں حج پر گئی۔ حج سے واپس آئی تو انہوں نے مجھ سے کہہ کر اس سلسلے کا ایک مضمون لکھوالیا۔

''لبیک اللھم لبیک......'' جو دو قسطوں میں شائع کیا۔ اس طرح ایک بار پھر قلم سے رشتہ جڑ گیا جو عارضی طور پر منقطع ہوگیا تھا۔ میں نے افسانے بھی لکھے، بچوں کی چند کہانیاں بھی لکھیں۔ اس زمانے میں، میں بے حد مصروف تھی کیونکہ اوپر گھر مکمل کروانا تھا، وہ بنوایا۔ گھر میں پوتے اور پھر پوتی کا اضافہ ہوچکا تھا۔ اسامہ اور ماہم' یہ بہت پیارے بچے ہیں اور ان ہی کے دم سے گھر میں رونق رہتی ہے۔

جب سے ساتواں قرآن حکیم ختم ہوا تھا مجھے عجب طرح کی بے چینی اور بے کلی محسوس ہوتی اور میرا دل چاہتا میں فوراً ہی نیا کلام پاک لکھنا شروع

کردوں...... مجھے رات کو نیند نہیں آتی تھی اور بلڈ پریشر بھی رہنے لگا تھا۔ بلگرامی صاحب کی وفات سے قبل مجھے بلڈ پریشر کی بیماری نہیں تھی بلکہ اللہ کا فضل ہے کہ مجھے کوئی بیماری نہیں، کوئی موروثی بیماری بھی نہیں ہے۔ صرف بلڈ پریشر مرض تو اب ویسے بھی عام ہوگیا ہے۔ کم عمر لوگوں کو بھی ہونے لگا ہے۔

جب میری بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی تو ایک بار پھر میں نے قرآن حکیم لکھنے کا عزم کیا۔ یہ میری زندگی کا ایک خاص قرآن حکیم ہے کیونکہ اسے میں نے اس لیے شروع کیا ہے کہ پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تحفے میں دے سکوں۔ 4 جون 2004ء کو لکھنا شروع کیا۔ اس کو لکھنے کا وقت میں نے 12 بجے رات بکا رکھا یعنی ساڑھے گیارہ تک لکھنے بیٹھ جاتی پھر دیر تک لکھتی رہتی۔ اس قرآن حکیم کو لکھنے کا اجر مجھے دنیا ہی میں ملا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا...... میں ان باتوں کو لکھوں گی نہیں مگر 24 جنوری 2005ء کو جب یہ کلام پاک مکمل ہوا اور رات 12 بج کر 15 منٹ پر میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تحفے میں دیا تو اس کے پانچ منٹ کے بعد میرے ذہن کی اسکرین پر اچانک

2^2	3^2	4^2	5^2
6^2	7^2		

کی فگرز چمکیں ایک لمحے کو اور غائب ہوگئیں۔

میں نے فوری طور پر ان کو حل کرلیا۔

4	=	2^2	2x2
9	=	3^2	3x3
16	=	4^2	4x4
25	=	5^2	5x5
36	=	6^2	6x6
49	=	7^2	7x7

کسی انجان آدمی کے سامنے آپ یہ اعداد رکھ بھی دیں تو وہ نہیں سمجھ سکے گا لیکن مجھے سمجھنے میں شاید لمحہ ہی لگا ہوگا۔

۱	پہلی منزل ''سورۂ نسا'' پر ختم ہوتی ہے۔	۴ (چوتھی سورہ)
۲	دوسری منزل ''سورۂ توبہ'' پر ختم ہوتی ہے۔	۹ (نویں سورہ)
۳	تیسری منزل ''سورۂ نحل'' پر ختم ہوتی ہے۔	۱۶ (سولھویں سورہ)
۴	چوتھی منزل ''سورۂ فرقان'' پر ختم ہوتی ہے۔	۲۵ (پچیسویں سورہ)
۵	پانچویں منزل ''سورۂ یٰسین'' پر ختم ہوتی ہے۔	۳۶ (چھتیسویں سورہ)
۶	چھٹی منزل ''سورۂ حجرات'' پر ختم ہوتی ہے۔	۴۹ (انچاسویں سورہ)
۷	ساتویں منزل ''سورۂ ناس'' پر ختم ہوتی ہے۔	۱۱۴ (ایک سو چودھویں سورہ)

اس کے لیے کسی فارمولے کی ضرورت نہیں۔ یہ فارمولا مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا جسے میں نے شائع کروادیا۔

قرآن حکیم کی کل 114 سورتیں ہیں جبکہ آیات کی تعداد ۶۲۳۶ ہے۔ اس وقت جو قرآن حکیم ہمارے سامنے ہے اور جس طرح اور جس جگہ جو آیات بھی لکھی ہیں اور تمام سورتوں کی ترتیب، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام قرآن حکیم کی آیات یا سورہ لے کر آتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آپؐ اسی وقت صحابہ کرامؓ کو ازبر کرواتے اور لکھوا بھی دیتے اور ان آیات یا سورہ کے مقام کا تعین بھی فرمادیتے۔ کاتب وحی مقرر تھے، وہ لوگ فوراً ہی وحی کو لکھ لیا کرتے۔ اسی طرح اللہ کے حکم کے مطابق حضرت جبرائیلؑ کی مدد سے قرآن پاک کو ترتیب دیا گیا۔ لیکن سپارے اور منزل کی تقسیم اللہ کی طرف سے نہیں ہے، یہ صحابہ کرامؓ کی کی گئی ہے قرآن حکیم کو 30 برابر کے حصوں میں تقسیم کردیا گیا تاکہ لوگ ایک سپارہ روزانہ پڑھ کر ایک ماہ میں قرآن پاک کو ختم کرلیں۔ تاریخ بتاتی ہے

کہ یہ تقسیم حضرت عثمانؓ نے فرمائی۔

☆☆☆

کچھ لوگ چاہتے تھے قرآن حکیم کو ایک ہفتے میں ختم کریں اس لیے صحابہ کرامؓ نے قرآن پاک کو سات حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ تقریباً برابر کی منزلیں ہیں۔ صرف تیسری منزل چھوٹی ہے۔ ساتوں منزلوں میں مکمل سورتیں موجود ہیں۔ یعنی اس طرح نہیں کہ آدھی سورہ اندر اور آدھی باہر...... اگرچہ یہ منزلیں اور ان کے اندر سورتوں کی تعداد اللہ کی طرف سے نہیں، اسے صحابہ کرامؓ نے ترتیب دیا پھر بھی ان کے اندر ردوبدل کرنا کسی انسان کے لیے مناسب نہیں۔ آج کل کے دور کا عالم یا مولانا خواہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو صحابہ کرامؓ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ یہ منازل صحابہ کرامؓ کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ ایک بات اور بھی ہے، جب مجھ جیسی گناہ گار اور ناچیز کو کشف ہو سکتا ہے تو پھر صحابہ کرامؓ کو کیا یہ کشف نہیں ہوا ہوگا کہ منزلوں میں اس طرح سورتیں رکھو۔ چنانچہ اگر منزل کے اندر سورتوں کی مقدار کچھ اس طرح ہے کہ اس میں ایک فارمولا بن گیا ہے تو تعجب کی کیا بات ہے؟

منزل کے اندر سورتوں کی تعداد کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ منزل 1...... 4
۲۔ منزل 2...... 5
۳۔ منزل 3...... 7
۴۔ منزل 4...... 9
۵۔ منزل 5...... 11
۶۔ منزل 6...... 13
۷۔ منزل 7...... 65
ٹوٹل.......... 114

اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا کسی انسان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ میں نے جو فارمولا دیا ہے وہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ کون سی منزل کس نمبر کی سورہ پر ختم ہو رہی ہے۔

this formula can be represented by general formula

$S=(m+1)2$

whereS is the number of sura on which manzil m end e.g

first manzil will end at sura $(1+1)^2=4$

secand manzil will end at sura $(2+1)^2=9$

third manzil will end at sura $(3+1)^2=16$

fourth manzil will end at sura $(4+1)^2=25$

fifth manzil will end at sura $(5+1)^2=36$

sixth manzil will end at sura$(6+1)^2=49$

Seventh manzil need no formula as it is already knon that it ends sura 114sura

اب اگر یہ پتا کرنا ہو کہ کون سی منزل کس جگہ سے شروع ہو رہی ہے۔ یعنی کون سے نمبر کی سورہ سے تو اس کا بھی جنرل فارمولا ہے۔

this may be represented by a general formula

$s = m^2+1$

where S is the sura from which manzil m start e.g

first manzil. no formula

is required as it is already known that first manzil starts

for 1st sura

secand manzil starts for sura=$2^2+1=5$

third manzil starts for sura =$3^2+1=10$

fourth manzil starts for sura=$4^2+1=17$

fifth manzil starts for sura=$5^2+1=26$

sixth manzil starts for sura=$6^2+1=37$

seventh manzil starts for sura=$7^2+1=50$

اس قرآن حکیم کو پروفیسر ڈاکٹر اخلاق احمد... پرو وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی نے بے حد پسند کیا۔ ان کی بیوی ڈاکٹر صالحہ (سابق چیئر پرسن شعبۂ نباتیات کراچی یونیورسٹی) میری دوست ہیں، میں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس قرآن پاک کو اپنی یونیورسٹی میں رکھنا چاہتی ہوں۔ چنانچہ لائبریری آف کراچی یونیورسٹی میں 21 رمضان المبارک 2005ء میں مجھے ایک ریسپشن دیا گیا، اس روز ڈاکٹر پیرزادہ قاسم (اس وقت کے وی سی) کو اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ تاہم ان کی طرف سے شیلڈ اور ایک عدد سرٹیفکیٹ مجھے ملا۔ یہ ایک کامیاب پروگرام تھا جس میں بہت لوگوں نے شرکت کی۔ جن لوگوں نے میرے لیے تقاریر کیں ان میں شیخ بن زید اسلامک سینٹر کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خلیل الرحمن، ڈین فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز ڈاکٹر.... عبدالرشید صاحب، ڈین فیکلٹی آف آرٹس، ڈاکٹر شمس الدین اور ڈاکٹر اخلاق احمد شامل تھے۔ لائبریرین محترمہ سیدہ ارجمند صاحبہ نے تعارفی کلمات پیش کیے تھے۔ میں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقع پر Geo t.v والوں نے میرا انٹرویو بھی ریکارڈ کیا۔

the news اور جنگ نے اور کئی دوسرے اخباروں نے کوریج کی۔

مجھے خوشی تھی کہ میرا قرآن حکیم میری یونیورسٹی میں رکھا جائے گا۔ میں نے اپنی پوری تعلیم اس یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ ایم ایس سی کے بعد ایم فل اور پھر پی ایچ ڈی اسی یونیورسٹی کی ڈگریاں میں نے لیں۔ مجھے اپنے اس تعلیمی ادارے سے جس قدر انسیت ہے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ پیچھے بھی لکھ چکی ہوں کہ بعد میں ایک شوکیس بنوایا گیا اور اس کے اندر رحل پر قرآن حکیم کھول کر رکھا گیا ہے۔ اس طرح بچپن میں دیکھے گئے خواب کی تعبیر مجھے ۵۰ سال بعد ملی جس کا ذکر میں کر چکی ہوں۔ آپ جوں ہی لائبریری میں داخل ہوں سیدھے ہاتھ پر شوکیس رکھا ہے۔ ہر آنے جانے والے کی نظر اس پر پڑنی لازمی ہے۔ (شوکیس بنوا کر رحل پر قرآن حکیم کھول کر رکھوانا ڈاکٹر اخلاق احمد نے کروایا۔ میں ان کی دل سے شکر گزار ہوں) جب سے میرے شوہر کا انتقال ہوا ہے قرآن حکیم کے سلسلے کے کام (کاغذ سے لے کر پرنٹ کروانا وغیرہ) وہ سب میرے بڑے بھائی حسن احمد بلگرامی انجام دیتے ہیں۔ یہ اب ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں، نیوی میں ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن کی جاب سے ریٹائر ہوئے۔ میرے ان بھائی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قلبی لگاؤ زیادہ ہے اور اس معاملے میں خاصے جذباتی واقع ہوئے ہیں (انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کا نام بھی اویس احمد رکھا کیونکہ حضرت اویس قرنیؓ عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے ان کا بیٹا یعنی میرا بھتیجا نیوی کمانڈر ہے) چونکہ یہ قرآن پاک میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے لکھا تھا اس لیے وہ اس نسخے کے لیے جذباتی ہو رہے تھے۔ پروگرام والے روز وہ خود اس نسخے کو اپنی گود میں لے کر گاڑی میں بیٹھے۔ انہوں نے جو کچھ محسوس کیا وہ میں یہاں لکھ رہی

ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ کراچی یونیورسٹی تک پہنچتے ہوئے انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مدینے کی گلیوں میں سفر کر رہے ہیں، وہی گلیاں، وہیں بازار، سب کچھ وہی تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ مگر ایسا ہی نظر آرہا تھا اس قرآنی نسخے کے بہت سے بابرکت اثرات رونما ہوچکے تھے جو میں نے نہیں لکھے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، اس کی رحمت ہے، وہی سب کچھ عطا کرنے والا ہے۔ کسی کے اختیار میں نہیں کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرسکے۔

حج کے سلسلے کی ایک بات میں لکھنا بھول گئی جو میرے خیال میں بہت اہم ہے۔ حج کرنے کے بعد جب ہم لوگ مدینے میں تھے، ہم ہوٹل کی چودھویں منزل پر تھے۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہمارے ہوٹل کے درمیان طرف ایک سڑک تھی۔ ہماری کھڑکی مسجد نبویؐ کی جانب کھلتی تھی جہاں سے پورا منظر صاف نظر آتا تھا۔ اکثر ایک منٹ پہلے بھی نکلتے تو نماز میں شامل ہوجاتے۔ مسجد کے میناروں سے ساری رات روشنی چھن چھن کر ہمارے کمرے میں آتی رہی۔ عجیب روح پرور اور پُرسکون ماحول تھا۔ ایک رات میں نے خواب میں اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ سفید کرتا اور علی گڑھ کٹ پاجامہ پہنے ہوئے پلنگ کے پاس کھڑے تھے۔ بالکل صحت مند حالت میں اور اس قدر خوش تھے کہ بیان سے باہر ہے۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں آصف سے ہنس، ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ آصف کے دوست عمران نے حج بدل کیا تھا اور انہوں نے جس خلوص، محنت، لگن اور نیک نیتی سے یہ فریضہ ادا کیا شاید کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ میں ان کی بہت زیادہ شکر گزار ہوں حالانکہ ان کو اپنے چھوٹے بچوں اور بیوی کو چھوڑ کر جانا پڑا تھا اور وہ اپنا حج ماں اور بیوی کے ساتھ ایک سال قبل کر بھی چکے تھے۔ پھر فوری طور پر دوبارہ جانا...... یہ ان کی نیک دلی، مروت اور اچھے اخلاق کی نشانی ہے۔ میں نے اپنے شوہر کو جس طرح خوش ہوکر بیٹے سے باتیں کرتے دیکھا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا حج قبول ہوا اور میرے شوہر کی روح خوش ہوئی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عمران کو دنیا اور دوسری دنیا میں بھی بہت اعلیٰ زندگی عطا فرمائے۔ (آمین) ایک عجیب اور ناقابلِ یقین واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ ہم نے اپنی جوتیاں رکھنے کے لیے ایک بڑی تھیلی سلوائی جس میں ہم تینوں کی جوتیاں آجاتی تھیں۔ تھیلی دور سے نظر آجاتی تھی اور اسے اٹھانے میں آسانی ہوتی تھی۔ یہ تھیلی میری جیٹھانی ثریا بھابی نے سی کر دی تھی۔ ایک بات میں یہاں لکھنا چاہ رہی ہوں کہ ثریا بھابی بے حد عبادت گزار خاتون ہیں۔

مدینے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن معمول کے مطابق مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نکلتے ہوئے جوتیاں پہنیں اور تھیلی ہاتھ میں لی۔ تھیلی میرے بیٹے آصف کے ہاتھ میں تھی، یہ فجر کی نماز کا وقت تھا۔ نماز پڑھ کر ہم ہوٹل چلے جاتے تھے تاکہ ناشتا کرسکیں۔ اتفاق دیکھیے کہ اس دن تھیلی راستے میں گر گئی۔ ہمیں افسوس ہوا کہ ثریا بھابی کی دی ہوئی تھیلی کھو گئی۔ خیر اب زیادہ ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ چند روز بعد کراچی واپس چلے آنا تھا۔ کراچی آنے سے قبل سوٹ کیس میں سامان رکھتے ہوئے یا شاید ایک دن قبل آصف نے دیکھا کہ تھیلی سوٹ کیس کے اندر رکھی تھی۔ ہمیں تعجب بھی ہوا ہنسی بھی آئی۔ ہمارے پاس وہ تھیلی حفاظت سے رکھی ہے اگر اللہ تعالیٰ نے عمرے کی توفیق دی تو پھر کام آئے گی۔

اس جگہ ایک اور خواب کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اس خواب سے بھی میرے شوہر کے حج کی تائید ہوتی ہے جو میں نے بہت پہلے دیکھا تھا اور سب کو بتایا بھی تھا پھر اپنی ڈائری میں نوٹ بھی کرلیا تھا۔ خواب میں دیکھا تھا کہ ہم دونوں میاں، بیوی کے گلے میں گلاب کے پھولوں کے بے شمار ہار پڑے

ہیں، ہم دونوں بہت سے مجمع کے درمیان ہیں۔ میں نے بچوں اور اپنی بھتیجی فوزیہ کو بھی بتایا تھا اور کہا تھا کہ اس خواب سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ہم دونوں کو ایک ساتھ عزت ملے گی۔ پھر میں سب بھول بھال گئی۔ حج سے واپس لوٹی تو مجھے لینے کے لیے اگرچہ چند لوگ ہی تھے، جیٹھانی ثریا بھابی، بہو بسمہ، اس کے ماں، باپ، چھوٹی بہن اور اس کی ایک کزن۔ اس کے علاوہ کاشف، عالیہ اور ضیا (داماد) لیکن حیرت انگیز طور پر سب کے ہاتھوں میں گلاب کے ہار تھے اور سب نے ایک، ایک کر کے میرے گلے میں ہار ڈال دیے اور میرا پورا گلا گلاب کے ہاروں سے بھر گیا۔ ائرپورٹ پر سب حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یہ کون صاحبہ ہیں جن کے گلے میں اتنے ہار ہیں۔ تب مجھے اپنے اس خواب کا خیال آیا یہی سماں تھا سب کچھ ایسا ہی تھا۔ اتنے ہی ہار تھے۔ اس وقت بظاہر میرے شوہر ساتھ نہیں تھے لیکن ان کا حج بھی ساتھ ہی ہوا تھا۔ اس وقت ان کے گلے میں بھی اتنے ہی ہار ہوں گے۔ جسم مر جاتا ہے، روح ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ ان کی روح میرے ساتھ تھی۔ اس روز مجھے میرے خواب کی تعبیر مل گئی۔

میں نے بہت طرح کے خواب دیکھے ہیں، اپنی پرسنل ڈائری میں نوٹ کر کے رکھے بھی ہیں، میرے خواب سچے ہوتے ہیں، بہت سی خاص باتیں، واقعات پہلے سے ہی خواب میں دیکھ لیتی ہوں۔ میرے خوابوں کی دنیا ہمیشہ آباد رہتی ہے۔ میں جب چاہوں جس سے چاہوں خواب میں مل لیتی ہوں، باتیں کر لیتی ہوں، ہر وہ شخص جو میرے دل کے قریب ہے یا جس کے دل میں، میں رہتی ہوں، میرے خوابوں میں ضرور آتا ہے۔ جس میں عزیز، رشتے دار، دوست، اپنے بچے سب ہی شامل ہیں۔ اپنے بچوں کی آوازیں مجھے اکثر سوتے میں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی کاشف پکارتے ہیں (وہ کینیڈا میں ہیں) اور کبھی عالیہ آواز دیتی ہے (وہ

نعتِ رسولؐ

میری آنکھوں کی ٹھنڈک کہاں کھو گئی
اپنے روضے کا جلوہ دکھا دیجیے
سیدھے رستے پہ چلتی رہوں عمر بھر
کالی کملی کا کونا تھما دیجیے
ہے یقیں جو بھی مانگوں گی مل جائے گا
کالی کملی کا کونا عطا کیجیے
یہ دل کہہ رہا ہے کہ جلدی کرو
در پہ آقا خدارا بلا لیجیے
ہے یہ عاصی کی خواہش کہ آقا مرے
میرے دل میں ہمیشہ رہا کیجیے
جانتی ہوں کہ ٹھنڈک نمازوں میں ہے
اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کیجیے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

اپنی سسرال میں ہے) میں گھبرا کر اٹھ جاتی ہوں۔ کبھی، کبھی تو جاگتے میں بھی ان لوگوں کی آواز آتی ہے۔ میں حیران ہو کر خالی کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوں کوئی نہیں ہوتا۔ کبھی آصف، بسمہ اور بچے گئے ہوئے ہوتے ہیں، باہر دروازہ کھلنے اور گاڑی کے اندر آنے کی صاف آواز آتی ہے مگر کوئی نہیں ہوتا۔ نہ جانے یہ کیسی آواز ہوتی ہے، کہاں سے آتی ہے، کبھی تو اسامہ اور ماہم (پوتا، پوتی) کی آواز تک سن لیتی ہوں۔ مگر دروازہ کھولنے جاؤ تو سناٹا، نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اب خواب کی بات نکلی ہے تو ایک بات اور ذہن میں آ رہی ہے۔ پلیز اگر آپ سے کوئی غلطی ہو جائے اور آپ کسی سے سوری کرنا چاہیں تو پھر دیر نہ کریں۔ کیونکہ بسا اوقات وقت ہاتھوں سے نکل جاتا ہے اور چاہتے ہوئے بھی پانچ منٹ نہیں مل پاتے کہ انسان سوری کہہ سکے۔ بس ایک چھوٹی سی بات تھی، میں اپنے شوہر سے سوری کرنا چاہتی تھی۔ مگر مجھے وقت نہیں مل سکا۔ حالانکہ پانچ منٹ ہی

چاہیے تھے لیکن اتنی مصروفیت اور پریشانی...... یہ ان کے انتقال سے چند روز پہلے کی بات ہے۔ انہیں پھیپھڑے کا کینسر تھا۔ سگریٹ منع ہوگئی تھی۔ انہوں نے کہیں سے سگریٹ حاصل کرلی۔ میری نظر پڑگئی۔ میں نے ان کے ہاتھ سے چھین کر سگریٹ پھینک دی، مسل دی، وہ اتنے کمزور ہوچکے تھے کہ کچھ نہ کہہ سکے، کچھ نہ کرسکے۔ ان کی وہ خاموش نگاہیں مجھے آج بھی یاد ہیں اور میری آنکھوں سے آج بھی آنسو رواں ہیں۔ میری نیت بری نہیں تھی۔ نہ عمل غلط تھا بس اس کا طریقۂ کار درست نہیں تھا۔ کاش میں نے ان سے سگریٹ چھینی نہ ہوتی۔ میں رُوڈ ہوگئی تھی، نہ ہوئی ہوتی۔ مجھے اس بات کا دکھ ہمیشہ رہے گا۔ مہلت نہ مل سکی اور وہ چپ چاپ ختم ہوگئے۔ محبت کی وہ کہانی جو انہوں نے خود اپنی مرضی سے 32 سال پہلے شروع کی تھی ختم ہوگئی۔ میرے ذہن پر اس واقعے کا اتنا گہرا اثر تھا کہ میں پچھتاوے کی آگ میں جلتی رہتی۔ یہاں تک کہ میں نے انہیں خواب میں دیکھا آغا خان اسپتال کا وہی کمرا اور وہی بیڈ اس پر وہ لیٹے ہوئے تھے اور ان کا انتقال ہوچکا تھا۔ کئی لوگ آس پاس کھڑے ہیں، گھر والے اور ڈاکٹر وغیرہ...... میں بھی وہیں کھڑی ہوں، میں ان سے پوچھتی ہوں۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' وہ ایک لمحے کو رکتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔

''نہیں......''

میں جانتی ہوں کہ مُردہ بول نہیں سکتا مگر اس خواب میں یہی دیکھا کہ مردہ حالت میں انہوں نے میری بات کا جواب دیا اور پھر جب میری آنکھ کھلی تو مجھے ایک طرح کا اطمینان نصیب ہوا۔

میں اس تحریر کے ذریعے تمام لوگوں سے معافی مانگنا چاہ رہی ہوں جن کو میری کسی بات یا کسی جملے سے دکھ پہنچا ہو۔ رات آہستہ، آہستہ بیت رہی ہے اور میں اپنی زندگی کی ادھوری کہانی لکھ رہی ہوں۔ زندگی تو خوشی اور غم سے عبارت ہے، دکھ اور سکھ زندگی کے ساتھ، ساتھ سفر کرتے ہیں مگر میں یہاں اپنی زندگی کے صرف ان لمحات کا تذکرہ کررہی ہوں جو قلم اور قرآن شریف کے حوالے سے گزرے۔ اب میں پھر قلم کی طرف آرہی ہوں۔ اردو ڈائجسٹ میں، میں نے ہمیشہ لکھا۔ وقفے، وقفے سے پرانا ساتھ ہے۔ میں نے رسالے میں اعزازی طور پر لکھا ہے کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ میرا دل چاہا میں اردو ڈائجسٹ کے لیے کسی سائنس داں کا انٹرویو کروں۔ اگرچہ یہاں صرف وزیروں اور سفیروں کے انٹرویوز شائع ہوتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کو خط لکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے میری خواہش پر انٹرویو کی اجازت دے دی۔ یعنی چھاپنے کی ہامی بھرلی۔ چنانچہ میں نے انٹرویو کے لیے ڈاکٹر احسن احمد واحدی ماہر جینیات کا انتخاب کیا۔ وہی واحدی صاحب جنہوں نے کبھی ۱۹۶۵ء میں مجھے پڑھایا تھا۔ اب وہ ڈیفنس میں میرے گھر سے کچھ فاصلے پر رہتے ہیں۔ کئی برس ہوگئے تھے، میں ان سے نہیں ملی تھی۔ ان کی بیگم سے میری بالکل بھی واقفیت نہیں تھی۔ اگرچہ ایم فل، پی ایچ ڈی کے دوران ڈاکٹر صاحب پی آر سی میں ہوتے تھے۔ بعد میں وہ بائیولوجیکل ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر بھی ہوئے، آتے جاتے علیک سلیک ہوجاتی تھی مگر کوئی خاص بات چیت نہ تھی۔ اب میں بہت سالوں بعد ایک صحافی کی حیثیت سے ان سے مل رہی تھی، ان کا بہت اچھا انٹرویو میں نے ریکارڈ کیا۔ اس دوران ان کی بیگم سے بھی ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی مائیکرو بائیولوجی ڈیپارٹمنٹ میں پروفیسر تھیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد اردو یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہیں۔ بہت خوش اخلاق اور مہذب خاتون ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا انٹرویو جنوری ۲۰۰۵ء کے

اردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا۔ اس سے قبل ڈائجسٹ میں کسی بھی سائنس دان کا انٹرویو شائع نہیں ہوا تھا۔ بات پھر وہی آجاتی ہے میری خواہش اور پھر اللہ کی طرف سے خواہش کی تکمیل...... میں نے جب بھی کسی چیز کی تمنا کی ضرور پوری ہوئی۔ ایک بار صرف دل میں سوچا تھا کہ ان لوگوں کا گھر قریب ہے اگر ان کی مسز سے واقفیت ہوتی تو ملنا جلنا آسان تھا ورنہ کراچی میں فاصلوں کی وجہ سے بھی ایک دوسرے سے ملنا ناممکن بن جاتا ہے۔ بس پھر ریحانہ واحدی سے دوستی ہوگئی۔ اس دوستی میں قرآن حکیم کا حوالہ شامل تھا۔ ایک سال تک ہم دونوں نے ساتھ مل کر قرآن حکیم کو پڑھا۔ کبھی وہ میرے گھر آجاتیں، کبھی میں ان کے گھر چلی جاتی۔ اب وہ سلسلہ تو نہیں ہے مگر دوستی قائم ہے۔ ہمارے گھروں میں اکثر گیٹ ٹوگیدر ہوتی ہے، ڈنر ہوتا ہے اور قریبی دوست اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کچھ وقت اچھا گزر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صالحہ احمد نے اپنے گھر میں غریب بچوں کے لیے پیام تعلیم ایجوکیشن سینٹر کے نام سے ایک ادارہ کھولا ہوا ہے۔ جہاں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ میں وہاں والنٹیئر ٹیچر ہوں اور میتھ پڑھاتی ہوں۔ میتھ میرا پسندیدہ مضمون ہے۔ میٹرک میں 100/100 نمبر لیے تھے اگرچہ میں بائیولوجی گروپ میں تھی۔ ہمارے زمانے میں نویں جماعت سے بائیولوجی اور میتھس کے گروپ الگ ہو جاتے تھے۔ ہمارے پاس صرف compulsary maths تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں آگے میتھ پڑھوں مگر ان دنوں لڑکیاں عموماً بائیولوجی گروپ میں ہی جاتی تھیں اس لیے میں بھی چلی گئی۔

اس دوران افسانہ نگاری کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ہلکی پھلکی شعر و شاعری بھی ہوتی رہی۔ نوائے وقت میں کالم نگاری کا سلسلہ بھی رہا۔ لیکن جب سے آٹھواں کلام پاک ختم ہوا تھا میں اداس رہنے لگی تھی۔ لگتا تھا میں خالی ہاتھ رہ گئی ہوں۔ میری راتیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے لکھے جانے والے قرآن پاک سے منور رہتی تھیں۔ وہ سناٹوں میں بدل گئیں۔ مجھے راتوں کو جاگنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ مشکل سے نیند آتی اور جب سو جاتی تو اکثر خواب میں قرآن حکیم کے بارے میں کچھ نہ کچھ دیکھتی۔ عجب بے چینی کا عالم تھا۔ چنانچہ میں زیادہ دن صبر نہیں کر سکی اور میں نے اپنے بھائی سے کہہ کر ایک بار پھر ارجنٹ بنیاد پر کاغذ پرنٹ کروائے اور اس وقت مجھے پتا چلا کہ کیلی گرافی پین ملتے ہیں جو اسی مقصد کے لیے ہوتے ہیں کہ ان سے عربی لکھی جائے۔ چنانچہ میں نے یہ پین خریدے اور صرف تین ماہ بعد 29 اپریل 2005ء جمعہ 19 ربیع الاول کو اپنا نواں کلام پاک لکھنا شروع کیا۔ اس بار چونکہ کیلی گرافی پین استعمال ہو رہا تھا تو لکھائی بہت خوب صورت تھی۔ لگتا تھا پرنٹ کیا ہوا ہے۔ اس کلام پاک کو مکمل کرنے میں صرف نو ماہ اور اٹھارہ دن کا عرصہ لگا اور یہ 16 فروری 2006ء بروز جمعرات کو پایۂ تکمیل کو پہنچا... (باقی آئندہ)

ضروری نوٹ

عزیز قارئین! ذکیہ آپا ناسازیٔ طبع اور ضعف کے باعث فون پر زیادہ گفتگو نہیں کر پاتیں۔ آپ کے جذبات و احساسات ان تک پہنچا دیے جاتے ہیں پھر بھی آپ ان سے بذریعۂ سوال کوئی رابطہ کرنا چاہتی ہیں تو ادارے کے ایڈریس پر ڈاکٹر ذکیہ آپا اور پاکیزہ لکھ کر روانہ کر دیں۔ آپ لوگ بذریعۂ ای میل بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔

E.mail:
kitabiat.1970@yahoo.com
jdpgroup@hotmail.com

آپ کی دعائیں، آرا، تجاویز ہم سب کے لیے قابلِ قدر ہیں۔

قسط: 19

اعتبارِ وفا

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سجھائی تک نہیں دیتی۔

ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کرلیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اوّلین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جمی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصّہ
کہاں کا ذکرِ سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رُکے ہوئے ہیں





ظفری کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ خدا بخش اور رواحہ کے بابا پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں عظام پر ٹھہر گئیں۔ عظام نے مڑ کر بابا کی طرف دیکھا جو ظفری کی آمد سے بے نیاز اپنے ہی کسی خیال میں گم سر جھکائے بیٹھے تھے۔

"اتفاق سے تمہارا ایک کلاس فیلو مارکیٹ میں مل گیا اس نے رواحہ کے ایکسیڈنٹ کا بتایا...... زیادہ سیریس ایکسیڈنٹ تو نہیں تھا اور اب کہاں ہے؟ کیسا ہے وہ...... اسے ہی دیکھنے آیا ہوں۔" لمحہ بھر عظام کو خاموشی سے دیکھنے کے بعد ظفری نے کہا۔

"ابھی تو آئی سی یو میں ہے۔" اپنے اندر امڈتے غصے پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے عظام نے جواب دیا۔ "لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں انشاء اللہ جلد ریکور کرلے گا۔"

"تو کچھ معلوم ہوا حادثہ کیسے ہوا؟" ظفری کی نظریں عظام کو ٹٹول رہی تھیں۔ "تو کیا ظفری... یہ معلوم کرنے آیا ہے کہ ہم کس حد تک جانتے ہیں۔" عظام نے سوچا اور دل ہی دل میں اپنے پاپا کی سمجھداری کا قائل ہوتے ہوئے بظاہر نارمل لہجے میں بولا۔

"ہاں، رواحہ نے بتایا ہے کہ کسی نامعلوم موٹر سائیکل سوار نے اس وقت فائر کیا جب اس نے فون کرنے کے لیے گاڑی کی رفتار آہستہ کی تھی۔ گولیاں لگنے سے اس کے ہاتھ سے اسٹیرنگ چھوٹ گیا اور گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھ کر درخت سے ٹکرا گئی۔"

"اوہ ویری سیڈ!" ظفری نے ہونٹ سکیڑے اور سوالیہ نظروں سے عظام کی طرف دیکھا۔ "کچھ اندازہ ہے کون تھا وہ؟"

"کون ہوسکتا ہے؟" عظام نے اپنے اندر کے کھولاؤ پر جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے کاٹتی نظروں سے ظفری کو دیکھا...... لیکن اپنے لہجے کو نارمل ہی رکھا۔

"کبھی پہلے کسی کو پتا چلا ہے کہ کون خون کی ہولی کھیلتا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن ہی تو سنتے ہیں کہ فلاں روڈ پر کوئی اسکوٹر سوار گولیاں چلاتا ہوا نکل گیا اور بے گناہ راہ گیر مارے گئے۔"

"اوہ ہاں...... یہ تو ہے۔" ظفری نے تائید کی۔

عظام کو لگا جیسے اس نے اطمینان بھری سانس لی ہو...... اگرچہ اس وقت اسے پاپا سے اختلاف ہوا تھا لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ پاپا نے صحیح کہا تھا وہ جو اتنی دیدہ دلیری سے یہاں تک چلا آیا تھا اگر رواحہ اس کے خلاف بیان دیتا تو وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

"لگتا ہے اس ملک میں اب نہ تو کوئی قانون رہا ہے نہ انصاف...... دہشت گرد کھلے پھرتے ہیں، جان و مال کا تحفظ دینے والا کوئی نہیں۔ ہر روز خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے اور ہمارے صاحب اقتدار لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

وہ چند لمحے خالص سیاستدانوں کے انداز میں بولتا رہا۔ عظام نے دیکھا بابا اور خدا بخش بہت دھیان سے اسے سن رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"کب تک روم میں شفٹ کریں گے رواحہ کو؟" اپنی بات مکمل کر کے اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر عظام سے پوچھا۔

"کچھ اندازہ نہیں۔" عظام اس کی گفتگو سے از حد بیزار ہوا تھا۔ اپنے گریبان میں جھانکنے کے بجائے دوسروں پر تنقید کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔

"یہ رواحہ کے لیے ہے، میں پھر چکر لگاؤں گا۔" ظفری نے مڑ کر اپنے ساتھ آنے والے گارڈ سے پھولوں کا گلدستہ لے کر اسٹول پر رکھا۔

"یہ رواحہ کے بابا ہیں۔" عظام کو خیال آیا کہ اس نے ابھی تک ان کا تعارف نہیں کروایا۔ شاید اسی لیے ظفری انہیں غور سے دیکھ رہا ہے۔

"اوہ...... ہاں......" ظفری نے چونک کر اُن کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔

"بہت افسوس ہے سر اس حادثے کا۔"

"اللہ میرے بچے کو صحت و زندگی دے بیٹا اور ظلم کرنے والوں کو ہدایت دے جو یہ بھول چکے ہیں کہ آج وہ جو دوسروں کے ساتھ کر رہے ہیں کل اُن کے ساتھ بھی برا ہو سکتا ہے۔" انہوں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر ظفری کی طرف دیکھا۔

"برا ہوگا صاحب...... ضرور ہوگا۔ اللہ انہیں ضرور کیفرِ کردار تک پہنچائے گا انشاء اللہ......!" خدا بخش نے بے اختیار کہا تو ظفری کے چہرے کا رنگ یک دم بدلا۔

"سر آپ نے مجھے پہچانا؟" ظفری بابا کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"نہیں......" انہوں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"سر میں ظفر ہوں، ظفر سومرو...... ممتاز سومرو کا بیٹا۔"

"ظفر سومرو......" انہوں نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"سر میں نے ایک سال آپ سے پڑھا ہے فرسٹ ایئر میں سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ ایک بار تاج بلوچ سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس کے بندے مجھے مار پیٹ کر چلے گئے تھے اور آپ مجھے اسپتال لے کر گئے تھے اور خون بھی دیا تھا۔"

"اوہ...... تو آپ ظفر ہیں، میں بالکل نہیں پہچان پایا۔ اس وقت تو دبلے پتلے سے تھے۔ کیا کر رہے ہیں آج کل...... ایک دم ہی پڑھائی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔" بابا کے چہرے پر ایک پرانے شاگرد سے ملنے کی خوشی تھی۔

"بس سر کچھ خاندانی دشمنی کا مسئلہ تھا۔ میرے والد نے مجھے باہر بھجوا دیا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سال باہر رہا پھر واپس آکر دوبارہ کسی اور کالج میں نئے سرے سے فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لیا، آج کل ماسٹر کر رہا ہوں فائنل ایئر میں ہوں۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں...... ایک بار آپ سے ملنے گیا تھا، باہر سے آنے کے بعد پتا چلا تھا کہ آپ کا کہیں اور ٹرانسفر ہو گیا ہے۔"

عظام نے محسوس کیا کہ بابا سے بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر وہ رعونت نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے نظر آرہی تھی۔

"بہت خوشی ہوئی ظفر بیٹا، اللہ آپ کو شاندار کامیابیاں عطا کرے اور آپ کو دوسروں کے لیے باعثِ راحت بنائے۔" انہوں نے اسے دعا دی تو عظام نے ایک بار پھر ظفری کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا۔

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے سر......" ظفری کا لہجہ مزید تبدیل ہوا تھا۔

"نہیں بیٹا بہت شکریہ...... سب لوگ ہیں اِدھر، عظام ہے، جواد ہے اور دوسرے دوست بھی آ جا رہے ہیں۔" وہ بہت شفقت و محبت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"عظام کے والد بھی ہیں یہاں ڈاکٹرز بھی بہت اچھے ہیں۔ بس آپ میرے بیٹے کے لیے دعا کرنا اللہ اسے صحت و زندگی دے اور ہمیشہ دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے...... بیٹا ظفر رواحہ میرا اکلوتا بیٹا ہے، میری واحد پونجی......" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"انشاء اللہ سر...... آپ کے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔" یکا یک وہ بہت اپ سیٹ نظر آنے لگا تھا۔

”اگر کبھی کسی کام کے لیے میری ضرورت پڑے تو عظام کے پاس میرا نمبر ہوگا۔“ اس نے ذرا سا سر جھکایا۔
”جیتے رہو بیٹا اور اپنے والدین کا دل ٹھنڈا کرو......“
”اگر میں آپ کے کسی کام آسکا تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ میں نے یہ بات کبھی نہیں بھلائی اگر اس روز آپ مجھے اسپتال نہ لے کر جاتے تو شاید میں آج زندہ نہ ہوتا۔“
”بچانے والی ذات تو اللہ کی ہے بیٹا، وہ کسی نہ کسی کو وسیلہ بنا دیتا۔ میں نہ ہوتا تو کوئی اور آجاتا کہ اللہ کو آپ کی زندگی منظور تھی۔“
”سوری سر!“ اس نے اپنا سر مزید جھکالیا اور پھر تیزی سے باہر نکلتا چلا گیا۔ انہوں نے حیرت سے اسے جاتے دیکھا، وہ نہیں سمجھ سکے تھے کہ اس نے سوری کس بات پر کیا تھا۔ پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہولے سے سر جھٹک کر انہوں نے عظام کی طرف دیکھا جو سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
”یہ چند ماہ میرا شاگرد رہا، ذہین تو بہت تھا لیکن تھوڑا اکھڑ اور جھگڑالو تھا۔ مجھے اپنی ذہانت کی وجہ سے بہت پسند تھا۔“ عظام کا جی چاہا کہ وہ انہیں بتائے کہ یہ ہی ظفری ہے جو بلاوجہ ہی رواحہ کا دشمن ہو رہا ہے لیکن جس شفقت و محبت سے وہ اس کا ذکر کر رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے اس کے لیے جو پیار جھلک رہا تھا اس نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ جب اس نے اس کا نام لیتے ہوئے اس کی آمد پر حیرت کا اظہار کیا تھا تو شاید بابا نے نہیں سنا تھا۔
”بچے اتنے قصوروار نہیں ہوتے عظمی بیٹا...... وہ تو خام مال ہوتے ہیں بالکل کچی مٹی کی طرح...... جس سانچے میں چاہو ڈھال دو جو شکل دینا چاہو دے لو...... یہ والدین ہی ہوتے ہیں جو اُن کی تربیت صحیح نہیں کرتے، اپنے لاڈ پیار میں بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ ظفر بھی اپنے والدین کے لاڈ سے کسی حد تک بگڑا ہوا تھا۔ امیر والدین کی اولاد تھا۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا تھا۔ ان دنوں اس کا نیا، نیا ہی ایڈمیشن ہوا تھا اس کا جھگڑا ایک سیکنڈ ایئر کے لڑکے سے ہو گیا...... وہ بھی کسی قبائلی سردار کا بیٹا تھا، اس نے اپنے بندوں سے ایک دن اسے پٹوایا اور زخمی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھے اس روز کالج میں دیر ہو گئی تھی۔ باہر نکلا تو یہ پارکنگ میں زخمی حالت میں پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے گیا۔ اس کی حالت کافی خراب تھی کیونکہ بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ میرا بلڈ گروپ اتفاق سے مل گیا تھا سو فوری طور پر میں نے ہی خون دیا تھا۔ صحت مند ہونے کے بعد یہ زیادہ دن کالج نہیں آیا لیکن جتنے دن آتا رہا میری بہت عزت کرتا تھا۔“ انہوں نے تفصیل سے بتایا تو عظام نے ایک گہری سانس لے کر خدا بخش کی طرف دیکھا۔
”چاچا...... چائے تو اب ٹھنڈی ہو گئی ہوگی۔ آپ کینٹین سے قہوہ گرم کروا لائیں۔ میں جواد وغیرہ کو بلا کر لاتا ہوں۔“
وہ اور خدا بخش دونوں ہی ایک ساتھ باہر نکلے...... خدا بخش کینٹین کی طرف گیا تو وہ آئی سی یو کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ایمل لاؤنج میں کسی گہری سوچ میں گم بیٹھی تھی جب افنان لاؤنج میں داخل ہوا۔
”السلام علیکم ماما......“ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
”پیاری ماما جانی کس سوچ میں گم ہیں؟“ اس کے قریب آکر تھوڑا سا اس کی طرف جھکتے ہوئے افنان نے کہا اور پھر اس کے قریب ہی صوفے پر ریلیکس انداز میں ٹانگیں تھوڑی سی پھیلا کر بیٹھ گیا۔
”کچھ نہیں...... بس ایسے ہی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔
”سوری مام کچھ دیر ہو گئی، ٹریفک میں پھنس گیا تھا۔ کھانا لگوائیں سخت بھوک لگی ہے۔ آپ لوگوں نے تو کھا لیا ہوگا۔“

”نہیں، کسی نے نہیں کھایا ابھی تک۔“

”کیوں......؟“ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”میں نے رتی کو میسج کر تو دیا تھا کہ میں شاید لیٹ آؤں میرا انتظار نہ کریں اور آپ لوگ کھالیں۔ اب تو پانچ بجنے والے ہیں اور یہ رتی کہاں ہے۔ ہم لوگ کافی پینے جارہے تھے تو مجھے ایک جگہ لگا تھا کہ رتی کی گاڑی گزری ہے لیکن نمبر نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کا تو کوئی پروگرام نہیں تھا باہر جانے کا۔ شاید کسی اور کی ہی گاڑی ہوگی۔“

”ہاں ابھی تو گھر پر ہی ہے لیکن کچھ دیر کے لیے گئی تھی۔ کسی کلاس فیلو کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ اسپتال گئی تھی اور جب سے آئی ہے کمرے سے باہر نہیں نکلی، دوبار نازو کھانے کے لیے بلانے گئی تو اس نے منع کر دیا۔“ ایمل نے تفصیل سے بتایا تو وہ مسکرایا۔

”محترمہ اوپر سے بہت بہادر بنتی ہیں لیکن اندر سے یہ ذرا سا دل ہے اس کا۔ ایکسیڈنٹ سے اپ سیٹ ہوگئی ہوگی لیکن ماما پلیز آپ تو کھانا کھالیں، حالت دیکھی ہے اپنی کتنی کمزور ہو رہی ہیں۔“ اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”جب سے نانا ابو کی ڈیتھ ہوئی ہے آپ نے اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے۔“

ڈیڈی کے ذکر پر ایمل کی آنکھیں نم ہوگئیں لیکن اس نے پلکیں جھپک کر اس نمی کو باہر آنے سے روکا۔

”رکھتی تو ہوں اپنا خیال......“

”نہیں، آپ بالکل بھی اپنا خیال نہیں رکھتیں۔“ اس نے ایمل کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا رخ اپنی طرف کیا اور پریشان سا ہوگیا۔

”مما کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔ نانو تو ٹھیک ہیں ناں؟“

”ہاں ٹھیک ہیں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں پریشان نہیں ہوں بس ایسے ہی تم نے ڈیڈی کا نام لیا تو وہ یاد آگئے۔“ لمحہ بھر کے لیے افنان خاموش ہوگیا وہ جانتا تھا کہ ایمل اپنے ڈیڈی سے بہت اٹیچڈ تھی اور ان کی اس طرح اچانک ڈیتھ سے ابھی تک اپ سیٹ ہے۔

”ماما موت ایک ایسی چیز ہے جس کے سامنے سب بے بس ہیں، ہر ایک نے اپنے وقت پر جانا ہے۔ آپ نانا ابو کے لیے دعا کیا کریں۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔“

”آمین۔“ ایمل نے آہستگی سے کہا۔

”کبھی، کبھی میں سوچتا ہوں ہم نے نانا ابو کے ساتھ بہت کم وقت گزارا...... نانا ابو اور نانو دونوں ہی آپ کے اور ڈیڈی کے یہاں سیٹل ہو جانے سے اکیلے ہوگئے تھے۔ ڈیڈی کو وہاں ہی رہنا چاہیے تھا، ان کے ساتھ۔“ اس نے ایمل کے بازوؤں سے ہاتھ ہٹائے۔

ایمل خاموش رہی تھی یہ ایسا دکھ تھا جو اندر ہی اندر اسے کاٹتا رہتا تھا۔ اسے بابر سے سوائے اس ایک بات کے اور کوئی شکایت نہیں تھی۔

”نانو نے کہا تھا کہ وہ عدت کے بعد کراچی آئیں گی لیکن نہیں آئیں...... اور ڈیڈی نے بھی تو کہا تھا کہ وہ جلد ہی شفٹ ہو جائیں گے لیکن پھر دوبارہ انہوں نے ذکر نہیں کیا...... کیا ان کا ارادہ بدل گیا ہے؟“

”معلوم نہیں......“ ایمل، بابر کے ارادوں سے بے خبر تھی کیونکہ پھر دوبارہ بابر نے تذکرہ نہیں کیا تھا لاہور جانے کا بلکہ پچھلے دنوں تو اس کا موڈ کافی آف تھا۔

”میں سوچ رہا ہوں خود ہی کیوں نہ کسی روز نانو کو جا کر لے آؤں...... کیا خیال ہے؟“ افنان کھڑا ہوگیا۔

”شاید وہ نہ آئیں۔“ ایمل نے خیال ظاہر کیا۔

''آپ بے فکر رہیں، میں منالوں گا نانو کو۔'' وہ مسکرایا۔ ''آپ جلدی سے کھانا لگوائیں، میں رتی کو دیکھتا ہوں۔ کیا کررہی ہیں محترمہ...... اور بڑی خوشبوئیں آرہی ہیں کچن سے کیا پکا ہے؟'' اس نے ناک سکیڑ کر خوشبو سونگھی۔
ایمل اسے کیا بتاتی کہ وہ تو صبح سے یونہی لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ تب سے جب سے ارتفاع گھر سے گئی تھی نازو نے پوچھا تھا کہ کیا پکانا ہے اور اس نے کہہ دیا تھا کہ جو جی چاہے اپنی مرضی سے پکالو۔ یہ آج پھر ارتفاع نے کیا کہہ دیا تھا۔ اسے کہ اگر وہ اس کی سگی ماں ہوتیں تو...... اس کا درد سمجھتیں۔ اس کی تکلیف محسوس کرتیں۔
اسے لگا تھا جیسے کسی نے تیز دھار خنجر اس کے دل میں اتار دیا ہو۔ اور اس تیز دھار خنجر کی تکلیف جیسے وہ اب بھی محسوس کررہی تھی۔
''نازو بھئی جلدی سے کھانا لگاؤ۔'' اسے خاموش دیکھ کر افنان نے خود ہی نازو کو آواز دے کر کھانا لگانے کا کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ افنان کو منع کرنا چاہتی تھی کہ وہ ارتفاع کے پاس مت جائے۔ وہ جانتی تھی وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ وہ اتنی ہی اپ سیٹ اور اداس تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ واپس آئی تھی۔ سوجی ہوئی آنکھیں، بھیگی پلکیں اور مسلسل رونے سے سرخ رخسار...... اس کی حالت دیکھ کر وہ خود پریشان ہوگئی تھی۔ اور بھول گئی تھی کہ وہ ارتفاع سے خفا تھی۔ وہ اس کے منع کرنے کے باوجود چلی گئی تھی۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ ہمیشہ کی طرح بدگمان بھی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اسے سگی ماں ماننے سے انکار کردیا تھا۔
''ارتی بیٹا کیا ہوا۔ وہ لڑکا تو ٹھیک ہے ناں......؟'' ارتفاع کے گھر لوٹنے پر اس کی حالت دیکھ کر وہ بے اختیار کھڑی ہوکر پوچھ بیٹھی تھی لیکن ارتفاع نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور لاؤنج میں رکے بغیر نچلا ہونٹ دانتوں تلے کاٹتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی تھی۔
''کیا وہ بہت زخمی ہے، کیا اس کی حالت نازک ہے؟'' ایمل نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔
''ہاں......''
ایمل نے رک کر اس کی طرف دیکھا تھا اور ارتفاع کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔
''وہ آئی سی یو میں ہے ابھی۔'' یہ کہتے ہوئے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔ ایمل نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگالیا اور ہولے، ہولے تھپکنے لگی تھی۔ ارتفاع کو اس کا سہارا کیا ملا وہ پھوٹ، پھوٹ کررونے لگی تھی۔
ایمل ہولے، ہولے اسے تھپکتی رہی۔
''ریلیکس میری جان...... حوصلہ۔''
''ماما پلیز...... آپ اس کے لیے دعا کریں ناں وہ ٹھیک ہوجائے۔'' کچھ دیر بعد اس نے ایمل سے الگ ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور ایمل تب سے لاؤنج میں پریشان سی بیٹھی تھی۔ یہ ارتفاع کس راستے پر چل نکلی تھی۔ اسے ہر صورت ارتفاع کو اس راستے پر آگے بڑھنے سے روکنا تھا...... لیکن کیا وہ اسے روک پائے گی؟ کیا اس کے آنسو، اس کی بے قراری اور بے چینی اس بات کی غماز نہیں ہے کہ وہ پہلے ہی اس راستے پر بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ اس وقت کچھ کہنے اور سمجھانے کا فائدہ نہیں تھا۔ لیکن بعد میں بھی کیا وہ اسے سمجھا پائے گی کہ محبت کا سفر بیکار اور رائگاں ہے۔ اس سفر میں سوائے اذیتوں کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محبت صرف کتابوں، کہانیوں اور افسانوں میں ہی خوب صورت لگتی ہے ورنہ یہ صرف ایک دھوکا اور فریب ہے۔ اور کیا وہ محبت کے اس فریب کو برداشت کرسکے گی۔ بابر نے جس طرح ہتھیلی کا چھالا بنا رکھا ہے وہ تو بکھر جائے گی...... اور یہ لڑکا کیا خبر مدثر کی طرح ہی ہو لالچی، بدکردار، مجھے ہر صورت اسے سمجھانا ہے۔ لیکن میری بات وہ کہاں سنے گی...... بابر، صرف بابر ہی اسے سمجھا سکتا ہے۔ مجھے بابر سے ہی بات

کرنا ہوگی اسے بتانا ہوگا تاکہ وہ یہاں ہی اسے روک لے۔ دل ہی دل میں فیصلہ کر کے وہ اٹھی اور کچن میں جھانک کر دیکھا...... نازو سالن ڈونگوں میں ڈال رہی تھی۔ وہ لاؤنج میں ہی کھڑے ہو کر افنان اور ارتقاع کا انتظار کرنے لگی لیکن افنان کو اکیلے سیڑھیوں سے اترتے دیکھ کر وہ ایک بار پھر مضطرب ہوگئی۔ ارتقاع اس لڑکے سے محبت کرتی ہے اب اس میں اسے شک نہیں تھا لیکن کیا وہ بابر کے سمجھانے پر سمجھ جائے گی؟ اسے بھی تو ممی نے کتنا سمجھایا تھا لیکن کیا اس نے ممی کی بات سمجھ لی تھی...... اور ڈیڈی نے بھی تو پہلے مدثر کے والد کو انکار کر دیا تھا لیکن پھر اس کی خوشی کی خاطر اور کیا ارتقاع بھی اس کی طرح......

اپنے اندر سے اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر افنان کی طرف دیکھا جو اسے کچھ سنجیدہ اور خاموش سا لگا۔ حالانکہ جب وہ ارتقاع کی طرف جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں شوخی اور شرارت تھی لیکن اب اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی لگتی تھیں۔

''وہ آرہی ہے منہ ہاتھ دھو کر۔'' اسے اپنی طرف تکتے پا کر اس نے بتایا اور ایمل ایک اطمینان بھری سانس لے کر افنان کے ساتھ ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ نازو نے کھانا لگا دیا تھا۔

''ماما یہ لڑکا جس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے کیا کبھی رتی نے اس کے متعلق آپ سے کوئی بات کی؟'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے افنان نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تھا لیکن ایمل چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''نہیں...... کیوں کیا ارفی نے تم سے کچھ کہا؟''

''وہ بہت اپ سیٹ ہے ماما۔'' افنان نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا سلاد ڈالا۔

''ہوسکتا ہے اس نے بابر سے ذکر کیا ہو۔'' ایمل نے خیال ظاہر کیا۔

''بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں ماما جو لڑکیاں صرف اپنی ماؤں سے ہی شیئر کر سکتی ہیں۔''

''وہ مجھے اپنی ماں سمجھتی ہی کب ہے۔'' ایمل نے بہت دلگرفتگی سے سوچا...... اور افنان کی طرف دیکھا۔

''افنان تم اس لڑکے کے متعلق پتا کرنا کون ہے؟ کس خاندان کا ہے؟ رواحہ نام ہے اس کا۔'' افنان نے سر ہلایا اس کے ذہن میں کیا تھا، وہ کیا سوچ رہا تھا وہ اچھی طرح اندازہ لگا سکتی تھی۔ افنان کانٹے سے گاجر کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال رہا تھا وہ یونہی بے خیالی میں اسے دیکھے گئی۔

''کیا دیکھ رہی ہیں ماما؟'' افنان نے اسے مسلسل اپنی طرف دیکھتے پا کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ چونکی۔ ''یونہی دیکھ رہی تھی تم ڈیڈی سے بہت مشابہ ہو......''

''رئیلی...... ماما......'' افنان خوش ہوا۔

''ہاں، ممی بھی کہتی ہیں کہ تم ڈیڈی کی جوانی کی تصویر ہو...... کبھی لاہور گئے تو تمہیں ان کی ینگ ایج کی تصاویر دکھاؤں گی۔''

''اور یہ بلی۔'' اس نے ہولے، ہولے چل کر آتی ہوئی ارتقاع کی طرف دیکھا۔ ''اس کی شکل کس پر گئی ہے آپ پر؟''

''کچھ تھوڑی بہت مشابہت تو ہے مجھ سے لیکن زیادہ......'' ایمل خاموش ہوگئی تھی۔ ارتقاع کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ اب بھی اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

''کیا پاپا پر ہے؟'' افنان نے شرارت سے سر دائیں بائیں کر کے اسے دیکھا۔

''کون...... بابر......؟'' غیر ارادی طور پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ارتقاع نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

''باپ پر نہیں تو ماں پر ہوگی شکل......'' ایمل نے اس کے لہجے میں چھپی تلخی کو شدت سے محسوس کیا۔

''ضروری تو نہیں کہ شکل ماں، باپ سے ہی ملتی ہو۔'' افنان نے خوشگوار لہجے میں کہا۔
''جیسے میری شکل نہ پاپا سے ملتی ہے نہ ماما سے بلکہ بقول ماما کے میں سارے کا سارا نانا ابو پر گیا ہوں۔''
ارتقاع نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔
''ہاں تم اپنے نانا ابو جیسے ہو۔'' ایمل نے تائید کی اور سوچنے لگی۔
''ارتقاع تو اپنے باپ کی ہی ہم شکل ہے، اس میں مدثر اور بابا جان کی بہت مشابہت ہے۔ بالکل مدثر جیسی آنکھیں اور پیشانی پر بائیں ابرو کے اوپر چھوٹا سا سیاہ تل......'' وہ کھوسی گئی۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ کس قدر کٹھور تھا مدثر، اپنی بیٹی کے لیے بھی اس نے اپنا دل پتھر کرلیا تھا۔ کبھی مڑ کر اس کی خبر نہیں لی۔ کبھی پوچھا نہیں حالانکہ پہلے کتنا شور مچایا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر جائے گا۔ اس کے پاس نہیں چھوڑے گا۔ اسے جتنی بچوں سے محبت تھی اور اپنے بچوں کے لیے جس طرح دیوانگی کا اظہار کرتا تھا، اس سے اسے خوف آتا تھا۔ ہر وقت دل کو دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ اسے چھین کر نہ لے جائے۔ وہ جب، جب بیٹی سے ملنے آیا وہ چھپ، چھپ کر دیکھتی تھی کہ وہ کتنی بے قراری سے اسے چومتا تھا۔
''ممی اسے منع کردیں......روکیں کسی طرح......وہ اس سے ملنے نہ آیا کرے۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ اسے مجھ سے چھین نہ لے۔'' اس نے ممی سے کہا تھا تو ممی نے اسے تسلی دی تھی۔
''وہ اس طرح اسے تم سے چھین کر نہیں لے جاسکتا تھا۔ لیکن ہم اسے اس کی اپنی ہی بچی سے ملنے سے نہیں روک سکتے۔ اس کا پورا حق ہے۔ تم ملنے نہیں دوگی تو یہ حق وہ بذریعہ عدالت حاصل کرلے گا۔ وہ باپ ہے ارتقاع کا...... بیٹا ایک بار پھر سوچ لو ارتقاع کی خاطر......صلح کرلو......مرد کا کیا ہے ایسا وہ تو......'' ممی نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ممی کی بات کاٹ دی تھی۔
''نہیں ممی، میں کسی ایسے شخص کے ساتھ گزارہ نہیں کرسکتی جو بدکردار ہو۔ اگر وہ اپنی غلطی مان لیتا اپنے ہونے والے بچے کو اپنا نام دے دیتا، اس عورت سے نکاح کرلیتا تو شاید میں اسے معاف کردیتی۔ ارتقاع کی خاطر اور اس محبت کے صدقے میں جو میں نے اس سے کی لیکن اب نہیں ممی......اب اگر وہ ارتقاع سے ملنے آئے تو اسے صاف، صاف کہہ دیجیے گا کہ وہ مجھے طلاق دے، دے نہیں تو میں بذریعہ عدالت خلع لے لوں گی۔'' اس کا فیصلہ حتمی تھا۔ مدثر اور بابا جان کے اصرار کے باوجود وہ ان سے نہیں ملی تھی کیونکہ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بابا جان کے سامنے وہ کمزور نہ پڑ جائے اور پھر جب بابر نے اپنے وکیل کے ذریعے اسے طلاق کے مطالبے کا نوٹس بھجوایا تو اس نے اسے طلاق بھجوادی تھی۔ شرعی طریقے سے بذریعہ یونین کونسل اسے پہلی طلاق ملی تھی لیکن اس کے بعد بھی وہ اسے فون کرنے اور ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ ممی اور ڈیڈی سے درخواست کرتا رہا کہ اب بھی وقت ان کے ہاتھوں میں ہے، وہ رجوع کرلے۔ بھلا دے اپنی بیٹی کی خاطر، پتا نہیں وہ کیوں اتنا خوش گمان تھا کہ شاید وہ اس کی اس حرکت کے بعد اس کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھتی ہے۔ لیکن اس نے تو اپنے دل سے اس کی محبت حرفِ غلط کی طرح مٹادی تھی۔ وہ اس کا نام بھی نہیں لینا چاہتی تھی۔ نہ سننا چاہتی تھی۔ ایک روز اس نے بچوں کے لیے کی جانے والی ساری شاپنگ بھجوادی تھی۔ وہ نہیں لینا چاہتی تھی لیکن ممی نے سب کچھ خاموشی سے رکھ لیا تھا۔
''باپ ہے......بہت شوق سے سب کچھ خریدا تھا اس نے اور دل دکھے گا اس کا۔''
''تو اپنے اس ناجائز بچے کو بھجوادے۔'' یابر نے بھی کہا تھا۔
''منہ پر ماریں سب اس کے۔''
لیکن ممی نے کچھ بھی واپس نہیں بھجوایا تھا۔ ممی، ڈیڈی جو پہلے مدثر کے ساتھ اس کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اب اس کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتے تھے اور یہ انہی دنوں کی بات تھی۔ پہلی طلاق کا نوٹس آئے پندرہ دن ہوئے تھے شاید...... جب ڈیڈی نے لندن جانے کا پروگرام بنالیا...... وہ سب برٹش پاسپورٹ رکھتے تھے۔ ممی کی پیدائش وہاں کی ہی تھی یوں ان کی وجہ سے ڈیڈی کو اور اسے بھی برٹش نیشنلٹی مل گئی تھی۔

دو تین بار پہلے بھی وہ وہاں جاچکی تھی۔ لندن میں ڈیڈی کا ایک ذاتی فلیٹ تھا جس کے ایک پورشن میں ڈیڈی کی ایک بیوہ کزن رہتی تھیں، اپنی تین بچیوں کے ساتھ، وہ جب بھی وہاں جاتے ان کا قیام ان کے ہاں ہی ہوتا تھا۔ فاطمہ پھپو بہت شفیق اور محبت کرنے والی خاتون تھیں...... ان کی بیٹی کی شادی وہاں ہی لندن میں کسی پاکستانی فیملی میں ہورہی تھی اور ڈیڈی کو اس شادی میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ اور ان کا خیال تھا کہ اس وقت وہ جس دکھ سے گزر رہی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ماحول کچھ تبدیل ہو...... اور وہ تو خود ارتقاع کو مدثر کی نظروں سے دور لے جانا چاہتی تھی سو فوراً ہی تیار ہوگئی تھی۔ ماحول کی تبدیلی نے واقعی اس پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ ممی، ڈیڈی تو ایک ماہ بعد واپس آگئے تھے لیکن فاطمہ پھپو نے اسے وہاں ہی روک لیا تھا...... ان دنوں اس کے اپنے ذہن میں بھی یہی تھا کہ اگر وہ یہاں ہی رہ جائے...... یہاں ہی جاب کرلے تو پھر مدثر اپنی بیٹی سے کبھی نہیں مل سکے گا سو وہ وہاں ہی رہ گئی تھی۔ پھر ممی نے بتایا کہ دوسری طلاق بھی آگئی اور پھر تیسری بھی...... اس نے اپنی عدت وہاں ہی اپنے لندن والے فلیٹ میں گزاری تھی۔ فاطمہ پھپو کا ساتھ تھا اور ان کی دونوں بچیاں اپنے کالج اور جاب سے آکر اسے اور ارتقاع کو کمپنی دیتی تھیں۔ عدت کے بعد اس نے جاب کا ارادہ کیا تو ڈیڈی نے سختی سے منع کردیا اور اسے لینے آگئے اور واپس آنے کے چند ہی دن بعد مدثر، ارتقاع سے ملنے آگیا تھا۔ وہ خوفزدہ ہوگئی تھی۔

''اب وہ نہیں آئے گا بیٹی سے ملنے۔'' بابر نے اسے دلاسہ دیا تھا۔

''اسے صرف تمہاری جائداد اور دولت سے دلچسپی تھی، اب یہ امید ختم ہوگئی ہے تو اسے بھی بیٹی کی ضرورت نہیں رہی۔''

''نہیں، اسے بچوں سے بہت محبت تھی۔'' اس نے بابر کی بات کی تردید کی تھی۔ ''وہ پھر آئے گا ارتقاع سے ملنے اور پھر اسے لے جائے گا۔''

''وہ ایسا نہیں کرسکتا...... وہ عدالت میں بھی جائے تو بھی ماں سے اس کی بیٹی نہیں لے جاسکتا۔'' بابر نے اسے یقین دلایا تھا اور بابر نے صحیح کہا تھا اس روز کے بعد وہ پھر کبھی ارتقاع سے ملنے نہیں آیا تھا۔

''اور یہ ارتقاع کے لیے اور تمہارے لیے اچھا ہے کہ وہ ارتقاع سے ملنے نہیں آیا۔ ورنہ سمجھدار ہونے پر ارتقاع ڈسٹرب ہوسکتی تھی۔''

اس روز وہ ارتقاع کا فراک تبدیل کررہی تھی اور بابر اس کے بیڈروم میں اس کی بک شیلف کے پاس کھڑا اس میں سے کتابیں نکال، نکال کر دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ارتقاع کو لینے آیا تھا۔ کبھی کبھار وہ اس وقت اسے پارک میں لے جاتا تھا اور ارتقاع بھی وہاں جاکر بہت خوش ہوتی تھی۔

ایک کتاب کی ورق گردانی کرتے، کرتے اس نے اچانک کہا اور وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ یہ اچھا ہے کہ مدثر اپنی بیٹی سے دستبردار ہوگیا ہے۔ وہ دوبارہ ملنے نہیں آیا۔ اس طرح ایک تو تمہاری ٹینشن ختم ہوئی ہے، دوسرا ارتقاع کے لیے ہر لحاظ سے اچھا ہے کہ اسے دو کشتیوں کا سوار نہیں بننا پڑے گا...... تمہاری دوسری شادی کی صورت میں تم اسے......''

''نہیں بابر بھائی مجھے شادی نہیں کرنی۔'' اس نے بابر کی بات کاٹی تھی۔ ''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''

''زندگی تنہا نہیں گزرتی ایمل...... اکیلے یہ سفر بہت مشکل ہوجائے گا۔ ہر مرد، مدثر نہیں ہوتا۔''

"اگر مدثر ایسا تھا تو پھر ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے بابر بھائی۔"

"ضروری تو نہیں ایمل، تم کسی کو آزما کر دیکھو اپنے لیے نہ سہی رتی کے لیے...... اسے باپ کی ضرورت ہوگی ہر قدم پر یہ باپ کی کمی کو محسوس کرے گی۔" بابر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"میں اپنی بیٹی کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔"

"یہ اس کی فطری طلب ہوگی، تم صرف رتی کے لیے سوچو اور ماضی کو بھلا دو...... جو ہوا سو ہوا اُسے ایک حادثہ سمجھ کر قبول کرلو...... زندگی کسی ایک شخص پر ختم نہیں ہوتی...... اور نہ ہی یہ ساکت ہے...... زندگی ایک متحرک شے ہے اور زندگی کے اس سفر میں ہمیشہ سب کچھ ایک جیسا نہیں ہوتا...... غم، خوشی دکھ، مسرتیں...... سب اس سفر کا حصہ ہیں۔ زندگی کسی ایک فیز میں ٹھہر نہیں جاتی ایمل......! اگر آج تمہیں دکھ ملا ہے تو کل خوشیاں بھی باہیں پھیلائے تمہارے راستے میں کھڑی ہوں گی۔ تم اپنی دنیا سے، اس غم سے باہر نکل کر تو دیکھو۔ محسوس تو کرو تمہارے راستوں میں کتنے پھول بچھے ہیں اور خوشیوں کی کتنی ہی کرنیں تمہیں چھونے کے لیے بے تاب ہیں۔ زندگی کا سفر اکیلے طے کرنا بہت مشکل ہے ایمل...... کسی ہمراہی کا ساتھ ہو تو یہ سفر آسانی سے طے ہو جاتا ہے۔"

اور اس نے بابر کی ساری بات بہت حیرت سے سنی تھی۔ بابر نے کبھی اس سے اتنی لمبی بات نہیں کی تھی اور پہلے کبھی وہ اس طرح بلا جھجک اس کے کمرے میں بھی نہیں آیا تھا لیکن اب اکثر ارتقاع کو لینے آجاتا تھا کبھی سو رہی ہوتی تو دو چار باتیں کر کے چلا جاتا لیکن آج شاید وہ اسے قائل کرنے کا سوچ کر آیا تھا۔ شاید ممی نے کہا ہو اس نے سوچا اور ارتقاع کی آنکھوں میں سرمہ لگانے کے بعد اس نے پاس پڑا فیڈر اٹھا کر اس کی گرمائش کو ہاتھ لگا کر چیک کیا اور پھر ارتقاع کو گود میں لیتے ہوئے اس کے منہ میں ڈال کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں نہیں سمجھتی بابر بھائی کہ میرے لیے زندگی کا سفر اکیلے طے کرنا مشکل ہوگا...... اور پھر میں اکیلی کب ہوں، ممی ہیں، ڈیڈی ہیں اور رتی ہے۔"

"ممی، ڈیڈی ہمیشہ تمہارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ کسی نہ کسی موڑ پر تم اکیلی رہ جاؤ گی۔ تب کیسے سروائیو کرو گی؟" اس کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

"کیا مجھ سے پہلے کسی عورت کو اکیلے سروائیو نہیں کرنا پڑا...... میں کئی ایسی سنگل ویمن کو جانتی ہوں جنہوں نے تن تنہا اپنے بچوں کی پرورش کی جبکہ انہیں کوئی معاشی سپورٹ بھی نہیں تھی اور مجھے تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے ایمل...... تم تنہا ایسی عورت نہیں ہو جسے اکیلے زندگی گزارنا پڑی ہو لیکن جانتی ہو ممی، ڈیڈی تمہارے لیے کتنے پریشان ہیں، تمہاری زندگی پر اُن کا بھی تو کچھ حق ہے اور ان کی خوشیاں تمہاری خوشیوں سے وابستہ ہیں۔" وہ بڑے اطمینان سے بک شیلف سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"کیا شادی خوشیوں کی ضمانت ہے بابر بھائی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے بابر کی طرف دیکھا تھا پھر خود ہی جواب دیا تھا۔

"نہیں بابر بھائی، شادی خوشیوں کی ضمانت نہیں ہوتی۔ اگر شادی خوشیوں کی ضمانت ہوتی تو میرے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔ مدثر کے ساتھ شادی کر کے میں بھی یہی سمجھی تھی کہ خوشیاں ہمیشہ ہاتھ باندھے میرے سامنے کنیزوں کی طرح کھڑی رہیں گی اور مدثر میری زندگی پر کسی معمولی سے غم کا سایہ بھی نہیں پڑنے دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شادی نے مجھے خوشیاں نہیں دیں بلکہ میرا محبتوں اور وفاؤں پر سے اعتبار ختم کر دیا...... یہ کاغذی رشتے کتنے ہی پائیدار ہوں ان کی بنیاد کتنی ہی شدید محبتوں پر رکھی گئی ہو یہ نا قابلِ اعتبار ہیں۔"

"یہ تمہاری غلط سوچ ہے ایمل۔" وہ ابھی تک بک شیلف سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ "اگر تمہارے لیے شادی

ایک تلخ تجربہ تھی تو ضروری نہیں کہ ہر ایک کے لیے یہ نا قابلِ اعتبار رشتہ ہو۔ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اگر دنیا میں چند لوگوں کو شادی راس نہیں آئی تو سیکڑوں لوگ بہت پُر مسرت اور آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ممی، ڈیڈی کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ کتنی آسودہ اور پُر سکون زندگی گزاری ہے انہوں نے ہاں اب ہر وقت تمہاری زندگی کے اس المیے سے دکھی رہتے ہیں، کبھی ان کے چہروں کو غور سے دیکھنا...... انہیں خوش کرنے اور ان کے سکون اور اطمینان کے لیے ہی ایک بار کسی کو آزمانے میں کیا حرج ہے۔'' وہ شاید آج اسے ہر صورت قائل کرنا چاہتا تھا۔

''میں مزید کوئی تجربہ نہیں کرنا چاہتی بابر بھائی اس لیے مجھے کسی کو آزمانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔ تمام زخموں کے منہ جیسے کھل گئے تھے اور اندر درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اور آنسوؤں کا سمندر ابلتا تھا۔ اس نے جتنی شدید محبت مدثر سے کی تھی اتنی ہی شدید نفرت بھی اس کے لیے محسوس کی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی کہ جو شوہروں کی بدکرداری پر سمجھوتا کر لیتی ہیں...... وہ خود بہت صاف شفاف سوچ رکھنے والی پاکیزہ لڑکی تھی اور اسے ایسے ہی باکردار مرد کا ساتھ چاہیے تھا۔ بہت کم عرصے میں اس نے محبت اور نفرت دونوں کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ وہ سارے تجربات سے گزر چکی تھی اور اپنے دل میں مزید کوئی گنجائش نہیں پاتی تھی اور نہ ہی وہ منافقت کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا دل محبت سے خالی ہو گیا ہے۔ وہ ساری زندگی اب کسی سے محبت کر سکتی تھی اور نہ ہی کسی کی محبت پر اعتبار کر سکتی تھی۔

''ایمل میری باتوں پر غور کرنا، سوچنا...... ہو سکتا ہے کوئی ایسا شخص ہو جو تمہیں خوشیوں کی ضمانت دے سکے۔'' بابر نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ اسے قائل کر ہی لے گا۔ ایک مدھم سی مسکراہٹ ایمل کے لبوں پر نمودار ہوئی تھی۔

''ہو سکتا ہے بابر بھائی کوئی ایسا شخص ہو جو مجھے میری خوشیوں کی ضمانت دے لیکن ایسا کون ہو گا جو رتی کو سگے باپ جیسا پیار دے اور مجھے اب اپنے لیے خوشیوں کی چاہ نہیں رہی، میرے لیے صرف رتی کی خوشی اہم ہے۔'' اس نے اپنی طرف سے حتمی بات کی تھی۔

''اگر تم میرا یقین کرو تو میں......'' بابر نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں رتی کو باپ کا پیار دوں گا۔ اتنا کہ کبھی اس کو احساس نہیں ہو گا کہ میں اس کا سگا باپ نہیں ہوں...... وہ اب بھی مجھے بہت عزیز ہے۔ پھر مزید ہو جائے گی۔'' اس نے بے حد حیرت سے بابر کی طرف دیکھا تھا۔ پھر اس کی نظروں کی تپش سے گڑبڑا کر نظریں جھکالی تھیں۔ ممی نے چند ایک بار اشاروں میں دوسری شادی کی بات کی تھی لیکن کبھی بابر کا نام نہیں لیا تھا۔

''آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ بابر بھائی......'' اس کا لہجہ پھر تلخ ہوا تھا۔

''یہ ہمدردی نہیں ہے۔ ایما بخدا میں دل کی پوری رضامندی اور خوشی کے ساتھ تم سے تمہارے ساتھ کا سوال کر رہا ہوں۔'' وہ جیسے تڑپ کر شیلف کا سہارا چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

''پلیز ایما مثبت انداز میں سوچو...... روشنی کو اندر آنے دو، میں یہ نہیں کہتا کہ تم مجھ سے ہی شادی کرو...... میں اگر تمہیں پسند نہیں ہوں تو کوئی بھی، کوئی دوسرا شخص تمہاری زندگی میں خوشیاں بکھیر سکتا ہے۔ میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ ایک بار ممی، ڈیڈی تمہیں میری زندگی میں شامل کرنا چاہتے لیکن ہم سب کو تمہاری خوشی تب بھی عزیز تھی اور آج بھی ہمیں تمہاری خوشی ہر شے سے بڑھ کر ہے لیکن ایک بات کا یقین رکھنا کہ اس بار یہ صرف ممی، ڈیڈی کی خواہش نہیں ہے، میری چاہ بھی ہے۔''

اس نے ارتفاع کے منہ سے خالی فیڈر نکال کر اسے اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے تھپکی دے کر ڈکار دلوائی۔ اور پھر کچھ کہے بنا اسے بابر کی طرف بڑھا دیا۔

"چندا پلیز میری بات پر غور کرنا۔"

"مجھے چندا مت کہیں، نفرت ہو گئی ہے مجھے اس نام سے...... ایمل کہا کریں مجھے...... پہلے بھی کہا تھا ناں میں نے آپ سے۔"

"آئی ایم سوری...... آئندہ خیال رکھوں گا۔" بابر نے ارتقاع کو گود میں لیتے ہوئے جن نظروں سے اسے دیکھا تھا اس نے اسے سارا دن ڈسٹرب رکھا تھا۔ رات کو جب وہ بیڈ پر لیٹی تھی تو بابر کی کہی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ بابر نے ان چھ ماہ میں اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ ہر ہر لمحہ وہ جیسے اس کے ساتھ، ساتھ تھا۔ جب وہ بے ہوش ہوئی تھی تو وہی تھا جو اسے اسپتال لے کر گیا تھا۔ اس کے آپریشن کے اجازت نامے پر اس نے ہی دستخط کیے تھے۔ اس نے اسے مدثر کے بعد اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ جب ارتقاع کو حفاظتی ٹیکے لگنے تھے، جب وہ ملازمہ کی گود سے گر گئی تھی اور اس کا سر پھٹ گیا تھا، جب اسے خسرہ نکلی تھی تو بابر ہی تھا جو اسپتالوں میں اس کے ساتھ چکر لگاتا رہا تھا۔ اسے بابر کے خلوص پر کوئی شک نہیں تھا۔ اور اب بابر کے لیے اس کی بلاوجہ کی ناپسندیدگی بھی باقی نہیں رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ بابر سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے دل میں بابر کے لیے کوئی جذبہ نہیں تھا، ہاں وہ اس کی ممنون ضرور تھی۔ احسان مند تھی لیکن محبت کے لیے اس کا دل بنجر ہو چکا تھا۔ اب وہاں کوئی کونپل نہیں پھوٹتی تھی، کوئی پھول نہیں کھلتا تھا۔ بے اعتباری کے زہر نے دل کی زمین کو گویا سیم اور تھور والی زمین میں بدل دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بابر جیسا مخلص شخص ساری زندگی ایک بنجر زمین میں پھول اگانے کی کوشش کرتا رہے لیکن ممی نے کہا تھا۔

"محرم رشتوں کے لیے محبت کا جذبہ خود بخود دل سے پھوٹتا ہے اور شادی کے بعد تمہارے دل میں خود بخود ہی بابر کی محبت پیدا ہو جائے گی۔"

اسے ممی کی بات سے اتفاق تھا یا نہیں لیکن وہ ممی کے اصرار اور ڈیڈی کی نظروں کی خاموش التجاؤں سے ہار گئی تھی...... عورت ہمیشہ کمزور ہوتی ہے چاہے وہ غریب اور متوسط طبقے کی معاشی بدحالی کا شکار عورت ہو یا اس کی طرح اونچے طبقے کی معاشی حالات سے بے نیاز عورت...... وہ بابر کی باتوں سے قائل نہیں ہوئی تھی لیکن ممی، ڈیڈی کے اداس اور غمزدہ چہروں کے سامنے ہار گئی تھی جو اس کی ہاں سے چمک اٹھے تھے۔ دونوں اس کی خوشیوں کے متعلق پُریقین تھے۔ یوں جب ارتقاع صرف چھ ماہ کی تھی تو ایک سادہ سی تقریب میں اس کا بابر سے نکاح ہو گیا۔ اس کا دل کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ ہاں ممی، ڈیڈی کے مطمئن چہروں کو دیکھ کر وہ بھی مطمئن تھی کہ اس نے ان کا مان رکھا تھا۔ ایک بار انہوں نے اس کا مان رکھا تھا اور اس کی خوشی کو اپنی خواہش پر مقدم جانا تھا تو اب ایک بار اس نے ان کا مان رکھ لیا تھا۔ شادی کے فوراً بعد ہی ڈیڈی نے انہیں ہنی مون کے لیے باہر بھجوا دیا تھا۔ وہ نہیں جانا چاہتی تھی۔ زندگی اس کے اندر جیسے مر گئی تھی لیکن ممی نے کہا تھا کہ اس طرح تم دونوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔ ممی چاہتی تھیں کہ وہ ارتقاع کو اپنے پاس ہی رکھ لیں لیکن بابر نے کہا تھا وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر جائیں گے اور بابر کی اس بات نے اس کے دل میں بابر کا احترام پیدا کیا تھا۔ اور یہ احترام اور عزت کبھی کم نہیں ہوئی تھی۔ بابر نے جو کہا تھا اسے ثابت بھی کر دیا تھا۔ اس نے ارتقاع کو بے تحاشا چاہا تھا اور اسے کبھی یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ وہ اس کا سگا باپ نہیں ہے۔ حد سے زیادہ لاڈ پیار نے ارتقاع کو کسی حد تک بگاڑ دیا تھا۔ وہ اس کی بات کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ وہ جس بات سے منع کرتی بابر اسی کی اجازت دے دیتا تھا لیکن اب اتنے سالوں میں پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ اس سے کہیں غلطی ہوئی ہے...... ارتقاع کے باب میں۔ "کیا بابر سے شادی میری غلطی تھی؟" اس نے خود سے پوچھا۔

"ماما......!" افنان اچانک ہی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"آپ کھانا نہیں کھا رہی ہیں جو ذرا سا سالن آپ نے اپنی پلیٹ میں ڈالا تھا وہ ایسے کا ایسا ہی پڑا ہوا ہے۔"
"مجھے بھوک نہیں ہے بیٹا...... بس تمہاری خاطر بیٹھ گئی تھی۔"
"کیوں ماما، صبح بھی آپ نے لائٹ سا ناشتا کیا تھا۔"
"پتا نہیں، بس جی نہیں چاہ رہا کچھ بھی کھانے کو۔" ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی اور اس نے ارتقاع کی طرف دیکھا جو یک دم کھڑی ہو گئی تھی۔
"ارے رتی! تم نے بھی بس دو لقمے ہی لیے ہیں۔ اکیلا میں ہی کھا رہا ہوں۔"
"بالکل بھی بھوک نہیں ہے مجھے...... تمہارے اصرار پر آ گئی تھی۔"
"ارے بھئی آج سب کی بھوک کیوں اڑ گئی ہے؟" افنان نے خوشگوار لہجے میں کہا لیکن ارتقاع نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور ڈائننگ روم سے نکل گئی...... ایمل اسے لاؤنج میں جاتے اور پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتی رہی۔ افنان بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔
"ماما رتی کے ساتھ کیا کوئی مسئلہ ہے، کسی کلاس فیلو کے حادثے پر پریشان ہونا فطری امر ہے لیکن اس حد تک اس کا اثر لینا...... آپ نے اس کی حالت پر غور نہیں کیا؟"
تو افنان بھی وہی محسوس کر رہا ہے جو اس نے محسوس کیا...... ایمل نے سوچا اور کھڑی ہو گئی۔
"تم جانتے تو ہو نا کہ وہ کتنی حساس اور نرم دل ہے۔" وہ نہیں چاہتی تھی کہ افنان، ارتقاع کے متعلق اس طرح کی کوئی بات سوچے...... وہ پہلے خود ارتقاع سے بات کرنا چاہتی تھی پھر افنان کو اس لڑکے کے متعلق معلومات لینے کو کہتی۔
"ہاں یہ تو ہے ماما، اپنی رتی کا دل بہت نرم ہے، کسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی۔" افنان نے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ٹشو نکالا اور ایمل، نازو کو آواز دیتی ہوئی ڈائننگ روم سے باہر نکل گئی۔ نازو کو کچن میں کھڑے، کھڑے کچھ ہدایات دیں اور اسے ٹیبل سمیٹ لینے کا کہہ کر باہر لاؤنج میں آئی ہی تھی کہ باہر بابر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وہ وہاں ہی رک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ بابر لاؤنج میں داخل ہوا اور ایمل پر ایک نظر ڈال کر گر نے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔
"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں......؟" ایمل کو وہ کچھ تھکا، تھکا اور نڈھال سا لگا تو اس کے قریب آتے ہوئے ایمل نے پوچھا۔
"ہاں ٹھیک ہوں میں، تم نازو سے کہو ایک کپ چائے بنا دے مجھے اور تم خود ذرا میرا بریف کیس تیار کر دو، مجھے دو دن کے لیے لاہور جانا ہے۔ ایک گھنٹے بعد مجھے نکلنا ہے لاہور کے لیے۔"
"کیوں خیریت ہے؟ چند دن پہلے ہی تو آپ لاہور سے آئے ہیں۔"
"بزنس کے سو جھمیلے ہوتے ہیں ایمل بیگم لیکن تمہیں کیا خبر۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز در آیا تھا لیکن فوراً ہی اس نے اپنا لہجہ نرم کر لیا۔
"دراصل ایک صاحب ہیں لاہور میں، وہ میرے بزنس میں پیسہ لگانے میں انٹرسٹڈ ہیں، کافی بڑا اماؤنٹ لگانے کو تیار ہیں۔ سو انہی سے ملنا ہے، پارٹنر شپ کی شرائط وغیرہ بھی طے کریں گے اگر بات بن گئی تو۔"
ایمل کا جی چاہا کہ وہ اس سے کہے کسی سے پارٹنر شپ کرنے کی کیا ضرورت ہے میرے اکاؤنٹ میں اتنی رقم تو ہو گی کہ...... لیکن پھر اسے ممی کی تاکید یاد آ گئی کہ اب اسے بابر کو اس رقم سے کچھ نہیں دینا...... پہلے بھی وہ کافی

"فی الحال یہ رکھ لو۔"
اور پیسوں کی تو وسیم کو ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔ اس نے پیسے لے کر جیب میں ڈالے اور بابر سے پوچھنے لگا کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے اور بابر اسے سمجھانے لگا تھا۔
"یہ چھوٹا سا اسپتال ہے، سیکورٹی کا زیادہ انتظام نہیں ہے۔ تم رکشا اندر پارکنگ میں لے آؤ اور کونے میں جدھر روشنی بہت کم ہے وہاں کھڑا کردو...... ذرا اور رات پڑنے دو، نرسری میں جس نرس کی ڈیوٹی ہے وہ اِدھر اُدھر ہوئی تو میں تمہیں بتادوں گا...... بلکہ تم ایسا کرنا کہ ایک بچے کے قریب تم اس بچے کو اٹھا کر ویٹرز روم میں آکر بیٹھ جانا...... اب کسی کو کیا خبر کہ تم نے کسی مردہ بچے کو اٹھایا ہوا ہے یا زندہ کو...... کسی نے پوچھا بھی تو کہہ دینا کہ بچے کی طبیعت خراب ہے، ایمرجنسی میں دکھانے کے لیے لایا ہوں۔ اول تو یہاں کوئی کسی سے کچھ نہیں پوچھتا...... موقع ملتے ہی تم نرسری میں جا کر بچی کو اٹھالینا اور اسے اس کی جگہ لٹا دینا۔"
"پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟" وسیم نے پوچھا تھا۔
"میں نے کہا ہے ناں کہ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کی تم فکر نہیں کرو۔"
اور پھر سب کچھ، بہت آرام سے ہوگیا تھا۔ اس نے سسٹر کو نرسری سے نکل کر کینٹین کی طرف جاتے دیکھا تھا اور وسیم کو اشارہ کردیا تھا۔ وہ خود نرسری کے قریب ہی کاریڈور میں کھڑا رہا تھا۔ چند منٹوں بعد ہی وسیم چادر کے نیچے بچی کو چھپائے نرسری سے نکل آیا تھا اور وہ اس کے ساتھ، ساتھ چلنے لگا تھا...... وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اسپتال سے باہر نکل کر پارکنگ میں آگئے تھے۔ بابر نے احتیاطاً اسے اپنی گاڑی دے دی تھی۔
"رات کے ڈیڑھ بجے کہیں کوئی پولیس والا تمہارے رکشے کو نہ روک لے۔ سو گاڑی لے جاؤ۔ کام ہونے کے بعد اِدھر ہی پارکنگ میں کھڑی کردینا اور اپنا رکشا لے جانا...... اور گاڑی کی چابی گاڑی کے پیچھے دائیں طرف والے ٹائر کے پاس رکھ دینا۔" سب کچھ بہت آسانی سے ہوگیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں قہقہہ لگایا اس کے اندر ایک کمینی خوشی رقص کررہی تھی۔
"مسٹر مدثر حسن، میرے راستے میں آنے کا مزہ چکھو...... تمہاری بیٹی اب کوٹھے پر ناچے گی اور گائے گی۔" وہ واپس اسپتال میں آگیا تھا۔ ڈیوٹی نرس ابھی تک کینٹین میں بیٹھی کسی میل نرس سے گپ شپ کررہی تھی۔ ایمل کی طبیعت پہلے سے زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر کوئی امید بھی نہیں دلا رہے تھے۔ وہ کبھی آئی سی یو میں جاتا، ممی کو تسلی دیتا اور کبھی نرسری کی طرف چکر لگاتا...... سسٹر وقفے، وقفے سے نرسری کا چکر لگالیتی تھی۔ صبح سے ذرا پہلے وہ بھی سسٹر کے ساتھ نرسری تک آیا تھا۔
"بچے ٹھیک ہیں ناں فیڈ وغیرہ لیا ہے؟"
"جی سر...... مزے سے سوتے رہے ہیں، ایک بے بی رویا تھا۔ میں نے فیڈ کروادیا تھا۔"
"کیا میں دیکھ سکتا ہوں انہیں۔"
"جی ضرور......!" وہ سسٹر کے ساتھ ہی نرسری میں آیا تھا۔ ایک بچے کی کاٹ کے پاس رک کر اس نے جھک کر اسے دیکھا اور پھر دوسری کاٹ کے پاس آیا۔ اور پھر یک دم سیدھا ہوتے ہوئے سسٹر کی طرف دیکھا۔
"یہ...... یہ اسے کیا ہوا ہے؟" مردہ بچے کا رنگ نیلا ہورہا تھا۔
"نہیں......" سسٹر کو ایک نظر میں ہی اندازہ ہوگیا تھا۔
"یہ...... یہ کیسے؟" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی تھی۔
"میں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ اس وقت وہ خود بھی گھبرا گیا تھا۔

لیکن ڈاکٹر کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا تھا وہ ینگ سی لڑکی تھی غالباً نیا، نیا ہاؤس جاب کر کے آئی تھی۔ اس نے چیک کیا اور اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

''یہ تو ایکسپائر ہو چکا...... لیکن کیسے؟'' وہ مڑ کر نرس سے سوال کرنے لگی۔ بابر نے نرس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے حیرت ابھرتے ہوئے دیکھی تھی جب ڈاکٹر بچے کو چیک کر رہی تھی۔ جوں ہی ڈاکٹر سسٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے فوراً ہی بے بی کو اٹھالیا۔ وہ یوں بھی اچھی طرح گلابی رنگ کے فلالین کے کپڑے میں پیک تھا۔ جسے ڈاکٹر نے لوز کیا تھا...... اس نے پھر اسی کپڑے میں اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔

''آپ کہاں تھیں...... کب چیک کیا تھا اسے...... کیا اسے سانس کا پرابلم تھا۔ اس کی ڈیتھ کو تو کافی ٹائم ہو گیا ہے؟'' ڈاکٹر کے پے در پے سوالوں سے سسٹر گھبرا گئی تھی، وہ بھی ایک ینگ سی لڑکی ہی تھی۔ اس کی گھبراہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو مخاطب کیا تھا۔

''ڈاکٹر پلیز...... مجھے اجازت دیں، میں بے بی کو اپنے گھر لے جاؤں...... کیوں، کہاں، کیسے اسے چھوڑ دیں، یہ اتنی ہی زندگی لے کر آیا تھا؟'' بابر نے آواز میں رقت پیدا کی تھی۔

''اللہ کی مرضی یہی تھی...... اور پلیز آپ سے درخواست ہے کہ جب تک میری سسٹر خطرے سے باہر نہیں آ جاتی، ممی کو اور ان کو بچے کی ڈیتھ کے متعلق مت انفارم کریں۔ آپ نہیں جانتیں ڈیڈی انجائنا کے پیشنٹ ہیں اور اس وقت بیٹی کی سیریس کنڈیشن کی وجہ سے اسپتال میں ہیں...... میں آپ سے ریکویسٹ کرتا ہوں۔''

''لیکن......'' ڈاکٹر کچھ متذبذب سی تھی۔ ''آپ کی سسٹر کا کیس ڈاکٹر حمیدہ نے کیا ہے، وہ صبح آئیں گی۔ آپ کچھ دیر انتظار کرلیں تو...... دراصل ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آپ کے بے بی کو اچانک......''

''پلیز...... ہم جان کر کیا کریں گے کہ بچہ کس مرض کا شکار ہوا...... اللہ کی رضا ہی تھی۔ ہمیں ان جھنجٹوں میں نہیں پڑنا...... ڈیوٹی پر آپ تھیں اور سسٹر تھیں...... بچے کو اچانک کیا ہوا باز پرس تو آپ سے ہی ہوگی۔ آپ کا کیریئر ابھی اسٹارٹ ہوا ہے...... پلیز ڈاکٹر حمیدہ سے میں خود بات کرلوں گا۔ اگر اجازت ہو تو میں بچے کو لے جاؤں؟'' ڈاکٹر اور سسٹر نے ایک ساتھ سر ہلایا تھا۔ اور وہ بچے کو لے کر باہر آ گیا تھا۔ گاڑی پارکنگ میں موجود تھی اس نے چابی اٹھائی اور صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں جب وہ بچہ گورکن کے حوالے کر رہا تھا۔

''اس بچے کی ماں موت و حیات کی کشمکش میں ہے، پلیز اس کے کفن دفن وغیرہ کا بندوبست کر دیں۔'' اس نے کچھ رقم گورکن کے حوالے کی تھی۔ ''میں زیادہ دیر رک نہیں سکتا...... اسپتال میں میری ضرورت ہوگی...... میں پھر چکر لگاتا ہوں۔ کرنل حامد میرے ڈیڈی ہیں۔''

اس نے گورکن کو گھر کا پتا سمجھایا تھا۔ گورکن اس کی شخصیت اور گاڑی سے کافی مرعوب ہو گیا تھا۔

اور جب وہ واپس اسپتال جا رہا تھا تو اسے خود حیرت ہو رہی تھی کہ سب کچھ کتنی آسانی سے ہو گیا تھا۔ یعنی کہ مسز مدثر حسن اور ایمل کی بیٹی شاہجہان بیگم کے چوبارے پر پہنچ چکی تھی۔

وہ واپس اسپتال پہنچا تو ایمل کی حالت بدستور تھی۔ اس کا بی پی نارمل نہیں ہو رہا تھا اور وہ ہوش میں نہیں تھی۔ ممی کو تسلی دے کر وہ آئی سی یو سے باہر آیا تو اسے ڈاکٹر حمیدہ مل گئیں۔ انہوں نے بار، بار بچے کی موت پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''دونوں بچے بالکل نارمل تھے۔ کسی قسم کا کوئی پرابلم نہیں تھا پھر......''

''اللہ کی رضا یہی تھی ڈاکٹر آپ سے ریکوئسٹ ہے کہ ممی سے ابھی ذکر مت کیجیے گا۔ وہ ایمل کی وجہ سے پہلے ہی پریشان ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس حالت میں دکھ پہنچاؤں۔'' اور ڈاکٹر حمیدہ نے سر ہلا دیا تھا۔

یہ چھوٹا سا پرائیویٹ اسپتال تھا گھر سے قریب ہونے کی وجہ سے وہ ایمل کو یہاں لے کر آیا تھا۔ ورنہ ایمل جس اسپتال میں چیک اپ کے لیے جایا کرتی تھی وہاں تو اس طرح کی کوشش ناممکن تھی...... اس کے لیے خود ہی راستے ہموار ہو گئے تھے...... وہ بے حد خوش تھا اور دل ہی دل میں خود کو شاباش دے رہا تھا کہ کیسا زبردست منصوبہ اس کے شاطر ذہن میں آیا تھا۔ وہ اس خوشی میں کینٹین میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ جب اس نے مین گیٹ پر وسیم کو دیکھا تھا...... دونوں کی نظریں ملیں اور وہ چائے پی کر باہر نکل آیا۔

''کیا بات ہے وسو، میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اس طرف مت آنا اب۔''

''صاحب ایک غلطی ہو گئی ہے۔''

''پاپا آپ ایسا کیوں نہیں کرتے ماما کو بھی ساتھ لے جائیں۔ وہ نانو کے لیے اداس ہو رہی ہیں'' افنان نے ڈائننگ روم سے باہر آتے ہوئے کہا تو بابر نے چونک کر افنان کو اور پھر سیڑھیوں کی طرف جاتی ہوئی ایمل کو دیکھا جو افنان کی بات سن کر رک گئی تھی۔

''اتنی جلدی میں کیسے تیاری کر سکتی ہوں افی...... تمہارے پاپا تو گھنٹے تک نکلنے والے ہیں۔ اگر پہلے مجھے تمہارے پروگرام کا پتا ہوتو میں تیار ہو جاتی۔ ممی کے لیے میں واقعی بہت اداس ہوں۔''

''ہوں......'' بابر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے خود اپنے پروگرام کا پتا نہیں تھا۔ خیر ایسا کرتے ہیں نیکسٹ ویک کو ہم سب چلتے ہیں۔ افنان اور رتی ہفتہ بھر کی چھٹی لے لیں گے ممی بھی خوش ہو جائیں گی...... کیوں افنان؟'' وہ افنان کی طرف متوجہ ہوا۔

''ٹھیک ہے پاپا لیکن میں اور رتی بس دو تین دن بعد واپس آجائیں گے۔ ماما بے شک زیادہ دن رہ لیں۔''

ایمل کے چہرے پر خوشی کا تاثر ابھرا تھا اور اس نے افنان سے پوچھا۔

''کیوں کیا تم دونوں کو چھٹی نہیں مل سکتی؟''

''چھٹی تو مل سکتی ہے، میں خود ہی پڑھائی کے خیال سے کہہ رہا تھا۔''

''تو تم بس ایک ہفتے کی چھٹی لے لینا اور ارتفاع تو ویسے ہی کہہ رہی تھی کہ اسٹوڈنٹ ویک شروع ہونے والا ہے پڑھائی کم ہی ہوگی۔''

''جو حکم ڈیئر مدر کا۔''

افنان نے ذرا سا سر خم کرتے ہوئے شوخی سے کہا تو ایمل مسکراتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی اور بابر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

عنبرین کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی اور آنسو بہت آہستگی سے اس کی آنکھوں کے گوشوں سے بہتے ہوئے تکیے میں جذب ہو رہے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے بار، بار وہ آ رہی تھی۔ پیلے مایوں کے کپڑوں میں اس کا چہرہ بھی زرد، زرد لگ رہا تھا لیکن اس زردی میں حیا کے سارے رنگ گھلے ہوئے تھے، لمحہ بھر جیسے کسی تصور سے اس کی لانبی پلکیں لرزتیں اور رخساروں پر شفق سی بکھر جاتی۔ وہ گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور آپا سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کی اچانک ہی نظر آپا پر پڑی تھی وہ آپا کو بلانا ہی چاہتی تھی کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آئی تھی اور آپا پر سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں اس پر ٹھہر گئی تھیں۔ وہ اس کی جوانی کی تصویر تھی۔ اس کے دل نے دھڑک، دھڑک کر اسے یقین دلایا تھا کہ یہ اس کی ہی بیٹی ہے۔ اماں کی زندگی تک تو آپا کی کوئی بیٹی نہ تھی اور نہ ہی چھوٹی کی اور اگر اماں کے بعد آپا کی کوئی بیٹی ہوئی بھی ہوگی تو وہ اتنی بڑی نہیں ہوگی۔

وہ یک دم ہی انٹرنس کے قریب ایک بڑے سے آرائشی گملے کے پیچھے ہوگئی تھی اور وہاں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ آپا اسے کچھ کہہ رہی تھیں اور وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ پھر شاید آپا نے اس کی بات مان لی تھی اور وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی تھی۔ اسے لگا تھا چمکتی دھوپ یک دم پھیکی پڑ گئی ہو...... کتنے سارے سال وہ اسے بھولی رہی تھی۔ اس نے کبھی اماں سے بھی اس کا حال نہیں پوچھا تھا لیکن اب چند سالوں سے وہ اسے دیکھنے کو تڑپ رہی تھی۔ ایک بار وہ اپنے پرانے محلے میں بھی گئی تھی۔ لیکن وہ لوگ وہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور جا چکے تھے۔ آپا اب پارکنگ سے نکل کر انٹرنس کی طرف آرہی تھیں۔ آپا کو بھی اس نے کتنے سالوں کے بعد دیکھا تھا۔ ان کی صحت اچھی ہوگئی تھی اور انہوں نے خاصا قیمتی لباس پہن رکھا تھا اور یہ گاڑی......

''شاید آپا کے تینوں بیٹے اچھا کما رہے ہوں گے جب ہی......'' وہ انہیں دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی اور جب وہ قریب آئیں تو اس نے ایک دم گملے پیچھے سے نکل کر آواز دی تھی۔

''آپا......'' وہ ٹھٹک کر رک گئی تھیں پھر اسے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے اُن کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی تھی اور پھر فوراً ہی رخ موڑ کر انہوں نے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔

''آپا پلیز رکیں...... ایک منٹ رک کر میری بات سنیں۔'' وہ تیز، تیز چلتی ہوئی ان کے قریب آئی تھی۔

''اندر آ کر بات کرو عنبرین......'' آپا نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر گاڑی کی طرف دیکھا تھا۔ اور وہ ان کے ساتھ چلنے لگی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ اس بڑے مال کے فوڈ کورٹ میں آپا کے سامنے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ اور وہ اسے دھیمی آواز میں تنبیہہ کر رہی تھیں۔

''یہ پبلک پلیس ہے عنبرین، بند کرو یہ رونا دھونا اور جو بات کرنی ہے جلدی کرو۔''

''آپا...... وہ میری ہی بیٹی ہے ناں......؟''

”نہیں ہے وہ تمہاری بیٹی...... “ آپا کے دھیمے لہجے میں سختی تھی۔

”تمہاری بیٹی ہوتی تو اسے یوں پھینک کر نہ جاتیں۔ میں نے اسے پالا پوسا ہے...... وہ میری بیٹی ہے، مجھے ہی اپنی ماں سمجھتی ہے۔“

”آپا پلیز، میں مانتی ہوں میں نے غلطی کی لیکن ایک بار صرف ایک بار میں اس سے ملنا چاہتی ہوں، اسے سینے سے لگانا چاہتی ہوں۔“ اس نے یک دم ہی آپا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”خدا کے واسطے آپا ایک بار صرف ایک بار مجھے میری بیٹی سے ملنے دیں۔“

”دیکھو عنبرین اس وقت تم خود اسے چھوڑ کر گئی تھیں۔ کتنا سمجھایا تھا میں نے، اماں نے منتیں کیں...... ہاتھ جوڑے لیکن تم پر تو امیر ہونے کا خبط سوار تھا، اس وقت تمہیں اپنی بیٹی نظر نہیں آرہی تھی۔“ ان کے لہجے میں نرمی آگئی تھی اور وہ تاسف سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”وہ تمہارے متعلق کچھ نہیں جانتی...... تمہارے جانے کے کچھ عرصہ بعد ہی احمد علی دبئی چلا گیا تھا بعد میں وہ چھوٹی کو بھی لے گیا لیکن یہ میرے ساتھ بہت اٹیچڈ تھی۔ سو میں نے احمد علی سے اسے مانگ لیا۔ اسے یہی پتا ہے کہ اس کے ماں، باپ دبئی میں ہیں۔ یہ مجھے امی کہتی ہے...... جب یہ ذرا سمجھدار ہوئی تو ہم نے وہ محلہ چھوڑ دیا تھا...... اس لیے تمہارے متعلق کچھ نہیں جانتی...... اسے ڈسٹرب مت کرو......“

”میں ماں ہوں اس کی سگی ماں۔“ وہ تڑپی تھی۔ ”اپنی بچی سے ملنا چاہتی ہوں، حق ہے میرا۔“

”اچھا......!“ آپا کے لہجے میں پھر طنز در آیا تھا۔

”یہ اتنے سالوں بعد تمہیں یاد آیا کہ تم ماں ہو...... مائیں تو اولاد کی خاطر بڑی، بڑی تکالیف برداشت کرلیتی ہیں۔ اور تمہیں تو کوئی ایسی تکلیف بھی نہیں تھی۔ پھر بھی تم اپنی بیٹی کی خاطر سمجھوتا نہیں کرسکیں۔ بھول جاؤ اسے جیسے پہلے بھولی ہوئی تھیں اور اپنے بچوں پر توجہ دو۔“

”نہیں ہیں...... میرے بچے......“ وہ پھر سسکنے لگی تھی۔ آپا لمحہ بھر تاسف سے اسے دیکھتی رہی تھیں۔

”کبھی، کبھی انسان کی ذرا سی لغزش اسے عمر بھر کے لیے پچھتاوے بخش دیتی ہے۔ اگر تم اللہ پر بھروسا رکھتیں۔ اپنی تقدیر پر شاکر ہو جاتیں تو اللہ تمہیں بھی محروم نہ رکھتا جو تمہاری تقدیر میں لکھا تھا وہ تو ہر صورت مل کر رہتا لیکن تم ہمیشہ سے بے صبری تھیں...... تم چاہتی تھیں کہ تمہاری ہر خواہش فوراً پوری ہو جائے...... آج احمد علی کا مصطفیٰ ٹاؤن میں ایک کنال کا اپنا گھر ہے۔ جسے اس نے کرائے پر چڑھا رکھا ہے خود بیوی بچوں کے ساتھ دبئی میں رہتا ہے، اللہ نے ہمیں بھی بہت نوازا ہے...... ہمارے پاس بھی گاڑی ہے، گھر ہے، تمہارا ایک بھانجا سعودی عرب میں ہے اور دوسرا آسٹریلیا چلا گیا ہے۔ اسٹوڈنٹ ویزے پر گیا تھا لیکن جاب بھی کررہا ہے۔ اور چھوٹا باپ کے ساتھ کام کرتا ہے۔ تمہارے بہنوئی نے اپنا جنرل اسٹور بنا لیا ہے...... کاش تم نے صبر کیا ہوتا عنبرین تو تمہاری بیٹی تمہارے پاس ہوتی۔“ اور اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے تھے۔

ہاں اس نے غلط کیا تھا بہت غلط...... لیکن اب گزرا ہوا وقت واپس نہیں آسکتا تھا۔ وہ کتنی بدنصیب تھی، نیچے پارکنگ میں موجود سفید کرولا میں اس کی بیٹی موجود تھی اور وہ اسے بیٹی کہہ کر نہیں پکار سکتی تھی۔

”عنبرین......“ آپا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

”تین دن بعد تمہاری بیٹی کی شادی ہے۔ آج اسے پارلر جانا تھا۔ کچھ ابتدائی کام کروانے کے لیے اور مجھے یہاں سے کچھ سامان لینا تھا۔ میں چاہ رہی تھی کہ وہ بھی میرے ساتھ آجائے لیکن اس نے منع کردیا کہ میں اپنی پسند...... بہت شرم و حیا والی ہے تمہاری بیٹی......“

''میری بیٹی کی شادی ہو رہی ہے اسے پیلے اور گرین کپڑوں میں دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ وہ مایوں کے کپڑوں میں ہے۔ کس سے ہو رہی ہے اس کی شادی آپ کے بیٹے سے؟''

''نہیں، اس کا ہونے والا شوہر ڈاکٹر ہے۔ خود تمہاری بیٹی نے ایم ایس سی کیا ہے، بہت معزز اور ایجوکیٹڈ فیملی ہے۔ وہ بھی نہیں جانتے کہ چھوٹی تمہاری بیٹی کی سوتیلی ماں ہے، تم نہ صرف میری بیٹی کو ڈسٹرب کرو گی بلکہ اس کی شادی بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ لوگ بیٹیوں کو ہمیشہ ان کی ماؤں کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ وہ ضرور سوچیں گے کہ جس کی ماں گھر نہ بسا سکی اس کی بیٹی کیا گھر بسائے گی۔ لیکن تم ہمیشہ کی خود غرض ہو...... تمہیں اپنی خواہشات کے سامنے کبھی دوسروں کا احساس نہیں ہوا۔ وہ باہر گاڑی میں بیٹھی ہے...... جاکر بتا دو کہ تم اس کی ماں ہو اور اس کے گھر کو بسنے سے پہلے ہی اجاڑ دو۔ لیکن اگر تمہارے دل میں بیٹی کی ذرا سی بھی محبت ہے تو اپنے دل کو سمجھا لو...... اولاد کی خوشی کے لیے قربانیاں دینی ہی پڑتی ہیں۔'' آپا اس پر ایک نظر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور وہ وہاں ہی بیٹھی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی جب وہ اٹھی تو اس کے پاؤں من، من بھر کے ہو رہے تھے۔ بہ مشکل وہ لفٹ تک پہنچی تھی جب وہ باہر نکلی تو غیر ارادی طور پر اس کی نظریں پارکنگ کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ سفید کرولا وہاں نہیں تھی۔ وہ یوں ہی مرے، مرے قدموں سے روڈ تک آئی تھی اور ایک رکشے کو روک کر اس میں بیٹھ گئی تھی۔ وہ بڑے گھر میں رہنا چاہتی تھی اور گاڑیوں میں سفر کرنا چاہتی تھی لیکن رکشوں میں دھکے کھاتی پھر رہی تھی اور ایک بیڈ روم کے فلیٹ میں رہ رہی تھی جبکہ آپا نے تو کبھی کسی بڑے گھر کا اور گاڑی کا خواب نہیں دیکھا تھا، وہ اپنی زندگی سے مطمئن اور شاکر تھیں اور ان کے پاس گاڑی بھی تھی اور گھر بھی...... لیکن اس نے مزید کی ہوس کی تھی اور اپنا گھر برباد کیا تھا...... اپنی بیٹی کو چھوڑا تھا...... نہیں بلکہ اس نے اس سے بھی برا کیا تھا...... اس نے ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑا تھا...... دو محبت کرنے والے میاں، بیوی کے درمیان جدائی ڈالی تھی...... ایمل اور مدثر کے درمیان اس نے شیطان کا کام کیا تھا اور اس نے تہمت لگائی تھی...... اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو ایسے کام سے (تہمت سے) ایذا دیں جو انہوں نے نہ کیا ہو تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔''

اس کے لیے آخرت میں جو سزا تھی سو تھی لیکن وہ دنیا میں بھی محروم کر دی گئی تھی۔ اللہ نے اسے تہی داماں رکھا تھا اور اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ''اور کیا جو کچھ میں نے کیا ہے اس کی معافی مجھے مل سکتی ہے؟''

اس نے خود سے سوال کیا تھا اور پھر خود ہی جواب بھی دے دیا کہ ''شاید اللہ مجھے معاف نہیں کرے گا لیکن اگر ایمل اور مدثر مجھے معاف کر دیں لیکن کیا وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ نہیں...... میرا جرم ایسا نہیں ہے کہ مجھے معاف کر دیا جائے۔'' مایوسی درحقیقت اس کے اندر اترنے لگی...... ''ہو سکتا ہے وہ مجھے معاف نہ کریں لیکن کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے، کیا خبر اللہ ان کے دلوں میں میرے لیے نرمی ڈال دے۔ اور اگر وہ مجھے معاف نہ کر سکے تب بھی ایمل حقیقت جان لے گی۔ اسے اعتبارِ وفا تو مل جائے گا...... مجھے ہر صورت ایمل سے بات کرنی ہے لیکن اس سے رابطہ کیسے ہو، بابر نے فون نمبر ڈیلیٹ کر دیا تھا اور مدثر پتا نہیں کہاں ہے۔ اور مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کس کالج میں پڑھاتا تھا۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ایمل کی ممی...... مجھے ان کے پاس جانا چاہیے...... اور ان سے ایمل کا نمبر لینا چاہیے۔'' ایمل کے گھر کا ایڈریس اسے آج بھی یاد تھا۔

گارڈن ٹاؤن میں کسی نواب کی کوٹھی کے ساتھ ہی ان کا گھر تھا...... ''حامد ولا......'' اس نے اس نواب کا نام یاد کرنے کی کوشش کی لیکن یاد نہ آسکا...... خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے...... وہ اس کا گھر ڈھونڈ ہی لے گی اور اگر ممی نے ایمل کا نمبر نہ دیا تو وہ انہیں ساری بات بتا دے گی۔ اور یہ کتنا مشکل ہے اپنے گناہ کا اعتراف کر کے معافی

مانگنا...... لیکن اسے یہ مشکل کام کرنا تھا اپنی بیٹی کی خاطر کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے گناہ کی سزا اس کی بیٹی کو ملے۔

وہ یکا یک بے حد مضطرب اور بے چین ہوگئی تھی اور پتا نہیں ایمل کی ممی اب بھی وہاں ہی رہتی ہیں اسی گھر میں یا کہیں اور کسی دوسرے گھر میں...... لیکن نہیں وہ بھلا کسی دوسرے گھر میں کیوں جائیں گی وہ تو ان کا اپنا گھر تھا۔ اتنا بڑا اور خوب صورت۔'' اور اس نے بھی تو ایسے ہی گھر کی چاہ میں اپنا آشیانہ اجاڑا تھا۔ یکا یک جیسے اس کے دل پر کوئی بوجھ سا آگرا تھا۔ سانس رکنے ہی لگی تھی اس نے اٹھ کر کھڑکی کا شیشہ ہٹایا اور گرل سے چہرہ لگا کر لمبی لمبی سانس لی ٹھنڈی خوشگوار ہوا چہرے سے ٹکرائی تو اسے سکون سا ملا وہ وہاں ہی کھڑی ہو کر یونہی گرل سے چہرہ چپکائے باہر دیکھنے لگی۔ نیچے احاطے میں اندھیرا تھا۔ شاید احاطے کی لائٹ فیوز ہوگئی تھی اور کسی فلیٹ والے کو خیال نہیں آتا تھا کہ وہ لائٹ لگوا دے...... اسٹریٹ لائٹ کی مدھم سی روشنی احاطے میں پڑ رہی تھی...... جس میں اس نے ایک دو گاڑیاں احاطے میں کھڑی دیکھیں...... اس بلڈنگ کے رہنے والے سب اسی کمپاؤنڈ میں اپنی گاڑیاں وغیرہ کھڑی کرتے تھے۔ کبھی کبھی روڈ پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس پڑتی تو سارا کمپاؤنڈ روشن ہو جاتا تھا۔ باہر روڈ پر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی وہ یونہی ناک گرل سے ٹکائے باہر دیکھ رہی تھی کہ بابر کو بیگ اٹھائے اندر آتے دیکھ کر چونکی...... ''بابر اس وقت کہاں سے آرہا ہے...... کیا کراچی سے لیکن اس نے آنے سے پہلے بتایا تک نہیں......'' رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے ابھی تک کمرے کی لائٹ نہیں جلائی تھی تاہم اسٹریٹ لائٹ کی روشنی کھلی کھڑکی سے اندر آرہی تھی۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے اس نے لائٹ جلائی اور پھر بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ مین ڈور کا لاک کھلنے کی آواز آئی اور پھر لابی میں بابر کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پھر وہ دروازے کو ہلکا سا پش کرتا ہوا اندر آیا۔ لیکن وہ یونہی بیٹھی رہی۔

''ہیلو سویٹی کیسا رہا سرپرائز......؟'' بابر نے بیگ سینٹر ٹیبل پر رکھا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے چونکا۔

''کیا ہوا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔'' اس کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''نہیں، تم ٹھیک نہیں لگ رہیں۔'' وہ بغور اسے دیکھتا ہوا اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور اپنی بات دُہرائی۔

''نہیں تم ٹھیک نہیں ہو...... کیا رو رہی تھیں۔''

عنبرین خاموش رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں یک دم نم ہوئی تھیں۔

''اِدھر میری طرف دیکھو رینو۔'' اس نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر اپنی طرف کیا۔ ''تم رو رہی تھیں...... کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں......'' عنبرین نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

''یونہی دل گھبرا رہا تھا، کبھی کبھی ہو جاتی ہے گھبراہٹ، تم پریشان مت ہو۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''سوری...... عنبرین، میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں۔'' بابر کا لہجہ بے حد نرم تھا۔

''لیکن اب بہت جلد تمہاری یہ تنہائی ختم ہو جائے گی۔ بس تھوڑا سا انتظار اور پھر میں تمہیں اپنی فیملی سے ملواؤں گا۔ ایمل کو بتا کر تمہیں ساتھ لے جاؤں گا اور ہم سب اکٹھے رہیں گے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے بابر کی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا...... وہ ایسی باتیں کرتا رہتا تھا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' بابر نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھایا۔

''کچن میں جا رہی ہوں، کھانا کھاؤ گے یا کھا کر آئے ہو؟''

''کھا کر نہیں آیا...... سیدھا ائرپورٹ سے تمہارے پاس آرہا ہوں اور راستے میں تمہارے پسندیدہ پزا کا

آرڈر بھی دے آیا تھا...... ابھی کچھ دیر میں آ جائے گا۔ میں جانتا ہوں عنبرین تمہارے ساتھ کیے ہوئے کچھ وعدے میں پورے نہیں کر سکا۔ پر اس اس بار تمہیں تمہاری بیٹی سے ملانے لے جاؤں گا...... تم چاہو تو اسے کچھ دنوں کے لیے گھر بھی لا سکتی ہو۔''

عنبرین کے اندر بہت سارے آنسو گرنے تھے۔ وہ اسے بتا نہیں سکی کہ اس نے آج اپنی بیٹی کو دیکھا تھا اور یہ کہ اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لیے اسے اب اس سے نہیں ملنا۔

''تم آج ہمیشہ سے زیادہ اداس ہو عنبرین اور تمہاری اداسی مجھے تکلیف دے رہی ہے۔'' اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے، ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

''پتا ہے عنبرین، میں نے سوچا ہے کہ ہم ورلڈ ٹور پر جائیں گے۔ ایک دو معاملات ہیں، وہ سلجھ جائیں۔ تم اور میں خوب انجوائے کریں گے...... ایک بار میں ایمل کے ساتھ گیا تھا لیکن بور ہوتا رہا۔ دھیان تمہاری طرف ہی رہتا تھا کہ کاش ایمل کے بجائے تم ساتھ ہوتیں تو اب وقت آ گیا ہے کہ میں اپنی خواہش پوری کروں۔''

آج بہت دنوں بعد وہ اس پر بہت مہربان ہو رہا تھا اور وہ اس کی محبتوں میں بھیگی جا رہی تھی۔ وہ ایمل سے محبت نہیں کر سکا تھا لیکن عنبرین کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتا تھا۔ یہ لگاؤ تھا یا محبت لیکن کچھ تھا...... ایمل نے اسے ٹھکرایا تھا اور عنبرین کی مدد سے اس نے ایمل کو حاصل کیا تھا یوں اپنی نیچر کے حساب سے اپنے دل میں وہ عنبرین کو ایمل پر فوقیت دیتا تھا۔ اگرچہ کبھی، کبھی اسے اس پر غصہ بھی آتا تھا کہ وہ زبردستی مسلط ہوئی تھی اس پر......

''صبح مجھے ممی کی طرف جانا ہے۔''

وہ اسے اپنا پروگرام بتا رہا تھا جبکہ عنبرین کے ذہن میں کچھ اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ اسے بھی ممی سے ملنا تھا اور اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا تھا۔

''کیا ممی اسی پرانے گھر میں رہتی ہیں؟'' اس نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

''ہاں انہیں اور کہاں جانا ہے۔'' بابر نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر جواب دیا۔ ''لیکن میں جلدی آ جاؤں گا اور لنچ ہم اکٹھے کریں گے اور پھر تمہیں شاپنگ کے لیے لے چلوں گا۔ کتنے سارے دن ہو گئے ہیں تمہیں شاپنگ نہیں کروائی اور ہاں میرے جانے کے بعد تم ایک چکر پارلر کا بھی لگا لینا...... دیکھو ناں تمہاری جلد کتنی رف ہو رہی ہے۔''

اس نے ایک انگلی سے اس کے رخسار کو چھوا تو وہ چونکی اور سر اٹھا کر بابر کی طرف دیکھا۔ وہ بہت محبت اور وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پگھلنے لگی اس کا ارادہ کمزور پڑنے لگا۔ ''اگر میں ایمل کے سامنے اعتراف کر لوں؟ اسے سب کچھ بتا دوں تو کیا ہو گا...... ایمل کو اب کیا فرق پڑے گا...... وہ شادی کر کے ایک خوشگوار زندگی گزار رہی ہے۔ شاید مدثر بھی خوشگوار زندگی گزار رہا ہو...... تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ ہاں میں...... مجھ سے بابر چھن جائے گا...... میں اس کے التفات سے محروم ہو جاؤں گی...... اور میرا کہاں ٹھکانا ہے...... کہیں بھی نہیں سوائے بابر کے اب کوئی بھی تو اپنا نہیں ہے لیکن میں نے گناہ کیا تھا اور گناہ کی معافی نہیں ملے گی۔'' بابر ایک بار پھر اپنا پروگرام بتانے لگا تھا۔

''ہم پہلے فرانس جائیں گے پھر......'' اور وہ پگھل رہی تھی موم ہو رہی تھی بالآخر اس کے اندر کی کمزور عورت نے ہتھیار ڈال دیے۔

''ٹھیک ہے، مجھے بھی سب کچھ بھول جانا چاہیے جو ہوا سو ہوا اب دبی ہوئی راکھ کریدنے سے فائدہ اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ میری غلطی کی سزا میری بیٹی کو دے۔'' اس نے مطمئن ہو کر بابر کی طرف دیکھا اور پورے دل سے مسکرائی...... تب ہی ڈور بیل ہوئی اور بابر اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''کھانا آ گیا ہو گا۔'' بابر باہر چلا گیا تو وہ اٹھ کر ٹیبل لگانے لگی۔ آج وہ بہت غمزدہ تھی۔ اور آج ہی بابر جیسے

اس کے ہر زخم پر پھاہے رکھ رہا تھا۔
اس کا التفات، اس کی محبت...... اور اس کی نرمی اس کا وارفتہ نظروں سے اسے تکنا، وہ پچھتاوے جو صبح سے اسے اذیت دے رہے تھے رُلا رہے تھے جانے کہاں چلے گئے تھے، وہ بہت سارے دنوں بعد بہت پُرسکون نیند سوئی تھی اس لیے صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر دیکھا بابر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔ سامنے صوفے پر گیلا تولیا پڑا تھا وہ کچھ دیر یونہی اسے دیکھتی رہی۔ وہ ایک شاندار مرد تھا اسے ایمل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی...... وہ اسے چاہتا تھا، ایمل سے شادی اس کی مجبوری تھی...... وہ صرف اس کا تھا...... دل و جان سے...... اس نے آج رات ان سب باتوں کو دُہرایا تھا۔ اور آدمی کو سب کچھ نہیں ملتا تو اسے بھی۔ کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ لیکن اس شاندار مرد کا ساتھ ملا تھا۔ اسے تو اس کی رفاقت پر شکر گزار ہونا چاہیے تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی عین اسی لمحے اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔
”تم جاگ گئیں؟“ ہاں وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
”کیا تمہیں ابھی جانا ہے؟“
”ہاں......“ اس نے پرفیوم اٹھا کر خود پر اسپرے کیا۔
”تو مجھے جگا دیتے، میں ناشتا بنا دیتی۔“
”تم اتنی پُرسکون نیند سو رہی تھیں کہ میرا جی ہی نہیں چاہا تمہیں اٹھانے کو...... اور ناشتا میں باہر سے لے کر آرہا ہوں تم فریش ہو کر اچھی سی چائے بنالو۔“
بابر نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرفیوم واپس رکھا اور باہر نکل گیا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آگئی۔ چائے کا پانی رکھنے کے بعد اس نے ٹیبل پر برتن لگائے اور پھر کچن میں آکر سنک میں پڑے برتن دھونے لگی۔ برتن دھو کر اس نے رکھے ہی تھے کہ اس نے بابر کے دروازہ کھولنے کی آواز سنی۔ پھر بابر لاؤنج میں داخل ہوا اور کچن میں آکر دو شاپرز اسے پکڑائے۔
”پوریاں، چنے اور نان ہیں...... نکال کے لے آؤ۔“
اس نے شاپر اس کے ہاتھ سے لے لیے...... تب ہی بابر کا موبائل بجنے لگا...... بابر موبائل آن کرتا ہوا لاؤنج میں چلا گیا تو اس نے جلدی، جلدی چنے باؤل میں ڈالے، چائے کو دم دیا اور ہاٹ پاٹ میں نان اور پوری رکھیں اور ٹیبل پر رکھنے کے بعد بابر کو بلانے کے لیے بیڈ روم کی طرف بڑھی کیونکہ بات کرتے کرتے بابر بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ اس نے بیڈ روم کے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے بابر کی آواز آئی...... وہ ابھی تک بات کر رہا تھا۔
”بس یار جو غلطی ہوئی تھی اس کا ازالہ تو کرنا ہے۔“
”لڑکی ہی پہنچانی ہے...... مجھے تو ادھار چکانا ہے لیکن تم چاہو تو دام کھرے کر لینا۔“ اس نے قہقہہ لگایا تھا۔
”ویسے کچھ پتا چلا کہ کب تک ہے یہاں...... ملو اور اسے روکو......“
”ارے کیوں نہیں رکے گی...... لڑکی کا سن کر تو منہ میں پانی بھر آئے گا...... دراصل میں چاہتا ہوں کہ کام یہاں ہو......“
اس کی آواز مدھم ہوگئی تھی عنبرین الجھ سی گئی تھی...... لڑکی...... دام...... کیا مطلب اس نے دروازے کی ناب سے ہاتھ ہٹایا اور آواز دی۔
”بابر آجاؤ ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا“ اور پھر یوں ہی الجھی، الجھی سی آکر ٹیبل پر بیٹھ گئی...... کچھ دیر بعد بابر بھی آگیا۔ ناشتے کے دوران بابر نے ہلکی پھلکی بات کی۔ دو تین بار اس نے سوچا کہ وہ بابر سے پوچھے کہ کس کا فون تھا اور وہ کیا بات کر رہے تھے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہوگئی کہ کہیں بابر کو میرا سوال کرنا اچھا نہ لگے اور اس کا موڈ خراب

ہو جائے...... کتنے عرصے بعد تو وہ اس طرح خوشگوار موڈ میں تھا اور اس کے رویے میں اتنی وارفتگی اور والہانہ پن تھا۔ ناشتا کرتے ہی بابر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''اوکے ڈیئر!'' اس نے دو انگلیوں سے اس کا رخسار چھوا...... ''لنچ پر ملاقات ہوتی ہے...... لنچ تمہارے ہاتھ کا اور ڈنر کے لیے باہر جائیں گے۔''

وہ مسکرا دی...... بابر کے اس التفات نے اسے اندر تک موم کر دیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر گنگناتے ہوئے ٹیبل سمیٹنے لگی اور بابر اس سے رخصت ہو کر سیدھا ممی کے پاس گیا تھا۔

اس نے جو کچھ عنبرین سے کہا تھا غلط نہ تھا وہ واقعی عنبرین کے ساتھ کہیں باہر جانے کا پروگرام بنا رہا تھا اور اس کے لیے اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ سو وہ کچھ ہی دیر بعد ممی کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ کچھ خاموش اور سنجیدہ تھیں۔ وہ ہمیشہ کی طرح والہانہ انداز میں نہیں ملی تھیں بلکہ ان کا رویہ اچھا خاصا روکھا روکھا سا تھا۔ حالانکہ ممی کو اس سے بہت محبت تھی اور وہ اکثر اسے کرنل حامد کو بتائے بغیر بھی رقم وغیرہ دیتی رہتی تھیں۔ کرنل حامد کی وفات سے چند دن پہلے ہی انہوں نے اسے بی ایم ڈبلیو خریدنے کے لیے پیسے دیے تھے...... سو ان کے اس انداز پر وہ ذرا سا حیران ہوا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں ممی......؟''

''ٹھیک ہوں، تم کب آئے؟'' انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

''رات کو ہی آیا ہوں، ایک نیا بزنس اسٹارٹ کر رہا ہوں اسی سلسلے میں رات دیر سے آیا تھا اس لیے عامر کی طرف چلا گیا تھا۔''

''اچھا'' ان کا اچھا خاصا معنی خیز تھا۔

''عامر سے کب صلح ہوئی تمہاری؟''

اس نے سٹپٹا کر اُن کی طرف دیکھا۔

''دو تین دن پہلے آپا آئی ہوئی تھیں، عامر کی طرف میں ملنے گئی تھی اُدھر تو عامر نے بتایا کہ کئی سالوں سے اس کی تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ شاید تم اس سے کچھ ناراض تھے اس لیے اتنے سالوں میں عامر نے بھی کبھی اِدھر کا چکر نہیں لگایا۔'' ان کا لہجہ نارمل تھا۔

اس نے دل ہی دل میں خود کو کوسا کیا ضرورت تھی عامر کا نام لینے کی ہوٹل کا بھی کہہ سکتا تھا۔

''دیر ہو گئی تھی سوچا بھائی ہے میرا کیا ناراضی سو چلا گیا کہ ضرورت کے وقت آدمی اپنوں کی طرف ہی دیکھتا ہے۔'' اس نے بات بنائی اور ممی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول پڑا تھا۔

''دراصل مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ عامر کا کام بہت اچھا ہے۔ سوچا اس سے کچھ رقم ادھار مانگوں گا لیکن اس نے تو صاف انکار کر دیا۔''

''آخر ایسی کیا ضرورت آ پڑی ہے۔'' ممی نے پوچھا۔

''بتایا تو ہے آپ کو کہ ایک نیا بزنس شروع کر رہا ہوں پارٹنر شپ میں...... کچھ رقم کم ہے۔'' بات مکمل کر کے اس نے ممی کی طرف دیکھا جو خاموش بیٹھی تھیں لحہ بھر اس کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بات آگے بڑھائی۔

''ممی آپ مجھے کچھ رقم دے سکتی ہیں، مجھے ایک کروڑ کی فوری ضرورت ہے۔''

''ابھی چند ماہ پہلے ہی تو تم نے ایمل کے اکاؤنٹ سے اچھی خاصی رقم نکلوائی ہے۔''

''تو محترمہ نے اطلاع دے دی ممی کو؟'' اس نے دانت پیسے۔

''مجھے ایمل نے نہیں بتایا۔'' ممی اس کی سوچ کا اندازہ لگا سکتی تھیں۔

''وہ تو ایمل نے اسٹیٹمنٹ منگوائی تھی اپنے اکاؤنٹ کی تو میں نے دیکھ لی اور پوچھا کہ اتنی رقم کس مقصد کے لیے نکلوائی ہے اس نے جبکہ اس کے ڈیڈی نے تاکید کی تھی کہ کسی مشکل وقت کے لیے سنبھال کر رکھنا۔''

''اس سے زیادہ مشکل وقت اور کیا ہوگا می......'' وہ جھنجلایا۔ ''میرا بزنس تباہ ہو چکا ہے مجھے نیا بزنس شروع کرنا ہے۔''

''کیا ضرورت ہے مزید پاؤں پھیلانے کی' اچھا خاصا تمہارا بزنس ہے اسی پر توجہ دو۔''

''مجھے لیکچر مت دیں می...... اگر آپ روپے نہیں دے سکتیں تو صاف منع کر دیں صرف نام کا بیٹا بنایا تھا آپ نے سمجھا کبھی نہیں۔'' ہمیشہ سے ہی اس کی برداشت کم تھی حالانکہ ناصر نوید اسے ہمیشہ سمجھایا کرتے تھے کہ برداشت سے کام لیا کرو۔

''ایسا نہیں ہے بیٹا......'' می کا لہجہ نرم ہوا تھا۔ انہوں نے بابر کو بیٹا ہی سمجھا تھا ہمیشہ......

''ایسا نہیں ہے می۔'' وہ طنزیہ ہنسا۔ ''تب ہی ڈیڈی نے مجھے میرے حق سے محروم کر دیا۔''

''شرعاً تم ان کے وارث نہیں تھے۔ جس حد تک وہ وصیت کرنے اور تمہیں دینے کا حق رکھتے تھے وہ انہوں نے تمہیں دیا۔''

''کیا دیا ہے انہوں نے؟'' وہ تلخ ہوا۔

''کراچی والا چار کروڑ کا گھر تمہارے نام ہے۔ پانچ' چھ کروڑ سے انہوں نے تمہیں بزنس اسٹارٹ کر کے دیا، وہ بھی تمہارا ہی ہے...... اور......''

''بس کریں می......'' اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید کچھ کہنے سے روکا۔ ''آپ بتائیں کہ آپ مجھے ادھار دے سکتی ہیں یا نہیں؟''

''سوری بیٹا، میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے...... اپنے باپ سے اپنا حصہ مانگو جس پر شرعاً تمہارا حق ہے۔ سیکڑوں ایکڑ اراضی ابھی باقی ہے ابھی تک جو تمہارے باپ کے شوق کی نذر نہیں چڑھی۔''

''میرے باپ نے وہ اراضی باقی بہن بھائیوں میں تقسیم کر دی...... کیونکہ ان کا خیال تھا کہ میں کرنل حامد کا وارث ہوں اور مجھے ان کی چند ایکڑ اراضی کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''تمہاری بیوی اور تمہارے بچوں کا جو کچھ ہے وہ بھی تو تمہارا ہی ہے بابر......'' می نے بدستور نرمی سے کہا۔

''مجھے بہلائیں مت می، ڈیڈی نے تو ارتقاع کے نام الگ سے جائیداد کی اور میں...... مجھے وہ اپنا بیٹا کہتے تھے، مجھے فارغ کر دیا بالکل......'' جب بات چل ہی پڑی تھی تو اس نے بھی سب کچھ صاف، صاف کہنے کا ارادہ کر لیا۔

''ارتقاع کے متعلق تمہارے ڈیڈی کو کچھ تحفظات تھے اس لیے۔''

''کیا تحفظات تھے؟'' اس کی آواز قدرے بلند ہوئی۔

''کیا میں نے اسے کبھی افنان سے کم سمجھا۔ افنان سے زیادہ محبت کی...... کبھی سوتیلی بیٹی نہیں سمجھا لیکن ڈیڈی نے اپنے اس عمل سے جتایا ہے مجھے کہ وہ میری بیٹی نہیں ہے۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''بیٹا بیٹھو، تحمل سے میری بات سنو تمہارے ڈیڈی نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے بس......'' انہوں نے اسے کچھ بتانا چاہا لیکن وہ ان کی بات سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔ تیزی سے لاؤنج سے باہر نکلتا چلا گیا...... ناصر نوید نے کہا تھا کہ جب گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑتی ہیں اور اسے اب انگلیاں ٹیڑھی کرنا تھیں۔

(جاری ہے)

یارِ غار

شمیم فضل خالق

تیمور کمرے میں داخل ہوا تو عامر کمرے میں موجود نہیں تھا...... تیمور نے اِدھر اُدھر دیکھا وہ نظر نہیں آیا۔ ”شاید باتھ روم میں ہو۔“ اس نے از خود سوچا...... دفعتاً اس کی نگاہ عامر کے سرہانے رکھے ایک نئے ناول پر پڑی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا...... ناول ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں کہا۔

”خدا کرے وہ منحوس ایک گھنٹے سے پہلے واش روم سے نہ نکلے......“ مطالعے کا اسے شوق نہیں بلکہ



جنون تھا..... کئی، کئی بار پڑھی تحریروں کو بھی اتنے شوق ذوق سے پڑھتا تھا تو یہ تو بالکل نیا ناول تھا..... ابھی وہ ناول میں پوری طرح ڈوبا بھی نہیں تھا کہ عامر واش روم سے باہر آ گیا۔

"ارے میرے دشمن کیوں اتنی جلدی باہر آ گئے، ابھی تو میں ناول کے کرداروں سے پوری طرح متعارف بھی نہیں ہوا۔"

"کیا میں نے تجھے یہاں ناول پڑھنے کے لیے بلایا ہے؟" عامر دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

"تو نے یقیناً کوئی بھاری بوجھ ڈالنے کے لیے ہی بلایا ہوگا لیکن پہلے میں ناول پڑھ کر ریلیکس ہو جاؤں تو پھر تیری کتھا سنوں گا۔"

"تیرے ناول کی ایسی کی تیسی....." عامر نے ناول اس کے ہاتھ سے چھین کر کہا۔ "یہاں میری جان پر بنی ہے اور تجھے ناول کی سوجھی ہے۔"

"تیری جان، نا تو اس پر تو ہر وقت ہی بنی رہتی ہے..... کبھی جو تو شانت ہوا ہو اور شامت میری آ جاتی ہے..... کاش میں تیرا یار غار نہ ہوتا..... تو کب کا راستہ بدل چکا ہوتا۔" تیمور نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"اچھا چل بتا..... کیا شامت آئی ہے تیری۔"

وہ اب پوری طرح عامر کی طرف متوجہ تھا۔

"تیمور تو جانتا ہے کہ بچپن کے چھوٹے، چھوٹے مسئلوں سے لے کر بڑے، بڑے مسئلے تو نے ہی حل کرائے ہیں میرے۔" عامر سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"بد نصیبی ہے میری..... خوش نصیبی نہیں..... اپنا پدی کے برابر مسئلہ حل نہیں کر سکتا اور تیرے پہاڑ جتنے مسئلے حل کرائے ہیں پر اب بک بھی..... اب کیا مسئلہ آن پڑا ہے؟"

"تیمور....." وہ قدرے جھجک کر سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے محبت ہو گئی ہے۔" وہ ایک ہی سانس میں بات ختم کر کے گہری، گہری سانسیں لینے لگا۔

"کک..... کیا؟" تیمور بڑے زور سے اچھل پڑا۔

"محبت؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

"مگر کس سے؟"

"عنبر کی دوست ہے نازیہ..... اسی کے ساتھ کالج میں لیکچرار ہے۔ اسے عنبر کی سالگرہ میں دیکھا تھا اور بس..... دل ہاتھ سے ایسے گیا کہ پھر ہاتھ نہیں آیا..... اور جب بالکل پاگل ہونے لگا تو سوچا کہ اب یہ مسئلہ تم ہی سلجھا سکتے ہو۔" وہ بڑی آس سے تیمور کو دیکھنے لگا۔

"مجھ سے اس بار کوئی امید نہ رکھو عامر..... تمہارے پہلے والے مسئلے اتنی سنگین نوعیت کے نہیں تھے اور میں نے کب محبت کی ہے جو اس کے اسرار و رموز سمجھ سکوں..... میں تو اس سلسلے میں بالکل کورا کاغذ ہوں..... تم ایسا کرو عنبر کو اپنا مسئلہ بتا دو، وہ تمہاری بہن ہے، تمہاری صحیح مددگار ثابت ہوگی..... اور پھر وہ لڑکی ..... کیا نام ہے۔ ہاں نازیہ..... اس کی دوست بھی ہے۔" تیمور نے قدرے بے مروتی سے کہا۔

"گویا تم اس مسئلے سے دستبردار ہو رہے ہو۔" عامر نے آنکھیں نکال کر اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... مکمل طور پر۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"جانتے ہو..... میں اگر..... غصے میں آ جاؤں تو..... مجھے خود پر بھی اختیار نہیں رہتا..... نہ ہاتھ پاؤں قابو میں رہتے ہیں نہ ہی دماغ پر قابو رہتا ہے۔ بس سامنے والے کو پٹخ، پٹخ کر زمین پر پھینکتا ہوں اس وقت تک جب تک اس کا دم نہ نکل جائے۔" وہ خطرناک انداز میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"یار عامر..... تم تو مذاق، مذاق میں سیریس ہو گئے ہو۔ اچھا بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا۔" اس کے آگے بڑھنے پر وہ جلدی سے پیچھے ہٹا۔

"مطلب تم مان گئے ہو۔" تیمور کے چہرے سے خطرناک اثرات فوراً مٹ گئے اور ہشاش بشاش نظر آنے لگا۔

"الو کی دم..... مان بھی جاؤں تو تمہارا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا کہ میں محبت وحبت سے کوسوں دور رہا ہوں..... آج تک کسی ایک لڑکی کو پٹا نہیں سکا تو

تمہارے کیا کام آؤں گا......کہیں کچھ غلط ولط بول گیا تو ہوسکتا ہے کہ لڑکی ہاتھ سے ایسے نکل جائے جیسے......"

"اچھا اب اور بکواس نہیں......ورنہ منہ ٹیڑھا کر کے رکھ دوں گا......" اس کی تقریر کا عامر پر کوئی اثر نہیں ہوا تیمور نے ٹھنڈی سانس لی اور اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح پھنس چکا ہے......اور اب عامر کی بات مانے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔

"میرا خیال ہے ......تم نازیہ تک میرے جذبات بھی پہنچادو اور یہ بھی کہہ دو کہ میں اس سے جلدی شادی کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"میں......؟ میں کہاں اس سے ملوں گا......تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔ ایک غیر اور انجان لڑکی سے میں ملوں گا......؟ امپاسبل......"

"کوئی مشکل نہیں......" وہ اطمینان سے بولا۔ "کالج جا کر مل لینا......کتنے ہی لوگ داخلوں وغیرہ کے سلسلے میں کالج جاتے رہتے ہیں......پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"اسے برا لگ گیا ناں......تو مجھے نوکروں سے پٹوا کر کالج کے باہر پھینک دے گی......کالج میں نوکروں کی کمی نہیں ہوتی......اور اسے لازماً برا لگے گا......یہ میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔" تیمور کو ٹھیک ٹھاک غصہ آ گیا۔

"تم جاتے ہو یا میں اٹھا پٹخ شروع کردوں......" عامر جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا......تو تیمور پیچھے ہٹتا ہوا با دلِ ناخواستہ بولا۔

"جاتا ہوں میرے باپ......جاتا ہوں۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا اس کے کمرے سے باہر آگیا۔

☆☆☆

"جی......آپ کو کچھ کہنا ہے۔" اسٹاف روم میں نازیہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی قدرے حیرت کے عالم میں اس سے پوچھ رہی تھی چونکہ اس نے چپڑاسی سے نام لے کر نازیہ کو بلایا تھا......دبلی پتلی اسمارٹ سی نازیہ پُرکشش چہرے کی مالک تھی......اس کے جواب نہ دینے پر اس نے پھر پوچھا۔

"آپ کو کالج میں داخلے کے لیے معلومات لینی ہیں؟"

جبکہ تیمور جو اس سلسلے میں بالکل کورا تھا......اسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے......عجیب سچویشن تھی......دل چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائے......کسی لڑکی سے یہ کہنا کہ کوئی تم سے محبت کرتا ہے......کتنا مشکل ترین کام ہے......'خدا تم سے سمجھے عامر کے بچے......' اس نے دل ہی دل میں اسے کوسا......وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"آپ عامر کو جانتی ہیں؟" وہ پہلو بدل کر بولا۔

"جی......عامر کون؟"

"وہ عنبر کا بھائی، عنبر کی سالگرہ میں آپ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھا ہاں......" شناخت کی پرچھائیں اس کی آنکھوں میں لہرائی۔ "عنبر نے تعارف کرایا تھا۔ کیا آپ کو اس کے متعلق کوئی بات کرنی ہے؟"

"جی......جی۔" وہ جلدی سے بولا۔

"تو پلیز بولیے ناں......دراصل مجھے ابھی ایک کلاس بھی لینی ہے۔" اس نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے جتایا کہ اس کے پاس وقت کم ہے......تیمور نے سوچا اور مقابلہ سخت......بات کرنی تھی اور جواب کے لیے بے چینی سے وہ ٹارزن کا بیٹا انتظار کررہا ہوگا۔ وہ ذرا سا کھنکھارا۔

"دراصل عامر آپ سے محبت کرنے لگا ہے......اور اگر آپ کا جواب ہاں میں ہو یعنی آپ اس کی محبت قبول کرتی ہیں تو وہ اپنے گھر والوں کو آپ کے رشتے کے لیے بھیجنا چاہتا ہے۔" اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات اس کے گوش گزار کردی کہ آر یا پار......اور یوں ہانپنے لگا جیسے ایک لمبی مسافت طے کر کے آیا ہو۔

"آپ ہوش میں تو ہیں؟" وہ شدید ناگواری کے عالم میں بولی۔

"آپ کو اس طرح میرے روبرو یہ بات کہنے

کی ہمت کیسے ہوئی۔'' اس کی آنکھوں سے مارے غصے کے شرارے نکلنے لگے...... تیمور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ تھوک نگل کر جلدی سے بولا۔

''میم میری پوری بات تو سنیے اور میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کیجیے...... دیکھیے، وہ دراصل عامر میرا بچپن کا دوست ہے...... آپ ہمیں ایک جان دو قالب سمجھ سکتی ہیں...... میں اس کی نظر میں دراصل ایک جینئس اور عقلمند بندہ ہوں...... سو بچپن سے لے کر اب تک عامر کے سارے مسئلے مسائل حل کرتا رہا ہوں...... لیکن یہ والا مسئلہ...... اس کے حل کے لیے میں قطعاً تیار نہیں تھا۔ میں نے بار بار انکار کیا...... لیکن وہ نہیں مانا...... دراصل میم، اس نے جوڈو کراٹے کی تربیت لی ہوئی ہے اور دوسرے اس کا ہاتھ بھی بہت بھاری ہے۔ گھما کر ایک مارتا ہے تو بندے کا دماغ پھر جاتا ہے...... اس نے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کا پیغام آپ تک نہیں پہنچایا تو وہ میری ہڈی پسلی ایک کردے گا...... اب آپ ہی بتائیں جان کس کو عزیز نہیں ہوتی۔'' اس کی لمبی چوڑی بے تکی تفصیل پر بھی اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا...... وہ داخلی دروازے کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔

''آپ جائیں اب...... اور شکر کیجیے کہ میں کوئی بھی ایکشن لیے بغیر آپ کو جانے دے رہی ہوں۔''

''جا رہا ہوں میم...... جا رہا ہوں......'' وہ جلدی سے بولا لیکن جاتے جاتے، پلٹ آیا اور ملتجی لہجے میں بولا۔

''میم...... عنبر سے اس بات کا تذکرہ مت کیجیے گا...... پلیز۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق بندوق سے نکلی گولی کی طرح وہ اسٹاف روم سے باہر آ گیا۔

وہ کالج کے اسٹاف روم سے باہر نکلا تو سیدھا عامر کے گھر گیا...... عامر کے کمرے کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا جو دوستوں کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا...... اس طرح عامر کے دوستوں کو آزادانہ آنے جانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور گھر والے بھی ڈسٹرب نہیں ہوتے...... وہ کمرے میں گھسا تو عامر پرانے سے ڈیک پر ایک بہت پرانی پاکستانی فلم فانوس کا گانا سن رہا تھا۔ آ جا دل گھبرائے...... دل گھبرائے...... دل گھبرائے۔

''آ گیا ہوں...... دل کو قابو میں کرلے۔'' وہ اندر گھس کر بولا۔

''تو...... تو آ گیا۔'' عامر چھلانگ لگا کر اس کے پاس آیا۔

''تیمور کیا بنا؟ تیری ملاقات ہوگئی نازیہ سے...... کیا بات چیت ہوئی؟'' وہ بے چینی سے سوال پر سوال کر رہا تھا۔

''وہی جو میں نے پہلے تجھ جیسی موٹی عقل والے سے کہہ دیا تھا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کک...... کیا......؟'' وہ ڈوبتے دل کے ساتھ بولا۔

''یعنی یہ کہ وہ بے طرح ناراض ہوئی...... اس نے احسان کیا کہ اپنے نوکروں سے دھکے دے کر مجھے باہر نہیں نکلوا دیا...... بس خود ہی کمرے سے باہر چلے جانے کا حکم دیا...... اور شکر کرو کہ تمہارا بدھو لوٹ کر گھر آ گیا ہے ورنہ تو مجھے امید نہیں تھی کہ میں گھر آ پاؤں گا...... اس کا احسان تھا کہ اس نے نوکروں سے پٹوا کر مجھے اسپتال نہیں پہنچا دیا۔''

''اس کا مطلب ہے اس کے دل میں نرم گوشہ موجود ہے میرے لیے تبھی تو تم اسپتال کے بجائے میرے پاس صحیح وسالم بیٹھے ہو۔'' عامر پُرسوچ انداز میں بولا...... تیمور حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا وہ کس نہج پر سوچ رہا تھا، تیمور کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''تیمور...... تم ایک بار پھر اس کے پاس جاؤ گے...... ایسے معاملات ایک بار جانے سے نہیں سدھرتے......'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''میں......؟'' اس کی ''میں'' ایک بلند چیخ کی

طرح تھی۔

”ہاں...... تم۔“ عامر نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

”دیکھ الو...... پاجی...... باز آجا...... ورنہ جب چیونٹی کاٹنے پر آتی ہے تو اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا...... مجھے چیونٹی نہ سمجھ ورنہ پچھتائے گا...... بری طرح پچھتائے گا......“ وہ انگلی اٹھا کر کوئی سا محاورہ اپنے انداز سے بولا۔

”دیکھ تیمور...... اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو میں تجھے یہیں قتل کر کے اس کمرے میں ہی تیری قبر بنا دوں گا...... کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تیمور نامی جوان بھی کبھی ہوا کرتا تھا۔“ عامر جارحانہ انداز میں بولا۔ اب وہ کوسنوں اور طعنوں پر اتر آیا تھا لیکن ہوا وہی جو عامر چاہتا تھا...... اگلے دن وہ پھر سے اس کالج کے اسٹاف روم میں نازیہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسٹاف روم میں ایک دو لیکچرار اور بھی تھیں...... جب وہ اپنا کام کر کے اسٹاف روم سے باہر چلی گئیں تو نازیہ نے سرد انداز میں اس سے پوچھا۔

”میں نے آپ کو وارن کیا تھا کہ آپ آئندہ اس مقصد سے مجھ سے ملنے نہ آئیں...... پھر آپ کے آج آنے کا مقصد......؟“

”دیکھیں میم......“ وہ اپنے دفاع میں گھگیا کر بولا۔

”وہ خبیث...... میرا مطلب ہے عامر...... بہت ہی جلاد قسم کا انسان ہے۔ وہ مجھے قتل کر کے اپنے کمرے میں ہی میری قبر بنانا چاہتا تھا۔ سو میرے پاس یہاں آنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ آپ نہیں جانتیں وہ کتنا ذلیل انسان ہے...... کس قدر دو نمبری بندہ ہے...... سانڈ جیسا تو اس کا جسم ہے...... جب طیش میں آتا ہے تو اگلے بندے کو بری طرح پچھاڑ دیتا ہے، جان کس کو عزیز نہیں ہوتی میم...... بس اس لیے......“

”اور اتنے برے انسان کے لیے آپ مجھے فورس کر رہے ہیں۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولی تو تیمور بوکھلا گیا۔

”نن...... نہیں...... میم...... ویسے وہ بہت نائس بندہ ہے...... پڑھا لکھا، مہذب، اچھی جاب پر لگا ہے...... ہمدرد اور پُرخلوص بھی ہے...... محبت میں تو جان لٹا دیتا ہے۔“

”ابھی آپ کچھ اور کہہ رہے تھے۔“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ایک بندے کے متعلق دو رائے کیسے ہو سکتی ہیں کسی کی۔“

”بالکل نہیں ہو سکتی۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”لیکن میم...... میں اصل میں غصے میں یہاں آیا تھا تو اس لیے اول فول بک گیا...... میں آنا نہیں چاہتا

تھا...... مجھے آپ کی وارننگ یاد تھی لیکن وہ پاجی...... مجھے چھوڑ نہیں رہا تھا۔'' وہ قدرے بے بسی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس بار میں پھر آپ کو غیرت سے جانے دے رہی ہوں......'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ ''یہ بھی اس لیے کہ عنبر میری دوست ہے ورنہ آج آپ اتنی آسانی سے جانے نہ پاتے......'' وہ کچھ کہے بنا اٹھ کھڑا ہوا تو وہ پھر بولی۔

''دیکھیں، جذبے زبردستی کسی سے نہیں منوائے جاسکتے......اور یہ بھی سمجھ لیجیے کہ یہ ادارہ ایک معزز ادارہ ہے...... یہاں تعلیم دی جاتی ہے...... عشق اور محبت کے عہد و پیمان نہیں کیے جاتے۔ آنے سے پہلے اتنا تو سوچ لیں کہ آپ کہاں آرہے ہیں اور کیا کرنے آرہے ہیں۔''

''جی، جی......'' اس کی باتوں پر وہ سرپٹ وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہاں سے سیدھا وہ عامر کے گھر آگیا...... عامر حسب معمول کمرے میں اندھیرا کیے ایک پرانی پاکستانی فلم عشق لیلیٰ کا گانا سن رہا تھا۔

ستاروں تم تو سو جاؤ...... پریشان رات ساری ہے۔

''ایک رات نہیں کم ظرف...... تیرا انسان ساری زندگی اب پریشان ہی گزارتا......'' وہ ایک دہاڑ کے ساتھ اندر گھسا اور لائٹ جلا کر روشنی کرتے ہوئے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' عامر بوکھلا کر پلنگ سے نیچے اترا...... ''کیا وہ آج بھی نہیں مانی......؟'' وہ دکھ بھری آواز میں بولا۔

''ہاں......اور کبھی نہیں مانے گی، سن لے اور سمجھ بھی لے......'' تیمور طنزیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں بھی باز آنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' وہ ایک عزم سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا تو مارے وحشت کے تیمور اپنے بال نوچنے لگا۔

''دیکھو عامر...... میں یہاں تمہارے کمرے میں خودکشی کرلوں گا......اور ایک خط چھوڑ کر جاؤں گا کہ مجھے تم نے مارا ہے۔'' وہ زور، زور سے دہاڑنے لگا لیکن جب عامر دہاڑا تو اس کی آواز کسی شیر کی دہاڑ سے کم نہیں تھی...... دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہوگئے...... تیمور کی گردن پر وار پڑا تو وہ وہیں فرش پر گر گیا......اور لگا ہائے وائے کرنے۔

ایک بار پھر وہ مظلوم چہرہ لیے بار، بار ہاتھوں سے گردن کو دباتا ہوا نازیہ کے سامنے اسٹاف روم میں بیٹھا تھا...... جیسے ہی وہ آئی تیمور اس کے بات کرنے سے قبل ہی بول اٹھا۔

''اس بار مجھے بالکل جانے نہ دینا میم...... مجھے بے شک نوکروں سے پٹوا کر باہر پھینک دینا...... میں اُف تک نہیں کروں گا کہ اسی قابل ہوں میں...... اوہ...... ہائے۔'' گردن میں درد کی ٹیس اٹھی تو وہ گردن کو دباتے ہوئے بولا، وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''اس درندے نے مار، مار کر میری ہڈی پسلی ایک کردی ہے، آپ سے بچ کر چلا بھی گیا تو بھی اس زخم، زخم وجود کے ساتھ نہیں بچ سکوں گا...... مرنے سے بچ بھی گیا تو اسپتال جانے سے نہیں بچ سکوں گا۔''

''نہیں...... آج کے بعد آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ میں آپ کے دوست کے لیے آخری اور حتمی جواب دے رہی ہوں۔'' نازیہ ایک بند لفافہ اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولی۔

''یہ لفافہ اپنے دوست کو دے دینا...... اسی میں اس کا جواب ہے۔'' اس کا لہجہ قدرے نرم تھا...... آج اس کی آواز میں غصے کی تپش نہیں تھی۔ تیمور کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا...... وہ ہکا بکا اس کی شکل تکنے لگا......وہ اس کے ہاتھ میں لفافہ دے کر اسٹاف روم سے باہر چلی گئی تھی لیکن وہ ابھی تک شاک کی کیفیت میں تھا...... ہوش آیا تو جیسے ہواؤں میں اڑتا ہوا عامر تک پہنچ گیا...... خوشی سے اس کے پاؤں میں پہیے فٹ ہوگئے تھے...... دل کی دھڑکنیں مارے خوشی کے قابو میں نہیں آرہی تھیں...... وہ کامیاب ہوگیا تھا اور اپنے دوست کو اس کی محبت حاصل کرنے میں مدد دی تھی بلکہ مدد کیا ساری محنت ہی اس کی تھی...... وہ سینہ پھلا کر

سوچنے لگا۔ عامر کے کمرے کا دروازہ ہلکا سا بھڑا ہوا تھا...... دروازے کو دھکا لگایا تو سامنے عامر اپنے پلنگ پر آڑھا ترچھا لیٹا تھا...... وہ شاید آفس سے ابھی آیا تھا...... اسے دیکھا تو پھرتی سے اٹھ بیٹھا...... تیمور کا چہرہ دبے، دبے جوش کے ساتھ تمتما رہا تھا...... مارے خوشی کے وہ بات تک نہیں کر پا رہا تھا...... الفاظ گول مول سے ہو کر اس کے حلق میں اٹک رہے تھے۔

''کیا ہوا......؟'' عامر نے حیرت سے اسے دیکھا...... یہ تو وہ والا تیمور لگ ہی نہیں رہا تھا...... لگ رہا تھا جیسے وہ بالکل بدل گیا ہو۔

''مم...... مبارک...... مبارک ہو...... تم نے محبت ...... کی بازی جیت لی۔'' وہ بہ مشکل ہی یہ چند الفاظ بول پایا۔

''کک...... کیا؟'' عامر اتنی زور سے چیخ اٹھا کہ در و دیوار کانپ اٹھے اور تیمور کو گلے سے لگا کر اس کو چومنے لگا۔

''بتا...... کیا کہا اس نے...... بتا اب جلدی سے۔'' بے قراری اس کے روئیں، روئیں سے ٹپک پڑ رہی تھی۔

''بتانے کی نہیں دکھانے کا اقرار نامہ ہے...... اس نے تمہارے نام یہ خط دیا ہے۔'' تیمور نے لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا تو اس نے بے چینی سے لفافہ چاک کیا...... اندر سے ایک رقعہ برآمد ہوا۔

''بلند آواز سے پڑھ منحوس......'' تیمور شرارت سے بولا۔

لیکن عامر اس کی بات کہاں سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ ساکت سا کاغذ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا...... تیمور کو حیرت ہوئی اس رقعے میں ایسا کیا لکھا تھا جس نے عامر کی یہ حالت کر دی تھی...... اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھوں سے وہ کاغذ چھینا اور جلدی، جلدی اس پر نظر دوڑانے لگا...... لکھا تھا۔

''عامر کے لیے مجھے انکار ہے کہ محبت ڈنڈے کے زور پر نہیں کی جا سکتی...... لیکن تم ایک سچے اور کھرے بندے ہو سو میں تمہارا ساتھ قبول کرتی ہوں۔''

تیمور کی تو سانس بند ہونے لگی...... وہ بے یقینی سے کبھی کاغذ کے ٹکڑے کو اور کبھی عامر کی صورت دیکھنے لگا...... اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سانس لینے کے قابل نہیں رہا ہو...... پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے اور اس کا جسم اس کا بوجھ سنبھالنے سے انکاری ہو رہا تھا...... جبکہ عامر اپنی طنزیہ نگاہیں اس پر گاڑے اس سے کہہ رہا تھا۔

''واہ...... واہ کیا کہنے...... یار غار کی وفاداری کی...... کہ یار کا پتا صاف کر کے اپنا الو سیدھا کر لیا۔ بھئی داد دینی پڑے گی تمہاری ہوشیاری کی...... کس طرح روپیٹ کر وہاں جانے کی اداکاری کرتے تھے، اب معلوم ہوا کہ وہاں اپنے لیے جاتے تھے میرے لیے نہیں......''

''نہیں عامر......'' تیمور گھگیا کر بولا۔ ''خدا کی قسم...... ایسی بات نہیں ہے...... میں بھلا ایسا کر سکتا ہوں؟ اور وہ بھی تمہارے ساتھ۔'' اس کا لہجہ بھرّا گیا۔ ''یہ اس لڑکی نے ہمارے ساتھ کوئی بہت خطرناک گیم کھیلا ہے...... تمہاری قسم یار...... میں تو ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔''

''گیم اس نے نہیں، تم نے میرے ساتھ کھیلا ہے۔ میری پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔ پیچھے سے وار کیا ہے تم نے۔'' وہ زور سے دہاڑا۔ ''آج سے میری اور تمہاری دوستی ختم...... بلکہ میری اور تمہاری جو بچپن سے لے کر اب تک دوستی چلی ہے اس پر میں جی بھر کر شرمندہ ہوں۔'' مارے غصے کے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

''عامر......'' وہ بے بسی کی انتہاؤں پر تھا......

''میں کس طرح تمہیں یقین دلاؤں...... ہم لوگوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا، نوعمری کا دور ہم دونوں نے ایک ساتھ گزارا...... اب جوانی ایک ساتھ گزر رہی ہے کیا تم نے میرے کردار میں کبھی کوئی جھول دیکھا؟ میں کیا اتنا گر

سکتا ہوں کہ تمہارے پیار پر ڈاکا ڈالوں گا...... اس الزام سے پہلے مجھے موت آجاتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔'' اس کی آواز بھرا۔ گئی تھی...... جبکہ عامر جو پہلے سے ہی غصے کا بہت تیز تھا اور اس وقت تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ تیمور کا گلا ہی گھونٹ دے...... اس کے اندر ابال سا اٹھ رہا تھا اور وہ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ سچ مچ اپنے ارادے پر عمل کر لیتا کہ کمرے کے دروازے پر جو گھر کی جانب تھا دستک ہوئی اور ساتھ ہی عنبر کی آواز آئی۔

''بھائی...... میں آسکتی ہوں؟'' عنبر کو عامر کے کمرے میں کھلے عام آنے کی اجازت نہیں تھی۔ چونکہ عامر کے ساتھ اس کے دوست بیٹھے ہوتے سو اکثر وہ کھانا، چائے لینے گھر کے اندر خود جاتا تھا اور عنبر اگر آتی تو کسی خاص ضرورت کے تحت ہی آیا کرتی۔

''اب کیا ضرورت آن پڑی ہے۔'' عامر نے الجھ کر سوچا...... وہ دونوں بری طرح چیخ چلّا رہے تھے...... شاید گھر والوں نے ان کی آوازیں سن لی ہوں۔

''کیا بات ہے عنبر؟'' عامر نے ناگواری سے اسے اندر آنے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''کوئی کام ہے کیا؟''

''جی بھائی...... آپ دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا تھا کیا؟'' عنبر معصومیت سے پوچھ رہی تھی...... ''بہت چیخ و پکار ہو رہی تھی۔''

''نہیں...... کوئی جھگڑا نہیں تھا۔'' عامر اسے جلد سے جلد یہاں سے ہٹانا چاہتا تھا۔ ''تم جاؤ۔''

''ایک منٹ بھائی......'' عنبر رکتے ہوئے بولی سامنے کاغذ کا وہ پرزہ رکھا تھا جو سارے فساد کی جڑ بنا تھا...... وہ اسے ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے بولی۔

''بھائی آپ دونوں کے جھگڑے کا سبب کہیں کاغذ کا یہ پرزہ تو نہیں۔''

''نہیں...... میں نے کہا ناں تم جاؤ اندر......'' عامر نے بڑے خراب موڈ میں کہا جبکہ اس ساری بات چیت کے دوران تیمور بالکل چپ تھا۔

''میں نہیں جاؤں گی بھائی...... کیونکہ میں آپ دونوں کے بیچ جھگڑا ختم کرنے آئی ہوں...... تیمور بھائی آپ اتنے خاموش کیوں ہیں؟''

''میں نے کہا ناں...... کہ تم جاؤ......'' عامر اپنے دانت پیستے ہوئے بولا جبکہ تیمور اتنا ڈسٹرب تھا کہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''عامر بھائی...... بات نازیہ کے متعلق ہے۔ آپ اب بھی میری بات نہیں سنیں گے۔''

''کک...... کیا؟'' دونوں شدت سے چونک پڑے۔

''ہاں...... جب آپ نے پہلی بار تیمور بھائی کو نازیہ کے لیے بھیجا تھا تو اسی دن نازیہ نے ساری روداد مجھے سنادی تھی...... اور اس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ آپ جب بھی رشتہ لے کر آنا چاہیں تو آسکتے ہیں۔ میں انتظار کرتی رہی کہ آپ گھر میں بات کریں گے اور ہم نازیہ کا رشتہ اس کے گھر لے جائیں گے...... لیکن آپ نے دوسری بار بھی تیمور بھائی کو ہی بھیجا تو نازیہ کو غصہ آگیا...... اس نے کہہ دیا کہ اگر پھر تیمور بھائی آپ سفارش لے کر آئے تو وہ آپ کو سبق سکھائیں گی اور جب تیسری بار تیمور بھائی پھر گئے تو ہم دونوں نے مل کر یہ اسکیم تیار کی...... اور تیمور بھائی کے ہاتھوں پر کاغذ بھجوا دیا...... نازیہ نے سختی سے مجھ سے کہا تھا کہ میں دو دن تک یہ بات کلیئر نہ کروں لیکن آپ کے کمرے سے آنے والے جھگڑے کی آواز سن کر میں رہ نہ سکی...... اور بات کلیئر کرنے آگئی۔''

وہ دونوں ہکا بکا عنبر کی بات سن رہے تھے...... عامر کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا تھا، وہ بے یقینی سے عنبر کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہارا مطلب ہے...... وہ...... نازیہ مجھ سے شادی کے لیے تیار ہے؟''

''بالکل بھائی...... آج ہم آپ کا رشتہ اس کی طرف لے کر جائیں گے...... میں نے اماں سے بابا سے سب سے بات کر لی ہے۔'' عامر کا دل بلیوں اچھلنے لگا جبکہ عنبر کہہ رہی تھی۔

''بھائی...... آپ کا طریقہ غلط تھا۔ آپ ہم سے بات کرتے ، ہم سیدھے سبھاؤ رشتہ لے جاتے...... تیمور بھائی کو آپ بار، بار بھیجتے رہے۔ نازیہ کو یہ اپنی بے عزتی محسوس ہوئی لیکن خیر...... اب سب کچھ سیٹ ہو گیا ہے۔ میں نے فون پر نازیہ سے بات کر لی ہے، وہ اور اس کے گھر والے شام کو ہمارا انتظار کریں گے۔'' مارے خوشی کے عامر کچھ بولنا بھول گیا...... ناچنے کو، گانے کو دل کرنے لگا۔ عنبر کمرے سے جا چکی تھی...... تیمور بالکل سیریس تھا...... اس نے کسی بات میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ کمرے سے باہر جانے لگا۔

''کہاں جا رہا ہے تو؟'' عامر چونک کر بولا۔

''گھر جا رہا ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ارے الو...... بیٹھ اب...... اب تو خوشی منائیں گے...... رات بھر جشن منائیں گے، خوشی کے لمحات ہیں...... تو اس خوشی میں مجھے اکیلا چھوڑ دے گا۔''

''میں صرف جا نہیں رہا...... تجھ سے دوستی کا رشتہ بھی ختم کر کے جا رہا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تو عامر بھونچکا رہ گیا۔

''کیا کہہ رہا ہے تو...... ہوش میں تو ہے تو؟''

''ہوش میں تو اب آیا ہوں عامر......'' وہ تھکے، تھکے انداز میں بولا۔ ''جب ایک کاغذ کا پرزہ ہماری دوستی پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو ایسی دوستی کا فائدہ کیا ہے...... کل اگر کسی اور نے میری جھوٹی سچی شکایت لگا دی تو تو مجھ پر اس سے بھی زیادہ سنگین الزامات لگائے گا...... اچھا ہے کہ ایسی نوبت آنے سے پہلے ہم اپنے راستے الگ کر لیں۔''

''تو راستے الگ کرے گا مجھ سے؟ تو دوستی ختم کرے گا مجھ سے؟'' عامر بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں اٹھا کر اس طرح نیچے پٹخ دوں گا کہ تیرے ٹکڑے، ٹکڑے ہو جائیں گے...... پاجی رذیل......'' تیمور کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا...... وہ کمرے سے نکلنے لگا تو عامر نے اسے بازو سے پکڑا اور زبردستی اس کے گلے لگ گیا۔

''مجھے معاف کر دے تیمور یار...... میں سچ مچ پاگل ہو گیا تھا۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولا تو تیمور نے ہاتھ جھٹک دیا۔

''معافی تلافی کا وقت گزر چکا ہے عامر...... بس اب دوستی کا اینڈ ہے۔''

''تیمور ، میری جان ، میرے دل کے ٹکڑے...... اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا تو میں زندہ نہیں رہوں گا، مر جاؤں گا، تو اور تیری دوستی تو میرے لیے آبِ حیات ہے...... امرت ہے میرے لیے۔'' وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگا...... وہ اس کے شانے سے منہ رگڑ، رگڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا...... تیمور زیادہ دیر تک اپنے اس یارِ غار سے خفا نہ رہ سکا۔

''اچھا، اب مزید ایکٹنگ نہ کر اور چائے پلا مجھے، بہت تھک گیا ہوں۔''

''تو نے مجھے معاف کر دیا ناں......'' وہ اپنے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں، کر دیا......'' تیمور نے بے پروائی سے جواب دیا تو وہ مارے جوش کے ایک بار پھر وہ تیمور کے گلے لگ گیا۔

''تیمور ہم ساتھ کی بیکری سے مٹھائی لا دو...... میں عنبر کو چائے کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

''میں لاؤں......؟'' تیمور اکڑ کر بولا۔

''ہاں...... تو تم ہی لاؤ گے...... اب میں مستقبل کا دولھا کیا اچھا لگوں گا...... بیکری سے اپنے پیسوں سے مٹھائی لیتے ہوئے، یہ کام تو یار دوست ہی سرانجام دیتے ہیں۔''

''خبیث نہ ہو تو......'' تیمور نے چپل پاؤں میں اڑستے ہوئے کہا تو دونوں دوست ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس دیے...... ملال کے موسم بیت گئے تھے اور خوشیوں کا سورج پوری آب و تاب سے نکل آیا تھا۔

شامل تھے۔ چیفس کالج کے دنوں میں اس کے شوق کالج کے لیے ٹرافیاں جیتنے کا سبب بنتے رہے تھے۔

ہوٹل کا سوئمنگ پول دن کا بیشتر حصہ آباد رہتا تھا۔ غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ فاروق بھی تیراکی کے

شاید وہ محض اتفاق ہی تھا۔ اگلا تمام دن فاروق اسے لے کر ہوٹل کے قریب پہاڑوں میں ہائیکنگ ٹریکس دریافت کرتا رہا۔ وہ ایک اسپورٹس مین تھا۔ گھڑ سواری، تیراکی اور کرکٹ اس کے ڈی این اے میں

ناولٹ

کھوئے کھوئے لمحے

تابندہ نعیم

پاکستان کی انتہائی معتبر، انتہائی خوب صورت اور انتہائی گہرے جملے لکھنے والی مصنفہ رفعت ناہید سجاد کے انداز تحریر سے متاثر ہو کر شروع کی جانے والی یہ کہانی گزشتہ کئی سالوں سے ٹکڑوں کی شکل میں لکھی جاتی رہی۔ اس عرصے میں پاکستانی معاشرہ تبدیل ہوچکا ہے۔ اب پاکستان کے پبلک پارکس میں شاید ہی کوئی غیر ملکی خاتون پاکستانی طالبات کو شام کی تفریح کرانے نکلتی ہو... مگر ہمارے آپ کے اسی پاکستان میں کبھی ایسا ہوا کرتا تھا۔ کہانی فرضی ہے۔ اس کے واقعات سن انیس سو ستاسی سے انیس سو بچانوے تک کے حالات اور کرداروں پر مبنی ہیں، تاہم ان کی کسی حقیقی کردار یا واقعے سے مماثلت محض اتفاقیہ ہوسکتی ہے۔

چوتھا حصہ





کسی موقع کو ضائع نہیں کرتا تھا۔ شام کو سوئمنگ پول کے گرد باربی کیو کے شوقین افراد تندہی سے چکن کی مہک کے ساتھ اپنی، اپنی مرضی کا مشروب لیے شکم اور نگاہ کے سرور کا بندوبست کررہے تھے۔

وہ سارے دن کی تھکا دینے والی سرگرمی کی وجہ سے اتنی تھک چکی تھی کہ کمرے میں تازہ دم ہونے کے بعد سوئمنگ پول کے گرد پڑی ایزی چیئر پر سستی سے بیٹھی تھی۔ اور پانی میں چھلانگ لگاتے، ڈوبتے ابھرتے تیرتے، سنہری سیاہ گندمی انسانوں کو حسین شام کے رنگوں سے اپنا حصہ وصول کرتے دیکھ رہی تھی۔

اس کے محبوب نے ایک زوردار چھپاکے سے پانی میں کودنے کے بعد ایک لمبا چکر مکمل کرکے کنارے پر ابھرتے ''ہے...... سبرینہ'' کا نعرہ لگایا تھا۔ وہ کنارے پر قطار سے لگی لمبی کھڑی کینوپیوں کے نیچے سفید جالی دار میزوں کے گرد بچھی کرسیوں پر بیٹھی، کئی حسین لڑکیوں کی رشک بھری نظروں کی زد میں تھا...... اور خوب جانتا تھا۔

شاید وہ بھی اپنی خوش قسمتی پر...ابھی کچھ دیر اور رشک کرتی اگر اسے اپنے قریب جھکے کسی ناخوشگوار وجود کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا ہوتا۔

''حیران ہوں، کسی ایسے شخص کا محبوب ہونا کیسا لگتا ہوگا، جس کی طلب سب کو ہو۔'' فصیح ماڈوی والا اس کی طرف جھکا نہ جانے کس سے جل رہا تھا اور کسے جلانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سرخ مشروب کا گلاس تھا۔ اس کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں تیرتی سرخی بتا رہی تھی کہ یہ ایسا پہلا گلاس نہیں ہے۔ اس کی سانس سے اٹھتی الکحل کی بدبو سے سبرینہ کا دماغ جھلس گیا۔ وہ آج ایسی کسی سوشلائزنگ کے موڈ میں نہیں تھی۔ فاروق سوئمنگ سے واپس آتا تو وہ کھانا کھا کر صرف سونا چاہتی تھی۔

''ایک دم زبردست......'' سبرینہ نے ایک مصنوعی مسکراہٹ طاری کرکے اس بدبودار آدمی کا وار [illegible] اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ کسی بے معنی جملے بازی میں الجھنا نہیں چاہتی تھی۔

''سوچتا ہوں مجھے کب ایسی عزت ملے گی؟'' وہ اس کے کرسی چھوڑتے ہی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اور اب اس کا راستہ روکے فلرٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

اس نے پلٹ کر ذرا کی ذرا سوئمنگ پول پر نظر ڈالی، جہاں ابھی ابھی اس کے یونانی دیوتا جیسے شوہر نے اسے رجھانے کے لیے زمین آسمان ایک کیا تھا۔ اور اب اپنی بیوی کو پرچانے کا ارادہ ترک کرکے ایک سنہری جل پری کو تیراکی کا وہ ناممکن انداز سکھا رہا تھا۔ جس کا مظاہرہ ابھی ابھی اس نے ''ہے سبرینہ'' کا نعرہ لگا کر کیا تھا۔ وہ اتنا مگن تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو کنارے پر کسی غیر دلچسپ وجود سے الجھتے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔

''اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ اپنی ترجیحات کتنی جلدی درست کرتے ہیں، مسٹر ماڈوی والا۔'' اپنی طرف سے اس کی طبیعت صاف کرکے وہ آگے بڑھی تھی۔ اسی وقت ہوٹل کے باربی کیو ایریا میں بجنے والی مدھر موسیقی ایک زوردار بینگ کے ساتھ دیوانی ہوئی۔ ہوٹل آرکسٹر نے کسی پرجوش دل کی فرمائش پوری کی تھی۔ ڈرم کی بیٹ تیز ہوتے ہی سوئمنگ پول سے ذرا فاصلے پر دھری کرسیوں پر بیٹھے ملکی اور غیر ملکی تالیاں بجاتے، جھومتے کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دیوانہ وار رقص کا دور اب شروع ہوا ہی چاہتا تھا۔

''مجھے یقین ہے، میں نے اپنی ترجیح درست طے کی ہے۔'' اس کے بازو میں وحشی مسخرے کی موٹی انگلیوں کی گرفت مضبوط تھی۔ اس کی چھوٹی، چھوٹی غلیظ آنکھوں کے عزائم کسی اندھے کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ سبرینہ نے اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کی آہنی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہا۔ مزاحمت کی زبردست کوشش میں اپنے ارد گرد نظر دوڑائی، فاروق کہیں نہیں تھا۔ اس کے گرد لوگ دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔ ایسے میں پبلک نے دیکھا بھی ہوتو

ایک غیر ملکی دکھائی دینے والی لڑکی کو ایسی دیوانگی اور استحقاق بھری گرفت سے آزاد کراتے دیکھ کر جوڑے کا اندرونی معاملہ سمجھنا اور بے خود کرنے والی موسیقی میں خود کو گم کر دینا مشکل نہیں تھا۔

وہ بازو چھڑانے کی کوشش میں کامیاب تو کیا ہوتی، تیز میوزک کی لے پر اسے اپنے ساتھ دبوچے مسخرا، اس کے پورے وجود سے کسی بدبودار، لجلجے سانپ کی طرح لپٹا، سر سے پاؤں تک اسے غصے اور نفرت کی ایک ناقابلِ بیان سیاہ آگ کے شعلے میں دھکیل رہا تھا۔

بعد میں اسے یاد نہیں آیا کہ وہ پورے حلق سے ایک بار چلائی تھی یا کئی بار..... مگر اس کا محافظ اس کا محبوب نہ جانے کہاں تھا۔

ہاں، جب اس نے مانڈوی والا کے سنہری راسلک کے کرتے والے بازو کو پوری طاقت سے دانتوں میں چبا کر چھوڑنے کا ارادہ بالکل ہی ترک کر دیا تو مانڈوی والا کی چیخیں اتنی بلند ضرور تھیں کہ ناچتے وجود ٹھٹک کر رکنے پر مجبور ہو گئے۔

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' کہہ کر اس کی طرف لپکتے چہروں میں اس نے دیکھا، ایک چہرہ فاروق کا بھی تھا۔

فاروق کے گیلے وجود سے ٹپکتے پانی کے قطرے، سفید سوئمنگ ٹاول گاؤن میں جذب ہو رہے تھے اور وہ اسے مانڈوی والا سے الگ کر کے اب اپنی بیوی کی... بدتمیزی کی معذرت کر رہا تھا۔

اس کا زلزلوں کی زد میں آیا صدمے کی زیادتی سے کانپتا وجود، ایک ہیجان کی کیفیت میں تھا۔ وہ جس میں اس کی ''جان'' تھی وہ اس سے ایک لفظ دل جوئی کا کہے بغیر اس مکار مسخرے کی دل جوئی میں مصروف تھا۔

وہ صدمے سے گنگ ہو گئی تھی۔

''کیا ہوا سبرینہ.....؟ تم اتنی پریشان ہو گئیں؟ وہ تمہارے ساتھ صرف ایک ڈانس ہی تو کرنا چاہتا تھا۔'' بعد میں فاروق نے اس کے گرد بازو پھیلا کر اسے بچے کی طرح پچکار کر کہا تھا۔

''صرف ایک ڈانس.....'' کیا فاروق اتنا سادہ ہے..... کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتی کہ ایک بے ضرر ڈانس اور چور راہے میں کسی دوسرے کی بیوی سے دست درازی کرنے میں کیا فرق ہوتا ہے؟ وہ جہاں سے آئی تھی وہاں ایک بے ضرر اور پریشان کن لمس میں فرق کرنا، پانچویں اور چھٹی کلاس کے بچوں کو سکھایا جاتا ہے۔

''واقعی..... وہ اتنی پریشان کیوں ہو گئی تھی؟'' مانڈوی والا ایسی بے عزتی کے بعد بھناتا، ہوا نکلے غبارے کی طرح کھسیانی ہنسی ہنستا، مہذب دنیا کا فرد ہونے کا دعویٰ کرتا، فاروق کی معذرت قبول کرنے کی ایکٹنگ کرتا، فوراً بے مزہ ہوتی محفل سے جا چکا تھا۔

فاروق بھی وقت ضائع کیے بغیر اسے ہوٹل کے اسی کمرے میں ہنکا لایا تھا جہاں پچھلے چند دنوں میں سبرینہ نے اپنی زندگی کا سب سے خوب صورت وقت گزارا تھا۔ لیکن جہاں آج اپنے شوہر کے ساتھ داخل ہوتے اس کے دل میں ایک نہیں کئی خدشے سر اٹھا رہے تھے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ فاروق اس کی بات پر یقین ہی نہ کرے..... فاروق نے کمرے میں آنے کے بعد روم سروس سے کھانا آرڈر کیا اور کھایا بھی، اس سے شامل ہونے کے لیے وہ اصرار بھی کرتا رہا مگر سبرینہ کے حواس ابھی صورتِ حال کو تسلیم ہی نہیں کر پا رہے تھے۔ اسے زبردست تذلیل کا احساس ہو رہا تھا۔

اس کے محبوب شوہر نے سونے سے پہلے بالکل چت لیٹ کر چھت تکتی اپنی خاموش محبوبہ کی ایک مہکتی لٹ ہولے سے کھینچی تھی اور جھک کر کہا تھا۔

''میرے خیال سے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے..... کیا تمہیں واقعی لگتا ہے کہ اس کا ارادہ تم پر حملہ کرنے کا تھا۔''

''ارادے کی تعریف تمہارے نزدیک کیا ہے؟ گھٹیا انسان۔'' سبرینہ نے دانت پر دانت جما کر غصے کی جھلسا دینے والی لہر کو دبا کر اس کی آنکھوں میں غور سے جھانکا۔

''دیکھو سبرینہ، میرے خیال میں وقت آ گیا ہے کہ تم جان لو، دنیا کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں

وہاں بیوی اپنے شوہر سے اس طرح بات نہیں کرسکتی جیسے تم مجھ سے کرتی ہو...... یہ ناقابلِ قبول ہے۔'' وہ برا مان کر اس کے پاس سے ہٹ گیا اور منہ موڑ کر ناراضی سے بولا سبرینہ اٹھ بیٹھی۔ اس پر غصے کی زیادتی سے لرزہ طاری تھا۔

''اب یہ مت کہنا کہ دنیا کے جس حصے میں تم رہتے ہو وہاں کوئی بیمار ذہن شخص تمہاری بیوی پر مجرمانہ حملہ کرسکتا ہے اور یہ قابلِ قبول ہے؟'' اسے پتا نہیں تھا کہ اس کی آنکھ سے گیلا، گیلا جو بہہ نکلا تھا وہ اس کے آنسو تھے۔

لیکن فاروق کی آنکھوں میں جو اچانک ہی لہریں لینے لگا تھا وہ غصہ تھا جو سبرینہ کے لیے بالکل ہی نیا تھا۔

''اوہ بس کرو سبرینہ...... میں آج کی رات کوئی بحث نہیں چاہتا، میں سخت تھکا ہوا ہوں۔ چلو اب اس بات کو ختم کریں اور سو جائیں ......اوکے......؟'' وہ ایک جھٹکے سے اس کے پاس سے اٹھا تھا اور اپنا تکیہ سیدھا کر کے سچ مچ سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

پر وہ ساری رات نہیں سو سکی تھی۔ وہ غصے سے کھول رہی تھی۔ وہ جو سوچ رہی تھی وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی کشتیاں جلا کر یہاں اسپین فتح کرنے آئی تھی۔

☆☆☆

لیکن وہ اگلے ہی دن پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ اس کی ہر ادا پر قربان ہوتا، فکر کر کے ناشتا کرواتا، کولون میں مہکتے وجود کے ساتھ اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا...... اپنے پہلو میں ہاتھ لگاؤ تو میلی ہوتی، دودھ اور شہد میں گندھی حسین شہزادی کو لیے اکڑ کر چلتا، وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب مرد تھا۔

بھوربن سے دن چڑھے نکلنے کے بعد فاروق کی پجیرو کہیں اور جا رہی تھی ایک اور خوب صورت مقام جو بھوربن ہی کی طرح سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہونے کے ساتھ کسی بھی درمیانے درجے کے حسین شہر جیسا تھا۔ فاروق اسے نہ بتاتا تب بھی اس نے سڑک کے کنارے انگلش میں لکھا پڑھ لیا تھا۔ ایبٹ آباد۔

فاروق کہتا تھا کہ اس کے ملک کا نظام آج بھی برطانوی دور کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے اور اس... شہر کا نام اسی کی ایک مثال تھا۔

یہاں آنا پہلے سے طے شدہ نہیں تھا۔ تبھی ڈرائیور راستوں سے ناواقف معلوم ہوتا تھا۔ انہیں فاروق کے کسی دوست کی پُرزور فرمائش پر یہ دعوت قبول کرنی پڑی تھی۔

ریسٹ ہاؤس کی طرح، لمبے برآمدوں اور ترچھی چھت والا یہ عالیشان بنگلا راستے میں نظر آنے والے کئی مکانوں سے بہت بڑا تھا۔ اس کی بیرونی آرائش پر بے دریغ پیسہ بہایا گیا تھا۔ پانی اچھالتے فواروں کے پاس لان کے درمیان میں ایک بڑا سا پنجرہ تھا۔ رنگین پروں کو پھیلانے اور سمیٹنے میں معروف پنجرے میں بند مور اسی جنگل میں ناچ رہے تھے۔ جہاں کوئی بھی دیکھنے والا نہیں ہوتا۔

فاروق کا دوست ان کا جی جان سے منتظر تھا۔ پہلی نظر ڈالتے ہی سبرینہ کو لگا اس کا دل کہیں نیچے بہت نیچے کی طرف گرتا جا رہا ہے۔ اسے ڈر نہیں لگا تھا اسے غصہ آیا تھا۔ اسے شکایت ہوئی تھی فاروق سے نہیں اپنے آپ سے۔

فاروق کا کہنا تھا کہ بھوربن میں اس کی بیوی اور فصیح مانڈوی والا کے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی اسے دور کرنے کے لیے مانڈوی والا کے اصرار پر اس کی موسم گرما کی رہائش گاہ پر آنے کا فیصلہ قطعاً اس کا ذاتی تھا۔ گو دعوت دینے میں پہل فصیح نے کی تھی۔ لیکن اسے کسی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ ان دو ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے کے اتنے گہرے دوست کب بن گئے۔ اسے کیوں پتا نہیں چلا؟

مگر کبھی میز پر جلتی موم بتیوں کے بیچ دنیا کے بہترین شیف کے ہاتھ سے تیار ہونے والی اٹالین اور فرنچ ڈشز کو ٹھکرانا اس کے شوہر کے نزدیک سخت غیر اخلاقی حرکت ہوتی۔ وہ اپنی مرضی سے یہاں آئے تھے۔ اب میزبان کو بے عزت کیسے کر سکتے تھے۔

رات کا کھانا کھایا اور اٹھایا گیا۔ فصیح مانڈوی والا

نے گہری ہوتی رات کا خمار، سرخ مشروب میں انڈیل کر گلاس فاروق کی طرف بڑھایا تھا۔ جو بڑے ہی اطمینان سے اس کے سامنے کے صوفے میں دھنسا کسی بات پر بے سبب مسکرا رہا تھا۔ اس کے سانچے میں ڈھلی مرمریں بیوی اپنے دراز قد کو شفون کی دل خوش کُن ساڑی میں چھپائے ناراضی سے پیٹھ موڑے کھڑی، زمین سے چھت تک بلند کھڑکی کے شیشوں کے پاس اندھیرے میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ مانڈوی والا کی نظریں اس کی پشت کے پیچ وخم کا طواف کر رہی تھیں۔

اس کے سرکل میں خوب صورت عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ آسانی سے ہاتھ آنے والی غیر ملکی عورتوں کی بھی نہیں...... مگر اس کے تجربے نے اتنا خام، اتنا خالص، ایسی آن بان والا، غیر ملکی حسن پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ آزاد دنیا سے آئی تھی مگر یہیں کی لگتی تھی۔ اس نے انگلیوں پر گن کر دیکھا۔ بھورین سے اب تک یہ اس کی اس اپسرا پر پڑنے والی پانچویں اتنی بھرپور نظر تھی۔ اس نے اب تک ایک بار بھی اسے روایتی پاکستانی لباس کے سوا کچھ پہنے نہیں دیکھا تھا۔

اسے مشکل سودے کرنے پسند تھے۔ اپسرا کے مالک فاروق سے پہلی ملاقات میں اسے خوب اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ کو جسے وہ کسی وجہ سے بیوی کہنے پر آمادہ ہو گیا ہے ایسی بے ضرر سوشلائزنگ پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جس سے اس کے لیے ملک کے بااثر کارپوریٹ سیکٹر میں اپنے راستے بنانے کا موقع ہموار ہو......اس نے فصیح مانڈوی والا کے سامنے کوئی اعتراف نہیں کیا تھا...... مگر فوج اور حکومت کے علاوہ وہ کراچی کی اسٹاک مارکیٹ اور چیمبر آف کامرس میں اپنی جڑیں گہری کرتی پنجاب کی اس ماڈرن جاگیردار کلاس سے وہ بخوبی واقف تھا۔ جس کے فارن پلٹ انتہائی پڑھے لکھے، بہت گھمنڈی، بہت جلدی سے سب کچھ حاصل کرنے کے خواہش مند over ambitious نوجوانوں کے لیے پاکستان میں حاصل کرنے کو بہت کچھ تھا۔ اور وہ اس کے لیے کوئی بھی قیمت کسی بھی قیمت پر دینے کو تیار تھے۔ اسے ان

سپنوں میں الجھی

سپنوں میں الجھی ناداں سی لڑکی
سمندر کنارے مٹی کے گھروندے بناتی
چاندنی راتوں میں چھت پہ کھڑی چاند کو تکتی
ساون کی سنہری شاموں میں باغوں میں جھولتی
گھٹا ٹوپ اندھیری راتوں میں آس کے دیپ جلاتی
تاروں بھرے آکاش پر نظریں جمائے کچھ تلاشتی
دسمبر کی سرد راتوں میں آتش دان پر ہاتھ سینکتی
اپنے خیالوں میں مگن آنکھیں موندے بیٹھی رہتی
اسے اپنے پریمی کا انتظار ہے......
کوئی ہے جو اس کا پریمی ڈھونڈ لائے؟

شاعرہ: مسز نگہت غفار، کراچی

محبت

محبت ریت جیسی تھی
مجھے تھی یہ غلط فہمی
محبت ڈھیر ساری تھی
میں دونوں ہاتھ بھر بھر کر
محبت کو سنبھالوں گا
زمانے سے چھپا لوں گا
کبھی کھونے نہیں دوں گا
مگر...... میں نے اسی ڈر سے
محبت ہی نہ کھو جائے
یہ مٹھیاں بند رکھی تھیں
مگر جب مٹھیاں کھولیں
تو دونوں ہاتھ خالی تھے
محبت کے سوالی تھے
کیونکہ......
محبت تو ریت جیسی تھی

مرسلہ: صدف آصف، کراچی

وسیع زمینوں کے پشت در پشت مالک اپنے باپ دادا کی طرح صرف علاقائی اور صوبائی سیاست پر قناعت نہیں کرنی تھی۔ قومی دھارے کی سیاست سے قومی خزانے تک کی وزارتوں اور محکمہ جات تک اپنی کامیابیوں کے کچھ اہم باب رقم کرنے تھے۔ وہ یقیناً اپنے باپ فیروز معظم خان سے کئی ہاتھ آگے تھا۔

اس نے دیکھا، فاروق اپنا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اپنی ناراض اپسرا کے پاس گیا تھا۔ اس نے بڑے استحقاق سے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اور فصیح مانڈوی والا کے دل پر جلن کی آریاں چل رہی تھیں۔ اس کے لیے زیادہ دیر تک اپنے حواسوں کو قابو میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

فاروق، سبرینہ کی تنی ہوئی پشت سے کچھ بے حد محبت سے کہہ کر اپنی جگہ دوبارہ جا بیٹھا تھا۔ یقیناً یہی کہ وہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ تب تک وہ کمرے میں جا کر کچھ آرام کر لے۔

فصیح مانڈوی والا کا دل باغ، باغ ہو گیا۔ جب سبرینہ کے جاتے ہی فاروق نے مسکرا کر فصیح مانڈوی والا کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سبرینہ کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔

اس کے بعد کے واقعات اتنی تیزی سے وقوع پزیر ہوئے کہ متاثرین کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ ہوا کیا ہے۔ سبرینہ کے پیچھے کمرے میں پہنچتے ہی مانڈوی والا کا سر زور سے پھینکی ہوئی کسی بہت بھاری چیز کی زد میں آ گیا تھا۔ فاروق دوڑ کر اندر پہنچا تو مانڈوی والا کے سر سے بہتے خون کے فوارے نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ شعلہ جوالہ بنی سبرینہ گیبرئیل اپنے دونوں ہاتھوں میں پیتل کا بھاری گلدان دبوچے اگلے حملے کے لیے بالکل تیار تھی۔ گلدان کے پیندے کا باریک کنارہ مانڈوی والا کے خون سے سرخ ہو چکا تھا...... فاروق ایسی ایمرجنسی کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ مانڈوی والا کو فوراً قریب ترین اسپتال لے جانا پڑا۔ جہاں اس کے پھٹے ہوئے سر میں ایک دو نہیں پورے آٹھ ٹانکے لگے۔ مانڈوی والا صدمے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے سوجے اور اکڑے ہوئے سر کو ٹٹول کر قسم کھائی تھی کہ وہ اس مغرور لڑکی کے دماغ کا خناس ضرور نکالے گا۔ فی الوقت تو اس نے فاروق کو دھمکیاں دے کر اس کا دماغ درست کر دیا تھا۔ جس نے لڑکی کو ذہنی طور پر تیار کیے بغیر یہاں لانے کی حماقت کی تھی۔ پولیس میں رپورٹ درج کرانے کی دھمکیاں سن کر فاروق نے خود کو مانڈوی والا کی منت کرتے اور دل ہی دل میں سبرینہ کو خوب سبق سکھانے کا ارادہ کرتے پایا۔ یہ سب کچھ قطعاً غیر متوقع تھا۔

فاروق کا خیال تھا کہ سبرینہ کی صورت قدرت نے اسے ویسا ہی جیک پاٹ دلوا دیا ہے جیسا کبھی اس کے باپ کے حصے میں آیا تھا۔ اس کا باپ بے وقوف تھا۔ جس نے اپنی کامیابی کی حسین کنجی اپنی پسند کے گھوڑے دشمنوں سے ہتھیانے، ضلع کچہری کے معمولی کلرک اور پٹواریوں کو خوش کرنے اور علاقائی سیاست میں اثر پیدا کرنے میں ضائع کر دی۔ وہ اپنے باپ سے کہیں زیادہ سیانا تھا۔ اس کا باپ کہتا تھا، فاروق میرے خاندان کا دماغ ہے۔ وہ اپنے بھائیوں کی طرح چیفس کالج لاہور گیا تھا، گھڑ سواری، پولو، تیراکی، کرکٹ... اس نے کھیل اور تعلیم دونوں میدانوں میں ہر جگہ اعزاز کے ساتھ کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

برطانیہ جاتے ہوئے اس کے باپ نے اپنے باپ کی طرح اس سے اپنی زمینوں پر واپس لوٹنے کا عہد لیا تھا کیونکہ اس میں فائدہ زیادہ تھا۔ وہ اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے پوری طرح آمادہ بھی تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ وہ اپنے باپ سے زیادہ ذہین، اچھی گفتگو کرنے والا، زیادہ اچھی صورت اور عقل کا مالک ہے۔ تبھی اسے سبرینہ جیسی خام اور خالص لڑکی ایسی آسانی سے مل گئی جو اس کے باپ کے شاندار محل کے زبردست ہال میں بجی، اس کی تعلیمی دور کی ٹرافیوں سے کہیں بڑی ٹرافی بن سکتی تھی۔

لیکن ایبٹ آباد کے واقعے نے اسے غصے سے پاگل کر دیا تھا۔ مانڈوی والا کو ٹانکے لگوا کر معاملہ پولیس

میں نہ جانے دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر جب فاروق میزبان سمیت واپس اس کے بنگلے پر پہنچا تو سبرینہ واپسی کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

اس دن فصیح مانڈوی والا کی آنکھوں کے سامنے فاروق فیروز خان کے ہاتھوں سبرینہ گیبریئل کو پہلا باقاعدہ اور زوردار تھپڑ پڑا تھا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ فصیح مانڈوی والا نے خود کو پہلی بار فاروق سے سخت مرعوب محسوس کیا۔ تھپڑ...... جس نے سبرینہ کے دماغ کو جھنجھنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے پھٹے ہوئے ہونٹ سے نکلنے والا خون اس کے حلق میں جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بے یقینی اور صدمے سے پھل پھل بہہ رہی تھیں۔

اور وہ خوب اچھی طرح جان چکی تھی کہ کشتیاں جلانے والوں کا انجام ہمیشہ ہی اچھا نہیں ہوتا۔

☆☆☆

اس نے 'اچھی' سے بے تکلف ہونے کے لیے اسے اپنا ایک منا سا کروکوڈائل کی کھال والا پرس تحفے میں دینا چاہا تھا۔

'اچھی' کی آنکھیں خوشی سے دمکنے لگی تھیں۔ اس نے ایک منٹ کے لیے پرس ہاتھ میں لے کر، الٹ پلٹ کر دیکھا پھر جیسے اس کے کان میں کوئی بولا تھا۔

"وہ ایک گندے، ننگے لوگوں کے دیس سے آنے والی ایک کافر اور ناپاک لڑکی ہے۔ خبردار، ایسے کافروں سے میل ملاقات رکھنے والوں کو اللہ گناہ دیتا ہے۔ ان پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے۔"

'اچھی' کے کان میں اپنی ماں کے سکھائے سبق گونجے، وہ سبق جو اس کی ماں کو، چوہدریوں کی بیویوں نے کافر جادوگرنیوں کے طلسم سے محفوظ رہنے کے لیے پڑھائے تھے۔ وہ اس نجس بٹوے کو چھو کر اپنے ہاتھ ناپاک کر چکی تھی۔ اس نے سہم کر پرس چھوڑ دیا تھا اور بھاگتی، بھاگتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ پرس ایک دھپ کی آواز کے ساتھ قالین پر گرا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ اس کی زندگی میں انقلاب ضرور آیا تھا لیکن ابھی [illegible] لا نہیں ہوئی تھی۔

"وہ اسے کیا سمجھانا چاہتے ہیں اور ایک قابلِ نفرت غلیظ کوڑھی کی طرح اسے ساری دنیا سے کاٹ کر کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟" پھر اس نے اپنے دل کا غبار فاروق کے سنگ مرمر سے بنے محل میں سایوں کی طرح منڈلاتے، خدمت گاروں پر نکالنا شروع کر دیا۔ وہ گونگے تھے...... بہرے تو نہیں تھے...... چند ہی دنوں میں، ان کا مالک بیچ پا ہو کر اس کے سر پر منڈلانے لگا تھا۔

"تو کیا کروں پھر؟" اس کی خودسری لوٹنے لگی تھی۔ جواب میں ایک اور زوردار تھپڑ نے اس کے اعصاب جھنجھنا دیے تھے۔

ایبٹ آباد سے آنے کے بعد حالات کبھی ویسے ہوئے ہی نہیں جیسے سبرینہ سوچتی تھی۔ وہ آدمی کبھی جس کے آنے پر اس کا دل کھل اٹھتا تھا، اطراف میں موسیقی بجنے لگتی تھی۔ برف سے ڈھکے دشوار موسم، جس کی آمد کی خوشی سے پُرجوش ہو کر جھومنے لگتے تھے۔ اپنے اصل سے کتنا مختلف تھا۔ یہ کوئی اور ہی شخص تھا، جس نے اس پر اپنا ہر اختیار حاصل کر لیا تھا پھر بھی خوش نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ کر آئی تھی۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ جب بھی سبرینہ کے ساتھ کوئی مہربانی کرتا، اسے سبرینہ سے کچھ ایسا چاہیے ہوتا تھا جسے وہ مان نہیں سکتی تھی۔

پھر بھی وہ خود کو حوصلہ دیتی...... وہ اتنا برا نہیں ہو سکتا...... وہ پیار، محبت سے اسے سمجھا سکتی ہے آخر اسے پہچاننے میں، اس نے کتنی بڑی غلطی کی ہو گی بھلا؟

لیکن جس دن فاروق کے ایک دوست کے شاندار فارم ہاؤس پر جو ایک بڑے سیاسی گھرانے کا چشم و چراغ تھا ہونے والی ایک انتہائی غیر رسمی پارٹی میں سبرینہ گیبریئل نے مشروب سے بھرا گلاس میزبان کے منہ پر الٹ دیا تھا...... اس دن فاروق نے اس کا دماغ درست کرنے کے لیے گھر واپسی تک کا انتظار نہیں کیا تھا...... وہ فاروق کے محل پہنچ کر گاڑی سے اتری تو اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ اور پھٹے ہوئے ہونٹ

سے ابھی خون رسنا بند نہیں ہوا تھا۔
فاروق کے دوستوں کی بے عزتی کرنے کا جرم قابلِ معافی نہیں تھا۔ فاروق سخت خفا تھا۔ جب سے وہ اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا، ایسے کتنے ہی تھپڑ اس کے سرخ و سفید رخساروں پر اپنے نشان بنا، بنا کر گزر چکے تھے...... وہ تھپڑ کھائے ہوئے گال کو سہلاتی، نفرت کے ناقابلِ بیان سیلاب میں بہتی اپنی سرکش ہوتی ''میں'' کو سنبھالنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھی...... وہ کیوں نہیں سمجھ لیتی...... جب تک وہ یہاں ہے اسے حالات سے سمجھوتا کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی...... اس نے غصے کا طوفان تھمنے کے بعد اپنے آپ کو بڑے سکون سے تسلی دی تھی۔
مگر وہ کب تک یہاں ہے؟ یہ سوال بھی بہت دلچسپ تھا۔ اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر مفلوج خاموشی سے اس سنگِ مرمر کے محل میں ایک ایسے شخص کے اندھے عزائم کی سولی پر چڑھے رہنا کوئی آسان کام تھا ہی نہیں...... بڑی مشکل سے اپنے ضدی اور بات، بات پر الجھ پڑنے والے دماغ کو سمجھا بجھا کر وہ ایک کنارے ہو کر چلنے کی مشق کرنے لگی...... اور ان گونگے ملازموں کو جو مالک سے وفاداری نبھانے پر مجبور تھے۔ ہر روز بلند ہونے والے اس ہنگامے سے نجات مل گئی جو فاروق صاحب کے اپنی غیر ملکی بیوی کے کمرے میں جانے پر اندر سے اٹھتا تھا۔ آوازیں دو برابر کی آتی تھیں...... ایک گرجدار اور غصہ ور مالک کی، بدزبان اور گستاخ رعایا سے جھگڑنے کی آوازیں۔
شاید پھر بھی وہ فاروق سے کوئی اچھی امید باقی رکھ لیتی اگر ایک گہری سیاہ رات میں فاروق نے ایک سیاہ ہیولے کو اپنی اونچی گاڑی کے پہیوں میں لپیٹ کر سڑک پر دور تک گھسیٹا نہ ہوتا۔
وہ بہاول پور میں ایک بڑی شخصیت کے فنکشن سے موضع محمد خان واپسی کے راستے میں تھے جب یہ دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا۔ بس ایک لمحے کی بات تھی۔ سب آناً فاناً ہو گیا تھا۔ سبرینہ نے ایک سائے کو دور سے سڑک پار کرتے دیکھا تھا اس نے فاروق کو دھیان سے گاڑی چلانے کو بھی کہا تھا...... مگر ایک تھڈ کی آواز کے ساتھ گاڑی سے ٹکرانے والا، وہ ایک انسانی ہیولہ ہی تھا۔ وہ حلق سے چلا رہی تھی...... فاروق کی قمیص کا بازو کھینچ کر اسے گاڑی روکنے کو کہہ رہی تھی...... فاروق کا نشہ ہرن ہو گیا تھا...... وہ سیاہ ہیولہ اب ان کے پیچھے نہیں تھا...... فاروق نے کچھ آگے جا کر گاڑی روکی۔ سبرینہ کو ڈپٹ کر خاموش رہنے کا حکم دیا لیکن سبرینہ خود کو اس کے پیچھے اترنے سے نہ روک سکی۔
فاروق کو گاڑی کے پچھلے پہیے پر جھکے دیکھ کر اس کا دل حلق میں آ گیا تھا۔ گاڑی کا پچھلا پہیہ گیلا، گیلا سا تھا۔ پہیے سے جو ٹپک رہا تھا...... وہ پانی نہیں تھا...... کسی کے ادھڑے ہوئے جسم کی باقیات اب بھی پہیے میں لپٹی ہوئی تھیں...... وہ جو بھی تھا...... زندہ ہوتا تو ضرور کوئی اسے بیٹا، بھائی یا شوہر کہتا...... اس وقت مگر ایسا کوئی انسانی رشتہ اس کے کچلے ہوئے سر اور خون میں لتھڑے ہوئے بالوں کو سہلانے کے لیے اس خاموش سڑک پر موجود نہیں تھا۔
سبرینہ خوف سے کانپ رہی تھی۔
''ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔'' جیسے بیکار مشورے، فاروق نے سنے ہی نہیں...... جیسے اس کے کانوں پر بھی اس کے ضمیر کی طرح مہر لگ چکی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر گردن گھما کر دیکھا۔ خاموش تاریک رات میں، اس کے جرم کی گواہی کس کو دینی تھی۔ کسی کو نہیں......
اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی...... باقی کا سفر طے کیا اور خون اور گوشت میں لتھڑی پراڈو اپنے سنگِ مرمر کے ڈرائیو وے میں چھوڑ کر چابی اسلحہ بردار، باوردی گارڈز کے حوالے کر دی۔
اب ان کا کام ہے کہ وہ گاڑی کو غسل دے کر چکا کر صبح تک ڈرائیو وے میں واپس کھڑی کر دیں...... بس۔
ایک گوشت پوست کی سانس لیتی زندگی کی اتنی حقیر قیمت لگتے، سبرینہ کھلی آنکھوں سے پہلی بار دیکھ رہی تھی...... یہ رات بھی سبرینہ گیبرئیل کی اب تک کی

زندگی کی بھیانک ترین راتوں میں سے ایک تھی......
اس نے اس شخص کو جسے دل کی پوری رضا کے ساتھ اپنے خونی رشتوں کو ناراض کر کے اپنے لیے چنا تھا۔ جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس سے اس نے محبت کی ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دل میں خاموشی سے اس محبت کو آخری ہچکی لیتا دیکھ رہی تھی۔
یہ کیسا خوفناک تجربہ ہے۔ شاید اسے وہی سمجھ سکے، جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی موت ہوتی دیکھی ہو۔
مگر وہ سمجھ گئی تھی۔
ان کے بیچ تناؤ تھا اور بڑھتا جا رہا تھا...... اب وہ کچھ دنوں کے وقفے سے آنے لگا تھا...... وہ جانتا تھا، وہ اسے خوب اچھی طرح سہمانے میں کامیاب ہو گیا ہے...... کچھ دنوں میں وہ راہِ راست پر آجائے گی۔
لیکن وہ اسے کچھ وقت دینا چاہتا تھا۔
وہ جانتا تھا وہ اس کے باپ کی زمینوں پر فالسے چننے والی کسی مزارعے کی لڑکی نہیں۔ وہ چاہے تو دنیا ہلا سکتی ہے حالانکہ ذہانت اور عقل کے سارے میڈل اندھا دھند اپنے باپ کی طاق پر چھوڑ کر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک مزارعے کی لڑکی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

☆☆☆

پھر اسے مزید سہمانے کے لیے ایک نئی چال چلی گئی۔
اس کے کمرے میں کھانا پہنچانے، صفائی کرنے دن میں 'اچھی' کے علاوہ ایک دوسری عورت بھی چکر لگاتی تھیں۔ اسے شبہ سا ہوا وہ بڑی عمر کی عورت جس کی مقامی لہجے والی اردو وہ کسی حد تک سمجھنے لگی تھی، اس کے کمرے میں غیر ضروری رک کر گاہے گاہے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ چھوٹے، چھوٹے فقرے...... اشاروں کی زبان...... ان دنوں وہ عورت اس کے کمرے میں کچھ زیادہ ہی آنے لگی تھی۔
ایک دن اس عورت نے اس کے پاس دو زانو بیٹھ کر رازداری کا وعدہ لے کر آس پاس دیکھ کر جیسے ابھی کوئی آکر اس کا گلا دبا دے گا...... سبرینہ کو تحمل کے ایک اور خونچکاں راز میں شریک کیا...... ایسا راز جس سے اس ضدی گردن اور اٹھے ہوئے سر والی خودسر لڑکی کو خوب اچھی طرح ڈرایا جا سکتا تھا۔ وہ اسے ساکن اور خوف سے دم بخود چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی جیسے پکڑے جانے کے خوف سے بھاگی ہو۔
لیکن اس کے پیچھے زوردار آواز سے بند ہوتے دروازے نے سارے راز کھول دیے۔ یقیناً وہ عورت کسی خاص مقصد کے بغیر تمام دفاعی انتظامات کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں ٹھہری بھی نہیں ہوگی۔
یہ کہانی اتنے اہتمام سے اسے کیوں سنائی گئی تھی۔ اسے سمجھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ یہ کہانی ہر اس انسان کو سنائی جاتی ہے جس کے لیے اس کا جاننا بہت ضروری ہے۔
وہ لڑکی جو کچھ سال پہلے فاروق کے بڑے بھائی کے ساتھ کسی ٹھنڈے ملک سے یہاں آئی تھی اور جس نے صاحب کے کسی دوست سے دوستی لگالی تھی اس نے فاروق کے بڑے بھائی سے الگ ہونے کا مطالبہ کیا تھا پھر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ مالک کے وفادار کتوں نے ایک گھنٹے میں اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ یہ وہ کہانی جو اس عورت کی زبانی اس نے سنی تھی۔
سبرینہ کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔
''کہاں ہے وہ لڑکی اب؟'' اس کے منہ سے نکلنے والے فقرے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔
''لو بی بی...... مالکوں سے بے وفائی کرنے والے زندہ تھوڑی بچتے ہیں۔'' عورت کو اس کی حماقت پر افسوس تھا۔
''مرگئی کم بخت...... اسے سانپ نے کاٹا تھا۔ یہ ساتھ والے کمرے میں تو رہتی تھی۔ اگلے دن جب دروازہ کھولا تو کمرے سے اس کی لاش نکلی...... نیلا بدن...... منہ سے بہتا جھاگ......''
بے شک، جس زہریلے سانپ نے اس لڑکی کو ڈسا تھا اسی کی نسل کے دوسرے سانپ، آج اس نئی لڑکی کے گرد سرسراتے پھر رہے تھے۔ کالے، سیاہ، لیکتی

زبانوں والے۔

"پھر......؟"

"پھر کیا بی بی...... اسے راتوں رات حویلی کے پیچھے جو کنواں نہیں ہے اس کے اُدھر فالسے کے باغ سے پرے مٹی میں دبا دیا۔ اس کا جنازہ جائز جو نہیں تھا۔" اس کے کان سائیں، سائیں کر رہے تھے۔

"اس کا جنازہ کیوں جائز نہیں تھا؟"

"ایک تو وہ مسلمان نہیں تھی اور پھر اس نے کسی کے ساتھ منہ جو کالا کیا تھا۔" عورت پھر بولی تھی۔

"پر تھی بڑی کرموں والی، بڑے میٹھے فالسے لگتے ہیں اس زمین پر...... آج جو دوپہر کو فالسے نہیں لائی تھی...... میں وہ اسی زمین کے تو ہیں۔" عورت نے اپنا بیان ختم کر کے ایک نظر سائڈ ٹیبل پر رکھی خوب صورت ٹوکری پر ماری۔

"ہائے بی بی، تم نے چکھے بھی نہیں...... بہت میٹھے ہیں کھا کر دیکھو تو......" وہ لپک کر ٹوکری اٹھا لائی تھی۔

سبرینہ دہشت کی زیادتی سے سن بیٹھی تھی۔

انسانوں کے سر قلم کر کے کھوپڑیوں کے مینار بنانا کتنی بڑی عظمت کی نشانی ہے...... اور جنگلوں کے یہ خونخوار جانور، کب سے انسانی بستیوں میں خون اور گوشت کی ایسی کہانیاں لکھ رہے ہیں...... کون اسے بتاتا؟ وہ بزدل نہیں تھی۔ لیکن زندگی کی ایسی کھلی زیادتی اسے پسند نہیں آئی...... اسے اتنی بے رحمی سے، ایسے بھیانک حادثوں کے منہ پر دے مارا گیا تھا کہ اس کی سوچ ماؤف ہو گئی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا...... اس نے یہاں آنے کے فیصلے کے سوا زندگی میں ایسا کون سا گناہ کیا تھا۔

اس نے بند کھڑکی کے شیشے کھول کر وقفوں، وقفوں سے چلتی ہوا کو سانس میں بھرنا چاہا...... خاموش رات، دور اندھیرے میں ٹمٹماتے ستاروں کی طرح چپ چاپ تھی۔

"کیسی ہوگی وہ لڑکی......؟" اس نے سوچا۔

"کیا اس جیسی......؟"

اس لڑکی کی موت سے جو کہانی ادھوری رہ گئی تھی، اس دوسری لڑکی کی یہاں موجودگی اسی کہانی کی تکمیل کی کوشش ہے...... اسے لگا کسی کے سسکنے کی آواز سنائی دی ہو...... اور یہ جان کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی کہ یہ آواز اس کے اپنے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔

"آج اگر اسے بھی کوئی سانپ ڈس لے تو کیا...... وہ بھی کسی مرے ہوئے، لاوارث کتے کی طرح، گمنام مٹی کے ڈھیر تلے، پھول اور پھل سینچنے کے لیے دبا دی جائے گی۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔" آج اس کی سرکش طبیعت کو کافی افاقہ ہوا تھا۔ وہ سبق جو آزاد دنیا کے کسی بھی فرد کو کسی بھی اور طرح سکھانے ممکن نہ ہوں وہ اس نے ایسی اسرار سے بھری رات میں خود بخود دیکھ لیے تھے۔

اس کی کھڑکی کے نیچے چرمراتے پتوں کی...... کھڑکھڑاہٹ ہوئی تھی...... جیسے کوئی چلا تھا پھر جیسے کوئی رک گیا تھا...... یہ اس کے لیے تنبیہ تھی...... رات کے اس پہر، کھڑکی کھولے رکھنے پر وارننگ کہ اس کے کمرے کی ہر حرکت پر نظر رکھی جا رہی ہے...... وہ بے مزہ ہو گئی...... وہ بھاگ کر جا کہاں سکتی ہے۔

وہ بستر پر گر کر چھت تکنے لگی...... کتنے خوب صورت عزائم لے کر آنے والوں کے لیے وہ عبرت کا نشان بنتے جا رہی ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لیے اسے کسی کیلکولیٹر، کسی جمع تفریق کے آلے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

اپنا بچہ کھونے کے بعد کئی دن تک، وہ خواب میں ایک ہیولہ دیکھتی رہی۔ جس نے اسے آواز دی تھی...... جس نے اسے پکارا تھا۔ جس نے اسے خون کے تالاب میں گرے دیکھ کر کسی کو مدد کے لیے آواز دی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے اپنے کمرے میں کھانا دینے والی 'اچھی' سے پوچھا تھا۔

مگر 'اچھی'، بے وقوف کو حویلی کے راز کھولنے کی اجازت نہیں تھی...... ویسے وہ ہمدرد تھی۔ خوفزدہ آنکھوں میں کبھی، کبھی چپکے سے جھلملاتی مسکراہٹ میں، اس کا

وہ بچپن صاف دکھائی دیتا تھا جو سبرینہ جانتی تھی۔ اس محل کی موٹی دیواروں میں کسی بھی وقت چوری ہو جائے گا۔ وہ جان گئی تھی۔ تاریخی طور پر یہ رہائش گاہ اس خاندان کے وہ شوق پورے کرنے کے لیے مخصوص تھی جو اپنی خاندانی بیویوں کی رہائش گاہ سے الگ پورے کرنے ضروری ہیں۔

اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی...... کسی کو اس سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن وہ سفید چادر والا ہیولا اس کے دماغ میں اٹک کر رہ گیا تھا...... وہ خاموش وجود جسے اس نے اکثر اپنی کھڑکی سے پرے دور کیاریوں سے فالتو جڑی بوٹیاں اکھاڑتے دیکھا تھا۔ وہ کون تھی آخر......

اسے لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ ایسی زندگی نہیں گزار سکتی...... مگر تکلیف کی مسلسل کیفیت میں، بہت سے لمبے دن اور راتیں کاٹ چکنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ شاید ساری زندگی ایسے ہی گزارنی پڑے۔

اس نے انگلیوں پر حساب لگایا...... اسے اس جہنم واصل ہوئے اس مہینے پورے دو سال ہو گئے تھے۔ دو سال سے وہ قید تنہائی کے لغوی معنی پر تحقیق کر رہی تھی...... قیدی نمبر فلاں، کوٹھڑی نمبر ڈھمکاں......

اس دن دوپہر کو کھانا دینے "اچھی" یا وہ دوسری عورت نہیں آئی تھی۔ ماتھے پر آنکھوں تک چادر کھینچے، وہ کوئی اور تھی...... کھانے کی ٹرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر اٹکا کر جانے والی کی پشت کو سبرینہ نے غور سے دیکھا اور اچھل پڑی۔

"رکو......!"

"تم وہی ہو ناں......؟"

ہلکے رنگ کی لمبی چادر میں لپٹی پشت، کمرے سے نکلتے نکلتے ٹھٹک گئی تھی۔

سبرینہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ صاف اردو میں ادا ہوئے تھے۔ جس پر مقامی بولی کا زبردست اثر تھا...... یقیناً "اچھی" ایک اچھی ٹیوٹر ثابت ہوئی تھی۔

اس کے ہاتھ دروازے کی ناب پر تھم گئے تھے۔

"تم یہاں آئی تھیں ناں...... جب میں نے اپنا بچہ کھویا...... تم وہی ہو ناں......؟" ساکت ہو کر تھمی پشت میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ وہ جو بھی تھی سبرینہ کی آواز میں شامل حیرت اور خوشی کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ اور پیچھے مڑ کر دیکھنے سے پتھر کی بھی ہو سکتی تھی۔

وہ کون تھی...... یہ بتانے سے کیا حاصل...... ہاں مگر وہ اپنے جیسی ایک اور عورت کو اپنے جیسے انجام سے دوچار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اگر کوئی اس سے پوچھتا تو وہ ضرور... کہتی کہ وہ اس پر بالکل خوش نہیں ہے مگر وہ جانتی تھی اس سے ایسے سوال کوئی نہیں کرے گا۔

شاید ابھی وہ کچھ اور پیچھے مڑ کر دیکھنے یا نہ دیکھنے کی الجھن سے نہ نکل پاتی اگر اس کے دروازے کی ناب پر رکھے ہاتھ کو ایک ملائم ہاتھ نے آہستگی سے چھو نہ لیا ہوتا۔

سبرینہ گیبریئل فاروق خان اس کے بالکل قریب کھڑی اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

سبرینہ نے دیکھا اس کی جھکی ہوئی سنہری پلکوں کے گرد باریک جھریوں کا جال تھا...... جب اس نے سبرینہ کی طرف نظر اٹھائی تو اسے لگا صدیوں کے ٹھہراؤ والے بے تاثر چہرے پر ہزاروں سالوں کی تھکن لکھی ہوئی ہے اور کبھی یقیناً خوب صورت رہ چکنے والی مٹے مٹے نقوش کے بیچ رکھی دو نیلی آنکھیں بولتی ہیں۔

"کیسا شکریہ......؟" اس نے سبرینہ کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ آہستگی سے کھسکا لیا اور مسکرا کر بولی تو اس کی آواز میں کسی تھکن کا شائبہ نہیں تھا۔

"مجھے تمہارے نقصان کا افسوس ہے۔ کاش میں اس دن تمہارے لیے کچھ زیادہ کر سکتی۔" 'بے عیب' برطانوی انگلش میں ادا ہونے والے الفاظ سمجھنے میں اسے جتنی دقت نہیں ہوئی اتنی ان کے مطالب پر یقین کرنے میں دشواری پیش آئی تھی۔ کتنی دیر تک حیرت کی زیادتی سے اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل سکا۔

"کون ہو تم......؟" وہ بولی تو اس کی آواز کسی کنویں سے آ رہی تھی۔ عورت نے دیکھا، سبرینہ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، مجھے خوشی ہے کہ تم ٹھیک ہو۔"

اس کی شکل پر کوئی پریشانی، کوئی حیرت نہیں تھی جیسے وہ دونوں ہمیشہ سے اسی طرح دروازے پر ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے کی عادی رہی ہوں۔

سبرینہ کو لگا، اس کا دل کسی گہری کھائی میں گرتا جا رہا ہے۔ ان شکست کھائی، تھکی ہوئی، نیلی آنکھوں میں اس نے اپنا انجام بھی صاف پڑھ لیا تھا۔ اب اسے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔

کیوں...... کیوں...... کیوں آخر......؟ یہ نویں صدی قبل مسیح نہیں ہے۔ یہ کوئی فراموش کردہ تاریخ نہیں ہے۔ وہ کسی پرانی گپھا کے اندھیروں میں مٹی اور دھول میں دفن، گمشدہ نسخے اور کتابیں نہیں ہیں۔ جنہیں سورج کی روشنی دیکھنا نصیب نہیں ہوتی۔ وہ جیتے جاگتے، سانس لیتے، چلتے پھرتے انسانی وجود ہیں...... جنہیں زندہ زمین میں گاڑا گیا ہے...... آج کی دنیا میں ایسے کیونکر ممکن ہو سکتا ہے......؟ کیا واقعی ان عورتوں کا گناہ اتنا بڑا ہے کہ انہوں نے اپنے خدا کی بنائی دنیا میں سانس لیتے اربوں انسانوں میں سے کسی ایک کو اپنے لیے خود چننے کا بنیادی انسانی حق استعمال کیا۔ مگر ان کا خدا ساری دنیا کا خدا اتنا ناانصاف، اتنا ناراض، اتنا سنگ دل کیسے ہو سکتا ہے؟

کیوں......؟ کیوں......؟ آخر کیوں......؟

☆☆☆

"یہ میں ہوں...... میگنا کارٹا...... میگی......"

اس کی کہانی سننے کے لیے سبرینہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا...... وہ جیسے خود بھی اپنے بارے میں، اپنے ہی جیسے ایک دوسرے کردار سے کچھ بانٹنا چاہتی تھی۔

"حیران مت ہو...... یہاں میرے بہت سے نام ہیں...... کچھ لوگوں کے لیے میں انگریز ہوں، کچھ کے لیے میم صاحب، کچھ کے لیے سفید چمڑی والی اور کچھ

کے لیے کافر...... حالانکہ اس محل کی دہلیز پار کر کے اندر آنے سے پہلے یہاں سے بہت دور اپنی دنیا کی ایک مسجد کے امام کے سامنے اپنا مذہب تبدیل کیا تھا میں نے...... میرے باپ، میری ماں اور میرے چرچ کے فادر نے مجھے عقیدے کی جو تعریف سکھائی تھی اس کی روشنی میں، میں اتنا ہی اندازہ لگا سکی کہ پالنے والے اور بنانے والے کے جو بھی نام ہوں وہ ایک ہی تصویر کے مختلف روپ ہوتے ہیں۔ میرے باپ نے میرا نام کیا سوچ کر۔ رکھا تھا معلوم نہیں...... مگر میں اپنے اس نام کے ہاتھوں اسکول میں ہمیشہ مذاق کا نشانہ بنی......"

میگی بول رہی تھی۔ رات گزر رہی تھی۔ وقت ٹھہرا ہوا تھا۔ رکے ہوئے پانی کے جوہڑ کی طرح...... جس سے حبس آلود گرم ہوا کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

اسکول میں مذاق سے بچنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو میگی کہلوانا شروع کر دیا تھا۔ اپنے باپ کو اس نے مشرقی لندن کی ایک نچلے درجے کی آبادی میں اپنے مختصر سے گروسری اسٹور اور کافی شاپ میں... بہ مشکل اپنا آپ سنبھالے ہوئے ہی پایا۔ اس کا باپ ولیم ہیملٹن صبح سے شام تک وہیل چیئر پر بیٹھا اسے اور اس کی ماں کو اپنے ایک عجیب و غریب عشق کی داستان سناتا نہیں تھکتا تھا۔

ولیم ہیملٹن مشرقی لندن کے ایک پسماندہ علاقے میں ایک یتیم خانے میں پلا بڑھا تھا۔ صرف سترہ سال کی عمر میں وہ شاعر، ادیب یا مصور ہو سکتا تھا۔ اس میں کسی آرٹسٹ کی روح تھی...... مگر جس دور میں اس نے ہوش سنبھالا...... برطانیہ کے نچلے طبقے کے نوجوانوں کو بحری جہازوں میں مزدور یا سیلر بھرتی ہونے کے سوا کوئی روزگار دستیاب نہیں تھا۔

یہ انیس سو سترہ کا زمانہ تھا۔ دنیا کی عظیم طاقتیں بیسویں صدی کی اولین جنگِ عظیم میں الجھی، ایک دوسرے کے دانت کھٹے کر رہی تھیں۔ دشمن کو خندقیں کھود کر، سست رو زمینی جنگ میں الجھایا جا چکا تھا۔ [illegible] اپنی بحری طاقت مضبوط کرنے کے لیے اسلحے کے ذخائر جمع کرنے میں مصروف تھا اور توپوں کے دہانوں پر باندھنے کے لیے انسانی جسم درکار تھے۔ جنگ کا چارہ بننے والے بیکار انسانی جسم جنہیں بحری بیڑوں میں دھڑا دھڑ سیلر بھرتی کیا جا رہا تھا۔

وہ پہلے بندرگاہ پر سامان ڈھونے والا مزدور بنا۔ پھر شاہی بحریہ میں سیلر......اور پھر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ سخت زندگی سے گھبرانے والا نہیں تھا...... لیکن سمندر اور زمینی فوج دونوں زندگیاں اس کے مزاج کے مطابق نہیں تھیں۔ اس کا دل کھل اٹھا، جب اسے پہلی مرتبہ ہندوستان بھیجا گیا۔ یہ فوج کی ملازمت شروع ہونے کے اولین دو سالوں کا قصہ تھا۔ اسے معلوم تھا، ہندوستان کی تعیناتی اس جیسے کم تجربہ کار رنگروٹوں کے لیے سنہری مستقبل کے لیے پروانہ ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے سیلر بھرتی ہونے سے پہلے اپنے مختصر سے پسماندہ علاقے کے سوا کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے سمندری فوج کی ملازمت کے ابتدائی مشکل دنوں کے سوا کبھی کہیں سفر بھی نہیں کیا تھا۔

ہندوستان کتنی دور تھا...... وہ وہاں سے واپس لوٹے گا یا نہیں...... اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دلچسپی تھی تو ایک بات میں کہ وہ ہندوستان جا رہا تھا۔ جس کے بارے میں اس نے بہت کچھ سنا اور پڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی کسی چیز نے کسی کتاب یا اخبار میں چھپی خبر اور تصویر نے اسے اس ہندوستان کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔ جس کی زمین پر اس نے کئی ہفتوں کے بعد پانی کے جہاز سے اتر کر پہلا قدم رکھا...... وہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ فوج کی ملازمت اس کے لیے داستانِ الف لیلیٰ ثابت ہو سکتی ہے...... اس پر جادو ہو گیا۔

بعد کے سالوں میں زندگی اس پر مہربان رہی...... وہ ترقی کرتے، کرتے سنہری ہندوستان میں تعینات برٹش فوج کا درمیانے درجے کا افسر بن چکا تھا۔ فوج کی ملازمت کے دوران اس نے دلی، پشاور، مردان، پنڈی اور لاہور کی فوجی چھاؤنیوں میں اپنے ایسے خوابوں کو حقیقت بنتے دیکھا...... جنہیں کھلی

آنکھوں سے دیکھنے کی جرأت وہ کبھی نہ کر پاتا۔
اس نے اپنی عمر کا سب سے خوب صورت وقت ہندوستان میں گزارا...... جہاں سانولی سلونی، ہندوستانی اپسرائیں حسین ساڑیوں اور خوش رنگ غراروں میں ملبوس، برٹش کلبز میں اپنے قریبی رشتوں کے ساتھ بہار کے رنگ بن کر اترتی تھیں۔ جہاں برطانوی راج نے دور تک پھیلی سرسبز زمینی اراضیوں کا کنٹرول، سانولے سلونے چہروں والے کچھ پڑھے لکھے، کچھ ان پڑھ مگر محفل کے آداب سے واقف زمینداروں کے ہاتھ میں دے کر اپنی حکومت کی طنابیں مضبوطی سے کھینچ رکھی تھیں۔ جاگیردار کہلانے والے ان زمینداروں کو وفاداری کے انعام میں ملنے والی زمین کا رقبہ اس قدر زیادہ تھا کہ صبح سے شام تک گھوڑا دوڑاتے رہنے پر بھی ختم نہ ہوتا تھا۔
ولیم ایک ایسے عشق میں مبتلا تھا جو اس کی بعد کی تمام زندگی کے ہر حسین خواب پر حاوی ہو گیا۔ وہ دل پھینک تھا۔ حاضر دماغ تھا اور ہندوستان کے عشق میں اس حد تک غرق تھا کہ اگر اپنے ایک آفیسر کی بہن اور بیٹی کو اپنی حفاظت میں لے کر پنڈی سے پشاور تک سفر نہ کرنا پڑتا۔ افسر کی بیٹی، اس پر اپنا دل ہار نہ بیٹھتی اور اپنے باپ سے جو رینک میں اس کا سینئر تھا، انعام میں اس کا جونیئر نہ مانگ لیتی...... تو وہ ایک انڈین سول سروینٹ کی بہن کو مسز ہیملٹن بس بنا ہی چکا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر شادی اس کے لیے ایک آسان تجربہ ثابت ہوئی۔ جیسے سفر کے دوران اچانک اس کا گھر آ گیا۔ اس کی کم عمر اور متحمل مزاج بیوی کیتھرین نے بعد کے چند سالوں میں اس کی زندگی میں کوئی خلا پیدا نہیں ہونے دیا۔
اب ان کی ایک بیٹی بھی تھی میگی...... میگنا کارٹا...... یہ نام اس نے تاریخ کی ان ہی کتابوں سے لیا تھا جنہیں پڑھنا اب اسے زیادہ دلچسپ معلوم نہیں ہوتا تھا۔
اب وہ ایک نئی تاریخ لکھنا چاہتا تھا۔ ہندوستان میں اپنے قیام کی تاریخ...... انسانوں اور اسرار سے بھرے سنہری، سرسبز ہندوستان کی تاریخ...... جہاں اس نے بہت سی کہانیاں سنیں۔ بہت سے دوست بنائے۔ بہت سی محبتیں پائیں اس زمین سے جس پر وہ انگریز راج کا معمولی افسر تھا شاید اس کا عشق ابھی مزید سر چڑھ کر بولتا۔ اگر بدقسمتی نے اچانک اس کے گھر کا راستہ نہ دیکھ لیا ہوتا۔
اس رات لاہور کے برٹ ہال کے قریب گھوڑے کا پاؤں کسی چیز پر رپٹنے سے تانگا الٹ گیا تھا۔ وہ کوچوان کی پچھلی نشست پر بیٹھا پکے ہوئے پھل کی طرح زمین پر آ گرا تھا۔ تانگے کا بڈھ اس کے اوپر گرا اور اس کی ٹانگ دو جگہ سے کچلی گئی تھی۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا لیکن ٹوٹی ہوئی ہڈی کی نوک، اس کی پوری ٹانگ کو زہریلا کر رہی تھی۔ چھ دنوں میں جان کے لالے پڑنے پر ڈاکٹر کو اس کی ٹانگ کاٹنی پڑی۔
لیکن شاید ٹانگ کھونے کی تکلیف کم ہو جاتی۔ اگر اسے اپنی بیوی کی زبردست ضد کے سامنے ہار مان کر ہندوستان کو خیر باد نہ کہنا پڑتا...... انیس سو بیالیس میں، جب اسے اپنی ایک سالہ بیٹی اور بیوی کے ساتھ لاہور سے کراچی اور پھر کراچی سے اپنے اصلی وطن کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی۔ لندن کا مشرقی علاقہ جرمنوں کی بمباری سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔ جنگ کی تباہی سے شکستہ حال شہر میں، ایک معذور کی زندگی گزارنے کا تجربہ شاید اتنا جان لیوا نہیں تھا۔ جتنا اس ماحول اور اس آب و ہوا میں سانس نہ لے سکنے کا خیال اسے بعد کی پوری زندگی تکلیف دیتا رہا۔
فوج سے ریٹائرمنٹ کی زندگی معزول حکمران کی سی زندگی تھی۔ ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم سے اس نے مشرقی لندن میں اپنی بیوی کے مشورے پر ایک مختصر سا گروسری اسٹور اور کافی شاپ خرید لی تھی۔ کچھ پنشن کی رقم سے گزارہ ہوتا تھا اس کی بیوی سارا دن اسٹور کی دیکھ بھال کرتی اور اس کی بیٹی اس کے پاس بیٹھ کر

کہانیوں کی تصویریں بنایا کرتی تھی۔

برطانیہ نے انیس سو سنتالیس میں اپنی ہندوستانی نوآبادی کو دو ملکوں میں تقسیم کر دیا مگر ولیم ہیملٹن اپنی موت تک دلی اور لاہور کو ایک ہی ملک کا حصہ سمجھتا رہا۔

میگی کو پتا بھی نہیں چلا کہ اپنے باپ سے سنی ہندوستان کی ادھوری کہانیاں، اس کے بچپن کی... یادداشتوں کا کیسے حصہ بن گئیں۔ اس کا بچپن جو اپنے خواب دیکھنے والے باپ کی آنکھوں میں دور کہیں پریوں کی ایک کہانی بنتے گزرا تھا۔ جس میں شہزادی سنہری شہزادے کے ساتھ برق رفتار گھوڑے پر سوار کسی انجانی منزل کی طرف رواں تھی اور شہزادہ دنیا کی ہر مشکل سے اسے بچاتا، گھوڑے پر بٹھائے سرپٹ دوڑا چلا جا رہا تھا۔

اسے کبھی لگا ہی نہیں کہ وہ جس سنہری دیس کے قصے اپنے باپ سے سنتی آئی ہے۔ اسے اس نے حقیقت میں کبھی نہیں دیکھا۔ اس نے اپنے باپ کو فخر سے کہتے سنا تھا کہ میگی ایک برٹش ہندوستانی ہے۔ وہ لاہور کے فوجی اسپتال میں پیدا ہوئی تھی اور اگر اس کی ماں راضی ہوتی تو وہ اپنی میگی کی ہندوستان میں ہی پرورش کرنا پسند کرتا۔

اس کی اٹھارھویں سالگرہ سے کچھ دن پہلے اس کا باپ ایک دن چپ چاپ اپنی وہیل چیئر میں ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

باپ کی موت کے بعد میگی کو پتا چلا کہ اس کی ماں کس قدر دکھی تھی، اپنی زندگی سے...... اس کی سختیوں سے اور ہندوستان کے عشق میں غرق اس کے ناکارہ باپ کو دنیا سے رخصت ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ اس کی ماں نے اپنے اسٹور اور کافی شاپ کی آمدنی مسلسل کم ہونے کے بعد اپنے ہی علاقے کے ایک زندہ دل رنڈوے بزرگ سے شادی کر لی تھی۔

اسے ماں کے شادی کرنے پر اعتراض نہیں تھا بلکہ دولھے کے بیاہ کر گھر آ جانے پر اعتراض تھا۔

اس نے خاموشی سے اپنا ٹھکانا الگ کر لیا۔ اس کی ڈرائنگ اچھی تھی۔ اسے کہانیوں کے کرداروں کی تصویریں بنانا اور ان میں رنگ بھرنا پسند تھا۔ اسے لندن کے ایک قدرے سستے آرٹ اسکول میں داخلہ مل گیا۔ اسکول کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے بچوں کی کتابیں چھاپنے والے ایک پبلیشر کے دفتر میں کہانیوں کی رنگین تصویریں بنانے کا کام ڈھونڈ لیا...... آمدنی تو زیادہ نہیں تھی مگر اس کے پینٹ، برش، مجسمہ سازی کے اوزار اور چھوٹے موٹے اخراجات کا بندوبست ہو جاتا تھا۔

ان دنوں وہ خوش تھی۔

آرٹ کلاس کے لیے بنائی اس کی ایک پینٹنگ اس کے ٹیچر کو اس قدر پسند آئی کہ اس نے اسے ایک تصویری مقابلے میں رکھنے کے لیے لندن کی ایک درمیانے درجے کے آرٹ گیلری میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مقابلے کی تین بہترین پینٹنگز بنانے والوں کو ایک عدد مہنگا اسکالرشپ مل سکتا تھا۔

اپنی ماں کی شادی کے بعد اس کا ہاتھ ہمیشہ تنگ ہی رہا تھا۔ تصویری مقابلے کے لیے اس کی پینٹنگ نے آرٹ کے کسی نقاد کو تو متاثر نہیں کیا لیکن ایک گندمی رنگت والے جنوبی ایشیائی کو وہ پینٹنگ ایسی پسند آئی کہ اس نے مقابلے کے نتیجے کا اعلان ہونے سے پہلے ہی وہ تصویر خریدنے کی پیش کش کر ڈالی۔

اس کی رنگت، اس کی شکل، اس کا حلیہ...... اگرچہ اس نے اپنے باپ کی سنائی ہوئی ہزاروں کہانیوں میں بار بار دیکھا تھا اور ایسے کسی حقیقی کردار سے میگی زندگی میں کبھی ملنے کی آرزومند بھی تھی۔ مگر اپنی محبت کی ایسی سفاک بولی لگتے دیکھ کر اس کا دل مٹھی میں آ گیا۔ تصویری نتائج کا اعلان ہونے اور کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں برائے فروخت ہی تھی مگر میگی کو خریدار کا اس قدر سودا گرانہ انداز بالکل پسند نہیں آیا۔

"یہ پینٹنگ برائے فروخت نہیں ہے۔" حتی الامکان تہذیب سے پھینکا ہوا ننھا سا کنکر، ہندوستانی لارڈشپ کی انا کو بری طرح زخمی کر گیا۔

وہ جس طبقے کا فرد تھا جہاں سے آیا تھا وہاں آرٹ اور آرٹسٹ نامی، کم حیثیت مخلوق کی ذخیرہ اندوزی کر کے اپنے ڈرائنگ روم سجانا ایک بیکار سا مشغلہ تھا۔ اس نے پینٹنگ سے نظر ہٹائی اور برابر میں کھڑی انگریز لڑکی کے انتہائی لاتعلق سے لہجے پر غور کیا جو اس کی دلچسپی کے ماخذ سے بے پروا آرٹ گیلری کی جملہ چہل پہل کو زیادہ توجہ سے دیکھتی معلوم ہو رہی تھی۔ بناوٹ کی کسی بیرونی آلائش سے پاک اور تراش خراش سے عاری بالکل خام برطانوی حسن۔

اس نے ایک نظر میں سر سے پاؤں تک لڑکی کا جائزہ لینے کے بعد دوبارہ پینٹنگ کی طرف توجہ کی۔ اب وہ اسے کسی اور نظر سے دیکھ رہا تھا۔

پینٹنگ کا منظر جانا پہچانا تھا۔ وہ ایسے کئی مناظر کا حقیقی طور پر حصہ بھی رہ چکا تھا۔

سیاہ بادلوں کے پیچھے سے برستی بارش کے درمیان سورج مسکرا رہا تھا۔ سنہری کرنیں، برستی بارش کے درمیان قدیم عمارتوں والے ایک تنگ بازار پر بے دریغ نچھاور ہو رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ جڑی تنگ عمارتیں، پرانی طرز کی کھڑکیاں، سودے کے لیے رسی سے باندھ کر لٹکائی ہوئی ٹوکری اور اس کے اوپری سرے پر جھکی لڑکی...... جو زرد لباس میں گہری سبز چنری کے ساتھ خوشی کی انتہا کو چھوتی منڈیر سے نیچے جھانک رہی تھی۔ نیچے بازار میں خوانچہ فروشوں اور بارش کے پکوان تلنے والوں کا خوش رنگ میلا سجا تھا۔ ڈھول والے، گھوڑے والے، پیدل چلنے والے...... اور تلے ہوئے سنہری پکوان سے اپنا حصہ وصول کرنے کے خواہش مند بچے اور عورتیں کسی نامعلوم جشن کی نوید پر مسکرائے جا رہے تھے۔

منظر اتنا حقیقی اور جاندار تھا کہ ایک لمحے کو اسے لگا وہ پنجاب سے ہو کر واپس آ گیا ہے۔ وہ قسم کھا سکتا تھا کہ اس نے تلے ہوئے پکوان کی خوشبو اپنے نتھنوں میں محسوس کی تھی اور فقیر کے ڈھول کی تھاپ کو پوری جزئیات کے ساتھ سنا تھا۔

وہ دلوں کے بھید جاننے کا دعویدار نہیں تھا۔ ہندوستان کے تقسیم ہو جانے والے پنجاب کا ایک روایتی جاگیردار امیر زادہ تھا۔ جسے ایک لمحے کے لیے لگا تھا، وہ جانتا ہے کہ تصویر بناتے ہوئے آرٹسٹ کے ذہن میں کیا رہا ہوگا۔

اس نے توجہ ایک بار پھر پینٹنگ سے ہٹا کر اسے بنانے والی کی طرف مبذول کی۔ جس کے لاتعلق چہرے پر ایک عجیب سی سرد مہری، ایک عجیب سا چیلنج تھا۔ دوسری نظر اس پر ڈال کر اسے لگا جیسے اس کے سامنے بچی تصویر کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔

اب کہ جب وہ بولا تو میگی کی آنکھوں میں چھائی عدم دلچسپی کی دھند ایک لمحے میں غائب ہو گئی۔

"تو آپ کتنی بار انڈیا جا چکی ہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ایک بار بھی نہیں۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ "لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ میں انڈیا میں پیدا ہوئی تھی۔" جنوبی ایشیائی مرد کے ابرو دلچسپی سے چڑھے۔

"اور کیا آپ کبھی وہاں دوبارہ جانا چاہیں گی؟"

"ضرور...... کبھی نہ کبھی...... مجھے یقین ہے، میں وہاں جاؤں گی۔ اور سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی۔"

"میں اس کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کو یہ عزت مجھے دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہو۔"

میگی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا...... اس کی شکل، اس کا حلیہ، اس کے باپ کی سنائی ہوئی کہانیوں کے انہی کرداروں جیسا تھا جن سے مل کر میگی کا آرٹ پچھلے کئی سالوں سے پنسل سے کھینچی لکیروں اور پینٹ برش کا کھیل بن کر کینوس پر بکھرتا رہا تھا۔

اسے اپنے اچانک عود پڑنے والے غیر ارادی جوش پر حیرت بھی ہوئی مگر بعد میں......

ورنہ اب تک تو میگی کو یہی لگ رہا تھا وہ اسے اپنی تصویر فروخت کرنے پر راضی کرنے کے لیے ایسی زبردست آرٹ شناسی کا دعویدار ہے اور شاید اگر وہ اس خیال میں رہتی تو اس کے حق میں زیادہ بہتر ثابت ہوتا۔

(باقی آئندہ)

زندگی دھوپ تم گھنا سایہ

شبانہ شوکت



احسن تھکا ہارا ہوا آفس سے گھر آیا تو سامنے لاؤنج میں ہی ہانیہ مل گئی۔

"یہ ٹائم ہے آنے کا...... میں نے کیا کہا تھا؟"

"بہت دیر ہو گئی، کیا کروں، میں نے تو بڑی کوشش کی......"

"کوئی کوشش نہیں کی، سارے بہانے مجھے دیکھ کر بنائے جا رہے ہیں۔" اس نے غصے سے نتھنے پھلائے۔

"اوہ...... میری ہنی ناراض ہو گئی، آئی ایم سو سوری ہنی۔" وہ اسے منانے کے لیے آگے بڑھا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"کوئی سوری نہیں چلے گا، مجھے ابھی گفٹ سینٹر لے کر چلو۔"

''پہلے ذرا میں فریش نہ ہو جاؤں؟'' اس نے ملتجی نظروں سے دیکھا۔

''اوکے، صرف دس منٹ میں واپس آؤ، میں یہیں بیٹھی ہوں۔'' تحکمانہ لہجے میں اجازت دے کر وہ وہیں ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور وہ بہ مشکل سات منٹ میں ہی آ گیا تھا۔ اس نے ہنکارا بھرا۔

''ہونہہ، اب چلیں، فاریہ کی تو برتھ ڈے سلیبریٹ بھی ہو گئی ہو گی۔''

''ایسے کیسے وہ ہنی کے بغیر سلیبریشن کر لے گی۔ چلو فٹافٹ ہم وہاں پہنچتے ہیں۔'' وہ تیزی سے پورچ کی طرف بڑھا۔ وہ بھی مسکراتے ہوئے پیچھے آئی تھی۔ گفٹ سینٹر میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اگلے پندرہ منٹ میں وہ فاریہ کے ہاں موجود تھی۔ احسن واپس چلا گیا تھا۔ خوب انجوائے کرنے کے بعد اس نے احسن کو فون کیا تو وہ اسے لینے کے لیے آ گیا تھا۔ سارا راستہ وہ اسے برتھ ڈے کی روداد سناتی آئی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سنتا رہا تھا۔

وہ دس سال کی تھی جب یتیم ہو گئی تھی اور پھپھو سمیت ہمیشہ کے لیے ان کے پاس آ گئی تھی۔ ہر وقت روتی رہتی یا گم صم بیٹھی رہتی۔ احسن زبردستی اسے بلاتا، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا، باہر لے جاتا۔ کبھی پارک، کبھی کسی رشتے دار کے ہاں، گھر میں بھی کئی انڈور گیمز میں اسے اپنے ساتھ شامل کیے رکھتا۔ غرض اسے یوں مصروف رکھتا کہ وہ رفتہ رفتہ بہلنے لگی۔ بتدریج وہ اس پر اتنا ڈیپنڈ کرنے لگی کہ اس کے بغیر کھانا تک نہیں کھاتی تھی۔ احسن سے بڑے دو بھائی اور تھے۔ حسن بھائی سب سے بڑے تھے، جن کی تین سال قبل ان کی خالہ زاد ماہم سے شادی ہوئی تھی، ان کے بعد محسن بھائی تھے جو حسن کی شادی سے کچھ ہی عرصہ قبل مزید تعلیم کے لیے امریکا چلے گئے تھے۔

''اب ویسے محسن بھائی کو آ جانا چاہیے تاکہ ان کی بھی شادی ہو اور گھر میں کچھ دھوم دھام بھی ہو جائے۔'' ہانیہ نے احسن کی طرف تائید طلب انداز میں دیکھا۔

''ہائیں، بس دھوم دھام کے لیے؟'' وہ حیران رہ گیا تھا۔

''نہیں، اب ان کی شادی بھی تو ہونی چاہیے ناں!''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''اب ظاہر ہے ان کی شادی ہو گی تو ہی ہماری باری آئے گی ناں......''

''خیر اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔'' اس نے منہ بنایا۔

''اچھا، اچھا...... یعنی، ان کی ہو نہ ہو، ہماری ہو سکتی ہے۔'' وہ مکمل شرارت کے موڈ میں تھا۔

''منہ دھو رکھو، ایسی بھی کوئی جلدی نہیں، میرا گریجویشن تو ہو جائے۔''

''یعنی اب کچھ عرصہ ہے آزادی کا ورنہ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ قید کے دن شروع ہونے والے ہیں۔''

''یہ مطلب ہے تمہارا مجھ سے شادی کا؟'' ہانیہ کے تیور بگڑ گئے۔ ''تو مت کرو یہ مہربانی...... میں بھی تم سے شادی کے لیے مری نہیں جا رہی۔''

''ہیں...... واقعی تم مری نہیں جا رہیں، میں نے تو ہنی مون کے لیے مری ہی سلیکٹ کر رکھا تھا۔'' وہ اسے نظروں کی گرفت میں لیتے ہوئے گہرے لہجے میں بولا۔ وہ بغیر اثر لیے اسی طرح گھورتی رہی۔

''تھوڑی سی شرم ہی کر لو...... لڑکیاں تو ہنی مون کے نام پر شرم سے دُہری ہو جاتی ہیں۔'' وہ شریر ہوا۔

''ہونہہ...... لڑکیاں......'' وہ تلملائی۔ ''اندر سے خوش اور باہر سے شرماتی ہوئی۔''

''اور تم......؟ تم کیا فیل کر رہی ہو؟'' وہ دھیمے سے لہجے میں کہتا ہوا اس کے قریب ہوا، وہ خوفناک حد تک سنجیدہ کھڑی تھی۔ اگر وہ اس کی طرف سے کسی قسم کے جذباتی تاثرات کی توقع میں نزدیک ہوا تھا تو مایوسی ہی ہوئی تھی۔ ''پھر کیا خیال ہے ممی سے پوچھ لوں۔''

''کیا، کیا پوچھو گے؟'' وہ چونک پڑی۔

''یہی کہ محسن بھائی سے پہلے ہماری شادی ہو سکتی ہے؟''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، میں ابھی پڑھ رہی ہوں۔'' وہ دہاڑی۔

''بعد میں بھی پڑھتی رہنا، میں منع تھوڑی

کروں گا۔"

"thanks for your generous gesture" وہ مڑ کر باہر جانے لگی، احسن نے بازو سے پکڑ کر روکا۔

"مان جاؤ ناں...... اب تو میرا دل چاہ رہا ہے واقعی ہماری شادی ہوجائے جلد از جلد......" وہ اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"کھڑے کھڑے کیا دورہ پڑ گیا ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہ سب تمہیں قید لگ رہا تھا اور اب اتنی جلدی خیالات بدل بھی گئے۔"

"بس تم ایک دم سے اتنی اچھی لگنے لگی ہو کہ دل چاہ رہا ہے......"

"stop this nonsence talking"

وہ اس کی بدلتی نظروں سے خائف ہو کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

صبح یونیورسٹی آئی تو موسم ٹھیک تھا لیکن اچانک بادل آئے اور تیز بارش شروع ہوگئی۔ ویسے تو وہ پوائنٹ سے چلی جاتی تھی مگر اب تو مشکل تھا، اس نے احسن کو فون کیا۔

"ہاں، میں آتا ہوں ابھی کچھ ہی دیر میں۔" جب وہ آیا تو وہ گیٹ تک آتے آتے بھی شرابور ہوگئی تھی۔

"اُف، پہلے میں نے سوچا تھا کہ رکشا کروالوں گی مگر بارش کا حال دیکھا تو تمہیں فون کیا۔"

"اس حلیے میں رکشے والا ضرور تمہیں تمہاری منزل پر پہنچا دیتا۔" احسن کے شرارت سے کہنے پر اس نے چونک کر خود کو دیکھا۔ پوری طرح گیلے کپڑے اس کے جسم سے چپکے ہوئے تھے، وہ سمٹ سی گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ کی نظر پڑی تو غصے سے کھول گئی۔

"سامنے دیکھ کر گاڑی چلاؤ، ویسے ہی صحیح نظر نہیں آرہا۔"

"مجھے تو سب کچھ بالکل صحیح نظر آرہا ہے۔"

"احسن کے بچے۔" اس کے ذومعنی لہجے پر وہ چیخ اٹھی، اس نے آہ بھری۔

"پتا نہیں کب آئیں گے میرے بچے۔" اس کے ساتھ ہی وہ پھرتی سے پیچھے ہوا اور اس کا گھومتا ہوا ہاتھ اسٹیئرنگ پر جا لگا۔ گاڑی لمحے بھر کو ڈول سی گئی۔ احسن نے پھرتی سے اسے کنٹرول کیا۔ وہ اب خود بھی سیٹ کی پشت سے لگ کر بیٹھ گئی تھی۔

غصہ اپنی جگہ مگر یوں مرنے کا بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ گھر کے گیٹ کے سامنے گاڑی روک کر ہارن دینے سے پہلے اس نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے کندھوں پر ڈالا۔ ہانیہ نے گھور کر دیکھا۔

"پہلے نہیں دے سکتے تھے؟"

"جب ضرورت محسوس ہوئی دے دیا۔" وہ مسکراتا ہوا ہارن بجانے لگا۔

چوکیدار کے گیٹ کھولنے سے پہلے وہ کوٹ اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ چکی تھی۔ کپڑے چینج کر کے وہ بستر میں لیٹنے ہی لگی تھی کہ دروازہ ناک ہوا اور مسکراتا ہوا احسن اپنے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے میں دو بھاپ اڑاتی چائے کے کپ لیے اندر آیا تھا۔

"ممی سے بنوا کر لایا ہوں کہ میری ہنی کو سردی نہ لگ رہی ہو۔"

"تھینکس احسن، مجھے چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی۔"

"صرف چائے کی؟"

وہ اس کے قریب ہوا اور صد شکر کہ وہ ٹرے سائڈ ٹیبل پر رکھ چکا تھا ورنہ اس اچانک حملے کا رزلٹ دونوں کے حق میں ہی اچھا نہ ہوتا۔ وہ ایک دم سے اس کے اوپر جھپٹی تھی۔ وہ پلٹ کر بیڈ پر گرا تھا۔

☆☆☆

شام کو وہ بہت دیر سے سو کر اٹھی تھی۔ مغرب کا وقت بھی گزر چکا تھا۔

"ممانے بھی مجھے نہیں اٹھایا؟" اس نے حیرت سے سوچا۔ فریش ہو کر بال برش کر کے باہر آنے لگی تو سائڈ ٹیبل پر رکھے چائے کے کپ دیکھ کر بے ساختہ

مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ "بدتمیز۔" وہ ٹرے اٹھا کر باہر آئی...... لاؤنج میں بالکل سناٹا تھا۔ وہ کچن میں چلی آئی۔

"رحیماں یہ مما، بھابی اور ماموں سب کہاں ہیں؟"

"وہ اسپتال گئے ہیں احسن صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔"

"کیا......" وہ چیخی تھی۔ "مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔" وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور مما سے بات کی۔ ان کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"دعا کرو بیٹا۔ بہت چوٹیں آئی ہیں اسے۔"

"میں آرہی ہوں مما......"

"نہیں ابھی بارش ہورہی ہے، تم کس کے ساتھ آؤ گی، میں احسن کو بھجوادیتی ہوں۔ بچے بھی تنگ ہورہے ہیں انہیں بھی لیتا جائے گا۔" کچھ ہی دیر میں احسن بھتیجے اور بھتیجی کو لیے گھر آگیا تھا۔ ہانیہ تو اس کا چہرہ دیکھ کر ہی ڈر گئی تھی۔

"اب کیسے ہیں حسن بھائی؟" اندیشوں سے اس کی آواز لرزنے لگی تھی۔

"دعا کرو۔" وہ آہستگی سے بولا۔ ہانیہ کی گھبراہٹ مزید بڑھ گئی۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔

"کیسے ہوا ایکسیڈنٹ، کیا بہت چوٹیں آئی ہیں؟" احسن نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ اتنے میں مشعل رونے لگی تو ہانیہ اسے لے کر باہر آگئی۔ ریان، احسن کے پاس ہی تھا۔ اس نے فیڈر بنا کر مشعل کو دیا اور دوبارہ لاؤنج میں آگئی۔ اسی پل احسن کا سیل فون بجا۔ اس نے اٹینڈ کیا، دوسری طرف کی بات سن کر وہ ایک دم سے جیسے اٹھا تھا۔ وہ بھی گھبرا کر اٹھ گئی۔

"کیا ہوا احسن، کس کا فون تھا؟"

احسن اس کی طرف مڑا تو اس کی آنکھیں خون رنگ ہورہی تھیں۔

"بھائی چلے گئے۔" اس نے گھٹی، گھٹی آواز میں... سرگوشی سی کی تھی۔

"نہیں۔" وہ بہت بری طرح سے چیخی تھی۔ مشعل کو اس نے اپنے ساتھ لپٹالیا تھا۔ احسن نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگالیا۔ وہ خود بھی رو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مما اور ماہم بھابی آگئیں۔ صحیح معنوں میں ایک کہرام مچ گیا تھا۔ اکیلا احسن ان سب کو سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہورہا تھا۔ کافی دیر بعد ماموں ایمبولینس میں حسن کی ڈیڈ باڈی لے کر آئے تھے۔ بے جان حسن بھائی، وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور چیخ، چیخ کر انہیں پکار رہی تھی۔ اسے ان کی موت کا یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ تیز بارش میں ان کی گاڑی دوسری گاڑی سے ٹکرا گئی تھی اور سب ختم ہوگیا تھا۔

☆☆☆

محسن کو سیٹ نہیں مل پائی تھی۔ وہ دس دن کے بعد آیا تھا۔ گھر میں سب لوگ موجود تھے۔ پھر بھی کیسا خوفناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دل دہلتا تھا۔ دسویں کی فاتحہ کے بعد ماہم کے والدین نے پوچھا تھا کہ وہ ماہم کو ساتھ لے جائیں یا عدت گزار لینے کے بعد۔

"کیسی باتیں کررہی ہو صوفیہ...... اسے یہیں رہنے دو۔" صائمہ مامی تڑپ تڑپ کر رو پڑیں، صوفیہ خالہ بھی بری طرح رورہی تھیں۔ کوئی قیامت سی قیامت ٹوٹی تھی ان کی بیٹی پر...... اتنی کم عمری میں وہ بیوہ بھی ہوگئی تھی۔ جوان بھانجا دنیا سے چلا گیا، کس، کس کا غم منائیں۔ وہ دونوں بہنیں روتی رہیں۔ وقت کتنا ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو آہستہ، آہستہ گزر ہی جاتا ہے۔ بس اپنے گہرے نقوش انسانوں پر چھوڑ جاتا ہے، وہ سب ہنسنا بولنا بھول گئے تھے۔ ماہم اپنے کمرے میں ہی رہتی تھی۔ احسن اور محسن بھی بلاوجہ سامنے نہیں ہوتے تھے۔ چار ماہ دس دن عدت کے انتہائی پردے میں گزرے تھے کہ اگلے ہی دن صوفیہ خالہ کا فون آگیا، وہ ماہم کو لے جانا چاہتی تھیں۔ صائمہ بچوں کو سینے سے لگا کر رو پڑیں۔

"ہم کیسے رہ پائیں گے ان کے بغیر، یہ تو میرے حسن کی نشانیاں ہیں، میں اب کیا کروں کہ تم لوگوں کو یہاں سے جانے نہ دوں۔"

"آپ انہیں روک سکتی ہیں ممی، ایک آپشن ہے میرے پاس۔" احسن ماں کے پاس آتے ہوئے بولا تھا۔ وہ چونک گئیں۔

"کیا......؟"

"میں ان سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" اس نے ماہم کی طرف اشارہ کیا اور کمرے میں موجود سب نفوس کو اس کی غیر متوقع بات نے ساکت کر دیا تھا۔

"فضول بات مت کرو احسن۔" ماہم نے روتے ہوئے اسے ڈپٹا تھا۔

"یہ فضول بات نہیں ہے ممی...... میں بہت سنجیدہ ہوں، پاپا سے بھی میں بات کر چکا ہوں، آپ انہیں راضی کر کے ہمارے نکاح کی تیاری کریں۔" وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماہم روتے ہوئے مسلسل انکار کر رہی تھی۔ صائمہ اور عارفہ گم صم بیٹھی تھیں اور ہانیہ؟ وہ تو جیسے خلا میں معلق ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ہانیہ کب سے پچھلے لان کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ بے آواز آنسو گالوں کو بھگوتے جا رہے تھے۔ اس نے ہمیشہ احسن کو اپنے پاس پایا تھا۔ وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا۔ اسے کوئی ہلکا سا رنج پہنچتا نہیں دیکھ سکتا تھا اور اب خود ہی اسے اتنا بڑا دکھ پہنچانے جا رہا تھا۔ وہ اسے ماہم بھابی کے ساتھ کیسے دیکھ پائے گی، وہ اس کڑے امتحان سے کیسے گزرے گی۔

"رو رہی ہو؟" برابر سے احسن کی دھیمی سی آواز ابھری۔ وہ ساکت رہ گئی۔ وہ کب آیا اور یہاں بیٹھ گیا۔ اسے خود فراموشی کے عالم میں کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

"تم جب چھوٹی سی تھیں تو اپنے پاپا کے لیے کتنا روتی تھیں، کتنی سہمی ہوئی رہتی تھیں تو اب تم مشعل کو اسی جگہ دیکھنا چاہو گی؟ پھپھو نے کہا تھا کہ میں ہانیہ کے لیے کبھی دوسری شادی نہیں کروں گی، مجھے تو شوہر مل جائے گا لیکن ہانیہ کو باپ نہیں ملے گا۔ حالانکہ ممی اور پاپا نے کتنا اصرار کیا تھا تو اب یہی صورتِ حال مشعل کے لیے بھی تو ہے، ماہم بھابی کی تو کہیں بھی شادی ہو جائے گی پر مشعل کے لیے وہ شخص ہمیشہ نامحرم ہی رہے گا، میں تو اس کا سگا چچا ہوں، اس کے باپ کا سگا بھائی...... اس کا محرم، میری تو ہمیشہ بھتیجی، میری بیٹی ہی رہے گی۔ میں اسے کیسے یوں چھوڑ سکتا ہوں؟"

"میں تمہیں روک تو نہیں رہی، بس میرے لیے یہ سب قبول کرنا بہت مشکل ہو رہا ہے۔" وہ بولی تو اس کی آواز آنسوؤں میں ڈبی ہوئی تھی۔

"میں نے بھی بہت مشکل سے یہ فیصلہ کیا ہے لیکن اس کے سوا اور کوئی آپشن بھی تو نہیں تھا؟"

"کیوں نہیں تھا، وہ تمہارے بھتیجا، بھتیجی ہیں تو کیا میرے نہیں، تم نے مجھ سے کیوں نہیں بات کی اور خود قربانی دینے چل پڑے۔" محسن کی آواز پر دونوں ہی اچھل پڑے تھے، وہ پیچھے ہی کھڑا تھا۔ ان کے متوجہ ہوتے ہی آگے بڑھ کر احسن کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"میں نے پہلے ہانیہ کو اور پھر تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھا تو میں بھی چلا آیا۔ ہے تو یہ غیر اخلاقی حرکت مگر تم دونوں میاں، بیوی تو ہو نہیں کہ تمہاری پرائیوسی میں مخل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال میں ماہم سے شادی کے لیے حاضر ہوں۔ تم مجھ سے چھوٹے ہو کر بھی اس گھر کی بہبود کے لیے فیصلہ کرنے میں آگے نکل گئے۔ مگر وقت ابھی ہاتھوں سے نکلا نہیں ہے، میں اب چلتا ہوں ممی، پاپا سے بات کرنے سے پہلے ماہم سے بات کرنی ضروری ہے بس...... تم دونوں میرے لیے دعا کرنا اور ہاں ایک اور بات...... ہانیہ کو آئندہ تمہاری وجہ سے رونا نہ پڑے ورنہ میں تمہارے کان ضرور کھینچوں گا۔" وہ اٹھا اور مسکراتے ہوئے ایک ہلکی سی چپت ہانیہ کے سر پر لگا کر چلا گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو یوں دیکھا جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو کہ کایا یوں بھی پلٹ سکتی ہے۔ محسن بہت ریزرو طبیعت کا تھا پھر رہتا بھی دور، دور تھا تو اس سے کوئی بھی اتنا فری نہیں تھا۔ احسن بھی ان سے زیادہ حسن بھائی سے بے تکلف تھا۔ بہر حال اس وقت انہوں نے اس کے کندھوں سے سارا بوجھ اتار کر خود اٹھا لیا تھا۔ احسن نے ایک گہری سانس فضا کے سپرد کی اور ہانیہ کی طرف مڑا۔

''یہ تو کسی کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ تو بہت بڑا سرپرائز دیا ہے محسن بھائی نے ، چلو آؤ اندر چلتے ہیں، نماز پڑھ کر دعا مانگیں گے کہ حسن بھائی کی روح بھی اس فیصلے پر سکون محسوس کرے...... ریان اور مشعل بھی ممی، پاپا کے سامنے رہیں گے تو آتے ، آتے انہیں بھی صبر آ ہی جائے گا۔''

''تمہیں ایک بار بھی میرا خیال نہیں آیا؟''

''میں نے کچھ اور سوچنا بند کر دیا تھا ورنہ شاید فیصلہ نہ ہو پاتا۔'' وہ افسردگی سے مسکرایا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ نیتوں کے حال جانتا ہے، اسی نے محسن بھائی کے دل میں یہ خیال ڈالا اور مجھے میری نیک نیتی کا اجر دیا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ ماہم بھابی کو صبر دے اور آئندہ کے لیے خوشیاں بھی......'' ہانیہ نے خلوصِ دل سے دعا کی تھی۔

''انسان کیا سوچتا ہے اور پل میں کیا ہو جاتا ہے۔ حسن بھائی اکثر مجھے کہتے تھے کہ تمہاری بیٹی ہو گی تو میں اپنے ریان کے لیے لوں گا اور وہ خود......''

وہ آگے بول نہیں پایا تو خاموش ہو کر خود پر قابو پانے لگا۔ ہانیہ کا بھی دل بھر آیا تھا۔ ہنستے مسکراتے حسن بھائی یوں مٹی میں مل گئے تھے کہ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس کے رکے ہوئے آنسو پھر بہہ نکلے...... احسن نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا تھا۔

''یہیں رو لو اور آنسوؤں کے سارے نشان صاف کر کے اندر جانا...... ورنہ ممی کو تو بہانہ چاہیے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتی اچھی طرح چہرہ صاف کر کے اس کے ساتھ اندر چلی آئی۔ لاؤنج خالی تھا۔ وہاں سے گزر کر وہ جیسے ہی کاریڈور میں آئے ماہم کے کمرے سے ماہم کی اونچی آواز آئی۔

''کیا سمجھ رکھا ہے تم بھائیوں نے مجھے، کبھی ایک اپنی سرد مہری پیش کر رہا ہے تو کبھی دوسرا۔ نہیں چاہیے مجھے تم دونوں کی ہمدردی...... میرے لیے حسن کا نام ہی کافی ہے، ان کے دونوں بچے میرے پاس ہیں، میرے جینے کے لیے وہی بہت ہیں، مجھے تمہاری ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''میں نہ تو ہمدردی کر رہا ہوں، نہ ترس کھا رہا ہوں، میں عام حالات میں تو مر کر بھی یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ میں شروع سے تمہیں پسند کرتا تھا لیکن میرے ذکر کرنے سے بھی پہلے ممی نے تمہیں حسن بھائی کے لیے مانگ لیا۔ میں اپنے بھائی کی امانت کے متعلق کچھ سوچنا بھی گناہ سمجھ کر یہاں سے چلا ہی گیا۔ اب اگر میں اس طرح سے تمہیں پا سکتا ہوں تو میں یہ موقع کھونے نہیں دوں گا۔ میرا یقین کرو ماہم، میں سچ کہہ رہا ہوں، تم پلیز ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو، تمہاری ایک ہاں سے اس گھر کی خوشیاں لوٹ آئیں گی۔''

ہانیہ اور احسن کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا تھا۔ دونوں ہی شاک کے عالم میں ان کی باتیں سن رہے تھے پھر احسن نے حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا اپنے کمرے میں لے آیا۔

''توبہ، کتنے گہرے ہیں محسن بھائی تو یہ اسی وجہ سے پاکستان نہیں آتے تھے۔''

''مجھے تو خود آج پتا چلا ہے، میری تو ویسے بھی تم نے مت مار رکھی تھی، کبھی اپنی طرف سے دھیان ہٹنے ہی نہیں دیا کہ کسی کے جذبات کا علم ہو جاتا۔''

''اچھا تو یہ بھی الزام میرے سر۔'' اس نے گھورا۔

''ہاں تو تم ہی تو ہو میری ملزم، دل چرا لیا، دماغ پر قبضہ کر رکھا ہے، تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا، نہ میرے خیالات میرے بس میں، نہ میرے حواس میرے تابع...... پھر کیا کہوں تمہیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے قریب آیا اور کوئی شرارت کرنا چاہتا تھا کہ وہ پھرتی سے دور ہوئی اور انگوٹھا دکھاتی باہر بھاگ گئی۔ وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔

☆☆☆

شام میں لاؤنج میں سب اکٹھے چائے پی رہے تھے۔ احسن اور ہانیہ نے صاف محسوس کیا کہ محسن بھائی، پاپا سے چپکے، چپکے کچھ کہہ رہے تھے اور دونوں کے چہرے کا اطمینان کسی خوش خبری کا آئینہ دار تھا۔

دردِ بے کراں

حمیرا نوشین

"میرے ہم سفر یہی تیری نذر ہیں میرے جذبۂ دل کی یہ شدتیں
میرے خواب میری بصارتیں میری دھڑکنیں میری چاہتیں
میرے روز و شب کے نصاب میں میرے پاس تو اپنا کچھ نہیں
تیرا قرض ہے میری زندگی، میری سانسیں تیری امانتیں"

میرا دل اتنے خوب صورت اظہار پر جھوم ہی تو اٹھا تھا۔ میرے چہرے کی الوہی چمک، لبوں کی شفق اور ہنسی کی کھنک کا تو وہ کس قدر دیوانہ ہوا تھا ظاہر ہے اتنی حسین بیوی کہ جس کو ایک نظر دیکھ لینے پر نظریں بار، بار مچل جاتی ہوں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، گولڈ میڈلسٹ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز...... ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کماتی ہوئی، اعلیٰ خاندان یقیناً کوئی بھی مرد ایسی بیوی پر فخر کر سکتا تھا۔

"رمیز آخر مسئلہ کیا ہے تم آج کل کہاں ہوتے ہو فون بھی اکثر آف رہتا ہے۔ اگر گھر میں کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو۔" کئی دنوں سے رمیز کے معمولات میں فرق آنے اور اس کے متفکر چہرے کو دیکھ کر آج میں نے پوچھ ہی ڈالا تھا اور پھر....... میرے روز روز کے استفسار پر آخر اس دن اس نے وہ سب کہہ ہی ڈالا جس کا مجھے خدشہ تھا۔



کس بے دردی سے وہ اپنی محبت کی داستان مجھے سنا رہا تھا اور میں دم سادھے اس کے ناکام عشق کے قصے سن رہی تھی۔ آنسو میری آنکھوں میں جھلملانے لگے تو اس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''میرا مقصد تمہیں رنجیدہ کرنا ہرگز نہیں تھا۔''

اُف اس کی شرمساری مجھے پگھلا گئی تھی۔

''اپنی بات جاری رکھو رمیز......! میری رنجیدگی چھوڑو......اب تم کیا چاہتے ہو مجھ سے۔'' میں نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے اور اس سے دور صوفے پر جا بیٹھی۔

''رملہ بہت پُرسکون زندگی گزار رہی تھی مگر اسے معلوم نہ تھا کہ اس کا ہم سفر محض چند سال ہی اسے ہمراہی بخشے گا۔ کینسر جیسے موذی مرض نے اس کے شوہر کی جان لے لی اور اب وہ پاکستان میں اپنے بھائی کے پاس رہ رہی ہے...... اولاد جیسی نعمت سے بھی قدرت نے اسے محروم رکھا۔ چند مہینوں پہلے ہی وہ مجھے اپنی فرم میں ملی، انٹرویو دینے کے لیے آئی ہوئی تھی کیونکہ اس کے بھائی بھابی اس کی دوسری شادی کے لیے اصرار کررہے ہے......اور وہ شادی کرنا نہیں چاہتی۔''

رمیز اپنی داستان جاری رکھے ہوئے تھا۔

''وہ رملہ جو کبھی مانندِ گلاب تھی اب خزاں رسیدہ پتے کی طرح مرجھا کر رہ گئی ہے، وہ بہت غمزدہ ہے، بہت دکھی ہے، میں اس کے دکھ بانٹنا چاہتا ہوں ایسے کڑے وقت میں اسے میری ضرورت ہے رامین...... میں اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانا چاہتا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں رملہ کا دکھ ہلکورے لینے لگا۔

''ہاں کسی کی زندگی کو خزاں کی نذر کر کے اپنی عہدِ رفتہ کی محبت کی زندگی میں بہار لانا چاہتے ہو۔'' میں دل میں محض سوچ کر رہ گئی۔

''میرا تم سے اور بچوں سے محبت و پیار کا وہی رشتہ قائم رہے گا جو روزِ اول سے ہے......بس تم اتنا کرم کرو کہ مجھے رملہ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے دو۔''

''یہ تمہیدِ اجازت نامہ ہے یا تمہارا حتمی فیصلہ؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''دیکھو میں تمہارے حقوق بھی اسی طرح ادا کروں گا۔ تمہیں مجھ سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' اس نے نظریں چرائیں۔

''گویا تم فیصلہ کرچکے ہو؟'' میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں۔'' کتنی سفاکی سے اس کے لبوں سے نکلا۔

''تو ٹھیک ہے، میرا فیصلہ تم چند دن بعد سن لینا۔'' میں کہتی ہوئی تیز قدموں سے باہر نکل آئی کیونکہ اب دل میں تاب رہی تھی نہ آنکھوں میں......آنکھیں اپنے محبوب شوہر کی بے وفائی پر برسنے کو بے تاب تھیں اور دل درد سے پھٹا جارہا تھا۔

☆☆☆

''کتنے دن گزر گئے تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' ایک دن بچوں کے اسکول جانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''بہت جلدی ہے۔'' میں کچن میں چیزیں سمیٹتے ہوئے بولی۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے دراصل رملہ کے بھائی اب جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں بس اسی لیے پوچھ رہا تھا۔''

''تو ٹھیک ہے، تم لاؤنج میں چلو وہیں آکر میں تم سے بات کرتی ہوں۔'' وہ خاموشی سے جاکر صوفے پر بیٹھ گیا۔

چار دن سے میں آفس سے چھٹی پر تھی اور جس ذہنی اذیت و کرب سے میں گزر رہی تھی۔ اس کا شاید اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔

میں اپنے کمرے میں گئی اور ایک کاغذ لاکر اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اس نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کاغذ کے پرچے کو پکڑ کر میری طرف دیکھا۔

''اس کو غور سے پڑھ لو۔'' میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی نظریں تیزی سے اس کاغذ پر دوڑنے لگیں اور میں اطمینان سے اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات و کیفیات دیکھتی رہی۔

''یہ..... یہ سب کیا ہے؟'' اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''ہم سب مل کر بھی تو رہ سکتے ہیں۔'' خوش گمانیاں عروج پر تھیں۔

''دیکھو اگر تمہیں یہ شرائط منظور ہیں تو اس پر دستخط کر دو بصورتِ دیگر میں تم سے طلاق لینے پر مجبور ہو جاؤں گی جو کہ میں نہیں چاہتی۔''

''لیکن رامین......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں...... تم آفس سے روزانہ سیدھے یہیں آیا کرو گے، بچوں کو اسی طرح وقت دو گے جیسے ...پہلے دیتے تھے ویک اینڈ بھی تم بچوں کے ساتھ گزارو گے، ہاں روز رات کو تم آزاد ہو...... دن اپنے بچوں کے ساتھ گزارنے کے بعد رات تم اپنی محبوبہ کی بانہوں میں بسر کر سکتے ہو۔ مجھ سے تم کسی بھی قسم کا تعلق روا نہ رکھو گے میرے نام کے ساتھ صرف تمہارا نام جڑا رہے گا۔ تمہاری ذات سے میرا کوئی تعلق نہیں رہے گا اور میرے دل سے یہ رشتہ آج ہی ختم ہو جائے گا...... اور ہاں خاندان کی کسی بھی تقریب میں تم میرے اور بچوں کے ساتھ شرکت کرو گے، رملہ کو کبھی اس خاندان کی بہو کے نام سے پکارے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔'' میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

''تو تم مجھے ڈسٹرب رکھنا چاہتی ہو؟'' وہ شاکی لہجے میں بولا۔

''اور جو میں ڈسٹرب ہوئی ہوں، میرے بچوں کو جب یہ پتا چلے گا کہ ان کا باپ دوسری شادی رچانے جا رہا ہے تو کیا وہ ڈسٹرب نہیں ہوں گے۔ خاندان میں جب تمہاری دوسری شادی کی خبر پھیلے گی تو کیا میرا تماشا نہیں بنے گا۔'' میں غصے پر قابو پاتے ہوئے مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔ پلیز ایسا مت کرو۔'' اس کے لہجے میں پل میں تھکن اتر آئی۔

''میرے بغیر بھی نہیں رہ سکتے، اپنی پہلی محبت کو

فیس بک

ایک سردار نے خوشامدانہ لہجے میں دوست سے کہا۔

''یار مجھے فیس بک کی آئی ڈی بنا دو۔''

اس کے دوست نے پوچھا۔

''تمہیں فیس بک چلانی آتی ہے؟''

تب سردار طمانیت سے بولا۔

''چلا تم لینا ہم پیچھے بیٹھ جائے گا۔''

مرسلہ۔ صباحت ضیا، کراچی

بھی خوش دیکھنا چاہتے ہو، اصل میں تو تمہیں اپنی ذات کی خوشی عزیز ہے مسٹر رمیز حسن۔'' میں نے پل میں اجنبیت کی دیوار قائم کر لی اور وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

رمیز کا دستخط شدہ پیپر میرے ہاتھوں میں...

پھڑپھڑا رہا ہے تو اتر سے بہتے آنسوؤں سے تحریر ایسے مٹتی چلی جا رہی ہے جس طرح میرے دل کو میرے محبوب کی بے وفائی نے چاٹ ڈالا ہو...... میری محبت کرلاتی رہ گئی...... دل کے کسی گوشے میں کہیں جو یہ خواہش مچل رہی تھی کہ شاید یہ شرائط اس کی راہ میں حائل ہو جائیں اور وہ میری بے التفاتی پر بے چین ہو کر میرے ہی پاس لوٹ آئے یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی۔ اس کی پہلی محبت بازی لے گئی اور بیوی کی بے لوث حقیقی شرعی محبت راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

آہ......! یہ مرد کی محبت بھی کیسی محبت ہے دل کے اگر چار خانے ہیں تو ہر خانے میں ایک محبت آسانی سے سما جاتی ہے اور یہ پاگل عورت کا دل اس کے دل کے بھی تو چار خانے چار دروازے ہوتے ہیں پھر یہ کیوں ایک در میں داخل ہونے والی محبت کے ساتھ ہی باقی تینوں دروازے بھی مقفل کر دیتی ہے اور کنجی دریا برد کر دیتی ہے۔



قسط 2

ہم گمشدہ محبت کے

انجم انصار

انسان نہ کچھ ہنس کر سیکھتا ہے، نہ رو کر سیکھتا ہے، جب بھی سیکھتا ہے یا کسی کا ہو کر سیکھتا ہے یا پھر کسی کو کھو کر سیکھتا ہے... چونکہ لوگ دل کے امیر کم، کم ہوتے ہیں، اس لیے زندگی کی کتاب میں اتنی غلطیاں نہ کرو کہ پنسل سے پہلے ربڑ ختم ہو جائے اور توبہ سے پہلے زندگی...

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا
نہ بہلاوا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے
ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا

محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر......



شہلا کی جان جل کر رہ گئی...... جب وہ ہنستی مسکراتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تو کریم آنگن میں بیٹھا ٹھاٹ سے چائے پی رہا تھا اور اپنی خالہ سے باتیں علیحدہ بنا رہا تھا۔

''اوہ...... گھر آنے کا یہ ٹائم ہے تمہارا؟'' وہ گھڑی پر اک نظر ڈال کر تمسخر سے بولا۔

''ہاں ہے پھر...... آپ کو کیا تکلیف......؟'' وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

''خالہ آپ کی بے جا نرمی نے بہت ڈھیل دے رکھی ہے شہلا کو...... اب مغرب کے بعد کون سے اسکول کھلے ہوتے ہیں مگر آپ تو گھر میں بیٹھنے والی خاتون ہیں، آپ کو یہ سب کیا پتا......'' وہ ہنس کر بولا۔

''آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ میرے آنے جانے کی بابت سوالات کریں؟''

''میں تو بھئی اِک عام سی بات کر رہا ہوں...... تم اس وقت اپنے اسکول سے ہی آ رہی ہو ناں......؟''

''جی نہیں، میں شاپنگ کرتی ہوئی آ رہی ہوں۔'' شاپنگ بیگز اس نے راحیلہ کو تھماتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت کریم کے منہ نہیں لگنا چاہ رہی تھی۔

''اپنی بہن کو بھی ساتھ لے جایا کرو، وہ بیچاری تو کہیں آتی جاتی ہی نہیں ہے۔'' وہ پھر بولا۔

''کریم بھائی آپ اپنی خالہ کے پاس آئے ہیں ناں تو اُن سے ہی باتیں کریں، وہ آپ کی ہر اوندھی، الٹی بات بھی بڑی رغبت سے سنیں گی مگر مجھ سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ غصہ دبا کر بولی۔

''کیوں، کیا تم اس گھر میں نہیں رہتی ہو...... یا اس گھر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے!'' خالہ کی مسکراہٹ کی شہ پا کر وہ اترا کر بولا۔

''یہ تو گھر ہی میرا ہے...... مگر آپ کا کیا حق بنتا ہے جو اس طرح کی بات چیت کریں، اس لیے آئندہ مجھ سے منہ سنبھال کر بات کیجیے گا ورنہ شاید آپ مجھے جانتے نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کو مڑی۔

''ارے جان، تمہیں نہیں جانیں گے تو بھلا کس کو جانیں گے۔ وہ گنگنایا۔ ''اور حق ہی تو بنتا ہے جبھی تو یہ سب اتنے پیار سے پوچھ رہا ہوں۔'' کہا تو اس نے دھیرے سے تھا مگر شہلا نے سن لیا تھا۔ اس کے آگے بڑھتے قدم سرعت سے پیچھے لوٹے اور وہ جوشِ غضب سے بولی۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں...... میں آپ کی یہ بکواس برداشت کروں گی اور چپ رہوں گی...... ہاں؟''

''ارے میں نے کہا ہی کیا ہے...... تم میری کزن ہو اس حوالے سے کیا دو لفظ میٹھے بھی نہیں بول سکتا......''

''نہیں، ہرگز نہیں اور اسی وقت نکل جائیں میرے گھر سے......!''

''یہ میری خالہ کا گھر ہے...... میں کیوں جاؤں؟'' وہ شانے اچکا کر بے غیرتی سے ہنسا۔

''یہ گھر میرے باپ کا ہے، آپ کی خالہ کا نہیں...... اٹھیں اور دفع ہو جائیں۔'' وہ غصے سے دہاڑی۔ ''سنا نہیں آپ نے...... دفع ہو جائیں یہاں سے......''

ذکیہ بیگم یہ غیر متوقع صورت حال دیکھ کر ہڑبڑا کر بس ہیں...... ہیں کرتی رہ گئیں مگر اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور وہ نفرت کی تصویر نظر آ رہی تھی اور کریم پہلی بار اس کا یہ شعلہ بار انداز حیرت سے تکے چلے جا رہا تھا۔

وہ غصے سے تنتناتی ہوئی اپنے کمرے میں اس طرح گئی تھی کہ راستے میں آنے والی چیزوں کو ٹھوکر سے گراتی ہوئی...... کرسی، جگ اور ٹرے نیچے گرنے سے شور علیحدہ مچا گئے تھے۔

''خالہ...... یہ شہلا اتنی بدتمیز لڑکی ہے، میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''چلو اب تو دیکھ لیا ناں......'' ذکیہ دھیمے سے بولیں۔

''ہاں دیکھ لیا اور بہت اچھی طرح دیکھ لیا۔''

''ہاں بیٹا...... کماتی ہوئی بیٹیوں کے بعض انداز کچھ اس طرح کے بھی ہوا کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو لڑکا سمجھنے لگتی ہیں۔''

''ایسی لڑکیوں کا صرف ایک ہی علاج ہونا چاہیے۔ وہ بھی بہت تگڑا علاج...... نہ ٹھیک ہوئیں تو میرا نام بدل دینا۔''

''یہ بات تو مجھ سے کہہ رہا ہے...... جس کے ماتھے پر سوتیلی ماں کا لیبل علیحدہ چسپاں ہے...... جو جتنا ہی چاہے اچھا کردے مگر بری ہی کہلائی جاتی ہے۔'' انہوں نے مگرمچھ کے آنسو بھی ٹپکا دیے۔

''خالہ...... آپ نے شہلا کو واقعی زیادہ ڈھیل دے دی...... جب ہی تو وہ سر چڑھ کر ناچ رہی ہے۔''

''چلو...... تم نے یہ تو مان لیا ناں کہ میں اس پر سختی نہیں کرتی ہوں...... اور ایک نرم ماں ہوں......'' وہ بھانجے کی اس بات کو بھی اپنی تعریف میں لے گئیں۔

''میرے ساتھ اگر کوئی دوسرا اتنی بدتمیزی کرتا ناں تو میں اس کے ہوش ٹھکانے لے آتا......'' کریم کا غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔

''ارے چھوڑو...... باؤلی ہے ناں...... جب ہی تو اس کو جان لینے والے اسے بالکل بھی پسند نہیں کرتے حالانکہ خوب صورت بھی ہے...... مگر ایسی خوب صورتی کس کام کی۔'' اب انہوں نے شہلا کو گرانے کے لیے الٹی چال چلی کہ وہ جانتی تھیں کہ کریم یہاں سے جا کر چار گھروں میں شہلا کی برائیاں خوب پیٹ بھر کر کرے گا۔

''خالہ اس پگلو لڑکی کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ اس کی کہیں جلدی سے شادی کر دیجیے...... تاکہ آپ کی جان کو سکون ملے۔'' کریم نے پتا پھینکا۔

''ارے بیٹا! اس جھگڑالو، پگلو لڑکی سے جانتے بوجھتے کون شادی کر کے اپنی جان عذاب میں ڈالے گا۔'' خالہ نے بھی اس کے پتے کو ترپ کی دکی سے کاٹ دیا اور وہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

اور راحیلہ ان کی باتیں نہ سمجھتے ہوئے بھی بے وجہ اپنا سر ہلا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

بشیر احمد کا یہ گھرانا لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا، وہ کسی سرکاری دفتر میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر تھے۔ ان کی دو ہی بیٹیاں تھیں...... شہلا اور راحیلہ...... شہلا ان کی پہلی بیوی رضیہ کے بطن سے تھی جن کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنی چھوٹی سالی ذکیہ سے شادی کر لی تھی اور ذکیہ نے بھی جب اپنی پانچ سالہ بھانجی شہلا کو گود لیا تو اس کو اپنی ہی بیٹی سمجھ کر پالا...... راحیلہ اور شہلا دونوں بہنوں میں بے حد پیار تھا...... مگر شکل صورت میں دونوں میں نمایاں فرق تھا...... اور اس کی واضح وجہ یہ تھی کہ شہلا کی ماں رضیہ اپنی تمام بہنوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھیں اور ان کا رنگ و روپ بھی کشمیریوں کی طرح تھا جبکہ ذکیہ خود بھی سانولی تھیں اور راحیلہ ان ہی کا پرتو تھی اور یہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کی ضد تھیں...... کوئی نیا دیکھنے والا ان دونوں کو بہن ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور یہی بات ذکیہ کا دل دکھی سا کر دیا کرتی تھی...... کہ ان کی اپنی بیٹی، اپنی بھانجی کے مقابلے میں کم ہے' کیا تھا کہ اگر راحیلہ بھی شہلا جیسی گوری ہوتی یا پھر وہ دونوں ہی سانولی سلونی سی ہوتیں...... جس سے دل میں دکھ کا صحرا تو نہ ہوتا...... اور جس دن ان کی اپنی بڑی بہن نے ان سے رازدرانہ لہجے میں کہا...... کہ راحیلہ کے چہرے پر رنگ صاف کرنے کی کریمیں لگایا کرو...... ورنہ وہ شہلا کے سامنے اس کی ملازمہ سی لگتی ہے تو ان کا دل چاہا تھا کہ وہ خوب چیخ، چیخ کر روئیں اور شہلا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر سے باہر نکال دیں...... جس کی وجہ سے ان کی پیاری سی بیٹی کی ویلیو گھٹ گئی تھی۔

''اگر یہ شہلا بھی اپنی ماں کے ساتھ مر کھپ گئی ہوتی تو آج گھر کے ایسے حالات نہ ہوتے...... کوئی میری بیٹی کا مقابلہ کسی سے نہ کرتا...... اور ایک پریشانی کی تلوار میرے سر پر بھی نہ لٹکتی رہتی......''

ذکیہ بیگم کے ذہن میں یہ باتیں جوار بھاٹا تو ضرور مچایا کرتیں...... مگر اُن کی ہمت نہیں تھی کہ وہ شہلا کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات اپنے لبوں پر لے آئیں...... اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ باپ کی زیادہ ہی منہ چڑھی تھی...... اور دوسرے وہ جاب کرتی تھی...... اور اسکول سے وہ جو کچھ کماتی وہ سب ماں کے ہی ہاتھ میں لا کر دیتی، اس نے کبھی کوئی حساب کتاب نہیں پوچھا تھا...... اور ذکیہ کو اس کی یہ ادا دل سے بھائی تھی...... اور وہ اس کو ناراض کرنے کے بارے میں سوچ تک نہیں سکتی تھیں...... کہ بہت سی نفرتیں دل میں ہی پالی پوسی جاتی ہیں اور زبان سے منافقت کا کام لیا جاتا ہے...... کتنا اچھا ہی ہے کہ لوگ دل کی باتیں سن نہیں سکتے ورنہ تو شاید دوستی کا وجود تک نہ ہوتا...... اور رشتے داریاں وہ تو ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے ہی ختم ہو جایا کرتیں۔

☆☆☆

چائے کا کپ ختم کر کے میں اٹھی ہی تھی آج آفس کے ٹائم سے دو گھنٹے اوپر ہو گئے تھے مگر میں نے اپنا پورا کام نمٹا دیا تھا۔ بیگ اٹھا کر، میں نے کیبن سے قدم باہر نکالا تو سر فرید کھڑے تھے۔

''کیا آپ تھوڑی دیر رک سکتی ہیں؟''

''سر میں پہلے ہی دو گھنٹے لیٹ جا رہی ہوں۔''

''ایک بات کہنی تھی۔'' وہ بولے اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

''جی کہیے......'' میں بادلِ ناخواستہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اگر آپ آفس ورکرز کی بھی مانیٹرنگ کر لیا کریں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟ میں ان کی انچارج تو نہیں ہوں۔''

''میرا مطلب ہے...... ہمارے آفس میں کام کرنے سے زیادہ باتیں بنائی جاتی ہیں۔''

''سر، ہر اخبار کے دفتر میں باتیں ہی بنائی جاتی ہیں اور باتیں ہی بیچی جاتی ہیں...... ساجد تو از خود خبریں تک بنایا کرتا ہے۔'' میں نے انہیں جتایا۔

''میرے ایک دوست نے مجھے مشورہ دیا تھا...... کہ آفس ورکرز کی بھی مانیٹرنگ بہت ضروری ہوتی ہے۔''

''تو سر...... یہ کوئی ضروری نہیں جسے کام کرنا ہے وہ ہر صورت میں کرے گا اور جسے نہیں کرنا وہ کسی صورت بھی نہیں کرے گا بلکہ اپنے کام نہ کرنے کے دس بہانے سوچے گا۔''

''ہوں...... تو پھر ٹھیک ہے، میں ہی پھر دیکھتا ہوں کچھ۔'' وہ مسکرا کر بولے۔

اور میں سر جھٹک کر باہر نکل آئی تھی کہ یہ بگ باس بھی بعض دفعہ کیسی چھوٹی بات کر لیا کرتے ہیں...... اب کسی کی ٹوہ میں رہنا بھلا کوئی اچھی بات ہے۔

☆☆☆

اگلے دن شہلا...... بینک وقتِ مقررہ پر پہنچ گئی تھی، اسکول کی فیس وہ جمع کرا چکی تھی...... مگر حارث ابھی تک بینک نہیں آیا تھا...... اس کا شیشے کا کمرا...... اس کے بغیر اسے سونا، سونا دکھائی دے رہا تھا۔

''تھوڑی دیر انتظار کرنا چاہیے......'' اس نے سوچا اور وہیں بیٹھی رہی...... اور اپنا وقت بینک میں آنے والی خواتین کو دیکھنے میں لگایا...... ''یہ اچھے گھروں سے تعلق رکھنے والی خواتین گھر سے باہر جاتے ہوئے اپنا خیال کیوں نہیں کرتیں......'' مسلا ہوا دوپٹا، بغیر پریس کی شرٹ، بکھرے بالوں کے ساتھ آنے والیاں اسے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھیں...... یا پھر بہت زیادہ میک اپ میں لت پت لڑکیاں بھی اسے بہت بری لگ رہی تھیں...... وہ پتا نہیں کب تک آنے والی خواتین کو دیکھتے ہوئے مختلف گریڈ دیتی کہ اسے حارث آتا ہوا دکھائی دیا...... سرو قد

......وجاہت بھری پرسنالٹی، سیاہ چشمہ لگائے وہ سید حا اپنے روم میں داخل ہوا......تو شہلا اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی......"واؤ......کتنا خوبرو ہے یہ حارث......" وہ اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے کمرے میں آئی تو وہ موبائل پر کسی سے بات کررہا تھا......اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا......اور قدرے رخ موڑ کر وہ فون پر بات کرتا رہا......اور وہ اسے دیکھتی رہی، مسکراتے ہوئے وہ کتنا اچھا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے اس نے اس کو دیکھا اور انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

"جی مس فرمائیں......"

"مسز اشفاق نے آپ کو سلام کہلوایا ہے۔ اور کہا ہے کہ کبھی ہمارے اسکول کا بھی چکر لگائیں......اور ہاں پندرہ دن بعد ہمارے اسکول میں مینا بازار ہونے والا ہے......اس میں تو آپ کو لازمی آنا ہے۔"

اسے معلوم تھا......اسکول کی اونر سے حارث کے فیملی روابط میں تو وہ خواہ مخواہ ہی بولے چلی گئی......(اپنے بے وجہ بیٹھنے کا جواز تو دینا ہی تھا)

"جی......" وہ کسی سے موبائل پر کہہ رہا تھا اور شہلا کو یوں لگا جیسے اس نے آنے کی حامی بھر لی ہو۔

"آپ کو پتا ہے مینا بازار میں میری ڈیوٹی حلیم کے اسٹال پر ہوگی اور آپ کو میرے اسٹال پر تو لازمی آنا ہوگا......اور گرما گرم حلیم بھی کھانا ہوگا......میں اسکول کی طالبات کے ساتھ۔" تب وہ کھنکھار کر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"آپ آنٹی کو میرا اسلام کہیے گا......بینک کے اوقات میں میرا کہیں جانا مشکل ہی ہوا کرتا ہے......مگر پھر بھی میں کوشش ضرور کروں گا۔"

"ایمان سے۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا......حارث نے چونک کر اسے دیکھا......جو وارفتگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"او کے، میں آؤں گا آپ کے اسکول......" اس نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

اور اسے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہا ہوں کہ تم بلاؤ......اور میں نہ آؤں ایسا بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں صرف تمہاری خاطر ضرور آؤں گا......ہاں ضرور......

"سچی......" اب وہ اپنے من میں ہی کہتی ہوئی حارث کو دیکھے چلی جارہی تھی۔

مگر وہ اپنا رخ قدرے بدل کر روم میں آنے والے کسی دوسرے شخص کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ جس کا صاف یہ مطلب تھا کہ اب آپ جاسکتی ہیں......شہلا کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ اس کے روم سے اب مسکراتے ہوئے باہر جارہی تھی۔

☆☆☆

مسکراہٹ کیسے دم توڑا کرتی اور آنسو حلق میں کیسے اٹکا کرتے ہیں اور حواس کیسے شل ہوجایا کرتے ہیں......آج اس کا بھی تجربہ مجھے ہوگیا تھا۔ اپنی سہیلی کو شوخ جملوں سے میں نے چھیڑا بھی تھا اور اس کی بات پر مسکرائی بھی تھی کہ آج میں ایک مقامی ہوٹل میں اپنی ایک عزیز دوست کے نکاح میں شریک تھی۔ ابھی کسی دوسری سہیلی کی بات پر میں مسکرا ہی رہی تھی کہ عین اپنے سامنے سبین کو بیٹھا دیکھ کر میری مسکراہٹ کافور ہوگئی جو مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملیں......تو ہڑبڑا کر انہیں سلام کر ڈالا۔

"اوہ......اچھا......سلام کرنا آتا ہے تمہیں۔" وہ دھیرے لہجے میں بولی تھیں۔

بارات آنے کے شور میں......کسی کو کسی کی بات سنائی نہیں دے رہی تھیں......مگر مجھے ان کی آنکھوں کی نفرت

بھری چنگاریوں کی تپش بھی محسوس ہو رہی تھی، میرا دل چاہا کہ وہاں سے اٹھ کر چلی جاؤں...... مگر میرے قدم ایسے من، من بھر بھاری ہو گئے تھے...... کہ اٹھنا چاہتے ہوتے بھی اٹھ نہیں سکتی تھی...... جبکہ میری ساری سہیلیاں اِدھر اُدھر ہو گئی تھیں۔

''مجھے نہیں معلوم تھا...... تم سے دوسری ملاقات اتنی جلدی ہو جائے گی۔'' وہ بولیں۔

مگر میں نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیا خیال ہے صرف دو ماہ بعد ہی ہم مل گئے ناں......'' وہ ہنسیں۔

''جی......'' میرے منہ سے بہ مشکل نکلا۔

''اب بھی...... منگنی کے دائرے میں قید ہو گی تم...... ہے ناں......؟''

میں نے ان کی بات پر نظریں جھکا لیں۔

''مس صبا رحیم...... ایک بات کہوں تم سے......'' وہ جملہ کہہ کر رکیں۔

میں نے نظریں اٹھائیں جو سوالیہ تھیں۔

''منگنی حقیقت میں ڈھکنی ہوا کرتی ہے اس میں لڑکی والوں کے ڈھنگ دیکھے جاتے ہیں...... اور جب منگنی میں لڑکی والوں کے ڈھنگ آشکار ہو جاتے ہیں...... تو لڑکے والے بتائے بغیر بھاگ جاتے ہیں کہ قانونی حیثیت تو اس کی کچھ ہوتی نہیں ہے...... اور نہ ہی وہ کسی کو جواب دہ ہوتے ہیں اس لیے بی بی...... تم بھی بھاگ جانے والوں پر صبر کر لو...... ورنہ دو چار سیزن گزر گئے ناں...... تو تمہارے لیے بھی کسی اچھے رشتے کا حصول مشکل ہو جائے گا...... اور ہاں یہ ساری خوب صورتی بھی دھری کی دھری رہ جائے گی۔'' اور ان کی بات سن کر میں پھر پتھر سی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''ارے خوشی کی بات سن کر...... کیا سکتہ ہو گیا تمہیں......'' چھوٹی آپا ہنس رہی تھیں۔

''میری آسان سی بات تمہیں سمجھ میں نہیں آ رہی......'' چھوٹی آپا، اپنی بہن ذکیہ کو یوں حق دق سا دیکھ کر چھیڑ رہی تھیں...... بلکہ ایک ہاتھ بھی شانے پر مارا تھا اور ذکیہ بیگم کا دل چاہا کہ وہ چیخ، چیخ کر کہہ دیں کہ میں اتنی مشکل بات اگر سمجھ بھی لوں تو ہضم کیسے کروں۔

''ذکیہ، تمہیں تو اچھا لگنا چاہیے...... کہ اب ہماری ڈبل رشتے داری ہو جائے گی......'' ان کی بہن نے ان کے منہ میں مٹھائی کی ڈلی رکھ کر کہا۔

یہ سب ذکیہ بیگم کو برا تو نہیں لگ رہا تھا...... مگر وہ اسے شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئیں کہ ان کی چھوٹی آپا نے اپنے بیٹے کریم کا رشتہ راحیلہ کے بجائے شہلا کے لیے دیا تھا۔ چھوٹی آپا کی یوں تو دوستی بھی ذکیہ سے بہت تھی...... اور وہ گاہے بہ گاہے شہلا کو چالاک لڑکی بھی کہا کرتی تھیں...... اور راحیلہ کی سادگی کی ہمیشہ تعریف کرتی تھیں...... مگر جب اپنے بیٹے کا رشتہ طے کرنے کی بات آئی تو انہیں شہلا ہی پسند آئی۔

''آپا...... یہ شہلا کب سے آپ کو پسند آنے لگی...... کریم کو تو وہ کبھی اچھی نہیں لگی۔'' انہوں نے بظاہر مسکرا کر ہی پوچھا...... ورنہ دل تو گالم گلوچ کرنے تک پر بضد تھا کہ اس دن کی بے عزتی بھی ان ماں، بیٹے کو بری نہیں لگی تھی۔

''تمہارا بھانجا...... کریم اس کا کلمہ پڑھ رہا ہے اور کریم کیا خاندان بھر کے لڑکے...... شہلا کو ہی پسند کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہمارے خاندان میں اس جیسی لڑکی تو دوسری کوئی ہے ہی نہیں...... بلکہ اس کے پاسنگ برابر بھی نہیں ہے۔'' تب ذکیہ کو یوں لگا جیسے ان کی بہن جھوٹ بول رہی ہوں...... کریم کے جملے انہیں ابھی تک یاد تھے جو وہ شہلا کی شان میں کہہ کر گیا تھا...... اور اس واقعے کو اتنا عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ ان لفظوں کی گونج بھول جاتیں۔

''سچی کہہ رہی ہوں میں...... کریم کو شہلا بہت ہی اچھی لگتی ہے۔'' چھوٹی آپا نے ان کے ساکت وجود کو جھنجوڑتے ہوئے پھر کہا۔

''اب اگر لوگوں کی آنکھیں خراب ہوگئی ہیں...... تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' ذکیہ کو اپنی بہن کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔

''ذکیہ تمہاری عقل مندی یہی ہے کہ شہلا کا رشتہ طے کر کے اپنی سیدھی سی بچی راحیلہ کے لیے راستہ صاف کرو...... ورنہ وقت گزر گیا تو مشکل تمہاری ہی ہوگی۔''

''آپا کیا آپ کو کریم نے نہیں بتایا...... کہ وہ اس کی کتنی عزت افزائی کر چکی ہے۔'' ذکیہ کا لہجہ تذلیل آمیز تھا۔

''ہاں بتاتا تو ہے وہ کہ ان دونوں کی بڑی گاڑھی چھنتی ہے۔''

''ایل لو...... شہلا کی تو کبھی کریم سے دوستی ہی نہیں رہی......''

''دوستی ہی تو ہے...... جب ہی تو وہ دونوں منہ ماری کرتے رہتے ہیں...... کزن جو ہیں وہ دونوں۔'' اب چھوٹی آپا اپنے بائیں ہاتھ سے باچھیں پوچھ کر منہ میں پان گھماتے ہوئے رغبت سے ہنس رہی تھیں۔

''یہ تو وہی بات ہوگئی کہ گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہ ہوئے۔''

''ارے ذکیہ جب خالہ، پھوپی کے لڑکے لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہیں ناں...... تو وہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ دوسرے سمجھا کرتے ہیں کہ وہ لڑ رہے ہیں۔'' اپنی بات کو مکمل کرنے سے پہلے ہی وہ پھر ہنسنے کے لیے پر تولنے لگیں۔

''سچی کہہ رہی ہوں میں آپ سے شہلا اور کریم کی اکثر باتوں پر اچھی خاصی لڑائی ہو جاتی ہے۔'' ذکیہ نے انہیں انتہائی سنجیدگی سے سمجھایا۔

''ارے تم نے سنا نہیں...... جس سے زیادہ لڑیں...... اسی سے تو پیار ہوتا ہے۔ کیا تم ٹی وی کے ڈرامے سے نہیں دیکھتی ہو...... جو ہیرو اپنی ہیروئن کو کاٹ کھانے کو آتا ہے...... آخر میں وہ اسی سے شادی کے لیے اچھا خاصا بلک رہا ہوتا ہے۔'' چھوٹی آپا نے بھی علامانہ رائے دے دی۔

''اگر آپ نہیں سمجھنا چاہ رہی ہیں تو نہ سمجھیں...... مگر یہ حقیقت ہے کہ شہلا، کریم سے اچھی خاص نفرت کرتی ہے اور وہ کریم کا رشتہ کسی صورت بھی قبول نہیں کرے گی...... میں تو کہتی ہوں کہ آپ یہ مٹھائی بھی واپس لے جائیں...... اگر اس کے کانوں میں بھی ایسی بھنک پڑ گئی ناں...... تو وہ غل مچا دے گی ہاں۔''

''افوہ...... یہ کیوں نہیں کہہ رہیں کہ اب لڑکی تمہارے ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔'' چھوٹی آپا نے طنز میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

''آپ کچھ ہی سمجھیں...... مگر میں یہ رشتہ قبول نہیں کر سکتی۔''

''اور تم بھی کچھ ہی سمجھو...... میں یہ رشتہ پکا کروا کے رہوں گی کہ اب یہ میری زبان کی بات ہے...... ورنہ چار لوگوں میں مجھ پر تھو، تھو ہو جائے گی۔''

''مگر میں کیا کروں...... میری حالت سے باخبر ہو کر بھی آپ ایسی بات کہہ رہی ہیں۔'' ذکیہ نے ہتھیار ڈالے۔

''ذکیہ تم اپنے شوہر سے کہو کہ وہ نکیل ڈال کر رکھے...... ورنہ اس جیسی لڑکیاں تو گھروں سے بھاگ جایا کرتی ہیں۔'' وہ اب دوسری بات الاپنے لگیں۔

''خواہ مخواہ بھاگ جائے گی۔'' کما ؤ بیٹی کے لیے یہ بات انہیں ناگوار گزری۔

''اگر بھاگ گئی تو پھر کیا کرو گی؟ بے عزتی تو تمہاری ہی ہوگی ناں...... کالک تو تمہارے منہ پر ہی لگے گی...... اور غیر ذمے دار سوتیلی ماں کا ٹھپا بطور میڈل کے الگ تمہارے سینے پر لگ جائے گا۔''

''تو پھر کیا کروں...... میں نہ شہلا کے خلاف جا سکتی ہوں اور نہ ہی اس کے خلاف اس کے باپ سے کوئی بات کر سکتی ہوں۔''

''کیا رضیہ کے بعد بھی اسی کی حکومت چل رہی ہے...... تم زندہ بیوی ہو...... اور پھر بھی تمہاری بات نہیں مانی جاتی۔'' چھوٹی آپا کی یہ بات...... ذکیہ بیگم کو تیر کی طرح لگی۔

اور انہیں اب بشیر احمد کو کسی طرح بھی راضی کرنا تھا...... اور پھر انہوں نے بشیر احمد کو کس، کس طرح گھمایا...... اور کیسی، کیسی تاویلیں دیں...... یہ وہی جانتی تھیں اور پھر شہلا کو بتائے بغیر...... کریم کا رشتہ قبول کرلیا گیا اور بشیر احمد کو یہی باور کرایا گیا کہ شہلا بے وقوف سی لڑکی ہے جب رشتوں کی یہ بہار ختم ہو جائے گی تو کوئی بھی پوچھنے کے لیے نہیں آئے گا...... اور ابھی کون سی ہم شہلا کی شادی کررہے ہیں...... آہستہ، آہستہ اس کو کریم کے رشتے کے لیے آمادہ بھی کرلیں گے...... اگر فوراً بتایا تو وہ بے وقوفوں کی طرح اودھم مچادے گی...... اور بشیر احمد کو ایسا ہی لگا جیسے ذکیہ کی بات بالکل صحیح ہو اور یوں بھی انہیں کریم بھلا سا لڑکا لگتا تھا۔ جب بھی ملتا آگے بڑھ کر مصافحہ کرتا...... اگر باہر کہیں وہ پیدل دکھائی دیتے تو انہیں اپنی بائیک پر گھر تک چھوڑ بھی دیا کرتا...... اور اس عید پر تو وہ ان کے لیے ایک کرتا شلوار بھی لے آیا تھا۔

''بیٹا...... اب ہم بچوں سے تحفے تحائف نہیں لیں گے...... اس کی کیا ضرورت تھی۔'' بشیر احمد کو عجیب سا لگا تھا۔ اور انہوں نے جوڑا واپس اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

''خالو، آپ اس سال پہلی مرتبہ اعتکاف میں بیٹھے تھے...... یہ اس لیے جوڑا اماں نے آپ کے لیے بھجوایا ہے۔'' وہ زبردستی ان کو جوڑا دیتے ہوئے بولا تھا۔

''ہاں ٹھیک تو کہہ رہا ہے...... خوشی کے موقع پر مٹھائی اور جوڑے دیے جاتے ہیں۔'' ذکیہ نے بھی بھانجے کو کمک پہنچائی اور کریم اس لیے مسکرا رہا تھا کہ اسے شہلا تک جانے کا راستہ سہل کرنا تھا اور پھر کامیابی بھی اس کے حصے میں آہی گئی تھی...... کہ خاندان کے دیگر لڑکے اس پر رشک کررہے تھے اور اس نے جو شرط لگائی تھی وہ علیحدہ جیت چکا تھا۔

''شہلا کو کریم کبھی اچھا نہیں لگا تھا...... مگر وہ اتنا لیچڑ سا ہوگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ مختلف بہانوں سے اس کی چھٹی کے وقت اپنی بائیک لے کر آرہا تھا کہ ''ارے میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ تم نظر آگئیں...... آؤ میں تمہیں گھر تک ڈراپ کردوں۔''

''میں خود چلی جاؤں گی...... آپ پلیز چلے جائیں۔'' پہلی مرتبہ تو اس نے تمیز کے دائرے میں جواب دے دیا تھا۔

مگر جب دوسری اور پھر تیسری، چوتھی مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے بری طرح لتاڑ دیا اور گھر آکر علیحدہ برسی تھی کہ کیا کریم بھائی کو ہمیشہ ہی بے عزتی کی خوراک درکار ہوتی ہے۔

''امی...... آپ خالہ کو بتادیں کہ کریم کے گلے میں پٹا ڈال کر رکھیں وہ...... میں اس کی پھٹ پھٹی پر بیٹھ کر کہیں آنے جانے والی نہیں ہوں...... میں جس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی...... اس کی بائیک پر کیوں بیٹھوں گی۔''

''آپا...... اگر آپ کو ساری زندگی ہی اس پھٹ پھٹی پر بیٹھنا پڑے تو آپ کیا کریں گی؟'' راحیلہ نے ہنس کر کہا۔

''میں پاگل تو ہوں نہیں...... جو بیٹھ جاؤں گی......''

''آپ کو پتا ہے، کریم بھائی کا رشتہ آیا ہوا ہے، آپ کے لیے۔''

''اماں سے کہو کہ صاف منع کردیں...... میں ایک چھوٹے گھر سے مزید دوسرے چھوٹے گھر میں کبھی اپنی زندگی نہیں گزاروں گی۔''

"چھوٹی آپا...... تو اب بڑا گھر دیکھ رہی ہیں...... اب تھوڑی وہ چھوٹے گھر میں رہیں گی...... پھر تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا ناں......" ذکیہ بیگم نے لاڈ بھرے لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر مجھے کریم اچھا ہی نہیں لگتا اور نہ ہی اس کی سوا نو بجاتی ہوئی مونچھیں پسند ہیں۔"

"آپا، میں کریم بھائی سے کہوں گی...... ہٹلر جیسی بارہ بجانے والی مونچھیں رکھ لو...... پھر تو چلے گا ناں یہ رشتہ......"

"نہ کسی صورت میں بھی نہیں۔" وہ نفرت سے بولی۔

"مگر کیوں......" راحیلہ نے پوچھا۔

"مجھے میرا آئیڈیل مل چکا ہے......"

"کون ہے وہ......؟"

"حارث، بینک منیجر...... جو مجھے بہت پسند کرتا ہے۔"

"وہ آپ سے شادی بھی کرے گا؟"

"ظاہر ہے...... شادی تو میری حارث سے ہی ہوگی۔"

"مگر کب؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا......"

"تو پھر کریم بھائی کے رشتے کا کیا، کیا جائے؟"

"انہیں بتا دو...... کہ وہ شہلا کے قابل نہیں ہیں۔" وہ اترائی۔

"اس بات پر وہ برا مان جائیں گے، آپا کوئی ایسا کہتا ہے کیا؟"

"مان جائیں، میری بلا سے......"

"مگر کریم بھائی، دل کے بہت اچھے ہیں۔"

"اچھا پر میرا دل تو انہیں نہ جانتا ہے اور نہ جاننا چاہتا ہے تو میرے لیے ان کی اچھائی بھی بے فائدہ ہی رہی ناں......"

"ٹھیک ہے، میں اماں کو بتا دوں گی۔"

"ہاں بتا دینا...... تاکہ وہ میرے راستے تک میں نہ آئے...... جو خواب آنکھوں میں سجا کر آ جاتا ہے...... تو مجھے بے حد برا لگتا ہے بے حد برا......"

اور دروازے پر کھڑی ذکیہ بیگم یہ سب باتیں سن کر تلملاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں...... اور اپنے آپ سے بولیں۔

"شہلا، تم بہت اچھی ہو...... بہت خوب صورت ہو...... مگر کوئی تمہیں میری آنکھوں سے دیکھے...... تو اسے پتا چلے کہ تم کتنی بری ہو اور کس قدر بدصورت ہو۔"

ذکیہ کا یہ پکا خیال تھا کہ شہلا اپنے باپ کے سامنے کبھی زبان نہیں کھول سکتی...... ایسے کئی مواقع بھی آئے تھے اور شہلا خاموش رہی تھی مگر یہ ان کی خام خیالی تھی شہلا کی سالگرہ سے دو دن پہلے جب ان کی بہن کے گھر سے شہلا کے لیے ایک گھٹیا سا ریڈی میڈ جوڑا اور اسی کی ساتھ کی دوپٹی کی نگینوں والی چپل آئی تو وہ بلا جانے بوجھے اس کا مذاق اڑانے لگی۔

"راحیلہ یہ خالہ کے گھر میں پہننے اوڑھنے کی تمیز کب آئے گی...... اب پٹیالا شلوار کے ساتھ انہوں نے اتنی لمبی فراک کا فیشن کس جگہ دیکھ لیا...... وہ کسی سرکس میں کام کرنے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہی ہیں...... ڈارک نیلے کے ساتھ گہرا عنابی کا کمبی نیشن تو میں نے نہ کہیں دیکھا ہے اور نہ ہی مجھے پسند ہے۔"

”پلیز آپا! آپ ان چیزوں کا مذاق نہ اڑائیں۔“ تب راحیلہ نے اسے بڑی رازداری سے بتاتے ہوئے کہا۔

”مگر کیوں بھئی...... میری مرضی، میں جو دل چاہے کہوں......“ وہ پھر ہنسی۔

”کہہ رہی ہوں ناں کچھ نہ کہیں...... اگر کسی نے سن لیا تو یوں بھی پڑوس کی ستارہ مامی اِدھر کی بات اُدھر کرنے میں ماہر ہیں، انہیں تو ہمارے گھر سے وہ کچھ بھی سنائی دے جاتا ہے جو کسی نے کہا بھی نہیں ہوتا۔“ راحیلہ کا لہجہ ہنوز رازداری لیے ہوئے تھا۔

”مگر کوئی وجہ بھی ہو؟ خواہ مخواہ ہی میں ہونٹوں پر تالے ڈال لوں۔“

”یہ سب چیزیں آپ کی سسرال سے آئی ہیں۔“

”کیا کہا؟ وہ دہاڑی۔“ دیکھو راحیلہ تمہیں پتا ہے میں مذاق میں بھی جھوٹ برداشت نہیں کرتی۔“

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جھوٹ بولنے کی...... جو بات ہے وہی تو کہوں گی......“

”کیسی بات ہے، کیا بات ہے؟ جو مجھے معلوم تک نہیں۔“ اس نے اپنی تیز آواز کو قدرے کم کرتے ہوئے پوچھا...... مگر دہکتی ہوئی آنکھیں...... اس کے غصے کی بخوبی عکاسی کر رہی تھیں۔

”آپ کا رشتہ کریم بھائی کے ساتھ طے ہو گیا ہے۔“ اس نے آہستگی سے بتایا۔

”کس نے کیا ہے؟“ وہ دہاڑی۔

”ابو نے، امی نے...... سب کے والدین ہی کیا کرتے ہیں۔“

”مجھ سے پوچھے بغیر؟“ اس نے حیرت اور غصے سے کہا۔

”اب ابو، آپ سے مشورہ کرتے کیا؟ آپ سے اجازت طلب کرتے؟ آپ کی خوشامد کرتے جو انہوں نے کیا بہتر کیا۔“

”ہاں مگر میری پسند پوچھنا تو ضروری تھا ناں۔“ وہ بولی۔

”مگر ہمارے والدین کو اپنی بیٹی پر بڑا اعتماد ہے...... وہ جانتے ہیں کہ وہ جو بھی کریں گے ان کی بیٹی کو وہ منظور ہوگا۔“ راحیلہ نے بہن کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

شہلا چپ رہی...... یوں جیسے اپنے آپ کو ٹٹول رہی ہو کہ اس خبر نے اسے کس حد تک جھلسایا ہے۔

”آپا یہ سب چیزیں کریم بھائی نے بہت محبت کے ساتھ بھجوائی ہیں۔ آپ کو تو ان کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے، وہ آپ کے منگیتر ہیں اور کوئی اپنے منگیتر کی لائی ہوئی چیزوں کو ایسے کہتا ہے بھلا...... وہ تو آپ کے غصے پر بھی مسکرایا کرتے ہیں۔“ اس کی خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھ کر راحیلہ بھی تقریر جھاڑتی چلی گئی۔

”کیا...... کیا کہا......؟“ وہ پھر چیخی، اسے احساس ہو گیا تھا۔ بہن کی باتیں سن کر وہ سرتاپا سلگ چکی تھی۔

”میرا مطلب ہے، اب آپ کا یوں شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے...... ابو نے آپ کا رشتہ کریم بھائی سے طے کر دیا ہے۔“ راحیلہ نے ماں کی سمجھائی ہوئی بات اس کے گوش گزار کی۔

”کیا میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی یہ رشتہ طے ہو گیا تھا۔“

”نہیں، پچھلے ماہ ہی طے ہوا ہے، میں نے ان دنوں آپ کے کان میں بات ڈالی تو تھی۔“

”مگر میں تو اسے تمہارا مذاق سمجھی تھی۔“

”مگر یہ مذاق نہیں، تھا آپا۔“

”تو یہ سب چیزیں اٹھا کر کوڑے کی ٹوکری میں ڈال دو...... یہ میں مذاق میں نہیں حقیقت میں کہہ رہی ہوں۔“

”مگر اگر ابو نے پوچھ لیا تو......؟“ راحیلہ نے سہم کر کہا۔

''تو میں انہیں خود بتادوں گی کہ میری ماں ضرور مری ہے مگر میں نہیں مری ہوں، میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کروں گی۔ سمجھ میں آیا یا نہیں۔'' اس لمحے وہ اتنی زور سے چیخی کہ کچن میں آلو کاٹتے ہوئے ذکیہ کے ہاتھ سے چھری ان کی انگلی کو زخمی کر گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ شہلا اس حد تک بھی خود سر ہو سکتی ہے جو اُن کی بچھائی ہوئی بساط تک الٹنا جانتی ہے۔

رات کو جب باپ کے سامنے اس کی پیشی ہوئی تو اس نے بغیر ڈرے اپنا موقف باپ کے سامنے بھی پیش کر دیا......اور زبردستی کی صورت میں گھر سے کسی ہاسٹل شفٹ ہونے تک کا عندیہ دے دیا۔

''تم اتنی بدتمیز ہو گی، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چھوٹے بڑے کی تمہارے سامنے کوئی عزت ہی نہیں ہے۔''

''ذکیہ خالہ نے میری تربیت ہی اچھی نہیں کی تو اس میں میرا کیا قصور......انہوں نے شروع دن سے ہی مجھے یہ سکھایا تھا کہ خاندان میں کبھی شادی نہیں کرنا......تمہارے باپ سے شادی کر کے مجھے وہ خوشی کبھی نہیں ملی جو کسی دوسری جگہ شادی ہونے پر مجھے مل سکتی تھی۔''

شہلا نے ذکیہ بیگم کے کبھی کے کہے ہوئے جملے اس خوب صورتی سے اپنی گفتگو میں فٹ کیے کہ وہ بھی بغلیں جھانکنے لگیں۔

☆☆☆

وہ پارک میں جوگنگ کر رہا تھا......موسم اچھا تھا، ہلکی ہلکی بوندا باندی میں وہ مسکراتے ہوئے راؤنڈ مکمل کر کے ٹاول سے اپنا چہرہ اور بازو خشک ہی کر رہا تھا کہ اس کے موبائل پر بپ ہوئی......اسکرین پر نام دیکھ کر اس نے موبائل آن کیا اور بولا۔

''میں پارک میں ہوں، ہاں بس گھر ہی جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں بات کرتے ہیں۔'' اور موبائل آف کر کے پاکٹ میں ڈال کر وہ بیگ کاندھے پر ڈال کر پھولوں کو خوش دلی سے دیکھتے ہوئے جا رہا تھا۔

دوسری جانب......فرید اپنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اپنے آپ سے بات کرتے ہوئے غصے میں کہہ رہا تھا۔

''ہونہہ......لاٹ صاحب کہیں کا......جوگنگ کے لیے ٹائم ہے گھومنے، پھرنے کے لیے ٹائم ہے۔ مگر ٹائم نہیں ہے تو میرے اخبار کے لیے ٹائم نہیں......پتا نہیں اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔'' گاڑی کے ڈیک پر بجتے میوزک کے ساتھ ساتھ سیٹی بجاتے ہوئے وہ گاڑی تیزی سے چلاتا جا رہا تھا کہ اس کے موبائل پر پھر بپ ہوئی تو وہ اسکرین پر فرید کا نام دیکھ کر مسکرا دیا۔

''بے صبرے انسان مجھے گھر تو پہنچنے دو۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''آخر ایسی کون سی خاص بات ہے جو آج تم صبح سے ہی میرے کان کھائے جا رہے ہو، اگر ہم کچھ دیر بعد بات کر لیں تو کیسا رہے گا۔''

''ابے میری بات تو سن......میں کیا کہہ رہا ہوں، عقل بیچ کھائی کیا' فرید جھنجلا کر بولا۔

''بس پانچ منٹ گھر جا کر بات کرتا ہوں۔''

فرید اس کی بات پر غصے سے اپنا موبائل بستر پر پھینک کر بڑبڑانے لگا۔

''خبیث کہیں کا میری بات جان بوجھ کر نہیں سن رہا اور نہ ہی سمجھ رہا ہے......ہر بات کو لائٹ لینے کا عادی ہے۔ پتا نہیں کب یہ سمجھے گا۔''

☆☆☆

ادھر سلمیٰ بیگم نے واقعی اپنا سر تھام لیا تھا۔

''اُف خدایا ایسی بھاری، بھاری باتیں کیں تم نے اس سے۔ وہ یقیناً تمہیں کوئی تیز وطرار خاتون سمجھ رہی ہوگی۔ کیا ضرورت تھی تمہیں باتیں سنانے کی۔ یہ کوئی زبردستی کا سودا تھوڑی تھا جو وہ جھٹ قبول کرلیتی۔'' سبین کی باتیں سن کر سلمیٰ بیگم کو بالکل بھی خوشی نہیں ہوئی۔

''اماں، اگر کوئی اپنے گھر بلا کر مہمانوں کو بے عزت کرے تو ایسے لوگوں کی طبیعت صاف تو کرنی چاہیے ناں!'' سبین بدستور اپنے موقف پر قائم تھی۔

''نہیں بیٹا، اس کی کوئی ضرورت ہوتی، وقت سب سے بڑا استاد ہے، وہ ہر ایک کو ہر بات اچھی طرح خود سمجھا دیتا ہے......'' سلمیٰ بیگم نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''اگر ایسا ہوتا ناں تو اصل بات کب کی اُن کی سمجھ میں آچکی ہوتی۔ بعض لوگ دوسروں کے تجربوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور ایسے لوگ ٹھوکر کھا کر ہی سمجھا کرتے ہیں۔'' سبین نے کہا۔

''اللہ نہ کرے کسی کو کوئی بھی پریشانی آئے۔ مگر مجھے تو وہ لڑکی جہاں بھی نظر آتی ہے، غصہ ہی آجاتا ہے، آج صبح بھی مجھے وہ اپنی خالہ کے ساتھ مال میں جاتی نظر آئی تھی۔ میں نے تو اپنا پروگرام ہی کینسل کردیا۔''

''میں تو اس بات کا شکر کررہی ہوں کہ یہ بات بڑھنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔ اگر یہ سلسلہ چلنے کے بعد ختم ہوتا تو تمہارے بھائی کا دل تو مزید کھٹا ہوجاتا......اور وہ شادی کا نام ہی نہ لیتا۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... آپ تو اب اپنے لاڈلے سپوت سے یہ کہہ دیں کہ جو اچھی لگی......وہ ہمیں بتادے، ہم بیاہ لائیں گے......لڑکی ڈھونڈنا بہت مشکل کام ہے۔''

''اتنی جلدی تھک گئیں تم...... جب بڑے کی شادی ہوگی تو چھوٹے کی ہوگی ناں......''

''آج کل لڑکے جو خود کرلیتے ہیں، وہ زیادہ بہتر ڈھونڈ لیتے ہیں...... میں تو واقعی تھک گئی۔''

''میں تو سوچ رہی تھی تم اپنی سسرال میں ہی ڈھونڈ لو......لڑکیاں تو اچھی ہیں اور پھر تمہاری دیکھی بھالی بھی۔''

''نہیں اماں...... پھر وٹا سٹا ہوجائے گا، لڑکی تو باہر سے ہی لانی ہے مگر اب آپ بھائی سے کہہ دیں کہ جو انہیں اچھی لگ رہی ہے، وہ ہمیں بھی بتادیں۔'' سبین بولی۔

☆☆☆

وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ڈنر کرکے واپس گھر جارہا تھا۔ موڈ خاصا خوشگوار تھا...... سڑک پر ٹریفک کچھ کم تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی......رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

''اُف کافی دیر ہوگئی ہے آج۔'' اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ اور کچھ ہی دیر میں وہ اپنے گھر میں تھا...... اپنے کمرے میں جاکر اس نے اپنے موبائل فون پر ایک نظر ڈالی جو سائلنٹ تھا۔

''اُف، دس مسڈ کالز۔'' اچھا بھلا موڈ تناؤ کا شکار ہوگیا اور وہ خاصی برہمی سے جوابی کال کرکے بول پڑا۔

''میں نے تمہیں منع تو کردیا ہے...... پھر کیوں میری جان کو آرہے ہو۔ سیدھی بات کیا سمجھ میں نہیں آتی؟''

''دیکھو میرا اخبار ڈوب رہا ہے اور تمہیں اپنے دوست کے نقصان کا احساس تک نہیں۔'' فرید یاس بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ابھی اخبار صحیح طرح سے نکلا نہیں اور یہ ڈوبنے بھی لگا۔'' ندیم کو اس کی بات پر ہنسی آگئی۔

''پری میچور تو جلدی ختم ہوسکتے ہیں ناں۔''

''ہوجانے دو، میں کیا کروں۔'' وہ پھر اپنی رو میں آگیا۔

''اگر یہ اخبار اپنی جگہ نہ بنا سکا ناں تو میرے حوصلے ٹوٹ جائیں گے پھر میں کچھ نہیں کرسکوں گا بس یار تو

آ جاناں۔'' فرید اب خوشامدی لہجے میں کہہ رہا تھا۔
''مگر میں آ کر کیا کروں گا...... اچھا خاصا اسٹاف ہے تمہارے پاس بس اُن سے صحیح طرح سے کام لو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''
''یہ کام تو ہی لے سکتا ہے۔ پلیز ندیم آ جا۔'' فرید اب ملتجی لہجے میں اپنے دوست سے کہہ رہا تھا اور جب فرید کا بے حد جذباتی بلیک میلنگ ختم ہوا تو ندیم نے یہ کہہ کر فون آف کر دیا۔
''اچھا سوچوں گا۔'' اور فرید اپنے ہونٹ چبا کر رہ گیا...... اس کا دل چاہا وہ ہمیشہ کی طرح ندیم کو خوب باتیں سنائے جسے اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ مگر اندر سے اٹھنے والا جوار بھاٹا اس کے ہونٹوں تک نہیں آیا کہ اب وہ یہ دلخراش منظر دیکھنے کی ہمت کرنے لگا کہ اخبار کے بنڈل اس کی سوزوکی میں واپس آ رہے تھے اور فرید دم سادھے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ورکر یہ بنڈل گودام میں رکھوا رہے تھے اور پھر وہ ندیم خان کو فون کر کے اتار دیا کہ اسے احساس تک نہیں ہوا۔

☆☆☆

آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے اور سبین کا کہا ہوا ہر لفظ میرے اوپر سنگ باری کر رہا تھا۔
''ابھی تک تم منگنی کی قیدی ہو ناں، منگنی دراصل ڈھکنی ہوتی ہے۔ اس میں لڑکی والوں کے ڈھنگ دیکھے جاتے ہیں۔ اور اس کی کوئی قانونی حیثیت تو ہوتی نہیں ہے جو لڑکے والے کسی کو جواب دہ ہوں...... اس لیے وہ بھاگ جاتے ہیں۔'' یہ امی اور خالہ نے اس عورت کو اس لیے بلایا تھا کہ وہ مجھے جہاں ملے باتیں سنائے۔
اس وقت گھر میں کوئی نہیں تھا...... اور میں خوب چیخ، چیخ کر رو رہی تھی۔ ورنہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے ہوئے میری یہ آرزو تک پوری نہیں ہوتی تھی کہ خوب دھوم دھام سے رو تک سکوں۔ میری سہیلی کی نکاح کی تقریب میں سبین نے صرف مجھے اس لیے باتیں سنائی تھیں کہ امی نے انہیں اپنے گھر آنے کی اجازت دے دی تھی۔
کال بیل کی آواز سن کر میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے دروازہ کھولا۔ امی اور خالہ ہنستی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ مگر میری سرخ آنکھوں کو دیکھ کر فوراً بولیں۔
''کیا بات ہے؟ یہ تمہاری آنکھیں لال سی کیوں ہو رہی ہیں؟''
''میں لوگوں کی باتیں سوچ کر بہت خوش ہو رہی تھی...... اس لیے وہ بھی سرخ ہو گئیں۔''
''کس کی بات نے تمہیں یوں لہولہان کر دیا؟'' امی نے تڑپ کر پوچھا۔
''جن کو آپ نے اپنے گھر مدعو کیا تھا جن کے سامنے ناشتے کی میز سجائی تھی...... جو جاتے ہوئے بھی مجھے باتیں سنا کر گئیں...... اور جہاں، جہاں مجھ سے ٹکرائیں گی اپنے لفظوں کی برچھیوں سے مجھے چھلنی کرتی رہیں گی۔''
''دماغ تو نہیں خراب ہو گیا اُن کا......'' فرح خالہ کو غصہ ہی آ گیا۔
''خالہ، غلطی تو آپ کی اور امی کی ہی ہے کہ آپ نے کسی کو اپنے گھر میں کیوں بلایا...... جبکہ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی ہوں۔''
''ارے ہم نے تو اس وجہ سے بلا لیا تھا کہ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا...... ہمارا خیال تھا کہ تمہیں بھی پسند آ جائے گا......'' خالہ نے کہا۔
''اگر ذرا بھی یہ اندازہ ہوتا کہ الٹے دماغ کے لوگ ہیں تو کبھی نہ بلاتے۔''
''ہونہہ، آج کل بظاہر خوب اچھے لوگ بھی انتہائی خراب ہوتے ہیں۔'' میں نے جل کر کہا اور کمرے میں چل دی۔
''اگر میں پہلے ہی دن ان سبین صاحبہ کی طبیعت اچھی طرح صاف کر دیتی تو اُن کی یہ ہمت نہیں ہوتی مجھے اس طرح باتیں سنانے کی۔ ہونہہ بڑی تو قلی ہے اپنے بھیا پر...... جیسے کہیں کا لاٹ صاحب ہو وہ۔'' اب میں از خود

بڑبڑا رہی تھی۔

''توبہ ہے، میں اس چھچھوری سی عورت کی وجہ سے رو رہی ہوں۔'' اپنے آنسو میں نے خود ہی پونچھے۔

''اگر اب سین تو کیا اس کا وہ شہزادہ بھیا بھی سامنے آ گیا ناں تو ان کو چٹکی بجاتے میں فارغ کر دوں گی...... یوں'' (انگلی سے چٹکی بجاتے ہوئے) میں ہنسی۔

☆☆☆

اُدھر وہ گاڑی چلاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد مجھ سے دوستی کی خواہش مند ہے اور منع کرنے کے باوجود مختلف بہانوں سے میرے قریب آنے کی کوشش کرتی ہیں۔ فیس بک پر نوے فی صد لڑکیاں روزانہ فرینڈ ریکوئسٹ بھیجتی ہیں اور...... ایک لڑکی نے اسے ریجیکٹ کر دیا۔

''آخر...... وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے......؟ اور ہے کون......؟ ہونہہ اگر سامنے کبھی آ گئی تو صرف دو منٹ میں اس کی طبیعت صاف نہیں کی تو میرا نام بھی ندیم خان نہیں۔''

اس نے سوچا اور اب اس کی گاڑی گھر تک پہنچ گئی تھی۔ آج ویک اینڈ پر اماں سین آپا کی طرف گئی تھیں اور چھوٹا بھائی اپنے آفس کے کام سے دوسرے شہر گیا ہوا تھا...... سو وہ خاصی دیر سے گھر میں داخل ہوا تھا۔

''صاحب جی...... کھانا لاؤں؟'' ملازم نے پوچھا۔ اور وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہیں لاؤنج کے صوفے پر پیر پھیلا کر بیٹھ گیا اور صوفے کی بیک پر اپنی گردن ٹکالی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بے حد تھک گیا تھا۔ اس لڑکی کا انکار ہنوز اس کے مزاج کو چڑچڑا سا کر رہا تھا۔

''پہلے شاور لے لوں پھر بیڈ روم میں جا کر اپنا کچھ کام کروں گا۔'' یہ سوچ کر تاول لے کر وہ واش روم کی جانب بڑھا ہی تھا تو اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے اکتائی ہوئی نظر موبائل پر ڈالی تو اس کی اسکرین پر فرید کا نام جگمگا رہا تھا۔

''یا وحشت! کیا مصیبت ہے بھئی...... ایسی کون سی بات ہے جو تم یوں بار بار مجھے فون کر رہے ہو؟'' اس کا لہجہ خفگی بھرا تھا جیسے اسے ڈسٹرب کر دیا گیا ہو۔

''میری بات بھول گیا کیا؟ پھر بتاؤں میں؟'' فرید جل کر بولا۔

''ہاں پھر بتاؤ؟ میں اتنا فارغ نہیں ہوں جو فالتو کی باتیں یاد رکھوں...... مجھے کچھ یاد نہیں ہے کہ تم نے کیا بکا تھا...... ہاں ذرا رک، پہلے میں شاور لے لوں پھر تجھ سے بات کرتا ہوں۔''

''نہیں، پہلے میری بات سنو۔'' فرید پھر دہاڑا۔

''اچھا بول، کیا کہنا ہے؟'' وہ ٹاول بیڈ پر پھینک کر وہیں قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ندیم یار...... میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا میرا اخبار جوائن کر لو...... تو تم میری بات کیوں نہیں مان لیتے...... میری پریشانی کا آخر تمہیں احساس کیوں نہیں ہے؟''

''مگر میں نے حامی ہی کب بھری تھی...... میں نے تو تمہیں اسی وقت منع کر دیا تھا ناں۔''

''تم نے کہا تھا کہ میں سوچوں گا......'' فرید کا لہجہ دھیما پڑا۔

''ہاں میں نے سوچ کر ہی منع کیا تھا...... اور کئی بار منع کیا تھا۔ یاد کرو تم کہ تمہاری اس بات پر میں نے بھلا کتنی بار حامی بھری ہے؟ اپنا حافظہ تو ٹھیک کر لو پہلے۔'' اس نے لفظوں کو چباتے ہوئے کہا۔

''مگر یار...... تو آ جا...... چاہے پارٹنر شپ میں آ جا...... مگر میرے اخبار کو آ کر دیکھ لے...... مجھے پتا ہے تیرے آنے سے وہ چلے گا نہیں بلکہ بھاگے گا اور خوب تیز بھاگے گا...... ہاں۔''

''فرید تم، شیخ چلی کی طرح خواب دیکھنا چھوڑ دو...... میری مجبوری سمجھو...... میں ان دنوں مصروف ہوں اور

یوں بھی میرا تجربہ انگریزی اخبار میں کام کرنے کا ہے، میں اردو اخبار کو نہیں چلا سکتا......" اس نے صفاچٹ انکار کر دیا۔

"پلیز ندیم...... اپنے اس دوست کو جس کو کبھی تم اپنا جگری دوست کہا کرتے تھے، اس کے اخبار کو گرتے ہوئے کیا تم بخوشی دیکھو گے۔" اب فرید کا لہجہ دکھی سا تھا۔

"یار میرے گھر تک میں کوئی اردو اخبار نہیں آتا بغیر تجربے کے میں کیسے کام کر سکتا ہوں...... اس لیے پلیز...... اس موضوع کے علاوہ دوسری بات کر۔"

"یہ بات تم کہہ رہے ہو۔" فرید کا لہجہ ہنوز ملتجی سا تھا۔

"ہاں یار...... مجھے وحشت ہوتی ہے، ایسی باتوں سے ایسے کاموں سے...... جن میں مجھے رتی بھر دلچسپی نہ ہو اور وہ مجھے کرنے کو کہا جائے...... میں نہیں کر سکتا بھئی...... تم سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"اچھا، اب تو اترا رہا ہے یا قابل بن رہا ہے۔"

"ایسی باتوں کی مجھے کبھی نہ عادت رہی ہے اور نہ تجربہ ہے۔"

"ہاں اپنے دوستوں کی بھی اب شاید تجھے عادت نہیں رہی ہے...... وہ دوست جو تجھے اسکول میں شریر بچوں سے بچایا کرتا تھا...... وہ دوست جو تیرے سیمینار کی کامیابیوں کے لیے ہمہ وقت دعائیں مانگا کرتا تھا، وہ دوست جو تجھے ان لڑکیوں تک سے بچایا کرتا تھا جو شہد پر بھنکنے کے بجائے تیری پرسنالٹی کے ارد گرد جمع ہو جایا کرتی تھیں۔"

"ٹھیک ہے تم میرے دوست تھے...... اگر ایسا کچھ کرلیا تو یہ تمہارا فرض بھی تھا۔" وہ ہنس کر اسے چڑانے والے انداز میں بولا۔

تب فرید نے اسے اتنی سنائیں...... اتنی کہ وہ چپ چاپ اس کی ہر بات شربت کے گھونٹ کی طرح اتارتا رہا...... اور جب وہ بولتے بولتے تھک گیا تو وہ بولا۔

"جتنے احسانات جتانے تھے وہ تم نے جتا دیے...... اب ٹھنڈا پانی پی لو کہ کہیں اخبار سے پہلے تم ہی تم گر جاؤ کہ گرے ہوئے انسان تو تم ہو ہی۔" فرید اس کی بات پر مزید کچھ کہتا...... مگر ایک ہنسی کے ساتھ وہ موبائل آف کر چکا تھا۔

شاید وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو تپانے میں ماہر تھے۔

☆☆☆

"یہ فرید اس سے قبل ایسا تو نہیں تھا۔" فریش ہو کر وہ اپنا پسندیدہ جوس پیتے ہوئے سوچ رہا تھا اور کتاب کی ورق گردانی بھی کر رہا تھا۔

"میرا بے حد پرانا دوست، اسکول سے یونیورسٹی تک کا ساتھی آج کتنا پریشان ہے۔" اسے دکھ سا ہوا۔ تب اچانک ہی اس کی نظریں کتاب پر جم گئیں۔ جس میں لکھا تھا۔

"زندگی جب بہتر ہوتی ہے جب آپ خوش ہوتے ہیں لیکن زندگی تب بہترین ہوتی ہے جب آپ کی وجہ سے کوئی دوسرا خوش ہوتا ہے۔"

"ہوں...... یہ تو ہے۔" کتاب بند کر کے وہ گہری سانس لے رہا تھا۔

"مگر آج کل تو کوئی کسی کو خوشی دینے کے بجائے دکھ دے کر زیادہ خوش ہو رہا ہے......" یکبارگی اس نے سوچا۔

"ہاں بالکل...... ایسا ہی ہو رہا ہے، ایسا ہی چل رہا ہے۔" جیسے اس کے دل نے کہا۔

"مگر میں تو ایسا نہیں ہوں...... تو پھر...... تو پھر کیا مجھے بھی ایسا ہی ہو جانا چاہیے......؟" دیکبارگی اس نے

سوچا...... کتاب تیزی سے بند کی...... گلاس میز پر پٹخا...... اور اب وہ تیزی سے موبائل پر نمبر ملا رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے فون اٹھایا تو دوسری طرف فرزانہ تھی۔

"صبو...... کل میں آفس ذرا لیٹ آؤں گی، تم باس کو بتا دینا۔"

"تم تو روز ہی دیر سے آتی ہو...... اور یہ بات تو وہ بخوبی جانتے ہیں۔" مجھے ہنسی آ گئی۔

"مگر کل شاید زیادہ دیر ہو جائے۔" وہ بولی۔

"تو تم کب تک پہنچو گی؟"

"شاید دو ڈھائی تک۔" اس نے بتایا۔

"اور پانچ بجے گھر کے لیے نکل جاؤ گی۔"

"ظاہر ہے ایک گھنٹے کا تو میرا راستہ ہے بھئی۔"

"تو پھر، پوری ہی چھٹی کیوں نہیں کر لیتی ہو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"چھٹی کرنے سے فرید صاحب زیادہ ناراض ہو جاتے ہیں، بس اسی وجہ سے آ رہی ہوں...... ورنہ میرا تو چھٹی کرنے کا ہی موڈ ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں بتا دوں گی۔"

"ہاں، تم لوگ لنچ مت کرنا...... میں مزے دار سندھی بریانی لے کر آؤں گی۔"

"ریئلی......!"

"ہاں یار...... لنچ پر مہمان آ رہے ہیں...... ان کی ٹیبل سیٹ کر کے باقی میں آفس لے آؤں گی۔"

"یہ تو زبردست نیوز ہے بھئی...... ہمارے بگ باس تو ویسے بھی بریانی کھانے کے شوقین ہیں۔"

"نہیں، بھئی ان کو نہیں دینی...... ورنہ جب غصے میں جھاڑیں گے تو کہیں گے آپ لوگوں کے پاس بریانی کھا کر باتیں بنانے کے سوا کوئی کام ہے۔"

"ہاں اس طرح تو ہوتا ہے۔" میں ہنسی۔

"صبو، تمہیں خاص خبر معلوم ہے۔"

"کون سی خبر؟"

"اپنے بگ باس، کسی توپ چیز کو اپنے اخبار میں لانا چاہتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"تا کہ کوئی توپ آ کر آفس میں پھٹ پڑے۔"

"اللہ نہ کرے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اور اللہ نہ کرے...... میں کبھی سبین سے دوبارہ ملوں" میرے دل نے چپکے سے یہ دعا مانگی...... جو لوگ مجھے دکھ دینا چاہتے ہیں اُن سے میں کبھی ملنا نہیں چاہتی۔

☆☆☆

"اماں، وہ پگلو لڑکی مجھے کل پھر مال میں نظر آئی تھی۔" سبین اماں سے کہہ رہی تھی۔

"تو پھر...... کیا اس نے تم سے کچھ کہا؟" سلمٰی بیگم نے بیٹی سے پوچھا۔

"وہ کیا مجھ سے کچھ پوچھتی...... میں نے تو اس کو دیکھ کر ہی اپنا راستہ تبدیل کر لیا تھا...... وہ اپنی سہیلیوں کے

گروپ کے ساتھ تھی پتا نہیں...... کیوں...... یہ لڑکی...... مجھ سے بار، بار کیوں ٹکرا رہی ہے؟'' اندر کمرے میں...... ندیم تیار ہوتے ہوئے یہ جملے سن کر اپنے آپ سے بولا۔

''کاش یہ لڑکی...... ایک مرتبہ مجھ سے ٹکرا جائے تو میں بھی تو دیکھوں کہ موصوفہ کتنے پانی میں ہیں۔''

''اماں، اس لڑکی کو دیکھ کر پتا نہیں مجھے اتنا غصہ کیوں آجاتا ہے...... اور پھر بعد میں تاسف بھی ہوتا ہے۔''

''شاید اس لیے کہ ہمارے ہاں رشتے ناتوں میں ہاں یا نہ گھر کے بڑے کیا کرتے ہیں...... مگر اس نے از خود ہی جواب دے دیا تھا جو شاید ہمیں ناگوار گزرا......''

''ہاں طنطنہ تو بہت تھا اس میں۔'' سبین بولی۔

''اور مجھے تو ایسی لڑکیاں ہی بری لگتی ہیں۔'' ندیم اسپرے کرتے ہوئے گویا اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ''اچھا ہوا اس نے خود ہی منع کر دیا...... ورنہ یہ کام مجھے کرنا پڑ جاتا۔''

''اماں کبھی، کبھی تو میرا دل چاہتا ہے ایک خط لکھوں ان محترمہ کو اور اسے بتاؤں کہ لوگوں سے گفتگو کرنے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔'' سبین نے ہنس کر کہا۔

''آپا...... آپ کیا کسی کی ٹیچر ہیں...... جو لوگوں کو فری میں ایجوکیٹ بھی کریں گی۔'' اب وہ کمرے سے باہر آکر اپنی ماں، بہن کی گفتگو میں شریک ہو چکا تھا۔

''مگر آج کل کسی کو جب تک آئینہ نہ دکھایا جائے اسے اپنی شکل بلکہ اصلی شکل نظر نہیں آتی۔''

''پلیز آپا...... ایسا کچھ مت کیجیے گا، جس راہ ہمیں جانا ہی نہیں تو اس سے رابطہ ہی کیوں رکھیں۔ اور ہاں آپ بے شک اچھی رائٹر بھی ہیں مگر پلیز ان محترمہ کو بھی لیٹر مت لکھ ڈالیے گا کہ کل کلاں کو کوئی جھاڑ کے کانٹوں کی طرح پریشان کرنے آجائے۔''

☆☆☆

گھر میں داخل ہوئی تو ایک اجنبی تحریر کا لفافہ میری ٹیبل پر رکھا تھا...... ''یہ آج شام آیا ہے۔ ڈاک سے۔'' فرح خالہ نے مجھے بتایا...... اور میرا آف سا موڈ دیکھ کر بولیں۔ ''پہلے چائے پی لو...... اس کو بعد میں پڑھنا۔''

مگر میں نے بے دلی سے وہ لفافہ اٹھایا...... کھولا، پڑھا اور پھر بے اختیار ہنستی چلی گئی۔

''الٰہی خیر، کس بات پر اتنی ہنسی آرہی ہے تمہیں، اپنے آفس سے تو منہ بناتی ہوئی آئی تھیں...... اور اپنی ڈاک دیکھ کر ہنسی ہی نہیں رک رہی...... کیا کسی نے لطائف کی گٹھڑی بھیج دی ہے۔'' فرح خالہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

''خالہ، آج ایک پروڈکشن ہاؤس سے جاب کی آفر اس شرط کے ساتھ آئی ہے...... کہ آپ کو کم از کم دس رائٹرز کو بھی لانا ہوگا......'' میں پھر ہنسی...... (لوگوں کے شاطر دماغوں کا واقعی کیا کہنا تھا)

''ظاہر ہے جب تک لکھنے والے نہیں ملیں گے یہ پروڈکشن ہاؤسز صرف فنکاروں کو بک کر کے تو ڈرامے نہیں تیار کر سکتے ناں۔''

''وہ بیچارے بھی کیا کریں...... انہیں بھی تو اپنا کام چلانا ہے۔'' امی کو ہر ایک سے بے وجہ کی ہمدردی ہو رہی تھی۔

''نہیں امی، یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ یہ جاب لیٹر پڑھ کر تو مجھے گلی، گلی کھلنے والے وہ چھوٹے، چھوٹے سے اسکول یاد آرہے ہیں جس میں وہاں کی ٹیچر کی تنخواہ اس کمیشن سے منسلک ہوتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ کتنے بچوں کا مذکورہ اسکول میں داخلہ کرواتی ہے۔''

''صبا تم یہ کیوں نہیں مان لیتیں کہ رائٹرز کی ویلیو کوئی خاص نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی ایڈیٹر کی۔'' فرح خالہ کو بھی

ایسا کھرا سچ بولنے کی عادت تھی جسے سن کر دوسرا تلملا جائے۔

"مگر میں تو منوا کر رہوں گی...... اور یہ باور کراؤں گی کہ کسی بھی ڈرامے، سوپ، اخبار اور میگزین کی کامیابی پہلے اس کے رائٹرز کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور پھر اس کے ایڈیٹر کی بھی کہ وہ اپنے گلدان کو کن پھولوں سے ترتیب دیتا ہے اور کس نفاست اور مہارت سے کس پھول کو کس جگہ پر لگاتا ہے۔"

"ہونہہ...... منوا چکیں تم یہ سب اپنے خواب......" فرح خالہ نے تمسخر سے ہنس کر چائے کا مگ مجھے تھمایا اور بولیں۔ "بیٹا چائے پیو...... اور فریش ہو جاؤ...... بیکار کی باتوں میں اپنا سر کیوں کھپا رہی ہو۔" آفس سے آتے ہی مجھے چائے کی طلب ہوا کرتی تھی...... اور میں ٹی وی دیکھتے ہوئے باتیں بھگارتے ہوئے چائے پینے کی بھی عادی تھی...... مگر آج میں نے چائے کے مگ کو واپس ٹرے میں رکھ دیا۔

"ارے کیا ہوا...... طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری...... آج تم چائے نہیں پیو گی؟" خالہ نے مجھے تمسخرانہ انداز میں نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"دل نہیں چاہ رہا...... بس......" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"اگر تمہارا دل قلفی، جوس، آئس کریم اور چاٹ کھانے کو چاہ رہا ہے تو تمہاری یہ پیاری سی خالہ تمہیں دو منٹ میں باہر لے جا کر کھلا سکتی ہے۔"

"نہیں خالہ اس وقت بالکل بھی کچھ کھانے پینے کا موڈ نہیں ہے...... آفس میں زیادہ ہو گیا تھا۔" یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف چل دی کہ آج میرا دل نہ جانے کیوں ماندہ، ماندہ سا تھا۔

اپنے بستر پر لیٹی تو آنکھیں خود ہی پُرنم سی ہو گئیں...... اور اب میں اپنے ہاتھ میں کڑا گھماتے ہوئے آزردہ سی تھی...... اور کوئی میری شکل دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی چند منٹ پہلے خوب ہنس رہی تھی۔

☆☆☆

شہلا آج اسکول بھی چار دن کے بعد آئی تھی اور حارث کو دیکھے ہوئے بھی پورے پانچ دن ہو گئے تھے۔ اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ نہ جانے کتنا عرصہ گزر گیا ہو اور اس نے حارث کی جھلک بھی نہیں دیکھی ہو...... اسکول میں ان دنوں امتحانی سیزن چل رہا تھا...... اور اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا...... وہ چھٹی ہونے سے قبل ہی اسکول سے اٹھ گئی...... غیر ارادی طور پر اس کے قدم بینک کی جانب بڑھ رہے تھے۔

"پتا نہیں، آج حارث سے ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں...... طرح طرح کے وسوسے اس کے دل میں آ رہے تھے...... مگر وہ اپنی دُھن میں مست چلی جا رہی تھی۔

بینک میں داخل ہوئی تو وہ اسے اپنے شیشے کے کیبن میں کام کرتا ہوا نظر آیا۔ وہ سیدھی اسی کے پاس پہنچی......

حارث نے نظر اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا...... جیسے پوچھ رہا ہو جی فرمائیں۔

"سر آج میری سالگرہ ہے۔" اس نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"رئیلی!" وہ قصداً مسکرایا۔

"جی، میں نے سوچا...... آخر آپ کے بینک کی کلائنٹ ہوں تو یہ بات آپ کو تو بتانی چاہیے۔"

"مبارک ہو۔" وہ مسکرایا...... اور قریب رکھی شیلف سے ڈائری، کی چین اور بینک کا پاؤچ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ ہماری جانب سے آپ کی سالگرہ کا گفٹ۔"

"ارے آپ مجھے گفٹ دے رہے ہیں۔" شہلا کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا...... اور وہ سب چیزیں تھامتے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہفت اقلیم کی کوئی دولت اسے مل گئی ہو۔

"مس، آپ ہماری کلائنٹ ہیں، یہ تو آپ کا حق ہے۔" حارث اپنے پیشہ ورانہ لہجے میں بولا کہ اس طرح کے گفٹ وہ عموماً اپنے کلائنٹس کو مختلف مواقع پر دیا کرتا تھا۔

مگر شہلا کو یوں لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو جہاں پیار ہوتا ہے وہاں محبت کرنے والے ایک دوسرے کو تحفے بھی ضرور دیا کرتے ہیں...... میں نے یہ ڈائری تمہیں اس لیے دی ہے کہ میرے بغیر جو وقت تم جس کرب میں گزارتی ہو اس کا سارا احوال لکھنا اور جب تقدیر ہمیں اکٹھا کرے گی...... تب میں مسکراتے ہوئے یہ سب پڑھوں گا...... اور وعدہ کروں گا کہ زندگی کا کوئی بھی پل تمہارا میرے بنا نہیں گزرے گا۔

☆☆☆

ذکیہ نے کریم کو بتا دیا کہ شہلا کو تمہارا رشتہ کسی صورت منظور نہیں ہے۔

"خالہ جب منظور نہیں تھا تو آپ نے قبول کیوں کیا تھا۔" کریم کا غصہ بھی بجا تھا۔ اب خاندان میں اس پر ہر طرف سے ہوہو، ہی ہی۔ ہو رہی تھی جو اس کے لیے سنگ باری سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔

"تم یہ سمجھو کہ شہلا نے تم سے منگنی توڑ دی ہے۔"

"اس کی یہ ہمت...... آپ نے اس کا سر نہیں توڑا۔"

"جب باپ ہی اس بے غیرت کے سامنے خاموش ہو جائے تو میں کیا کر سکتی ہوں...... میں تو پھر سوتیلی ماں ہوں وہ مجھے بہ حالتِ مجبوری امی تو ضرور کہتی ہے...... مگر دل سے اس نے کبھی مجھے ماں نہیں سمجھا ہے......" ذکیہ نے زہر اگل ہی دیا۔

"پھر تو آپ کی تربیت میں ہی کہیں کمی رہ گئی۔" کریم نے جل کر دل کی بھڑاس نکالی۔ اس وقت اسے خالہ کی نہ شکل اچھی لگ رہی تھی اور نہ ہی بات۔

"تمہارا جو دل چاہے کہہ لو...... مگر میں تو ان باپ، بیٹی کے درمیان چھنی بنی ہوتی ہوں...... کہ اس گھر میں یا تو شہلا کا...... حکم چلتا ہے یا پھر اس کے باپ کا...... میری تو اس گھر میں نہ کوئی ویلیو ہے اور نہ ہی کوئی وجود۔" ذکیہ بیگم نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے شروع کیے...... تو اپنی اوقات از خود دو کوڑی کی کر کے رکھ دی۔

☆☆☆

جب سے وہ حارث سے اس کے بینک کے گفٹس لے کر آئی تھی، گھر آ کر اس کا زیادہ وقت اُن کو ہی دیکھنے میں گزرتا۔ وہ ان چیزوں سے باتیں کرتی...... ان سے مذاق کرتی اور اس ڈائری کو سینے سے لگا کر رو دیا بھی کرتی۔

حارث کو ایک خوب صورت لڑکی سے جتنا متاثر ہو جانا چاہیے تھا اتنا وہ ہوا نہیں تھا۔ یہ صدمہ شدید تھا، جسے وہ اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیتی تھی۔

"مجھ میں آخر کس چیز کی کمی ہے...... پورے خاندان میں کوئی مجھ جیسی لڑکی نہیں ہے، جس اسکول میں جاب کر رہی ہوں وہاں دونوں شفٹوں کے اسٹاف میں کوئی میرا ہمسر نہیں...... اور اس کے باوجود حارث نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ اس کے گھر اس کی ماں آنا چاہتی ہیں یا وہ نہیں چاہتا...... کہ وہ اسکول کی جاب کرے...... وہ چاہتا ہے کہ وہ اس کا بینک جوائن کرے...... جہاں وہ ہر روز وہ اس کو دیکھتا رہے اور اپنی دل کی باتیں اس سے کرتا رہے۔

☆☆☆

اخبار کے دفتر میں، میں ہفتہ وار میگزین کی انچارج تھی۔ روزانہ کی خبروں سے میرا کوئی لینا دینا نہیں تھا...... مگر یہ عمارت خاصی چھوٹی تھی اس لیے نیوز روم کی ہلڑ بازیاں بھی سب کے سامنے آشکار تھیں...... آج میں اپنے میگزین کی پیسٹنگ میں مصروف تھی...... صبح سے ہی فرید صاحب کے ڈکرانے کی آوازیں میرے کیبن تک آ رہی تھیں......

وہ نیوز ایڈیٹر پر خوب گرج رہے تھے۔

''ابے یہ اخبار کی سرخی لگائی ہے تو نے...... ساری سیاسی پارٹیاں اب متحد ہو کر پارلیمنٹ میں کام کیا کریں گی۔''

''ہاں سر...... موجودہ انتشار سے بچنے کی یہ واحد صورت ہے۔''

''ارے پاگل، یہ اخبار ہے...... اس میں جب تک مسالے دار خبریں نہیں لگیں گی اس کو کوئی خرید لے گا نہیں، یہ کسی خاتون کی سرخی نہیں ہے۔''

''سر سرخی لگانے کو کیا میں آئٹم سانگ سمجھوں؟''

''ہاں بالکل...... جب تک اخبار کی سرخی پھڑکتی ہوئی نہیں ہوگی اخبار میں جان کیسے پڑے گی۔''

''اوکے سر۔'' نیوز ایڈیٹر مزید رک کر کچھ سننے کے بجائے خود ہی تیزی سے واپس اپنے کیبن میں چلے گئے...... جہاں جا کر اب وہ اپنے اسسٹنٹ پر چلا رہے تھے۔ اور صبا اپنا کام مکمل کرنے کے بجائے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

فرید صاحب لاؤنج میں بیٹھے زور دار آواز میں سب لوگوں کو سنا رہے تھے۔ ''ہمارے اخبار میں، ندیم خان جوائن کرنے والا ہے اور جب وہ تم کو سیدھا کرے گا تب تمہیں پتا چلے گا کہ کام کیسے کیا جاتا ہے۔ مفت کی روٹیاں تو تم لوگوں نے خوب توڑ لیں۔ اور اب یہ لگ پتا جائے گا کہ ندیم خان ہے کیا چیز؟''

چائے کی بریک میں مس ناعمہ نے فرید صاحب سے پوچھا کہ ندیم خان آخر ہے کون؟

''اس اخبار کا ایڈمنسٹریٹر...... جو سارا انتظام دیکھے گا اور چلائے گا۔''

''کیا اخبار کا اداریہ بھی وہی لکھا کریں گے؟'' نیوز ایڈیٹر نے ہمت کر کے پوچھا کہ آج ان کے اداریے

کے بھی بخیے ادھیڑ دیے گئے تھے۔

"ہاں! اداریہ بھی وہی لکھے گا...... اور اشتہارات تک کو پہلے وہ اوکے کرے گا بعد میں وہ شائع ہوں گے...... چاہے وہ تلاش گم شدہ بھینس کا ہی اشتہار کیوں نہ ہو۔" فرید صاحب تو اپنی تقریر ختم کر کے چلے گئے...... مگر آفس کے ماحول میں لطیفے بکھر گئے۔

"ہونہہ بڑے اشتہارات آئے ہیں ناں اس اخبار میں جو پہلے وہ ایڈیٹر دیکھے گا......" علی اور ساجد نے ہنسی اڑائی۔

"ارے وہ ہماری غلطیاں پکڑے گا...... تلاش گم شدہ بھینس تو... بھورے رنگ کی تھی اشتہار میں کالی کیسے چھپ گیا......" فرزانہ بھی مضحکہ اڑانے میں کم نہیں تھیں۔

فرید صاحب کو ہی بکواس کرنے اور چیخنے چلانے کی عادت کم نہیں تھی...... اور اب کوئی ان سے بھی بڑھ کر آرہا ہے...... یہ خبر کسی کو بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"مجھے اگر یہاں کام کرنا دوبھر لگا تو پہلی فرصت میں اسے چھوڑ دوں گی...... میرے پاس تو دوسری جگہ کام کرنے کی آفر موجود ہے۔" میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

اور پھر فرید صاحب کا روزانہ کا ہی یہ دستور بن گیا...... کہ ہمارے لنچ ٹائم میں وہ ندیم خان کا نام لے، لے کر ہم سب ورکرز کو خاصا ڈرانے کی کوشش کرتے...... جیسے کوئی ایڈمنسٹریٹر نہیں کوئی ڈکٹیٹر آرہا ہو...... اور ہم کسی اخبار میں نہیں اس کے ذاتی ملازم ہوں۔

"ندیم خان کا مزاج میرے جیسا نہیں ہے، اس میں نہیں ہے نرمی...... میری طرح کہ دیر سے آنے والوں کو کچھ نہ کہوں اور ان کی سنائی ہوئی جھوٹی، سچی کہانی پر آنکھ بند کر کے یقین کرلوں۔"

"سر اخبار کے دفتر میں ہمارے آنے کا تو ٹائم ہے مگر جانے کا تو کوئی ٹائم نہیں ہوتا...... جب تک پرچہ پریس میں نہیں چلا جاتا ہم کہاں ہلتے ہیں۔" نیوز ایڈیٹر نے خاصا تنگ کر کہا تھا۔

"ارے میں یہ کب کہہ رہا ہوں...... یہ اخبار ہے کس کا...... آپ ہی لوگوں کا تو ہے۔ اس کے مالک کون ہیں...... آپ لوگ مگر جب یہ نقصان میں جاتا ہے تو اس کا خمیازہ بھگتنے والا اکیلا صرف میں ہی ہوتا ہوں۔" وہ باتوں کی پٹریاں اس تیزی سے بدلا کرتے تھے۔ کہ ناعمہ کا یہ پکا خیال تھا کہ اس اخبار کو نکالنے سے پہلے وہ یقیناً ریلوے میں گارڈ تو ضرور رہے ہوں گے۔

اور پھر پورا ہفتہ یوں ہی گزر گیا...... فرید صاحب کی تقریریں بھی خود ہی کمزور پڑنے لگیں۔

"دیکھو...... ندیم خان کب تک ہمیں جوائن کرتا ہے۔" وہ اس طرح کہتے جیسے کہ اب انہیں خود بھی یقین نہ ہو۔

"ہونہہ...... اگر کوئی اس اخبار کو جوائن کرنے والا ہوتا تو کب کا آچکا ہوتا......" فرزانہ نے مجھے رازداری سے بتایا۔

"کیا اس ظرم خان نے آنے سے منع کر دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید ہاں......"

"شاید کا کیا مطلب...... یا تو وہ آرہا ہوگا یا نہیں؟" میں نے وثوق سے پوچھا۔

"میں نے کئی بار سنا ہے، سر فون پر خوشامدی لہجے میں کسی ندیم خان سے باتیں کرتے ہوئے اسے آنے کے لیے کہتے تو ہیں۔"

"تو پھر......؟"

"وہ روزانہ آنے کی حامی بھی بھرتا بھی ہوگا......اور......"
"مگر وہ آتا نہیں ہے۔" فرزانہ کا ادھورا جملہ مکمل کر کے میں ہنس پڑی۔
"ہاں، مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے......کہ وہ آنا ہی نہیں چاہتا؟"
"اس کے نہ آنے کی کوئی وجہ تو ہوگی۔" میں نے کہا۔
"شاید......یہ اخبار اس کے حساب سے نہیں ہوگا......وہ ہوگا کوئی توپ چیز......" فرزانہ بولی۔
"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی......محنت سے ہر چیز اوپر جاسکتی ہے اور محنت نہ کرنے سے کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی نیچے آسکتی ہے۔"
"اب یہ سب کون دیکھتا ہے......چلتی ہوئی چیزیں لوگوں کو زیادہ اٹریکٹ کیا کرتی ہیں۔" ناعمہ کا تجزیہ بالکل صحیح تھا۔ اور اس کی باتیں سن کر مجھے بھی یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس اخبار کو جوائن کرنے والا کوئی ندیم خان بھی نہیں آئے گا اور ہمارے پاس صرف اس کے نام کو اسی طرح استعمال کرتے رہیں گے۔

☆☆☆

"وبعض لوگ شاید کم سخن ہوتے ہیں......" وہ اپنے آپ کو دلاسہ دیتے ہوئے سمجھایا کرتی۔
"اور خوب صورت ہیرو......تو پہلے من ہی من میں اپنی ہیروئن کو چاہتا ہے......اور بعد میں اظہار کرتا ہے۔
ہونہہ ایسا بھی کیا محتاط انداز......کہ کوئی دل کی بات کسی سے کہنے ہی نہ پائے۔"
وہ اپنے آپ سے ہی باتیں کرتی رہتی......اور اس کی یہ روش دیکھ کر ایک شب راحیلہ نے اس سے پوچھا۔
"کیا حارث سے آپ کی فون پر بات چیت نہیں ہوتی جو آپ ہر وقت خود سے باتیں کرتی رہی ہیں۔"
"ہاں کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔" اس نے بات بنائی۔
"میں سمجھی نہیں۔" راحیلہ نے حیرت سے پوچھا۔
"میرا مطلب ہے کہ وہ مصروف بہت ہوتے ہیں ناں......تو جب انہیں فرصت ہوتی ہے تو بات کر لیتے ہیں......ورنہ ظاہر ہے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔
"ایسے کون سے بینک میں وہ جاب کرتے ہیں جہاں اُن کی مصروفیات چوبیس گھنٹوں کی ہوتی ہے۔"
"اکلوتے بیٹے ہیں نہ کوئی بھائی نہ کوئی بہن تو گھر آ کر ماں سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔"
"آپا اس سارے منظر میں مجھے تو تم کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی ہو۔" راحیلہ کے لہجے میں دکھ تھا۔
"ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتا ہے......تم جو دیکھنا چاہو گی وہ تمہیں نظر آئے گا......اور جو میں دیکھنا چاہوں گی وہ مجھے نظر آجائے گا۔ کیوں ٹھیک ہے ناں......"
"اوہ تو یہ بات ہے، آپ موصوف کو دل کی آنکھوں سے دیکھا کرتی ہیں۔" راحیلہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی۔
"ہاں دل سے بھی اور جگر سے بھی......اور ہاں تمہیں اس معاملے میں نہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی مجھ پر رحم کھانے کی۔"
اور راحیلہ اس پر حیرت کی نظر ڈالتی چلی گئی کہ وہ اپنی بہن کو نہ تو اتنا بے وقوف سمجھتی تھی اور نہ ہی اتنی جذباتی......
ماں کے منہ سے کڑوی کسیلی سن کر بھی اس کے دل میں کبھی شہلا کے لیے نفرت اور جلن کا جذبہ نہیں پیدا ہوا تھا۔

☆☆☆

سرکاری تعطیلات کے باعث دو دن کی چھٹی ایک ساتھ آئی تھی۔ ان ایام میں چونکہ اخبار نہیں شائع ہونا تھا اس لیے تمام ورکرز کی بھی چھٹی تھی۔

ایسے ایام سب کے لیے ہی بڑے اچھے ہوتے تھے...... اور سب ہی اپنے، اپنے حساب سے چھٹیاں انجوائے کیا کرتے تھے...... میں چونکہ اپنے ہفتہ وار میگزین کا کام ایڈوانس میں کر کے آئی تھی اس لیے ایک دن کی چھٹی مزید بڑھالی تھی اور مزے سے فرح خالہ کی یونیورسٹی کی پرانی فرینڈز کے ساتھ میں بھی پکنک پر چلی گئی...... اور فارم ہاؤس میں رہ کر واقعی بہت انجوائے کیا اور جب چھٹیاں گزار کر ہم شاداں و فرحاں گھر واپس آئے تو امی نے بتایا۔

''تمہارے باس کے فون بار، بار آرہے تھے...... انہیں شاید تمہارا چھٹی کرنا اچھا نہیں لگا۔''

''امی ہمارے باس کو کبھی کچھ بھی اچھا نہیں لگتا...... اس لیے مجھے بھی کوئی پروا نہیں ہے ان کی ناراضی کی۔''

''میں نے تو کبھی ڈر کر کام نہیں کیا...... صبو گڑیا، تم یوں کرو...... ایک دن کی چھٹی اور کرلو...... اچھا ہے آج ہم دونوں سردیوں کے لیے اپنے کپڑوں کی شاپنگ بھی کرلیں گے اور کچھ چھوٹی موٹی چیزیں بھی لے لیں گے۔'' فرح خالہ نے کہا۔

''مگر خالہ آپ یہ تو سوچیں اگر میں نے چھٹی کرلی تو...... باس کے فون میرے بلڈ پریشر کو کتنا بڑھا دیں گے۔'' میں تذبذب میں تھی کہ کروں تو کیا کروں۔

''جب، جب تم میری بات نہیں مانو گی...... تو ایسا ہی ہوا کرے گا......'' فرح خالہ نے جھنجلا کر کہا۔

''میں نے بھلا آپ کی کون سی بات نہیں مانی......'' میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ حال ہی میں ان کے کہنے پر اپنا فیس بک کا اکاؤنٹ تک تو بند کردیا تھا۔

''صبو بیٹا چھٹی کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنا موبائل بھی آف رکھا جائے...... اور گھر کے لینڈ لائن فون کا بھی پلگ باہر نکال دیا جائے جیسا کہ میں نے ہمیشہ کیا اور ہمیشہ کروں گی۔''

''ٹھیک خالہ۔'' میں نے بھی سر جھٹک کر کہا اور خالہ کے ساتھ شاپنگ کو نکل گئی۔

خالہ کے ساتھ شاپنگ کرنے ہمیشہ امی ہی جایا کرتی تھیں اور میں آج ان کے ساتھ آکر واقعی چکرا سی گئی تھی۔ پہلے پوری مارکیٹ کا چکر پھر پسند آنے والی چیزوں کے پیچھے جانا اور تو کبھی آگے بھاگنا...... کپڑے خرید کر فارغ ہوئیں تو ان کی چھوٹی موٹی چیزوں کی لسٹ شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی جو کسی صورت ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی...... کبھی وہ میچنگ بیگز کی طرف لپک رہی تھیں تو کبھی لاسٹک، کنگھیوں اور سیفٹی پن کی جانب بھاگ رہی تھیں...... اور جب میں نڈھال ہو کر گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی کہ آج کی شاپنگ ختم ہوئی اور اب خالہ کے ساتھ شاپنگ پر ہرگز نہیں آؤں گی تو انہوں نے سرعت سے گاڑی چلاتے ہوئے اچانک اپنی گاڑی مشرق سینٹر کی جانب موڑلی۔

''ہمارا گھر تو اس طرف نہیں ہے، اب آپ کہاں جارہی ہیں۔''

''اب ہم ایکسپو سینٹر جارہے ہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولیں۔

''کیوں جارہے ہیں؟'' میرا لہجہ بھی تھکا تھکا سا تھا۔

''سامنے کتابوں کی نمائش' چلو راؤنڈ مار کر آتے ہیں۔''

''پلیز خالہ...... میں بہت تھک چکی ہوں...... آپ جائیں، میں یہیں آپ کا انتظار کروں گی......'' میں نے سیٹ سے سر ٹکا دیا۔

''ارے صبو، یہاں بیٹھ کر تم بور ہوگی...... ہم بس یوں گئے اور یوں آئے......'' انہوں نے چٹکی بجائی۔

''اچھا چلیے......'' میں بادلِ ناخواستہ بے دلی سے ان کے ساتھ چل پڑی...... ایکسپو سینٹر کی جانب۔ واقعی خوب صورت اور نادر کتابوں کے اسٹالز تھے میں تو حیران سی رہ گئی۔ کتابوں کا ایک شہر آباد تھا۔

''تمہیں کوئی کتاب خریدنی ہے تو خرید لو......'' اب وہ اپنی پسندیدہ کتب لیے ہوئے مجھ پر بھی احسان دھر رہی تھیں۔

''نہیں خالہ، مجھے کوئی کتاب نہیں چاہیے۔ ہم اخبار والوں کے پاس تو ویسے ہی فری میں کتابیں آتی رہتی ہیں۔'' اب خالہ آگے، آگے چل رہی تھیں اور میں آہستہ، آہستہ سارے اسٹالوں کو رغبت سے دیکھتے ہوئے گزر رہی تھی۔

ایک جگہ اپنا اخبار بھی رکھا نظر آیا تو حیرت سی ہوئی۔

''اب ہمارے اخبار کو یہاں کون خریدے گا......'' میں آگے بڑھ کر فرح خالہ سے بولی جو ایک جگہ رک کر طنز و مزاح کی کتب دھڑا دھڑ خریدے جا رہی تھیں۔

''شاید فری میں بانٹا جا رہا ہوگا۔'' انہوں نے جیسے کھرا سچ بولا اور کھی، کھی کر کے ہنس بھی دیں۔

''صبو...... تم ذرا یہیں رکو...... میں کھانا پکانے کے ..... میگزین لے کر ابھی آئی۔''

اور میں ان کی کتابوں کے بڑے سے بنڈل کو پاس رکھ کر ایسے ہی ایک کونے میں کھڑی ہوگئی...... اور آتی جاتی خواتین کو بغور دیکھنے لگی...... ان دنوں اور نج لپ اسٹک لڑکیاں زیادہ کیوں لگا رہی ہیں...... بڑی عمر کی خواتین لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ بال کھول کر کس وجہ سے پھر رہی ہیں...... ایجڈ مرد، خواتین کو رغبت سے کیوں دیکھ رہے ہیں جیسی باتیں میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں کہ فرح خالہ ہانپتی ہوئی واپس آئی اور بولیں۔

''میں نے ابھی رئیسہ آنٹی کو دیکھا ہے...... وہ کسی بچی کو کتابیں دلوا رہی تھیں۔''

''کہاں دیکھا ہے آپ نے آنٹی کو؟'' میں نے بھی پُرجوش لہجے میں پوچھا اور خالہ کے بائیں جانب اشارے پر میں بھاگتی ہوئی چلی گئی...... کس سے ٹکرائی اور کہاں اپنا موبائل گرایا...... یہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

پتا تھا تو صرف یہ تھا کہ وہاں رئیسہ آنٹی کہیں بھی نہیں تھیں...... اگر وہ ہوتیں تو نظر بھی آجاتیں۔ میں نے ایکسپو سینٹر کے نہ جانے کتنے چکر لگا لیے تھے۔

''اوہ...... آج میں اپنا چشمہ بھی تو نہیں پہنے ہوئے تھی...... شاید وہ کوئی اور ہوں گی......'' چلتے ہوئے خالہ اطمینان سے اپنا بیان داغ رہی تھیں...... اور میں تلملا کر ہی رہ گئی...... خالہ کو بے وقت اور بلاوجہ ایکٹو بننا بے حد آتا تھا...... انہیں اس بات کا خیال تک نہیں تھا کہ میں اس وقت کتنی تھکی ہوئی تھی...... اور ان کی وجہ سے میں شدید تھکاوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔

اور جب ہم ایکسپو سینٹر سے باہر نکل رہے تو میرے کانوں میں عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔

''مس رکیے...... مس پلیز، سنیے......'' اور میں سرعت سے یوں آگے بڑھی جا رہی تھی کہ کہیں فرح خالہ کو کچھ مزید یاد آجائے تو وہ پھر کہیں دوبارہ پلٹ پڑیں

''اب چشمے کے بغیر تو میں اپنی فرینڈز کو بھی نہیں پہچان پاتی ہوں۔'' گھر آکر وہ خوب ٹھٹے سے ہنس رہی تھیں۔

''چلو آج خوب اچھی واک ہوگئی...... ورنہ کہاں چلنا ہوتا ہے۔''

''خالہ آپ کی تو واقعی شاندار واک ہوگئی مگر میرا تو آپ نے خواہ مخواہ تماشا بنوا دیا...... کوئی کیا کہتا ہوگا...... کتابوں کی نمائش میں لڑکیاں اس طرح گھومتی ہیں کہ کبھی آگے کی جانب تو کبھی پیچھے کی جانب؟''

''توبہ ہے صبو...... تم تو رائی کا پہاڑ بنا دیا کرتی ہو۔''

''نہ ہم نے کسی کو دیکھا...... اور نہ ہی کسی نے ہمیں۔''

''ہاں، سب آنکھیں بند کر کے آئے ہوں گے نمائش میں۔'' میں جل کر بولی۔

''بے وقوف لڑکی...... کتابوں کی نمائش میں لوگ اپنی من پسند کتابیں ڈھونڈتے ہیں...... لوگوں کے چہرے نہیں پڑھا کرتے۔'' اب فرح خالہ مختلف شاپنگ بیگز میں سے چیزیں نکال کر بیڈ پر پھیلا رہی تھیں اور بولے چلی جا رہی تھیں۔

''ہاں یہ تو ہے...... مجھے بھی کوئی اپنا جاننے والا نظر نہیں آیا۔ سوائے اپنے اخبار کے...... پتا نہیں کس نے وہاں سجا دیے تھے...... سر فرید تو وہاں نہیں تھے۔'' اب میں وہیں کارپٹ پر کشن کے سہارے لیٹ گئی تھی اور فرح خالہ کی کنٹری سن رہی تھی...... اور جو وہ اپنی شاپنگ دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں کسی چیز کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں اور کسی کو آزردہ...... اس میں تو میں لٹ گئی۔ ہاں اس میں تو، میں نے لوٹ لیا۔ ان کے جملوں پر دل چاہتے ہوئے بھی کوئی کمنٹس پاس کرنے کی ہمت نہیں تھی...... کہ آج کا دن میرا کیسا تھکا دینے والا تھا...... میں واقعی وہیں لیٹ گئی تھی...... اور آنکھیں مندی سی ہوئی جا رہی تھیں۔

''صبو...... آج کا دن میرا تو بھئی بہت شاندار گزرا اور تمہارا کیسا رہا......؟'' خالہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں اور میں اپنے لبوں سے بور ترین جملے ادا کرنے سے قاصر تھی...... کہ اب تھکن پر نیند غالب ہو گئی تھی...... اور یہ دونوں جو یہ سمجھ رہی تھیں کہ انہیں کسی نے نہیں دیکھا...... وہ لاعلم تھیں...... قطعی لاعلم......

اس نمائش میں ایک شخصیت ایسی ضرور تھی جس نے نہ صرف صبا کو دیکھا تھا بلکہ بغور دیکھا تھا پہلی مرتبہ جب وہ اخبار کے اسٹال پر تبصرہ کرتی ہوئی گزری تھیں کہ یہ اخبار یہاں کس نے رکھ دیا...... دوسری مرتبہ جب جب وہ اس سے ٹکرائی تھی۔

اور تیسری مرتبہ اس وقت جب وہ بھاگ رہی تھی اور اس کا موبائل وہاں گر گیا تھا۔ اور اس نے اسے آواز بھی دی تھی...... مگر وہ آواز سننے کے باوجود پیچھے نہیں مڑی تھی۔ اس کا موبائل اس کے ہاتھ میں آ گیا۔

''یہ طوفان کی طرح بھاگتی دوڑتی لڑکی کون تھی؟'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا لڑکیاں اس حد تک بھی پاگل ہوتی ہیں جنہیں کچھ ہوش ہی نہیں ہوتا۔''

دفعتاً ہاتھ میں آ جانے والے موبائل پر بیپ ہوئی۔

غیر ارادی طور پر اس نے اوکے کر کے موبائل کان سے لگایا۔

''صبو کی بچی کل آفس آ جانا۔ ورنہ وہ موٹا تو موٹا وہ عینکو بھی کھا جائے گا۔'' کوئی لڑکی تمسخرانہ لہجے میں تقریر کرنے کے موڈ میں تھی۔

''کون موٹا؟ کون عینکو؟'' اس نے حیرت سے موبائل کو دیکھا اور قصداً اسے آف کر دیا۔

موبائل لاکڈ نہیں تھا...... اور کسی صبو نامی لڑکی کا پتا لگانا اب کوئی مشکل نہیں تھا۔

جس کو دوڑتے بھاگتے وہ دیکھ چکا تھا۔

☆☆☆

اور جب میں مزید ایک اور چھٹی گزار کر آفس پہنچی تو وہاں ایسا سناٹا تھا جیسے کرفیو اسی آفس میں لگا دیا گیا ہو۔

''آج اتنی خاموشی کیوں ہے آفس میں۔'' میں نے اپنے کیبن سے انٹرکام پر فرزانہ سے پوچھا۔ اس نے کھٹ سیدھا، سیدھا جواب دیا۔

''اب ایسی ہی رہا کرے گا۔''

''کیوں؟ ایسی کیا مصیبت آ گئی ہے؟'' میں نے پھر سوال داغا۔

''ہاں، ایسی ہی آ گئی ہے۔'' جواب حاضر تھا۔ وہ سرد لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''کیا مطلب......؟''

''وہ دراصل ندیم خان نے جوائن کرلیا ہے۔''

''کیا بہت سخت ہے وہ؟''

''پلیز ڈسٹرب نہ کرو، باقی باتیں لنچ ٹائم میں ہوں گی۔'' فرزانہ جو اپنے کیبن میں بیٹھی باتیں کرنے کی رسیا تھی اس وقت وہ مجھ سے بات بھی نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

یہ سب مجھے بے حد عجیب سا لگا کہ فرزانہ کی عادت سے میں بخوبی واقف تھی کہ جب تک وہ رائی سے رتی تک کی خبر مجھے نہیں دیتی اسے چین ہی نہیں ملتا تھا......ایک ایسی لڑکی جسے آفس آتے ہوئے رستے میں کوئی انہونا سا منظر یا لوگ بھی نظر آجاتے تو وہ ان کے بارے میں بھی مجھ سے گھنٹوں ڈسکس کیا کرتی تھیں اور آج بغیر کسی تاثر کے بات کررہی تھیں میں نے انٹر کام بند کردیا۔

''یہ ندیم خان ہے کیسا؟ آخر ایسی کون سی توپ چیز ہمارے آفس میں آگئی ہے۔'' میں نے بڑبڑا کر کیبن سے باہر کا رخ کیا مگر کوئی بھی نیا چہرہ نظر نہیں آیا۔ بلکہ ہر شخص جلدی میں ہی نظر آرہا تھا۔ جیسے اس کے پیچھے کوئی ایمرجنسی سی لگ گئی ہو۔

''شاکر بھائی آپ کیسے ہیں؟'' ہمارا پیون جو ہر روز اپنی ایک عدد بیوی اور اس کی تیرہ کہانیاں سنانے کا شوقین تھا......میری بات کے جواب میں سر اثبات میں ہلاتا ہوا چل دیا۔

''لگتا ہے آج اپنی بیوی سے پٹ کر آئے ہو؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''جی الحمدللہ......'' وہ میری بات سنے بغیر ہی کہتا ہوا چلا گیا۔

''اوہ......یہ حالت ہوگئی بیچارے کی......پٹ کر بھی شکر کررہا ہے۔'' مجھے ہنسی آگئی......اس سے کہ پہلے کہ میں ساجد کے کیبن میں جاکر اس کی خیریت اور آفس کی آج کی نئی خبر کا مزہ لیتی......فرید صاحب اپنے کمرے سے باہر نکل کر مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے کسی اجنبی کو دیکھتے ہیں۔

''کیا ہوا سر......آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''طبیعت تو مجھے آپ کی پوچھنی ہے، کہاں غائب تھیں آپ؟ نہ کوئی فون، نہ کوئی رابطہ......کیا ہوگیا تھا......میں تو سمجھا کہ بتائے بغیر کہیں دوسری جگہ چلی گئی ہیں آپ۔''

''سر رابطہ آپ سے کیسے کرتی......ایک ڈاکو نے گن پوائنٹ پر نہ صرف میرا پرس بلکہ موبائل تک چھین لیا تھا......یہ دن کتنے پریشانی میں گزرے ہیں......روزانہ پولیس اسٹیشن کے چکر کاٹتی رہی مگر کہاں شنوائی ہوتی ہے کسی کی......اور ظاہر ہے ایسے میں میری ذہنی حالت ایسی تو نہیں رہی تھی کہ آپ سے رابطہ کرکے اپنے اوپر بیتی ہوئی یہ افتاد آپ کو سناتی۔'' میرے ذہن میں جو فوری کہانی آتی تھی اسی کا سرا کھینچ کر میں نے خاصے غمگین لہجے میں انہیں سنادی تھی۔

اب میں جوابی طور پر ان کے ہمدردی کے کلمات سننے کی خواہاں تھی۔ مگر وہ مڑے اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں سوچنے لگی میرے جملوں نے تیر کا کام کردیا ہے سر بیچارے پریشان سے ہوگئے......جب ہی تو ان سے کھڑا تک نہیں ہوا گیا۔

اس سے قبل کہ میں اپنی اس سوچ پر عمل کرتی کہ مجھے ساجد کے کیبن میں جاکر سر کا مضحکہ اڑانا ہے یا ناجمہ کے......سر تیزی سے واپس آئے اور میرا موبائل مجھے دیتے ہوئے بولے۔

''مس صبا، جس ڈاکو نے آپ سے یہ موبائل چھینا تھا وہ ہمیں واپس کرگیا ہے۔''

''سر...... یہ میرا موبائل آپ کے پاس کیسے آیا؟'' اب میں حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
''کہہ تو رہا ہوں کہ ڈاکو خود واپس کر کے گیا ہے کہ مس صبا کو پریشانی ہو جائے گی اُن کے سارے ماسٹر پلان اس میں فیڈ ہیں۔''
اور تب ہی میری پشت پر ایک قہقہہ بلند ہوا جو میرے سر پر سنگ باری سا کر گیا۔ غصے سے مڑ کر دیکھا تو شاکٹذرہ گئی۔
اب کسی کی یہ ہمت کہ مجھ پر ہنسا جائے...... واقعی میں غصے سے کھول رہی تھی اور میرا دل واقعی یہ چاہ رہا تھا کہ فرزانہ کی بتیسی نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دوں۔
''صبا تمہارے ہاتھ سے تو کوئی ڈاکو چھین کرلے کر گیا تھا ناں تمہارا یہ موبائل تو پھر یہ ہمارے آفس میں کیسے پہنچ گیا ہے؟''
''ہاں، لے کر گیا تھا...... اور اب اگر اس نے اسے کتابوں کی نمائش میں کہیں گرا دیا تو مجھے کیا پتا......'' غیر ارادی طور پر میں کہہ گئی...... اور احساس تک نہیں ہوا کہ میں نے اپنی بات کی نفی خود ہی کر دی تھی۔
فرید صاحب مسکرا کر آگے بڑھ گئے اور فرزانہ اپنے کیبن میں...... ''یہ اخبار میں کام کرتے کرتے یہاں کے ورکرز بھی معمولی باتوں کو خبر بنا دیتے ہیں۔'' اب وہ یہ سب ندیم خان کو بتا رہے تھے...... جو انتہائی سنجیدگی سے کسی رپورٹ کو پڑھ رہا تھا۔
''فرید...... پلیز مجھے توجہ سے پڑھنے دو......'' فرید کی مزید گفتگو جو قہقہوں کے ساتھ اسٹارٹ ہوئی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید گفتگو سے منع کرتے ہوئے کہا۔
اپنے کام میں اسے ڈسٹربنس بالکل بھی پسند نہیں تھی۔
میرے موبائل کھونے کا مذاق آفس میں خوب اڑایا جا رہا تھا مگر اس انداز میں کہ مجھے خبر نہ ہو...... (اور میں واقعی بے خبر بھی تھی)
فرزانہ میرے کیبن میں آتی تو اپنا منہ ہی کراتی اور باہر نکلتی تو اس کے حلق سے ڈھولک بجنے لگتا...... تو کبھی نقارے اور تو اور چپڑاسی تک دھڑلے سے مزہ لے رہا تھا اور اس کے قہقہے بار، بار چھت اڑا رہے تھے۔
''بس کریں سب۔''
''بہت ہو گیا۔''
''ایک بات کے پیچھے بار بار نہیں پڑ جاتے آپ لوگ......''
ندیم خان کے دھاڑنے کی آواز آئی جسے میں نے حیرت سے سنا۔ (ہاں اصل حقیقت سے تو میں بھی بعد میں واقف ہوئی تھی)
''اوہ، یہ بات ہے دونوں دوست ایک جیسے ہی ہیں...... چیخنے، چلانے کے ماہر......'' اپنا کام کرتے ہوئے میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر لاتعلق سی ہو کر اپنے کام میں محو ہو گئی۔
میں ایک قابل جرنلسٹ تھی اور میں چاہتی تھی کہ اس نئے بندے کو بھی جلد پتا چل جائے کہ میں آخر ہوں کیا...... اس لیے دل چاہنے کے باوجود اپنی کیبن سے باہر جانے کے بجائے وہیں بیٹھی اپنا کام کر رہی تھی اور دھیمے لہجے میں گنگنا بھی رہی تھی۔ اور ندیم خان اپنے کمرے میں لگے کیمرے میں سے تمام ورکرز کا احوال دیکھ رہا تھا۔

(جاری ہے)

"واہ یار کیا چیز ہے یہ زبردست......" زیاد کی آواز کان سے ٹکراتے ہی نبراس نے پلٹ کر دیکھا حسبِ توقع وہ اور شاہ زیب دونوں لیپ ٹاپ سامنے رکھے بیٹھے اپنی ہی دُھن میں مگن تھے۔ انہیں دیکھ کر نبراس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس وقت وہ کسی لڑکی کی پروفائل میں سے اس کی تصاویر دیکھنے میں مصروف ہیں...... اپنی دو سالہ دوستی میں اتنا تو وہ جان ہی چکا تھا کہ "چیز" کا لفظ عام طور پر زیاد لڑکیوں کے لیے ہی استعمال کرتا تھا۔ جس پر ہمیشہ نبراس اسے ٹوکا بھی کرتا مگر وہ بھی ایک ڈھیٹ ہی تھا باوجود منع کرنے کے ہمیشہ ایسی ہی زبان استعمال کیا کرتا...... نبراس نے فی الحال اپنا اسائنمنٹ مکمل کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے فائل بند کردی اور ان دونوں کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ زیاد نے پلٹ کر اسے

اس طرح تو ہوتا ہے

نفیسہ سعید



دیکھا ضرور مگر کہا کچھ نہیں......

''کون ہے یہ؟'' نبراس نے کمپیوٹر اسکرین پر موجود لڑکی کی تصویر پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں سوال کیا۔

''میری فیس بک فرینڈ ہے بس ایویں سی ہے یہ...... سارا کمال تو ایڈیٹنگ کا ہے۔'' شاہ زیب نے اس کی تصویر کے نیچے تعریفی ریمارکس لکھتے ہوئے وضاحت دی۔

''تم ملے ہو کیا اس لڑکی سے؟'' زیاد نے حسرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''کئی بار ملا ہوں، پچھلے دنوں اس نے اپنی برتھ ڈے سیلیبریٹ کی تھی ایک کیفے میں، وہاں جانا پڑا اور بلاوجہ کے ہزار روپے بھی حرام کیے تھے تحفے کے نام پر...... سامنے دیکھو تو تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی پروفائل کو تم اتنی حسرت بھری نگاہوں سے تک رہے ہو۔'' شاہ زیب نے زیاد کے حسرت سے کھلے منہ کا جائزہ لیتے ہوئے مذاق اڑایا۔

''بری بات ہے یار...کیوں بلاوجہ اس طرح لڑکیوں کا مذاق اڑاتے ہو۔'' آخر نبراس سے برداشت نہ ہوا اور اس نے ایک بار پھر سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''لو جی اب اگر کوئی عام سی شکل صورت والی لڑکی اپنی تصویر میں خود کو خوب صورت اور پری جیسے الفاظ سے مخاطب کرے تو کیا اس کا مذاق اڑانا ہمارا حق نہیں بنتا......'' ہمیشہ کی طرح شاہ زیب کو نبراس کا اعتراض ذرا نہ بھایا۔

''اپنی نظر میں ہر انسان خوب صورت ہوتا ہے اور ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی کے ان احساسات پر اپنے سنگین الفاظ کی مدد سے ضرب لگائیں، کوئی خود کو جیسا سمجھے یہ اس کا حق ہے لیکن کسی کو بری شکل صورت کا طعنہ دیتے ہوئے اس کا مذاق اڑانا ہمارے لیے مناسب نہیں ہے اور نہ ہی ہمارا مذہب ہمیں ان تمام باتوں کی اجازت دیتا ہے۔'' نبراس نے اچھا خاصا لیکچر دیا۔

''خیر ہمارا مذہب تو کسی جوان لڑکی کو اس طرح اپنی تصویریں سرِعام لگانے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔'' اب یہ زیاد تھا جس کی بات سو فیصد درست تھی۔ ''اور اگر وہ لگاتی ہے تو اس پر تنقید کا حق ہم محفوظ رکھتے ہیں۔'' ماحول میں ایک دم پھیلی سنجیدگی کو دور کرنے کے لیے زیاد ہنس دیا۔ نبراس بنا جواب دیے واپس اپنے بیڈ پر آگیا تاکہ اپنا ادھورا اسائنمنٹ مکمل کرسکے...... وہ تینوں پچھلے دو سال سے ہاسٹل کے اسی ایک کمرے میں ساتھ ہی رہتے تھے۔ باوجود بہت سارے اختلافات کے یہ ان کی آپس کی محبت ہی تھی جو وہ دو سالوں سے ایک ہی کمرے کو شیئر کر رہے تھے۔

☆☆☆

''اوئے وہ سامنے لڑکی دیکھ......''

وہ ان دنوں دونوں کے ساتھ شاپنگ کرنے آیا تھا۔ جب مال کی سیڑھیاں چڑھتے زیاد نے شاہ زیب کو ٹہوکا دیتے ہوئے ایک لڑکی کی جانب متوجہ کروایا اور نہ چاہتے ہوئے بھی نبراس نے پلٹ کر اس سمت دیکھ لیا جہاں زیاد نے اشارہ کیا تھا، ریڈ اسکن ٹائٹ ٹاپ اور جینز میں ملبوس بڑے سے گلے کے ساتھ قدرے فربہی مائل جسم کی گوری چٹی لڑکی جسے دیکھ کر وہ دونوں جیسے سیڑھیاں چڑھنا بھول گئے اس لڑکی کا حلیہ نبراس کو کافی عجیب سا محسوس ہوا اور بلاوجہ ہی مارے شرمندگی اس کی اپنی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔

''کیا بات ہے مولانا صاحب، آج تو آپ بھی لڑکی کو بڑے دھیان سے دیکھ رہے ہیں۔'' اس لڑکی پر ڈالی گئی اس کی ایک نظر شاہ زیب سے چھپی نہ رہ سکی۔ اور وہ فوراً ہی نبراس پر چوٹ کرتے ہوئے ہنس دی۔

''لڑکیوں کو کسی بھی انداز سے دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ہمیشہ میرے اپنے گھر میں موجود میری بہنوں کا تصور رہتا ہے۔'' بظاہر ان پر چوٹ کرتے ہوئے اس کا لہجہ بالکل سادہ سا تھا۔

''چلو جی اب لڑکیاں دیکھ دیکھ کر بہنوں کا تصور کرتے رہے تو انشاء اللہ بڑھاپا کنوارا ہی گزر جائے گا۔'' زیاد نے اس کا دل کھول کر مذاق اڑایا۔

''ویسے میں تو بھئی ایسی بے باک لڑکیاں دیکھ اپنی بہنوں کا تصور نہیں کرتا کیونکہ میری دونوں بہنیں شرعی پردہ کرتی ہیں۔'' شاہ زیب سنجیدگی سے کہتا ہوا آگے بڑھ گیا جبکہ اس کے الفاظ پیچھے رہ جانے والے نبراس کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گئے۔

☆☆☆

''یہ کیسی لڑکی ہے یار، جس کی آئی ڈی میں کوئی تصویر ہی نہیں ہے۔''

زیاد کا لہجہ اور آواز دونوں ہی مایوسی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''میری کلاس فیلو ہے اور کافی اچھی لڑکی ہے۔'' شاید زندگی میں پہلی بار نبراس نے شاہ زیب کے انداز میں کسی لڑکی کے لیے عزت محسوس کی۔

''یقیناً کوئی خوفناک شکل صورت کی لڑکی ہو گی اس لیے اپنی آئی ڈی میں ایک بھی تصویر نہیں لگائی...... کہیں مجھ جیسے کمزور دل جوان اس کی تصویر دیکھ کر بے ہوش ہی نہ ہو جائیں......''

''غلط فہمی ہے تمہاری۔'' شاہ زیب نے ہنستے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

''بہت خوب صورت لڑکی ہے جناب، اپنی تصویر کے لیے کسی فوٹو شاپ کی محتاج بھی نہیں ہے۔ بس ذرا ایٹی ٹیوڈ سے زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پاس کسی ایرے غیرے لڑکے کو ایڈ بھی نہیں کرتی۔''

''اچھا پھر تمہیں کیسے ایڈ کر لیا۔؟''

نبراس کے دل میں آیا سوال زیاد کی زبان پر آ گیا۔

''ابھی تو بتایا کہ میری کلاس فیلو ہے، دوسرے میری پرسنالٹی یو نو ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔'' شاہ زیب فخریہ انداز میں کالر کو جھٹکتے ہوئے بولا۔

''اچھا پھر کب ملوا رہے ہو اس خوب صورت لڑکی سے؟'' زیاد اپنے لہجے میں دنیا جہان کی لجاجت بھرتے ہوئے بولا، وہ ہمیشہ اپنے مطلب کے حصول کے لیے ایسا ہی انداز اپناتا۔

''ابھی نہیں۔'' شاہ زیب کا لہجہ قطعی تھا۔

''بس دعا کر جس دن وہ مجھ سے سیٹ ہو گئی سب سے پہلے تجھ سے ہی ملواؤں گا۔''

ان دونوں کا یہ انداز گفتگو نبراس کو کبھی اچھا نہیں لگا۔ یہی وجہ تھی کہ اب بھی دونوں کو اسی طرح باتیں کرتا چھوڑ کر وہ اپنی کتابیں اٹھائے ہاسٹل کے کمرے سے لان میں آ گیا تاکہ کل یونیورسٹی میں جمع کروایا جانے والا اسائنمنٹ مکمل کر سکے۔

☆☆☆

نبراس کئی دن سے حیرت میں مبتلا تھا کہ شاہ زیب پہلے سے خاصا تبدیل ہو گیا تھا۔ اب وہ بلاوجہ لڑکیوں کے ساتھ فیس بک پر مصروف دکھائی نہیں دیتا اور نہ ہی اپنے موبائل کے ذریعے کسی لڑکی سے دوستی کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا۔ شروع، شروع میں تو نبراس کو ایسا محسوس ہوا کہ شاید اس کی وجہ متوقع ایگزامز ہیں جنہوں نے شاہ زیب کو بزی کر دیا ہے لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ شاہ زیب محبت جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو رہا ہے۔ یہ محبت نامی بلا آہستہ، آہستہ زہر بن کر اس کی رگوں میں اتر رہی تھی۔ پہلے تو نبراس کو علم ہی نہیں ہوا کہ شاہ زیب کی محبت کے دوسرے سرے پر کون ہے یعنی وہ کون لڑکی ہے جس کی محبت نے فی الحال اسے ساری دنیا سے بیگانہ کرنا شروع کر دیا ہے لیکن اگلے آنے والے چند دنوں میں نبراس کو پتا لگ گیا کہ شاہ زیب اپنی اسی کلاس فیلو کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے جس کی تصاویر اس کی آئی ڈی میں موجود نہ ہونے کے باوجود اس کا دعویٰ تھا کہ وہ بے حد خوب صورت لڑکی ہے لیکن اصل خوب صورتی تو وہ ہے جو دیکھنے والا محسوس کرتا ہے اور یہ خوب صورتی اس لڑکی کے لیے شاہ زیب کے دل میں اتر آئی تھی اور وہ آہستہ، آہستہ اس کے سحر میں گرفتار ہو رہا تھا جس کا سب سے زیادہ دکھ زیاد کو تھا کیونکہ اس طرح وہ شاہ زیب کے ذریعے ملنے والی وقتی تفریح سے قدرے

محروم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

خالی دل نئیں اے جان وی اے منگدا
عشق دی گلی وچوں کوئی کوئی لنگدا

شاہ زیب کو تیسری بار یہ گانا سنتا دیکھ کر زیاد سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر سی ڈی پلیئر ہی آف کر دیا۔

"کیا ہے یار، اتنا اچھا گانا ہے کیوں بند کر دیا؟" گانا بند ہوتے ہی شاہ زیب اٹھ بیٹھا۔

"ہوگا اچھا......لیکن اتنا بھی نہیں ہے کہ اسے سن، سن کر ہمارے کان بھی پک جائیں اور اگر تمہیں اتنا پسند ہے تو کانوں میں ہیڈ فون لگا کر سنو۔" وہ آج کل ویسے بھی شاہ زیب کی حرکتوں سے خاصا چڑا ہوا تھا۔

"مجھے آج پتا چلا کہ تم میری محبت سے جلتے ہو؟" شاہ زیب اسے چڑاتا ہوا بولا۔

"کس کے پاس اتنا ٹائم ہے ان بیکار سی باتوں پر جلنے کا، ویسے بھی اگر تمہیں اتنی محبت ہے تو جا کر اس کے سامنے اظہار کرو جس کے لیے تم ساری دنیا تیاگ کر اس کمرے میں پڑے رہتے ہو۔"

"یہ ہی تو مشکل ہے، اس کے بات کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ سامنے جاتے ہی میری ہمت جواب دے جاتی ہے۔" وہ آہستہ، آہستہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہمت کرو میری جان اور اگر نہیں کر سکتے تو اس محبت پر لعنت بھیج کر کوئی اور ڈھونڈ لو......" زیاد نے لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔

"ویسے تو مجھے اتنا اندازہ ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔" شاہ زیب نے اٹھ کر کھڑے ہوئے زیاد کو فخریہ انداز میں جتلایا......کیونکہ وہ عام طور پر کلاس میں کسی بھی لڑکے کو زیادہ منہ نہیں لگاتی لیکن مجھ سے اس کی خاصی دوستی ہے کئی بار وہ میری تعریف بھی کر چکی ہے، ویسے بھی تم جانتے ہو تمہارے بھائی کی پرسنالٹی کو کوئی اتنا نظر انداز نہیں کر سکتا......محبت اس کے دل میں ہے یہ تو میں جان چکا ہوں مسئلہ صرف اتنا ہے کہ اسے زبان تک کیسے لایا جائے۔ کس طرح اس لڑکی سے اگلوایا جائے کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔"

نبراس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی شاہ زیب کی لن ترانیاں عروج پر پہنچ گئیں۔

"کون لڑکی؟" کانوں میں پڑنے والے آخری جملوں کی مدد سے نبراس کے لیے یہ جاننا دشوار تھا کہ وہ دراصل کس لڑکی کی بات کر رہا ہے۔

"ارے وہ ہی رامین......جس کا میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ کسی ایرے غیرے لڑکے کو منہ نہیں لگاتی سوائے میرے۔" اس کی خوش فہمی عروج پر تھی جس کا اندازہ نبراس کو اس کی گفتگو سن کر ہو چکا تھا۔

"اوئے یہ پری کون ہے؟" ان دونوں کی گفتگو کے دوران اچانک ہی زیاد کی ابھرنے والی آواز نے شاہ زیب کی توجہ فوری طور پر اپنی جانب مبذول کروالی۔

"تم میری آئی ڈی میں کیا کر رہے ہو؟" وہ نبراس کو چھوڑ کر زیاد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "اور یہ جسے تم پری کہہ رہے ہو ناں یقین جانو سامنے جا کر دیکھو گے ناں تو مارے خوف کے بے ہوش ہی ہو جاؤ گے، ایک دم کالی اور بدشکل سی لڑکی ہے، بات کرتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی مینڈک ٹرٹر کر رہا ہو۔" وہ سامنے اسکرین پر دکھائی دینے والی لڑکی کی تصویر دیکھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں بے لاگ تبصرہ کر رہا تھا۔

"تم دونوں کو کچھ سمجھانا ایسا ہے جیسے دیوار سے سر مارنا۔" نبراس کا لہجہ افسوس بھرا تھا، اسے شاہ زیب کا اندازِ گفتگو ذرا نہ بھایا۔

"ہاں تو کس نے کہا ہے کہ تم ہمیں سمجھاؤ۔" زیاد کسی دوسری لڑکی کی آئی ڈی کھنگالتا ہوا بولا۔ نبراس کے پاس اس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے خاموشی سے اپنا موبائل اٹھائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

نبراس کی کزن کی شادی تھی......جس میں شرکت کے لیے وہ گاؤں گیا ہوا تھا جہاں سے آج پورے پندرہ دن بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ شام میں جب وہ ہاسٹل پہنچا تو کمرا بند تھا جس کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ زیاد اور شاہ زیب روم میں نہیں......اس نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر کمرے کی چابی ڈھونڈی اور تالا کھول کر اندر آ گیا۔ کمرا بری طرح بکھرا ہوا تھا۔ نبراس سمجھ گیا کہ وہ دونوں ابھی یونیورسٹی سے ہی واپس نہیں آئے تھے اس نے جلدی، جلدی بستر سمیٹے، اپنے بیگ سے کپڑے نکال کر الماری میں سیٹ کیے کمرے میں موجود الیکٹرک کیتل میں پانی گرم کر کے چائے بنائی کیونکہ وہ ہمیشہ تھکن دور کرنے کے لیے پہلے چائے پیتا تھا اور پھر نہاتا تھا، جیسے ہی وہ نہا دھو کر فارغ ہوا تقریباً نو بج گئے ان دونوں کا ابھی تک کوئی اتا پتا نہ تھا۔ نبراس کو بھوک لگی تھی اس کا ارادہ باہر جا کر کچھ کھانے کا تھا اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھول کر شاہ زیب اور زیاد دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔

''اوئے تو کب آیا؟'' نبراس کو کمرے میں موجود پا کر دونوں ہی حیران رہ گئے۔

''تقریباً گھنٹا ہو گیا ہے۔'' نبراس نے جواب دے کر اپنا موبائل اٹھایا اور آئینے کے آگے کھڑا ہو کر بال بنانے لگا۔

''اب کہاں جا رہے ہو؟'' اسے دوبارہ باہر جاتا دیکھ کر زیاد پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''کھانا کھانے......'' نبراس کا جواب اب بھی مختصر تھا۔

''میں نے کھانا آرڈر کیا ہے، ابھی آ جائے گا اس لیے تمہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں...... آرام سے کمرے میں بیٹھو تھکے ہوئے گاؤں سے واپس آئے ہو۔'' شاہ زیب نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''خیریت......تم نے کس سلسلے میں کھانا آرڈر کیا ہے؟'' نبراس نے حیرت سے پلٹ کر شاہ زیب پر نظر ڈالی کیونکہ عام طور پر جب بھی وہ باہر سے کھانا آرڈر کرتے یا تو اسے تینوں شیئر کرتے یا کوئی ایک اپنی کسی خوشی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے ٹریٹ دیتا اور آج یہ ٹریٹ کس خوشی میں تھی نبراس کو سمجھ نہیں آیا۔

''رامین کی خوشی میں۔'' شاہ زیب اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''بچی سیٹ ہو گئی ہے۔'' یہ جملہ زیاد کی طرف سے آیا تھا اس کی زبان عام طور پر اتنی ہی گھٹیا ہوتی......جسے سن کر نبراس کو سخت کوفت محسوس ہوتی۔

''بچی نہیں بھابی ہے وہ، عزت سے نام لو اس کا۔'' شاہ زیب نے اسے گھرکا، ان کی اس گفتگو سے نبراس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی سوائے اس کے کہ بنا جانے اس کی نظر میں رامین کا امیج خاصا خراب ہو گیا۔ اس سے قبل شاہ زیب کی باتوں سے اس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ رامین خاصی سلجھی ہوئی لڑکی ہے جسے شاہ زیب جیسے لڑکے اپنے چکر میں نہیں پھنسا سکتے لیکن آج اس کا یہ خیال خام ثابت ہوا جس پر اسے بلاوجہ ہی دکھ ہوا...... ساتھ ہی اسے حیرت بھی ہوئی کہ ایسا کیا تھا شاہ زیب جیسے عام سے لڑکے میں جس نے رامین جیسی لڑکی کو اس کے دامِ الفت میں گرفتار کر دیا وجہ کچھ بھی ہو اس کو یہ سب کو ذرا بھی پسند نہیں آیا مگر اس نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ان سے کرنا ضروری نہیں سمجھا اور خاموشی سے شاہ زیب کی دی ہوئی ٹریٹ میں شریک ہو گیا۔

☆☆☆

وہ کتنی دیر سے دیکھ رہا تھا کہ شاہ زیب موبائل کے ساتھ، ساتھ فیس بک پر بھی بری طرح مصروف تھا۔ نبراس نے آگے بڑھ کر اک ذرا سی نظر سامنے کھلی کمپیوٹر اسکرین پر ڈالی اس کا خیال درست نکلا وہ کسی لڑکی سے چیٹنگ کے ساتھ، ساتھ ایک اور دوسری لڑکی کی تصاویر میں گھسا ان پر نہایت ہی غیر شریفانہ ریمارکس لکھنے میں مصروف تھا۔ جسے سیکسی، مار ڈالا ظالم، اُف یہ ادا، ایک پل کو تو نبراس کو ایسا محسوس ہوا

جیسے وہ کسی ٹرک کے پیچھے لکھے جملے پڑھ رہا ہو اور بالآخر اس کا صبر جواب دے گیا، وہ اپنے کام میں بری طرح مصروف شاہ زیب کو پکار بیٹھا۔

"تمہاری ان تمام مصروفیات کا علم رامین کو ہے؟" اس کا کھلا اشارہ کمپیوٹر اور موبائل کی جانب تھا۔ جسے سمجھتے ہوئے بھی شاہ زیب شاید نہیں سمجھا اور چہرے پر دنیا بھر کی معصومیت لیے وہ نبراس کی جانب پلٹا۔

"کون سی مصروفیات؟ معصومیت کے ساتھ، ساتھ اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی۔

"یہ جو تم بیک وقت چار چھ لڑکیوں کے ساتھ عشقیہ چیٹنگ کر رہے ہو، اس کے بارے میں رامین جانتی ہے؟"

نبراس کی بات سنتے ہی شاہ زیب نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"یار تم تو ابھی تک گاؤں کے سیدھے سادے آدمی ہی ہو...... ارے بھائی یہ ساری لڑکیاں میری دوست ہیں جن سے بات کر کے میں اپنا ٹائم پاس کر رہا ہوں اور فیس بک پر ایسی دوستیاں عام ہیں پھر بھلا رامین کو ان پر کیا اعتراض ہوگا؟"

"تو کیا رامین نے بھی اپنا دل بہلانے کے لیے ایسے ہی فیس بک فرینڈز رکھے ہوئے ہیں۔" نبراس کا سوال خاصا چبھتا ہوا تھا۔

"وہ کیوں رکھے گی؟" شاہ زیب کا انداز بالکل غیر متوقع تھا۔ "وہ اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہے جسے اپنا دل بہلانے اور ٹائم پاس کرنے کے لیے گھٹیا اور فضول لڑکوں کی ضرورت ہو۔ وہ خاصی سلجھی ہوئی لڑکی ہے اور سوائے میرے اس نے کبھی کسی لڑکے سے بات کرنا پسند نہیں کیا اور شاید یہ بات میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں۔"

"مطلب یہ کہ تم مانتے ہو کہ تم ایسے گھٹیا اور فضول لڑکے ہو جو لڑکیوں کا دل بہلانے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔" نبراس الفاظ کے تیر پھینک کر واپس اپنے ٹیبل کی جانب آگیا جہاں اسے کمپیوٹر کے ذریعے آن لائن اسائنمنٹ جمع کروانا تھا۔

"گھٹیا اور فضول میں نہیں بلکہ وہ لڑکیاں ہیں جو اک ذرا سی تفریح کے لیے ہم جیسے لڑکوں کا سہارا لیتی ہیں۔"

نبراس نے اس کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ لیکن اسی پل اس کے دل نے بے اختیار یہ خواہش کی کہ کاش وہ زندگی میں ایک بار رامین سے ضرور مل سکے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا اس لڑکی کو جس کے بارے میں شاہ زیب جیسا لڑکا اتنے اچھے خیالات رکھتا تھا...... وہ لڑکا جو شاید رامین کے علاوہ کسی لڑکی کی عزت کرنا بھی نہیں جانتا تھا۔ نبراس کو تو یہ بھی حیرت تھی کہ اگر رامین اتنی اچھی اور پرفیکٹ لڑکی ہے تو اسے شاہ زیب جیسے سطحی لڑکے میں ایسا کیا نظر آیا جو وہ اس کی محبت میں غرق ہو بیٹھی ہے۔ ان ہی باتوں کو سوچتے ہوئے اس کے دل میں رامین سے ملنے، اسے دیکھنے کی خواہش زور پکڑ گئی۔

☆☆☆

"یار یہ قریبی مسجد میں نمازِ جمعہ کی ٹائمنگ کیا ہیں؟" نبراس الماری سے اپنے کپڑے نکال کر باتھ روم کی جانب بڑھا ہی تھا جب اس کے کانوں سے شاہ زیب کی آواز ٹکرائی وہ بے اختیار اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔

"خیریت یہ آج تمہیں نماز جمعہ کی ٹائمنگ کا خیال کیسے آگیا؟"

شاہ زیب کا سوال نبراس کے لیے اس لحاظ سے خاصا حیرت انگیز تھا کہ عام طور پر وہ اور زیاد جمعے والے دن دوپہر تین بجے تک سویا کرتے کیونکہ ان کی یونیورسٹی جمعے کو آف ہوتی اور اتوار کو وہاں کلاس ہوا کرتی...... اور بقول ان دونوں کے ہفتے میں ملنے والے ایک دن تو ان کا یہ حق بنتا تھا کہ وہ اچھی طرح اپنی نیند پوری کریں جبکہ ساری رات وہ جاگ کر کمپیوٹر پر مصروف رہا کرتے۔ شروع، شروع میں نبراس کو ان کے اس طرح سونے پر خاصا اعتراض ہوتا اور وہ کوشش کرتا کہ دونوں کو جگا کر اپنے ساتھ لے جایا کرے...... اور واپس آ کر وہ دوبارہ سو جایا کریں مگر اپنی اس کوشش میں مکمل طور پر ناکام ہونے کے بعد اب

وہ اس سلسلے میں بالکل خاموش ہو گیا تھا اور اس نے ان دونوں کو انہی کے حالوں پر چھوڑ دیا تھا اور ایسے میں آج خلافِ توقع شاہ زیب کا جلدی اٹھنا اور پھر نماز کے سلسلے میں کیے جانے والے سوال نے نبراس کو خاصا حیران کیا تھا۔

"یہ خیال اسی لیے آیا کہ آج سے میں نے جمعے کی نماز باقاعدگی سے پڑھنے کا تہیہ کر لیا ہے اور اسی سلسلے میں تم سے ٹائم دریافت کر رہا ہوں۔"

"ویسے آپس کی بات ہے تمہیں نماز پڑھنی آتی ہے؟" نبراس نے باتھ روم کے دروازے کے باہر ہی رک کر شاہ زیب سے سوال کیا۔

"الحمدللہ میں مسلمان ہوں، ساری زندگی اپنے والد کے ساتھ جمعہ پڑھنے مسجد جاتا رہا ہوں وہ تو بس ابھی کچھ سالوں سے ہڈحرام ہو گیا تھا لیکن مجھے امید ہے کہ جلد ہی دوبارہ سدھر جاؤں گا۔" وہ نبراس کی کسی بھی بات کا برا منائے بغیر بولا۔

"چلو پھر میں تمہیں دوبارہ مسلمان ہونے پر مبارک باد دیتا ہوں کیونکہ ہم نے بچپن میں اپنے دادا ابو سے سنا تھا کہ مسلسل تین جمعہ نہ پڑھنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔"

"لگتا ہے تمہارا اور رامین کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے۔" شاہ زیب دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ اس کے اور تمہارے دادا ابو کے الفاظ ایک ہی جیسے ہیں۔"

"اچھا تو تم رامین کے کہنے پر آج جمعہ کی نماز پڑھنے جا رہے ہو؟" نبراس نے شاہ زیب کی بات یہ ہی نتیجہ اخذ کیا۔

"ہاں یار، رات اس نے بتایا کہ ان کے گھر کا ہر فرد نماز پنجگانہ پابندی سے ادا کرتا ہے اور یہ بات تو بالکل ناممکن ہے کہ ان کے ہاں سے کبھی کوئی مرد جمعے کی نماز پڑھنے نہ گیا ہو یہاں تک کہ اس کے بھائی کا پانچ سالہ بیٹا بھی گھر کے دیگر مردوں کے ساتھ جمعہ پڑھنے جاتا ہے۔" شاہ زیب نے آہستہ آہستہ ہر بات

یہ محبت میری ہے

کبھی یہ درد میں ڈوبی کوئی سسکی سناتی ہے
کبھی ہر وقت بے چینی، خوشی میں ساتھ دیتی ہے
کبھی آنکھوں کے ساحل پر چمکتی شام ہوتی ہے
کبھی بارش کے موسم میں اداسی ساتھ لاتی ہے
کبھی خوشبو کوئی بن کر نئے رستے دکھاتی ہے
کبھی ہونٹوں پر آ کر یہ سسکتی ہے تڑپتی ہے
کبھی بجلی کی صورت آشیانوں کو جلاتی ہے
کبھی یہ صبر کرتی ہے فقط آنسو بہاتی ہے
مگر یہ میرے ہاتھوں میں ہمیشہ ہاتھ دیتی ہے
جہاں سے بھی گزر جاؤں
محبت ساتھ دیتی ہے

از: نبیلہ نازش راؤ، اوکاڑا

کی وضاحت کی۔

"وہ بھی تمہاری طرح نمازِ جمعہ نہ پڑھنے والوں کو کافر قرار دے رہی تھی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے کم از کم اس لڑکی نے تمہیں کوئی تو ایک اچھی بات سمجھائی۔ بہر حال میں نہا کر آتا ہوں پھر تم بھی تیار ہو جاؤ، ساتھ ہی نماز کے لیے نکلتے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم زیاد کو بھی جگا دو تا کہ آج وہ بھی ہمارے ساتھ جمعے کی نماز میں شریک ہو سکے۔" وہ جانتا تھا کہ زیاد، شاہ زیب کی بات کبھی نہیں ٹالتا...... اسی بنیاد پر وہ اسے ہدایت دیتا خود باتھ روم میں گھس گیا اور پھر اس دن اسے بہت خوشی ہوئی جب زیاد اور شاہ زیب دونوں نے اس کے ساتھ جا کر جمعے کی نماز پڑھی اور اسی خوشی میں واپسی پر نبراس نے ان دونوں کو اپنے پیسوں سے دوپہر کا کھانا ایک قریبی ہوٹل میں کھلایا۔ کیونکہ ان دونوں کا جمعے والے دن ہاسٹل کے کمرے میں شام تک سونا شروع سے ہی نبراس کے لیے باعثِ الجھن رہا تھا اور آج اسے اس الجھن سے نجات مل گئی

تھی جس کا سبب بلاشبہ رامین ہی تھی۔

☆☆☆

شاہ زیب نے اپنی آئی ڈی سے تمام لڑکیوں کو ریموو کر کے بلاک کر دیا اور ایسا شاید اس نے رامین کے کہنے پر ہی کیا تھا...... کم از کم نبراس کو تو ایسا ہی محسوس ہوا۔ اب جب بھی اس کے پاس سے کوئی لڑکی گزرتی تو اس کا انداز پہلے سے خاصا مختلف ہوتا وہ زیاد کے لاکھ کہنے پر بھی کسی لڑکی کی جانب کوئی توجہ نہ دیتا البتہ وہ اپنے واٹس ایپ پر خاصا مصروف ہو گیا تھا۔ نبراس کو لگتا وہ واٹس ایپ کے ذریعے رامین سے بات کرتا ہے بہر حال جو بھی تھا شاہ زیب آہستہ، آہستہ تبدیل ہو رہا تھا اور بلاشبہ اس کی اس تبدیلی کا سہرا رامین کے سر تھا جسے دیکھنے کی خواہش ہر گزرتے دن کے ساتھ نبراس کے دل میں بڑھتی ہی جا رہی تھی مگر وہ اپنے منہ سے شاہ زیب کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مبادا کہیں وہ برا ہی مان جائے مگر جلد ہی قدرت نے اس کی یہ خواہش اس طرح پوری کی کہ اسے خود سے کہنا ہی نہ پڑا اور کام بھی ہو گیا۔

☆☆☆

"میرے ساتھ بازار چل رہے ہو؟" نبراس باہر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا جب اچانک ہی شاہ زیب نے اس سے سوال کیا۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے پوچھا۔

"کسی جیولری شاپ پر، مجھے رامین کے لیے ایک رنگ لینی ہے کیونکہ عنقریب ہی اس کی برتھ ڈے آنے والی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اسے رنگ کے ذریعے پرپوز کر دوں۔"

"پرپوز کر دوں؟ مطلب تم اپنی فیملی کی اجازت کے بنا اسے پرپوز کر دو گے؟" پرپوز کا مطلب نبراس کے نزدیک رشتہ طے کرنا تھا جس کے لیے لازمی طور پر دونوں طرف کے بزرگوں کی موجودگی بہت ضروری تھی۔

"بے وقوف آدمی، یہ وہ والا پرپوز نہیں ہے۔" زیاد ان دونوں کی باتیں سن کر ہنستا ہوا بولا۔ "یہ دوسرا والا پرپوز ہے...... مطلب یہ اپنا بھائی، رامین بھابی کو انگوٹھی دیتے ہوئے "آئی لو یو" بولے پھر سمجھو بات پکی۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک اس نے رامین کو آئی لو یو نہیں کہا۔" نبراس خاصا حیران ہوتا ہوا بولا۔

"نہیں یار، میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ ذرا دوسری ٹائپ کی لڑکی ہے۔"

"لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ......"

"ہاں، ہاں بتایا تھا کہ وہ سیٹ ہو گئی ہے......" شاہ زیب نے نبراس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ "لیکن ابھی تک یار میں اسے یہ نہیں کہہ سکا کہ مجھے اس سے محبت ہے، میں اس سے جب بھی یہ کہنے کی کوشش کرتا ہوں زبان ساتھ ہی نہیں دیتی۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے اتنا ضرور ہے کہ وہ میرے علاوہ کسی اور لڑکے سے بات نہیں کرتی، مجھ پر مکمل بھروسا ہے اسے، اس کا ہر کام میں ہی کرتا ہوں اس کا موبائل نمبر بھی صرف میرے ہی پاس ہے، اس کا ہر انداز مجھے یہ جتلاتا ہے کہ آگ دونوں طرف برابر ہی لگی ہوئی ہے لیکن پھر بھی ایک بار تصدیق ضروری ہے جس کے لیے میں اسے انگوٹھی گفٹ کرنا چاہتا ہوں تاکہ ہر بات واضح ہو جائے اور یوں میں اپنے گھر والوں سے بات کر کے رامین سے اپنا رشتہ طے کر سکوں۔"

کوئی اور بات نبراس کی سمجھ میں آئی ہو یا نہیں لیکن وہ یہ ضرور جان گیا کہ شاہ زیب حقیقی معنوں میں اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ رامین دنیا کی شاید وہ واحد لڑکی تھی جس کی خاطر وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اس لڑکی نے اسے دوسری لڑکیوں کی عزت کرنا بھی سکھا دیا تھا اور یہ ہی شاید رامین کی محبت کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔

"چلو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب

کرے، ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" نبراس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خلوصِ دل سے دعا دی۔

☆☆☆

زیاد کو شاہ زیب سے کچھ کام تھا جس کے باعث وہ نبراس کو اپنے ساتھ لیے اس ڈپارٹمنٹ کی جانب آ گیا جہاں شاہ زیب زیرِ تعلیم تھا۔ اسے زیاد نے اپنی آمد کی اطلاع شاید پہلے ہی دے دی تھی، اس لیے وہ انہیں سامنے ہی دکھائی دے دیا۔ ان دونوں کو ساتھ لیے وہ اوپر کیفے ٹیریا آ گیا...... جہاں کچھ کھانے کا آرڈر دے کر وہ ان دونوں کے قریب آن بیٹھا۔

"لاؤ یار جلدی سے وہ یو ایس بی دو ورنہ ڈاکٹر صدیقی آج مجھے جان سے ماردیں گے اور ویسے بھی آج پریزینٹیشن میں پہلا نمبر میرا ہی ہے۔" اسے کرسی سرکا کر بیٹھتا دیکھ کر زیاد جلدی سے بول اٹھا۔

"یو ایس بی......؟" شاہ زیب دھیرے سے بڑبڑایا۔

"سوری یار، وہ تو رامین کے پاس ہے رات اس کا نیٹ نہیں چل رہا تھا۔ اسی لیے میں نے اسے کچھ ضروری چیزیں ڈاؤن لوڈ کر کے دی ہیں، دراصل اسے بھی آج اپنی پریزینٹیشن کی تیاری کرنی تھی۔"

"لیکن مجھے دو بجے تک اپنا کام ختم کرنا ہے پھر تم مجھ سے لے کر وہ رامین کو دے دینا۔" زیاد جلدی سے بول اٹھا۔

"اچھا ایک منٹ......" جواب دے کر شاہ زیب نے فون کان سے لگالیا۔

"میرا خیال ہے وہ لائبریری میں ہے اس لیے اس کا فون آف جا رہا ہے۔"

عام طور پر لائبریری میں کام کرتے ہوئے موبائل کا سوئچ آف کرنا ضروری تھا۔

"پھر اب میں کیا کروں......؟" زیاد نے بہت بے چینی کے عالم میں کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔

"اچھا تم یہ جوس پیو پھر لائبریری چل کر رامین سے یو ایس بی لے دیتا ہوں۔"

خاموش بیٹھے نبراس نے ایک نگاہ شاہ زیب اور دوسری زیاد کے چہرے پر ڈالی جہاں اسے رامین سے ہونے والی متوقع ملاقات کی خوشی جھلکتی نظر آ رہی تھی، یہ ہی سبب تھا جو اس نے دو گھونٹ میں ہی جوس کا گلاس خالی کر دیا اور اس کی یہ حرکت دیکھ کر بے اختیار ہی نبراس مسکرا دیا۔

"چلو آؤ یار مجھے دیر ہو رہی ہے۔" گلاس ٹیبل پر رکھتے ہی زیاد اٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈاکٹر صدیقی ہمیشہ کلاس میں اپنے ٹائم سے آتے ہیں اور ایک منٹ بھی لیٹ ہو جانے والے طالب علم کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے۔" کھڑے ہوتے ہوئے وہ وضاحت دینا نہ بھولا۔ شاہ زیب بنا کچھ کہے اٹھ کر ان کے ساتھ چل دیا، انہوں نے گراؤنڈ فلور پر بنی لائبریری کے اندر خاموشی سے ایک چکر لگایا مگر شاید وہاں رامین نہیں تھی۔ اسی لیے شاہ زیب راؤنڈ لگا کر باہر نکل آیا۔

"پتا نہیں کہاں گئی...... فون بھی بند جا رہا ہے شاید چارجنگ ختم ہو گئی ہو۔" منہ ہی منہ میں وہ بڑبڑاتا ہوا آگے کی جانب چل دیا جبکہ اس دوران زیاد بڑی بے چینی سے بار بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا۔

"تم نے رامین کو کہیں دیکھا ہے؟" سیڑھیوں سے نیچے اترتی لڑکی کو دیکھتے ہی شاہ زیب نے تیزی سے اس کی جانب بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں وہ اوپر اکنامکس کی کلاس کے باہر سمیعہ کے ساتھ بیٹھی شاید اپنی پریزینٹیشن کی تیاری کر رہی ہے۔" سیڑھیاں اترتی لڑکی جواب دے کر لائبریری کی جانب بڑھ گئی اور وہ شاہ زیب کی تقلید میں چلتے اوپر آ گئے جہاں راہداری کا موڑ مڑتے ہی کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی...... اور یہ آواز غالباً رامین کی تھی جس کا اندازہ شاہ زیب کے چہرے پر ایک دم آنے والی خوشی کی لہر دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا اس سے قبل کہ وہ راہداری کا موڑ مڑ کر سامنے جاتے ان کے کانوں سے ٹکرانے والے جملے نے بیک وقت تینوں کے قدم اپنی جگہ ساکت کر دیے اور وہ جہاں تھے

وہیں کھڑے رہ گئے۔

''شکر ہے تم نے موبائل بند کر دیا ورنہ اس جونک نے تو ہمارا پڑھنا حرام کر دینا تھا۔''

''جونک کون شاہ زیب......؟'' یہ آواز کسی اور لڑکی کی تھی غالباً وہاں رامین کے ساتھ ایک سے زیادہ لڑکیاں تھیں اور یہ ہی وہ جملہ تھا جس نے ان تینوں کو اپنی جگہ رک جانے پر مجبور کر دیا۔

''ظاہر ہے اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے، عجیب بے وقوف آدمی ہے لگتا ہے کبھی آئینہ نہیں دیکھا ہر وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خود کو کوئی راجا اندر سمجھتا ہو۔'' یہ ہنستی ہوئی آواز یقیناً رامین کی تھی جس کا اندازہ نبراس کو شاہ زیب کے چہرے پر اترتی شرمندگی دیکھ کر ہو گیا تھا۔

''سنا ہے اس نے تمہارے لیے ایک رنگ خریدی ہے جو وہ تمہیں پرپوز کرتے ہوئے دے گا اور یہ بات اس نے مجھے خود بتائی ہے۔''

یہ آواز پہلے والی لڑکی کی تھی جس کا انداز خاصا تمسخرانہ تھا۔ نبراس کو وہ لڑکی اپنی گفتگو کے لحاظ سے بالکل زیاد کا پرتو لگ رہی تھی۔

''دے کر تو دکھائے انگوٹھی، منہ توڑ دوں گی اس کارٹون آدمی کا......وہ تو میں اپنا کام نکلوانے کے لیے ذرا نرمی سے بات کر لیتی ہوں......ورنہ مجھے ایسے...... بےوقوف لوگوں کے دماغ ٹھکانے لگانے خوب آتے ہیں، شکل نہ صورت اور نہ ہی بات کرنے کا سلیقہ جب ہنستا ہے تو پورا جبڑا دکھائی دیتا ہے پتا نہیں کس طرح برداشت کرتی ہوں۔''

نبراس کو لگا شاید یہ بھی مکافاتِ عمل ہے ویسا ہی بے لاگ تبصرہ جو وہ بڑی بے دردی سے لڑکیوں پر کرتا رہا تھا آج اس کی زد میں خود اس کا اپنا وجود آ گیا تھا۔ نبراس کو اس لمحہ شاہ زیب قابلِ رحم محسوس ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ کس طرح اسے وہاں سے ہٹائے تا کہ وہ رامین کی مزید گفتگو نہ سن سکے وہ گفتگو جس نے آج شاہ زیب کو منہ کے بل گرا دیا تھا اور اس مشکل لمحے میں زیاد کی آواز نے اسے کچھ حوصلہ بخشا۔

''چھوڑو یار، یو ایس بی مجھے نہیں چاہیے، وہ تم اس چھچھوری لڑکی کو ہی دے دو جس کے عشق نے تمہیں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کی کلاس بھی نہیں لے رہا، کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ ایک غیر حاضری ہی لگ جائے گی ناں تو لگنے دو۔'' شاید یہ تھی وہ لازوال دوستی جس کے لیے زیاد نے آج اپنے دس نمبروں کی قربانی دی تھی اور شاہ زیب بنا کوئی جواب دیے مرے، مرے قدموں سے ان کے ساتھ چل دیا۔ اس کے چہرے پر چھائے تاثرات دیکھ کر کوئی بھی یہ جان سکتا تھا کہ اس وقت اس کی حالت ایک ہارے ہوئے شخص کی سی ہے جو اپنی محبت کے ہاتھوں سب کچھ لٹا کر تہی دامن واپس جا رہا تھا اور نبراس کو افسوس صرف اس بات کا تھا کہ رامین کا شاہ زیب کے بارے میں لگایا جانے والا تجزیہ ان دونوں نے بھی سن لیا اور اب شاید شاہ زیب ان دونوں کے سامنے کوئی بات کرنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ دوستوں کے سامنے ہونے والی اس غیر متوقع صورتِ حال نے اسے جس شرمندگی سے دوچار کیا تھا اس نے فی الحال شاہ زیب کی زبان پر قفل لگا دیا تھا اسے اس طرح نڈھال حالت میں سیڑھیاں اترتا دیکھ کر بے ساختہ نبراس کے دماغ میں ایک شعر آ گیا جو اس نے اپنے بچپن میں کبھی سنا تھا۔

کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

لاکھ کوشش کے باوجود وہ یہ شعر اپنی زبان پر نہ لا سکا لیکن دماغ میں آتے ہی کچھ دیر قبل والی سچویشن کو یاد کر کے زیرِ لب مسکرا دیا۔

جو بھی تھا رامین نے ہر لحاظ سے شاہ زیب کو انسان ضرور بنا دیا تھا۔ اور نبراس کو یقین تھا کہ اب وہ کسی لڑکی کے بارے میں اپنے منہ سے نکلنے والے لفظوں کو سوچ سمجھ کر ادا کرے گا اور یہی ایک بات اس کے لیے قابلِ اطمینان تھی۔

اب وہ رعنائی خیال کہاں

نادیہ احمد



"رانیہ تم پاکستان کب آئیں؟" اسکول کی پارکنگ میں گاڑی لاک کرتے ہوئے اپنے عقب سے آتی حیرت میں ڈوبی مردانہ آواز سن کر اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور وہ فریز ہوگئی۔ وہ سعد تھا۔

"تم میرے شہر میں ہو اور اور تم نے مجھے انفارم بھی نہیں کیا۔" مسکراتے ہوئے وہ اس سے شکوہ کررہا تھا۔ رانیہ نے خود پہ قابو پاتے اسے سلام کیا۔

"پچھلے دنوں کافی مصروفیت رہی، بچوں کے

ایڈمیشن، گھر کی فرنشنگ بس خیال ہی نہیں رہا۔" اس نے جواز پیش کیا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ یہ جانتے ہوئے کہ سعد بھی اسی شہر میں وہ کبھی یہاں آنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اسے ہمیشہ اس لمحے سے خوف آتا تھا جب اس کا سعد سے سامنا ہو جائے اور اس سے خود سے رابطہ تو خیر وہ کبھی نہ کرتی۔ وہ جب تک پاکستان میں نہیں تھی دل کو ایک یہی تو سکون تھا کہ اسے سعد سے ملنا نہیں پڑتا تھا۔

"یہ تو ہے رانیہ، اب تم لوگ دس سال بعد پاکستان شفٹ ہوئے ہو تو مصروفیت تو ہوگی ہی لیکن اگر تم مجھے بتا دیتیں تو میں اور روبی تمہاری کچھ مدد کر دیتے۔" سعد کے منہ سے اس کی بیوی کا نام سن کر رانیہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی تھی۔

"شکریہ! اب تو میں کافی ریلیکس ہوں گھر کا انٹیریئر تو چلتا ہی رہے گا ساتھ ساتھ۔" رانیہ نے فارمل انداز میں کہا۔ سعد سفیان سے بات کرتے ہوئے وہ ہر بار اتنی ہی فارمل ہوتی تھی۔ اس سے باتیں کرنا رانیہ کے لیے کبھی آسان تجربہ نہیں تھا۔ وہ بلاوجہ ہی نروس ہو جاتی تھی۔

"دراصل روبی کو انٹیریئر ڈیزائنگ میں کافی دلچسپی ہے اگر تم چاہو تو وہ تمہارا گھر ڈیکوریٹ کرنے میں تمہاری بہت مدد کر سکتی ہے۔" سعد جس کا نام اتنی اپنائیت اور وثوق سے لے رہا تھا اس کی مدد تو درکنار رانیہ کو اس سے ملنے میں بھی کوئی انٹرسٹ نہیں تھا نہ آج نہ بارہ سال پہلے۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ہم نے ایک انٹیریئر ڈیزائنر سے کانٹریکٹ کیا ہوا ہے۔" رانیہ نے جان چھڑائی۔

"میں بچوں کو پک کر لوں۔" رانیہ کے لیے وہاں مزید رکنا اسٹریس فل تھا اور اچانک سعد کو بھی خیال آیا کہ وہ یہاں اپنے بچے پک کرنے آیا ہے۔

"میں بھی فرخ اور ثاقب کو پک کرنے آیا تھا ویسے تو انہیں روبی ہی پک اینڈ ڈراپ کرتی ہے لیکن آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے مجھے آنا پڑا لیکن اچھا ہوا اس بہانے تم سے ملاقات ہو گئی۔ دو بچے ہیں ناں تمہارے؟" وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے اسکول کی بلڈنگ کی طرف جا رہے تھے۔ رانیہ کو اس کی اپنے بارے میں معلومات پہ حیرت ہوئی۔ کب سعد سفیان کو رانیہ فیروز کی ذات میں اتنی دلچسپی ہوئی کہ وہ اس کے متعلق مکمل انفارمیشن رکھے۔

"اچھا اپنا نمبر تو دو...... میں تمہیں اور فہیم کو اپنے گھر انوائٹ کروں گا۔" رانیہ اس سوال سے جتنا بچنے کی کوشش کر رہی تھی بالآخر وہ بات ہو گئی تھی۔ رانیہ کی خاموشی طویل ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا نمبر یاد نہیں اپنا؟ سعد نے اسے جز بز ہوتے دیکھ کر ازراہِ مذاق کہا۔ رانیہ نے اسے نمبر بتا دیا تو اس نے فوراً بیل دے کر اپنا نمبر بھی اس تک پہنچا دیا تھا۔ بچوں کو لے کر گھر آتے ہوئے اسے اپنا سفر زندگی کا طویل ترین سفر لگا۔ فضا اور یاسر تمام راستے اسے اپنے نئے اسکول، ٹیچر اور دوستوں کے بارے میں بتاتے ہوئے اس کی ذہنی حالت سے بے خبر تھے۔ وہ بے توجہی سے ان کی باتیں سنتی، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں رسپانس دے رہی تھی۔ اس کا دماغ حال سے نکل کر ماضی میں چلا گیا تھا۔ اچانک وہ سب یاد آ رہا تھا جو وہ اتنے سالوں سے بھولنے کی کوشش کر رہی تھی اور اسے لگا وہ کچھ بھی بھول نہیں پائی تھی۔ سعد اب بھی اتنا بے خبر تھا اور رانیہ آج بھی تیرہ سال کی جذباتی اور بیوقوف لڑکی تھی۔ یادوں کا ایک سیلاب تھا جو امڈ آیا تھا۔ رانیہ کو لگا اس ایک دہائی میں کچھ بھی نہیں بدلا سب کچھ مسالا لگا کر حنوط کر دیا گیا تھا اور آج بھی سعد کے لیے اس کی محبت محفوظ تھی۔ دل کا ہر زخم روزِ اول کی طرح تازہ تھا اپنے اندر کی تنہائی اور اداسی اس قدر بڑھی کہ گھبرا کر رانیہ نے گاڑی میں لگے میوزک پلیئر کا والیوم فل کر لیا۔ دونوں بچے خاموش ہو کر اب میوزک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

شام کو فہیم گھر آیا تو رانیہ بہت حد تک نارمل ہو چکی تھی۔ اتنا وقت کافی تھا اسے اپنے خول میں واپس چلے جانے کے لیے...... اب ایک بار پھر وہ وہی رانیہ تھی جس کی

زندگی کا محور اس کا گھر، خاوند اور بچے تھے۔ جس نے شادی کے دس سال میں کبھی اپنے شوہر کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ ایک آئیڈیل بیوی تھی، ایک آئیڈیل ماں تھی۔ دس سال میں رانیہ، فہیم کی زندگی کا سب سے اہم حصہ بن گئی تھی جس کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ وہ اسے کتنا چاہتا تھا یہ بات فہیم اسے دن میں دو تین بار ضرور بتاتا تھا۔ کبھی فون پر تو کبھی ٹیکسٹ کر کے۔ اس کی سالگرہ اور اینی ورسری پہ اسے وش کرنا اور گفٹ دینا کبھی نہیں بھولتا تھا اور رانیہ بھی اس کی دل سے قدر کرتی تھی۔ اس کی خدمت اور خیال میں کوئی کوتاہی نہیں کرتی تھی۔ زندگی کے ہر مرحلے پر رانیہ فہیم کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کی وفادار تھی، اس کی عزت کرتی تھی لیکن آج بھی وہ سعد سفیان کو بھول نہیں پائی تھی وہ اس کے مقدر کا وہ کانٹا تھا جو آج بھی دکھ دیتا تھا اور اس درد میں جانے کیا کیا تھا اذیت، ہتک، جلن، شکوہ اور محبت بھی۔ رانیہ آج بھی اس بے خبر سے محبت کرتی تھی اور یہ بات وہ نہ کبھی سعد سے کہہ پائی تھی نہ کسی اور سے۔

وہ کمرے میں آئی تو اس کا فون بج رہا تھا۔

"سعد کالنگ....." فہیم نے اس کا موبائل بیڈ سائڈ ٹیبل سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

"میرا کزن ہے۔" رانیہ کی بات سن کر وہ ایک بار پھر اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو رانیہ! میں سعد بات کر رہا ہوں تم کیسی ہو؟" وہ خوش اخلاقی اور دوستانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟" سعد کا نام آج بھی رانیہ نہیں لے پاتی تھی وہ اب بھی آپ جناب سے مخاطب تھی۔ بہت نپے تلے لفظوں میں وہ سعد سے مختصر بات کرتی۔ سعد کچھ پوچھے اور رانیہ نہ گھبرائے ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسکول اور کالج کی بہترین مقررہ، دنیا کے ہر موضوع پہ بے حساب بولنے والی باتونی سی رانیہ، سعد کی کسی بات کا کبھی تین چار لفظوں سے زیادہ میں جواب نہیں دے پائی تھی اور آج جو رانیہ، سعد سے گفتگو کر کے آئی تھی وہ ان دونوں کے درمیان کی پہلی طویل ترین گفتگو تھی۔

"میں اور روبی سوچ رہے تھے تم لوگ اس ویک اینڈ ہمارے ساتھ ڈنر کرو۔ تم کہو... تو میں فہیم کو بھی پرسنلی انوائٹ کر لیتا ہوں۔" فوراً ہی رانیہ نے سعد کی بات فہیم سے کرا دی تھی۔ فہیم کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ رانیہ اس رات ٹھیک طرح سو نہیں پائی تھی۔ ایک بار پھر سعد سے وہ بھی اس کے گھر پہ ملنا تھا وہاں روبی بھی ہوگی جس سے رانیہ پہلی بار ملنے والی تھی، وہ عورت جس نے رانیہ کی جگہ لے لی تھی۔ یہ بہت تکلیف دہ مرحلہ تھا رانیہ کو ایک بار پھر اس اذیت سے گزرنا تھا جس سے وہ سعد کی شادی والے دن گزری تھی۔

☆☆☆

سعد کا گھر ڈیفنس میں اس کے گھر سے بس دو خیابان دور تھا، سعد اور روبی ان سے بہت خوشدلی سے ملے تھے۔ ان کے دونوں بچے رانیہ کے بچوں سے بڑے ہونے کے باوجود ان سے بہت گھل مل گئے تھے۔ رائل بلیو سوٹ میں گہرے میک اپ سے اپنے چہرے کی جھریوں کو چھپائے پانچ فٹ تین انچ قد کی روبی کو دیکھ کر اسے ایک بار پھر سعد کی پسند پہ حیرانی ہوئی تھی۔ وہ سعد کے ساتھ آج بھی جچتی نہیں تھی اور رانیہ کے روبی کے بارے میں آج بھی وہی تاثرات تھے جو سعد کی شادی والے دن اسے دور سے دیکھ کر ہوئے تھے۔ ایک بار پھر رانیہ کو اس سوال نے آن گھیرا تھا کہ آخر سعد نے اس کا انتخاب کیا سوچ کر کیا اور...

بلااختیار اس نے اپنا موازنہ روبی سے کیا تھا جو روبی سے زیادہ صاف رنگ اور دراز قد رکھتی تھی۔ رانیہ اس سے بہت ریزرو ہو کر ملی تھی۔ رسمی دعا سلام کے بعد ان کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی البتہ سعد اور فہیم دنیا جہان کے موضوعات پہ گفتگو کر رہے تھے۔ یہ رانیہ کا اسٹائل نہیں تھا وہ اپنی سسرال میں اسی لیے ہر دلعزیز بھی تھی کیونکہ وہ بہت جلد گھل مل جاتی تھی اور یہ بات فہیم نے

بھی محسوس کی۔ کبھی کبھی وہ دونوں رانیہ کو اپنی باتوں میں شامل کر لیتے اور وہ ان کی بات کا مختصر جواب دیتی یا صرف مسکرا کر کام چلا لیتی۔

''تم ٹھیک سے کھانا نہیں کھا رہیں رانیہ۔'' یہ سعد تھا جو اس کی پلیٹ پہ نظریں جمائے اسے ٹوک رہا تھا۔

''میں کھا چکی ہو، بس اتنا ہی کھاتی ہوں میں۔'' وہ دھیمے سے بولی۔

''بھئی آج تو یہ ڈائٹنگ وغیرہ چھوڑو اور اچھی طرح کھاؤ۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔ روبی اس کے سامنے ڈشز پیش کر رہی تھی۔

''ویسے تمہیں دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا تم بالکل نہیں بدلیں، آج بھی اتنی ہی سلم اسمارٹ ہو جتنی دس سال پہلے تھیں، لگتا ہی نہیں دو بچوں کی ماں ہو۔'' سعد کی بات سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ یہ ایک سرسری سا جملہ تھا جو ایک کزن کی طرف سے کمپلیمنٹ تھا لیکن رانیہ کے اندر ہلچل مچا گیا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کیا سعد نے اسے پہلے کبھی اتنے غور سے دیکھا تھا اور کیا رانیہ اس کے لیے اتنی اہم تھی جو اسے دس سال پہلے کی باتیں یاد رہتیں۔ وہ اچانک ماضی کے بھنور میں پھنس گئی تھی۔

''اسی لیے تو ہم روزِ اول کی طرح آج بھی ان محترمہ کے دیوانے ہیں۔'' فہیم نے سعد کی بات کے جواب میں پیار سے رانیہ کو دیکھتے ہوئے اس کے کندھے کے گرد بازو کا گھیرا ڈالا۔ فہیم کا جملہ اسے حال میں لے آیا تھا اسے اس وقت اس آسرے کی اشد ضرورت تھی۔

ڈنر کے بعد کافی کا دور چلا اور پھر فہیم نے سعد اور روبی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی جسے ان لوگوں نے قبول کر لیا۔ کچھ دیر مزید یہاں وہاں کی باتیں کر کے وہ وہاں سے چلے آئے تھے۔ رانیہ کے لیے چند دن میں دو بار سعد سے ملنا آسان نہیں تھا۔ اس سے بات کرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھے ہوئے وہ ضرورت سے زیادہ محتاط تھی۔ اندر ہی اندر اس بات سے خوفزدہ کہ اس کا راز فاش نہ ہو جائے۔ وہ راز جسے رانیہ نے تب سے سنبھال رکھا تھا جب اس کے دل نے پہلی بار سعد کے لیے دھڑکنا شروع کیا تھا۔

☆☆☆

سعد اور رانیہ خالہ زاد تھے۔ سعد، رانیہ سے آٹھ سال بڑا تھا اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں سنجیدگی آ رہی تھی۔ ان دونوں کے بیچ ایک حد تھی جس کی وجہ سے سعد اور رانیہ میں کبھی بے تکلفی نہیں رہی تھی۔ وہ بچوں میں شمار ہوتی تھی اور سعد ٹین ایجر تھا۔ پھر جب اے لیول کے بعد وہ پڑھنے کے لیے مانچسٹر چلا گیا تو رانیہ سے اس کی ملاقات اور بھی محدود ہو گئی۔ شگفتہ آنٹی اور اس کی والدہ کا تمام بھائی بہنوں سے زیادہ میل جول تھا اور رانیہ کے ساتھ شگفتہ آنٹی کا سلوک خاص تھا۔ خود اسے بھی شگفتہ آنٹی اپنے سب انکل آنٹیوں میں سب سے زیادہ پسند تھیں۔ رانیہ ان دنوں آٹھویں میں تھی جب اس دن اس کے تایا کی بیٹی ان کے گھر پہ آئی ہوئی تھی۔ وہ رانیہ سے عمر میں کافی بڑی تھی لیکن رانیہ کی تو سب سے ہی اچھی بن جاتی تھی۔ شگفتہ آنٹی ان کے گھر آئیں تو وہ دونوں کچن میں چائے کا انتظام کرنے چلی گئیں۔

''سعد کب تک واپس آ رہا ہے رانیہ؟'' کرن آپی نے کباب فرائی کرتے ہوئے رانیہ سے پوچھا۔

''آنٹی بتا رہی تھیں ابھی تو سعد بھائی کو مزید تین سال لگ جائیں گے، ان کا آگے ماسٹرز کرنے کا ارادہ ہے۔'' رانیہ نے اپنی معلومات شیئر کی۔

''کیا سوچا ہے چچی نے کوئی منگنی نکاح کریں گی یا پھر بس ڈائریکٹ شادی ہی کر دیں گی تمہاری۔''

رانیہ فریزر سے سموسے نکالتے ہوئے واپس مڑی۔

''میری منگنی اور شادی؟ کرن آپی یہ آپ کیا بات کر رہی ہیں۔'' کرن نے حیرت سے رانیہ کو دیکھا جو اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا تمہیں واقعی نہیں پتا رانیہ، تمہاری خالہ نے تو کئی سال پہلے سب کے سامنے تمہیں سعد کے لیے مانگ لیا تھا۔ یہ بات تو فیملی میں سب جانتے ہیں کہ چند سال بعد تمہاری شادی سعد سے ہی ہو گی۔ میں بھی

تمہیں اس بات کا علم ہوگا۔'' وہ ان کی بات سن کر شاک رہ گئی تھی اور پھر اچانک اسے آنٹی کا وہ سارا خصوصی رویہ اور ان کے لاڈ پیار کی وجہ سمجھ آ گئی تھی جو وہ اس کے ساتھ کرتی تھیں لیکن اس کی شادی سعد بھائی کے ساتھ...... وہ تیرہ سال کی تھی، اسے سوچ کر ہی عجیب لگا تھا اور اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے پچھلے سال ہوئی خرم ماموں کی شادی کی یاد آ ئی جہاں دولہا بنے ماموں کے ساتھ دلہن بنی نائلہ ممانی شرمائی لجائی بیٹھی تھیں۔ یک دم وہ چہرے رانیہ اور سعد میں بدل گئے۔ اس دن پہلی بار رانیہ نے سعد کے بارے میں سوچا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کب اس کے دل نے سعد کے نام پہ دھڑکنا شروع کیا، کب اسے اس سے محبت ہوئی اور کب وہ اس کے خوابوں کا حصہ بن گیا۔ وہ خواب جو وہ جاگتی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ سعد گریجویشن کے بعد پاکستان آیا تو سب گھر والے اس سے ملنے گئے، رانیہ بھی ان کے ساتھ تھی لیکن اس بار وہ سعد کا سامنا کرتے ہوئے بہت نروس تھی۔ وہ سب لوگوں سے ملتا اس تک آیا اور باقی کزنز کی طرح اس نے رانیہ سے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔ رانیہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس کا ہاتھ ہی نہیں پورا جسم کانپ رہا تھا۔ سعد کا ہاتھ تھام کر اسے کرنٹ لگا تھا اور پھر فوراً ہی اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ ایک کونے میں بیٹھ گئی تھی۔ اسے لگا کمرے میں موجود سب لوگ صرف اسے اور سعد کو ہی دیکھ رہے تھے۔ امی کے پیچھے چھپی وہ چور نظروں سے سعد کو دیکھتی رہی جو اب اور بھی اسمارٹ ہو گیا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے والا پُراثر لہجہ، گوری رنگت اور لمبا قد اس کی شخصیت کو چار چاند لگا رہے تھے۔ اس کا پاکستان میں قیام مختصر تھا اور رانیہ سے تو اس کی ملاقات ایک دو بار ہی ہوئی لیکن رانیہ تو بس سعد کی ہو گئی تھی۔

کچھ جذبے اظہار کے محتاج نہیں ہوتے ہیں اور محبت ان میں سے ایک ہے۔ آپ کسی سے کتنی محبت کرتے ہیں یہ لفظوں میں بیان کرنا آسان نہیں ہوتا۔

یہ تو بس ایک کیفیت ہوتی ہے، میٹھا میٹھا درد، بے بسی اور تڑپ، رت جگے اور بے سکونی...... اور یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ خود پہ اختیار نہیں رہتا۔ ہم سب سمجھداری کا ٹیگ خود پہ لگانا چاہتے ہیں لیکن یہ وہ واحد نا سمجھی ہے جو ہم جان بوجھ کر کرتے ہیں۔ وہ بھی کیا دن تھے جب ہر شعر اپنے دل کا حال معلوم ہوتا تھا اور ہر رومانوی ناول اپنی اور سعد کی داستان لگتی تھی۔ اسے آج بھی وہ دن، مہینے اور وقت تمام تر موضوعات کے ساتھ یاد تھے جب، جب اس نے اور سعد نے کوئی بات کی تھی۔ بولتا تو بس سعد ہی تھا رانیہ کی تو زبان کو تالا لگ جاتا تھا۔ پوسٹ گریجویشن کے بعد وہ مستقل پاکستان آ گیا تھا، رانیہ ان دنوں سیکنڈ ائیر میں تھی۔ اسے ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب آفر ہوئی تھی اور وہ چند دن بعد ہی لاہور چلا گیا تھا۔ سعد پاکستان آ کر بھی اس سے دور ہی رہا، رانیہ اس دوری سے کبھی الجھتی تو کبھی اسے انجوائے کرتی۔ عجیب محبت تھی اس کی بھی اسے سامنے دیکھ کر بولتی بند ہو جاتی تھی لیکن کبھی دروازے کی اوٹ سے تو کبھی کھڑکی سے، چھپ کر وہ سعد کی ایک جھلک دیکھ کر خوش ہو جاتی تھی۔ خالہ اور امی کی باتوں میں سعد کا ذکر سننا اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کا نام دل میں رنگینیاں بکھیر دیتا۔ اپنا اور اس کا نام ساتھ لکھتی اور گھنٹوں اس کاغذ کو دیکھتی رہتی۔ ویک اینڈ پہ وہ آیا تو اس کے گھر والوں نے سعد کی دعوت کی۔ رانیہ کو دیکھ کر وہ اس سے بھی ہیلو ہائے کرنے لگا۔

''تم آج کل کیا کر رہی ہو رانیہ؟'' وہ معمول کے انداز میں پوچھ رہا تھا اور رانیہ کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔

''میں تھرڈ ائیر میں ہوں۔'' کن انکھیوں سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیتی وہ بڑی مشکل سے بولی تھی۔

''اچھا گڈ، کیا سبجیکٹس ہیں تمہارے؟'' ایک اور سوال پوچھا گیا تھا۔

''اردو لٹریچر۔'' وہ ایک لفظی جملہ بول کر وہ وہاں سے کھسک گئی تھی۔ وہ آنٹی کے کئی بار بلانے پہ بھی دوبارہ

کمرے میں نہیں آئی تھی البتہ سعد کو گھر سے نکلتے دیکھنے کے لیے وہ ننگے پاؤں سیڑھیاں چڑھتی ٹیرس پہ گئی تھی اور وہاں سے چھپ کر اس نے جی بھر کر اسے دیکھا تھا جو ابو اور امی سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔

اس دن وہ کالج سے آئی تو پتا چلا کہ شگفتہ آنٹی آئی ہوئی ہیں۔ وہ انہیں سلام کرنے امی کے کمرے کی طرف آرہی تھی کہ شگفتہ آنٹی کی آواز سن کر باہر ہی رک گئی۔

''میں تو انتظار کر رہی ہوں فائزہ کہ رانیہ کا گریجویشن مکمل ہو اور میں اسے اپنی بہو بنا کر لے جاؤں۔'' وہ امی سے کہہ رہی تھیں اور رانیہ کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

''آپ نے سعد سے بات کرلی آپا؟'' امی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''سعد نے کیا کہنا ہے، پہلے کبھی اس نے میری کسی بات سے اختلاف کیا ہے بھلا۔ یوں بھی اسے پتا ہی ہے کہ رانیہ اس سے منسوب ہے اور پھر ہماری رانیہ تو چاند کا ٹکڑا ہے، ایسی بیوی تو قسمت والوں کو ملتی ہے، مجھے تو لگتا ہے وہ خود بھی رانیہ کو پسند کرتا ہے۔'' آنٹی کی بات سن کر اسے ان پہ بے تحاشا پیار آیا تھا۔ وہ وہاں مزید کھڑی نہیں رہ سکتی تھی، دل کو تو جیسے پر لگ گئے تھے ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہا تھا۔ یوں تو یہ بات پہلے بھی راز نہیں تھی اور اب تو رانیہ نے اپنے کانوں سے سن لی تھی دل میں جلترنگ نہ بجتے تو کیا ہوتا۔ ویسے تو خاندان میں رانیہ کے ہم پلہ بہت سے رشتے تھے لیکن چونکہ سب ہی کسی نہ کسی طرح یہ بات جانتے تھے کہ وہ سعد سے منسوب ہے سو کسی نے اس کے لیے ایسی خواہش کا اظہار نہ کیا اور ان دنوں ایک دو باہر کے آئے ہوئے رشتوں کو امی نے انکار کر دیا۔

رانیہ کا بی اے کا رزلٹ آگیا تھا لیکن شگفتہ آنٹی کی طرف سے رشتے کی باقاعدہ بات اب تک نہیں ہوئی تھی۔ اس دن وہ ان کے گھر آئیں تو امی نے خود ہی بات شروع کی۔ رانیہ اس وقت چائے کی ٹرے تھامے لاؤنج میں جا رہی تھی۔

''آپ نے سعد اور رانیہ کی شادی کے بارے میں کیا سوچا آپا، آپ کو پتا ہے رانیہ کے لیے پچھلے ماہ دو رشتے آئے تھے لیکن میں نے بغیر دیکھے انکار کر دیا۔'' فائزہ کچھ دنوں سے بہن کا الجھا الجھا رویہ نوٹ کر رہی تھیں اسی لیے انہوں نے رشتے والی بات بھی کہہ ڈالی۔

''کیا بہت اچھے رشتے تھے فائزہ! دیکھنا تو چاہیے تھا تمہیں، ایسے انکار کیوں کر دیا؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولیں۔ فائزہ حیرت سے ان کا منہ تک رہی تھیں اور باہر کھڑی رانیہ کو اپنے کانوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔

''آپ جانتی ہیں آپا، آپ کیا بات کر رہی ہیں۔ سعد کے لیے رانیہ کی بات آپ نے دس سال پہلے خود کی تھی اور ابھی کچھ عرصہ پہلے تک آپ مجھے یہی کہہ رہی تھیں کہ رانیہ کے گریجویشن کرتے ہی آپ شادی کی تاریخ رکھ دیں گی اور اب آپ مجھے کہہ رہی ہیں کہ دوسرے رشتے اچھے ہیں تو وہ دیکھ لوں؟'' فائزہ تلخی سے بولی تھیں۔

''میں کیا کروں فائزہ، میرا اس میں کوئی قصور نہیں...... میں نے کئی بار سعد سے کہا، سفیان کا بھی اس سے اچھا خاصا جھگڑا ہوا ہے لیکن اس کی تو بس ایک ہی رٹ ہے وہ رانیہ سے شادی نہیں کرے گا، کہتا ہے وہ تو ہمیشہ اسے اپنی چھوٹی بہن سمجھتا رہا ہے۔ کتنا ارمان تھا مجھے کہ رانیہ میری بہو بنے لیکن کیا کروں بیٹے کے آگے بے بس ہوگئی ہوں۔'' شگفتہ کا لہجہ معذرت بھرا تھا۔ وہاں کھڑے کھڑے رانیہ کے خوابوں کی طرح دل بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔ شرمندگی سی شرمندگی تھی، اذیت سی اذیت تھی۔ بے تاثر چہرے کے ساتھ اس نے کمرے میں چائے کی ٹرے رکھی اور باہر نکل گئی۔ اسے یہ بات امی نے بعد میں بھی کبھی نہیں بتائی اور اس نے بھی یہی ظاہر کیا کہ وہ کچھ نہیں جانتی ہے۔ دل ٹوٹنے کا رنج اپنی جگہ تھا لیکن اس نے کسی کے سامنے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ دکھی ہے۔ ان دنوں امی کا موڈ بہت خراب تھا اور ابو بھی چپ چپ تھے۔ ایک ماہ بعد شگفتہ آنٹی سعد کی شادی کا کارڈ دینے آئیں تو امی نے شادی میں

جانے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے خوب منتیں کی اور شادی والے دن آ کر بھی ان کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ صرف دنیا داری کی خاطر دو گھنٹے کے لیے غیروں کی طرح ولیمے میں گئیں۔ اس دن رانیہ نے ہال میں دور سے سعد کے ساتھ بیٹھی روبی کو دیکھا تھا۔ حسد اور جلن کے ساتھ ہتک کا احساس ہوا تھا۔ اس نے جانچتی نظروں سے اس عام سی لڑکی کو دیکھا جس کا رانیہ سے تو کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔

"سنا ہے بڑا زوردار افیئر چل رہا تھا دونوں کا۔"

اس کے پاس ہی بیٹھی کسی کزن نے تبصرہ کیا۔ روبی، سعد کے پہلو میں سرشار بیٹھی تھی وہ اگر سعد کی زندگی میں نہ آئی ہوتی تو یقیناً یہ جگہ رانیہ کی ہوتی۔

رانیہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ایم اے میں داخلہ لے لیا اور ساتھ ہی ساتھ گھر میں رشتے والی خواتین کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ آئے دن اسے مختلف لوگوں کے سامنے چائے کی ٹرالی سنبھالے جانا پڑتا اور وہ بوجھل وجود کے ساتھ وہ سب کچھ کرتی جو امی اسے کرنے کو کہتیں۔ رانیہ کی رائے کسی نے نہیں مانگی تھی لیکن امی کو اب سعد سے بہتر اور شگفتہ آنٹی سے زیادہ بڑے خاندان میں رشتہ جوڑنا تھا' یہ جیسے ایک ضد تھی اور پھر بہت دیر کے بعد آخر ان کی نگاہِ انتخاب فہیم عثمان پہ جا ٹھہری۔ فہیم دوحہ میں رہتا تھا اور ایک نہایت قابل انجینئر تھا۔ یوں ایم اے کے بعد رانیہ کی شادی ہو گئی۔ اس کی شادی پہ سب کی امید کے برخلاف سعد خصوصی طور پہ شرکت کے لیے آیا تھا۔ شادی کا ہر فنکشن اس نے اٹینڈ کیا تھا۔ روبی اس کے ساتھ نہیں آئی تھی وہ ان دنوں بچے کی پیدائش کے بعد اپنے والدین کے گھر پہ تھی۔ رانیہ نے اسے دو سال بعد دیکھا تھا۔ وہ بہت زیادہ نہیں بدلا تھا لیکن اسے لگا وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ ہو گیا ہے۔ شادی کے دنوں میں رانیہ نے سعد کو یہاں سے وہاں کاموں کے لیے بھاگ دوڑ کرتے دیکھا، وہ امی اور ابو سے بھی بہت باتیں کر رہا تھا۔ رانیہ کو لگا جیسے وہ وہاں ازالے کے لیے آ رہا تھا۔ شادی والے دن وہ فہیم کے پہلو میں بیٹھی سعد کو دیکھتی رہی تھی جو ہنستا مسکراتا لوگوں سے ملتا انتظامات میں مصروف تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا فہیم سے موازنہ کرتی رہی تھی اور اس دن کے بعد بھی اگلے کئی سال وہ فہیم کی شخصیت میں سعد کو تلاش کرتی رہی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فہیم اس سے بے تحاشا محبت کرتا ہے' اس نے بے حد عیش سے رکھا ہوا تھا پر رانیہ کے دل میں ایک کسک تھی۔ شادی کے بعد وہ قطر چلی گئی تھی۔ پچھلے دس سالوں میں وہ جب بھی پاکستان آئی اس کی سعد سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن وہ کہاں ہے کیسا ہے اور اس کے کتنے بچے ہیں رانیہ اس سے باخبر تھی۔ فہیم کی کمپنی اسے لاہور آفس شفٹ کر رہی تھی اور فہیم خود بھی پاکستان واپس آنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ دو سال پہلے اس نے لاہور میں گھر بنوانا شروع کر دیا تھا اور رانیہ اسے چاہ کر بھی منع نہیں کر پائی تھی اور اب وہ وقت آ گیا تھا کہ اسے اس شہر آنا پڑا تھا جہاں سعد رہتا تھا بلکہ اس شہر ہی نہیں وہ ایک ہی علاقے میں رہتے تھے اور اس پر یہ کہ ان کے بچے بھی ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ پریشان نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ زندگی بھی کیسے' کیسے امتحان لیتی ہے۔

☆☆☆

آج کل ان کے گھر بہت زیادہ مہمانوں کی آمد و رفت تھی اور وہ اچھی خاصی مصروف رہتی تھی۔ اس کی نند سعدیہ بھی ان دنوں ان کے پاس رہنے آئی ہوئی تھی۔ گھر میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ وہ کچن میں لگی ہوئی تھی اور سعدیہ اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی جب فضا نے آ کر کھانے کا پوچھا۔

"ابھی دس منٹ میں کھانا لگاتی ہوں جانی۔"

رانیہ نے اپنی آٹھ سالہ بیٹی کو پچکارتے ہوئے کہا۔ جو منہ بنا کر واپس لوٹ گئی تھی۔

"مجھے تو فضا بہت پیاری لگتی ہے رانیہ بالکل تمہاری صورت ہے، کیوٹ سی گڑیا۔ میں نے اسفند سے کہہ دیا ہے میں تو بس اپنی بھتیجی کو ہی بہو بناؤں گی

اگر عمیر کی شادی کسی سے ہوگی تو صرف فضا سے۔''
سعدیہ مسکراتے ہوئے رانیہ سے کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں محبت تھی لیکن رانیہ کو اپنا وجود سلگتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ لب بھینچے وہ سعدیہ کی باتیں سن رہی تھی۔

''بس کریں آپی، جانتی بھی ہیں کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ آٹھ سال کی ہے فضا اور عمیر بھی اتنا چھوٹا ہے یہ کون سی عمر ہے رشتے جوڑنے کی، شادی بیاہ کی باتیں اس عمر میں کرنے کی کوئی تک نہیں بنتی۔'' وہ بہت تلخی سے بولی تھی اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کا چہرہ اور آواز دونوں سے کتنا غصہ عیاں تھا۔

''تم اتنا ناراض کیوں ہو رہی ہو رانیہ، میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ میرے بھائی کے ساتھ میرا رشتہ اور مضبوط ہو جائے اور پھر اس میں برائی بھی کیا ہے؟'' سعدیہ کو اس سے اتنی تلخی کی امید نہیں تھی۔

''میرا وہ مطلب نہیں تھا آپی! لیکن آپ پلیز ابھی اس قسم کی کوئی بات مت کریں میں نہیں چاہتی بچوں کے ذہن میں کم عمری میں منگنی اور شادی کے حوالے سے کوئی بات آئے۔'' سعدیہ کی بات سن کر وہ دھیمی پڑ گئی تھی۔

''اس کا احساس تو مجھے بھی ہے رانیہ یہ تو میری تمہاری آپس کی بات ہے بچوں تک کیسے پہنچے گی بھلا۔'' سعدیہ کو بہر حال رانیہ کی بات مناسب لگی تھی۔

''آپی یہ بات آج میرے اور آپ کے درمیان ہے کل یہ کسی نہ کسی طرح خاندان میں گردش کرتی ہمارے بچوں تک پہنچ ہی جائے گی، عمیر تو خیر لڑکا ہے لیکن فضا..... اور لڑکیاں ویسے بھی بہت جذباتی ہوتی ہیں یہ خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ دل ہی دل میں آئیڈیل بنا لیتی ہیں۔ کل اگر عمیر اور فضا کی کسی بھی وجہ سے شادی نہ ہو سکی تو اس بات کی تکلیف اس کے دل سے تمام عمر نہیں جائے گی۔ فرض کریں چند سال بعد عمیر، فضا کے بجائے کسی اور لڑکی سے شادی کی خواہش کرے اور آپ کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا دوسرا کوئی آپشن نہ ہو تو پھر میری بیٹی کا کیا ہوگا۔ اس کا تو دل ٹوٹ جائے گا ناں۔ اس کے خواب بکھر جائیں گے جو اس نے کم عمری سے اپنی آنکھوں میں سجائے ہوں گے۔ ٹھکرائے جانے کی اذیت بڑی جان لیوا ہوتی ہے آپی انسان تمام عمر کسی دوسرے شخص کو قبول نہیں کر پاتا۔ میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ میری بیٹی اس تکلیف سے نہ گزرے۔ ہمارے بچوں کی خوشیوں کے لیے یہی مناسب ہے کہ آج ہم کوئی کمٹمنٹ نہ کریں۔ کل کیا ہوگا یہ نہ آپ جانتی ہیں اور نہ میں لیکن اگر وقت آنے پر ان دونوں کی بھی یہی خواہش ہوئی جو آپ کی اور اسفند بھائی کی ہے تو انشاء اللہ یہ شادی ضرور ہوگی لیکن اگر آپ کے بات کرنے سے پہلے ہمیں فضا کے لیے اس کے ہم پلہ کوئی بھی رشتہ ملا تو میں آپ کا انتظار نہیں کروں گی۔'' رانیہ کا لہجہ اتنا دوٹوک تھا کہ سعدیہ مزید کچھ کہہ نہیں پائی اور خاموشی سے کچن سے چلی گئی۔

رانیہ اسے کیا بتاتی کہ جس کرب سے وہ اتنے سالوں سے گزر رہی ہے وہ اسے اپنی بیٹی کا مقدر نہیں بنانا چاہتی۔ یہ تو صرف وہی جانتی تھی کہ یک طرفہ محبت کا عذاب کیا ہوتا ہے اور جب خواب ٹوٹتے ہیں اور انسان حقیقت کی دنیا میں آتا ہے تو اپنا آپ کتنا حقیر اور کمتر لگتا ہے۔ آج اگر وہ یہ سب نہ کہتی تو ہو سکتا تھا دس پندرہ سال بعد فضا کے روپ میں ایک اور رانیہ اپنی محبت کا ماتم کر رہی ہوتی۔ کاش اس کی امی اور شگفتہ آنٹی نے بھی یہ سب سوچا ہوتا تو آج وہ ایک مطمئن اور پرسکون زندگی گزار رہی ہوتی۔ اسے فہیم کے اظہار محبت کے جواب میں مسکرا کر نظریں نہ چرانی پڑتیں۔ وہ اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے بتاتی کہ وہ اس دنیا کی سب سے خوش قسمت عورت ہے جسے ایک چاہنے والا، محبت کرنے والا، قدر کرنے والا ہم سفر ملا ہے۔ وہ ہر بار فہیم اور سعد کا موازنہ نہ کرتی۔ آج رانیہ کے پاس فہیم کے لیے سب کچھ ہے سوائے محبت کے۔ کاش اس دن کرن آپی نے اسے سعد اور اس کے بارے میں نہ بتایا ہوتا۔ یہ سب سوچ کر اس کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔



سنسنی ناول

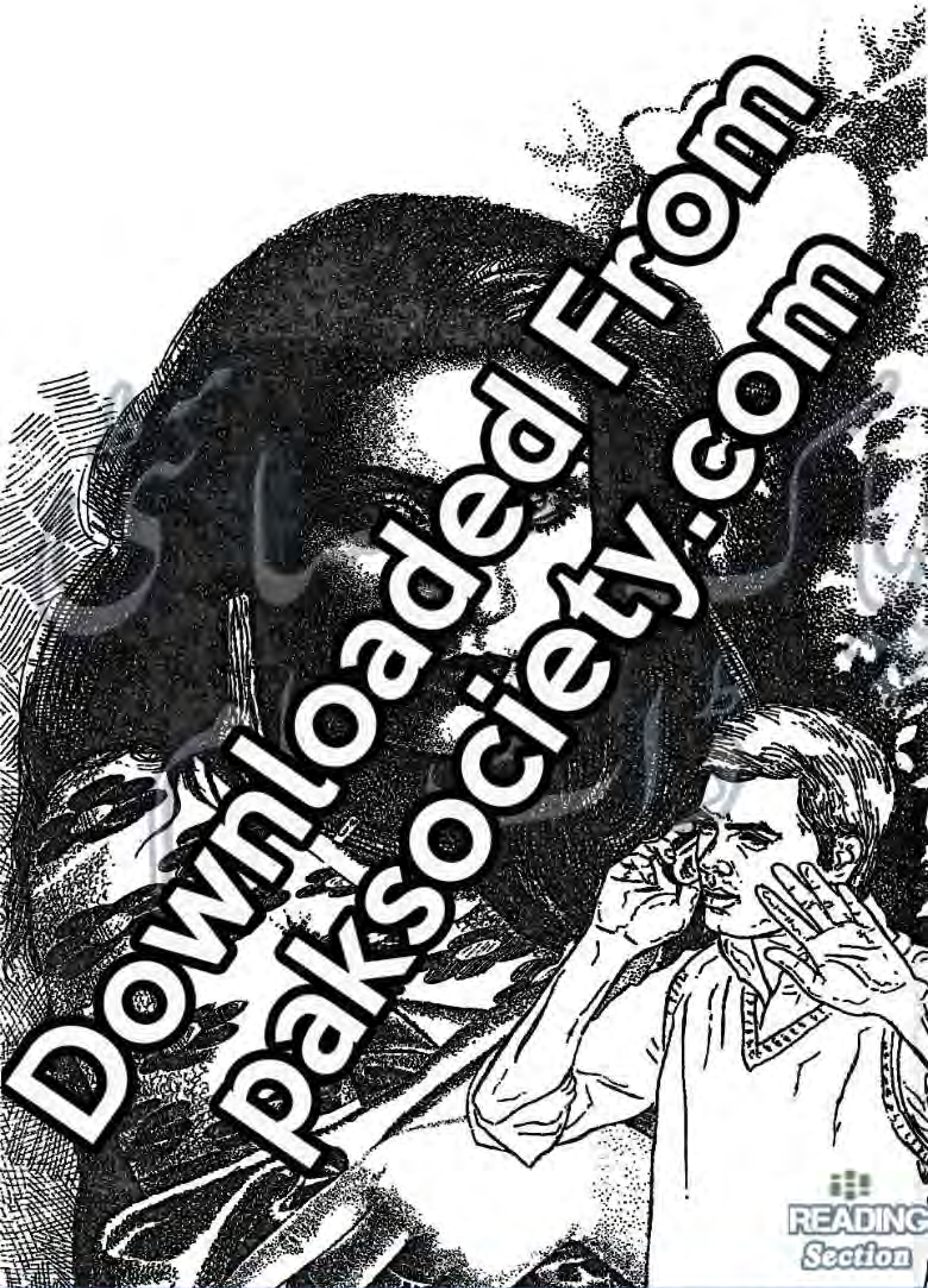
دیارِ صبح کے اجالوں میں

نایاب جیلانی

تیسرا حصہ

رات کا سفر بالآخر اپنے اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ اسما نے دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنی ٹوٹی ہمتوں کو مجتمع کیا اور ایک نئے حوصلے کے ساتھ آنے والے حالات کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

اگر اس گھر کے کچھ افراد کو یا ہادی کو اسما را کے متعلق غلط فہمی ہوئی تھی تو اس میں اسما کا کیا قصور تھا؟ وہ کیوں ڈرتی؟ شرمسار ہوتی؟ بارِ ندامت سے چھپی رہتی؟ وہ تو بے قصور اور انجان تھی اگر غلط فہمی کا شکار تھے



تو عبدل انکل کے گھر والے تھے...... وہ نہ کسی غلط فہمی میں مبتلا تھی اور نہ کسی سے شرمسار ہو سکتی تھی۔

اس کی اپنی ایک پہچان تھی، ایک وقار تھا۔ کوئی بھلا کیوں اسے اسمارا سے کمپئر کرتا؟ اسمارا کا اور اس کا کیا مقابلہ تھا؟ اسمارا کی اپنی پرسنالٹی تھی اور اسما کی اپنی شخصیت...... اس نے بھی خود کو اسمارا سے کم تر نہیں سمجھا تھا۔ اور نہ وہ احساسِ کمتری کا شکار تھی۔

اس نے رات بھر کے ایک، ایک منظر اور بات کو ذہن کی سلیٹ سے صاف کر کے جھٹک دیا تھا۔ اسے آنے والے حالات کا جائزہ لینا تھا۔ اپنی عقل اور فہم کو ... بروئے کار لا کر بے ترتیبی کے ہر، ہر پہلو کو نظر میں رکھنا تھا۔ کہاں پہ اور کس جگہ پر معمولی سی لغزش ہوئی تھی؟ جو اتنی بڑی ڈسٹربنس کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

آخر کچھ تو گڑبڑ تھی ناں......

اس نے ہلکے رنگ کا سوٹ نکالا اور واش روم کی طرف بڑھ گئی...... اپنی پامالی اور ذات کی بے توقیری کا سارا غبار پانی کے نیچے بہا کر ایک پُر سکون کر دینے والے احساس کے ساتھ وہ ساری تھکاوٹ دور کرتی باہر آئی تو پہلے والی شکستگی کا اثر بہت ہلکا پڑ چکا تھا۔

وہ گرم پانی سے تروتازہ ہو کر باہر نکلی تھی...... اپنے لمبے گھنگرالے بال سلجھا کر اس نے سلیقے سے دوپٹا اوڑھ لیا تھا۔ آئینے پر نگاہ پڑی تو اسے کہیں سے بھی آئینہ اپنا مذاق اڑاتا نظر نہیں آیا تھا۔ وہ کم رو ضرور تھی لیکن بے اعتماد ہرگز نہیں تھی۔ اس کے اعتماد کی مضبوطی ہی اس کی شخصیت کا نکھار تھی۔

اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو وقتِ نماز، قضا میں ڈھل چکا تھا۔ دل میں ڈھیروں افسوس لیے اس نے قضا نماز کے ساتھ نوافل ادا کیے اور اپنے لیے صبر، حوصلے، برداشت اور ثابت قدمی کی دعا مانگی۔

ابھی اس نے جائے نماز تہ کر کے اٹھایا ہی تھا جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی پھر کوئی دبے قدموں بہ مشکل چلتا ہوا اندر آیا تھا۔ اسما نے آنے والی خاتون کو ڈگمگاتے دیکھا تو جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔

پھر انہیں سہولت سے بیڈ پر بٹھا دیا۔ وہ اپنی سانسیں رواں کرتی اس کا ہاتھ بیٹھنے کے بعد بھی پکڑے ہوئے تھیں۔ جب وہ سانس ہموار کر چکیں.... تب انہوں نے اسما کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر چوما اور اس کے سلام کا جواب دیا۔

"میرے ہادی کی دلہن ہو...... مجھے بڑی پیاری ہو۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پھر سے نرم انداز میں دبایا تھا۔ ان کی بات پر اسما کی پلکیں جھک گئیں۔ یہ تاثر شرمانے کا نہیں تھا، نہ شرمندگی مٹانے کا...... وہ اپنی آنکھوں کی سرخ کرچیوں کو ان سے چھپانا چاہتی تھی۔

"اسما بیٹی! میں جانتی ہوں تم رات سے کس تکلیف میں مبتلا ہو...... کیسی اذیت سے گزر رہی ہو۔ مجھے اس بات کا احساس ہے۔ تمہیں ان سب کے رویوں نے مایوس کیا ہوگا لیکن بیٹا! یہ لوگ ایسے نہیں...... دل کے برے نہیں...... دراصل ایک چھوٹی سی غلط فہمی کی بنا پر سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا...... منگنی کی تصویروں میں کسی اور لڑکی کو ان لوگوں نے اسما سمجھ لیا۔ شاید وہ بچی شکیل بھائی کی تھی...... ان سب نے اسے اسما سمجھ لیا...... انسان خطا کا پتلا ہے، غلط فہمی کسی کو بھی لاحق ہو سکتی ہے۔" وہ بڑے نرم ملائم انداز میں اس کا دل صاف کر رہی تھیں۔ باقی سب کے رویوں کی معذرت کر رہی تھیں۔ بات یہاں تک ہوتی تو ٹھیک تھی۔ ہما بھی ان کی وضاحت پہ مطمئن ہو جاتی بلکہ وہ ان کی معذرت پہ مطمئن ہو بھی رہی تھی۔

یہ ایک غلطی تھی جسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ درگزر بھی کیا جا سکتا تھا۔ اتنی معمولی سی بات جو اتنی معمولی ہرگز نہیں تھی کو بھلایا بھی جا سکتا تھا اگر آگے معاملات نہ بگڑتے...... ہادی بھی اس غلط فہمی کو تسلیم کر لیتا......

بات نہ بڑھائی جاتی اور ہادی اپنے گزشتہ رویے کی معذرت کر لیتا...... وہ ایک خوشگوار زندگی کا آغاز کر لیتے...... اسما بھی اپنی نٹ کھٹ کزن کی شرارت کو شرارت سمجھ لیتی بلکہ یہ شرارت بھی نہیں تھی اسمارا کو

تصویریں کھچوانے کا کریز تھا۔ ہر وقت موبائل پکڑ کر سیلفیاں بناتی، کبھی فرینڈز کو بھیجتی کبھی فیس بک پر لگاتی کبھی کزنز کو سینڈ کر کے تعریفیں وصول کرتی۔

اگر منگنی کی تصویروں میں کثیر تعداد اسمارا کی تصویروں کی تھی اور یہ لوگ اسمارا کو دیکھ کر ہادی کی منگیتر سمجھنے کی غلطی کر چکے تھے تو اس بات پر اتنا طوفان اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بات بڑھانے سے بڑھتی ہے، طول دینے سے لمبی ہوتی ہے بحث کرنے سے فساد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسما اس بات کو یہیں پر ختم کر سکتی تھی۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا اسمارا کو کچھ بتانے کا یا اس سے باز پرس کرنے کا... اگر اسمارا اس سب سے انجان تھی تو انجان رہتی...... اسما کبھی اپنے گھر کا بلکہ اپنی ہی ذات کے حوالے سے اتنا حساس معاملہ اسمارا کے کانوں تک نہیں پہنچنے دیتی۔ اس میں اسما کی اپنی انسلٹ تھی۔ اور اپنی ذات کی بے توقیری اسما کو مزید گوارا نہیں تھی۔

اسما اپنی ساس کے اصرار اور سمجھانے پر بڑی ہی فرمانبرداری کے ساتھ اس معاملے کو اسی جگہ پر لپیٹ چکی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا یہ بات پنڈی والوں کے کانوں تک پہنچنے نہیں دے گی۔ کیونکہ اسمارا تو کم ہی اس بات پر اس کا ریکارڈ لگاتی البتہ مامی نے مارے اتراہٹ کے زمین پر نہیں آنا تھا...... انہیں اپنی بیٹی کے حسن کو کچھ کم مان پہلے بھی نہیں تھا پھر تو ان کے قدم بھی نہ ٹکتے...... اور وہ پورے خاندان والوں کو یہ بات مرچ مسالا لگا کر بتاتیں۔ مامی کے منہ سے بات نکل کر کچھ ایسی صورت اختیار کر جاتی۔

”ارے اسما کے سسرال والے ایک مدت تک اسمارا کو اپنی بہو سمجھتے رہے...... میری اسمارا ماشاء اللہ سے چاند کا ٹکڑا ہے...... ہر کوئی اس چاند سے اپنا آنگن روشن کرنا چاہتا ہے...... وہ بیچارے غلط فہمی میں مارے گئے۔ شادی والی رات پنڈورا باکس کھلا اور نکلا کیا؟“ یا پھر مامی اس انداز میں بھی گفتگو کا رخ موڑ سکتی تھیں۔

”اسما کے سر کی بینائی جاتی رہی تھی۔ سویرے کے بجائے اندھیرا اٹھا کے لے گئے۔ کسی عورت کو ساتھ لاتے تو وہ اتنی کم عقلی کا ثبوت ہر گز نہیں دیتی لیکن پرانے رواجوں نے بیچاروں کی دھول اڑا دی۔“

مامی کو اگر موضوع گفتگو مل جاتا تو مزید بھی چر کے لگانے سے گریز نہ کرتیں۔

”اسما کو پہلی رات میں انگلی سے پکڑ کر چلتا کر دیا گیا...... بیچاری کی اوقات بھی یہی تھی۔ باوا نے تو اپنی طرف سے بڑا اونچا ہاتھ مارا تھا۔ مقدر بھی آرڈر پر اونچا بنوا لیتا۔“ یہ اور اسی قسم کی اور باتیں مامی کی طرف سے ضرور آتیں۔

اسما جانتی تھی اگر اس گھر سے معمولی سی بھنک بھی اس موجودہ صورتِ حال کی مامی کو پڑ گئی تو اس کے لیے قدم، قدم پر آزمائشوں کے گڑھے نکل آنے تھے...... کیونکہ مامی ایسی تھی ہی نہیں جو دل کی بات دل میں رکھ لیتیں۔ جب تک وہ چیدہ، چیدہ لوگوں کو پورا قصہ نہ سنا ڈالتیں انہیں چین نہیں آنا تھا۔ جہاں پر اسما کی سبکی اور اسمارا کے حسن کی بات ہوتی ان کی زبان کو روکنا محال ہو جاتا تھا۔

اس کی ساس نے جو کہا اس نے سمجھ لیا تھا، مان لیا تھا، تسلیم کر لیا تھا اور درگزر بھی کر دیا تھا لیکن ہادی کے چند الفاظ ابھی تک اس کے دماغ میں کانٹے کی طرح کھبے تھے۔

”میں تم سے تمہارے ہی گھر میں ملاقات کر چکا ہوں۔“

ہادی نے کب اس سے ملاقات کی تھی؟ وہ اسما کے گھر کب آیا تھا؟ ایک بات تو طے تھی اسما سے ہادی نے خواب میں بھی ملاقات نہیں کی تھی پھر جس نے ملاقات کی تھی وہ کون لڑکی تھی؟

”کیا اسمارا؟“

”ہر گز نہیں......“ اسما مان ہی نہیں سکتی تھی اگر ہادی آتا اور بابا یا عاشر بے خبر رہتے؟ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ یا اسے بے خبر رکھا جاتا یہ بھی ممکن نہیں تھا۔

”تو کیا گلناز؟ وہ ایسی چیپ حرکتیں کر سکتی ہے......“ وہ پہلے بھی ایسی شرارتیں سرانجام دے چکی

تھی یہ ایک معما تھا تو کیا گلناز نے ہادی سے اس کے گھر میں اسما بن کر ملاقات کی تھی؟"

☆☆☆

اس کا ذہن اسی نکتے پر ٹھہر سا گیا تھا۔

گلناز انتہائی چھچھوری ،فسادن، شریر اور ایسی حرکتوں کی ماسٹر تھی۔ اس کے ہاسٹل میں قیام کے دنوں میں اکثر اسمارا لمبے، لمبے خط لکھ کر گلناز کے فسادات کی تفصیل بتایا کرتی تھی۔

"اسے جگہ، جگہ کے کھانے کا سواد ہے۔ عاشر اسے گھاس نہیں ڈالتا...... منہ نہیں لگاتا...... بڑی ادائیں دکھاتی ہے اسے۔ بڑے ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کی دال گلنے والی نہیں...... ہر روز نئے، نئے آئٹم (ڈشز) بنا، بنا کر لاتی ہے، کہیں عاشر کے دل میں معدے کی بھول بھلیوں سے ہوتی ہوئی اتر جائے لیکن بات بنتی نظر نہیں آتی۔ تمہارا بھائی بھی تمہاری طرح قول کا پکا ہے۔ مجال ہے جو دل کو اِدھر اُدھر پھسلنے دے۔ مجھے اپنی قسمت پر رشک آتا ہے اور تمہاری قسمت پر افسوس...... ایک عاشر ہے جو صبح شام میرے گرد پروانوں کی طرح گھومتا ہے اور ایک تمہارا گھونچو منگیتر ہے جس نے آج تک فون کال کر کے تمہارا حال تک نہیں پوچھا۔ وہ خود کو دو ہزار سولہ کے بجائے انیس سو بیس میں تو نہیں تصور کرتا...... حد ہے یار شرمانے کی۔ آج کل کے فاسٹ دور میں اتنا محتاط بندہ بلکہ کسی حد تک بے نیاز، بیگانہ اور بے پروا۔ میرا ایسا منگیتر ہوتا تو اٹھا کر خود بخود دیوار سے پار گلناز بیگم کی گود میں گرا آتی۔ اس کے چرنوں میں بٹھا آتی۔ لو بی بی سنبھالو، ہم سے ایسے موڈی منگیتر نہیں سنبھالے جاتے۔ جن کو اپنی معصوم ،بیچاری سی فیانسی کا احساس تک نہیں ہو...... کبھی جو کوئی تحفہ عید، شبرات یا سالگرہ کے نام پر بھجوایا ہو حتیٰ کہ تمہارے ٹاپ کرنے پر بھی اس بھوکے ،ننگے ،کنجوس کو خیال نہیں آیا...... کچھ اور نہ سہی...... اُدھر سے سوکھے چلغوزے ،کالے اخروٹ، ہتھوڑے سے بھی نہ ٹوٹنے والے بادام اور لوہے کے دانتوں سے چبانے والی خوبانیاں ہی بھیج دیتا۔" اسمارا کے خطوط ایسے ہی ہوتے تھے۔ بات گلناز سے شروع کرتی اور خاتمہ ہادی کی بے نیازیوں پر جا کر ہوتا۔

پھر جب پہلی چھٹیوں میں اسما گھر آئی تو بستر میں گھس کر ٹھنڈی اسٹرابیریز کھاتے ہوئے اسمارا نے گلناز کے مزید کارناموں پر سے بھی پردہ اٹھایا تھا۔ وہ چن ،چن کر اس کے کرتوت بتا رہی تھی۔

"گلناز اپنا سنہرا رنگ اور بلی جیسی آنکھیں کیش کراتی پھر رہی ہے...... تھوڑا موٹاپا کم کر لے تو پھر کالونی کے سارے ہیرو اس کے پیچھے...... یقین کرو، اس گلو نے پروفیسر سہیل کی بیٹی ہما آرا کے جیٹھ کی سالی کا رشتہ تڑوا دیا ہے۔" اسمارا چٹخارے لے کر مزے سے بتا رہی تھی۔ اسما کچھ، کچھ حیران رہ گئی۔ گلناز شوخ و شریر ضرور تھی پوری کالونی کے لوگ اس کی شرارتوں سے ناک تک عاجز تھے۔ خاص طور پر اس کی مامی کو گلناز ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ لیکن وہ ایسی ویسی بھی تھی جیسا کہ اسمارا بتا رہی تھی؟ اس کا اندازہ اسما کو نہیں تھا۔

"تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟" اسما نے بے یقینی بھرے لہجے میں کہا۔

"پوری کالونی کو پتا ہے، مجھے تو امی نے بتایا۔" اسمارا نے بتایا۔

"پھر تو سراسر ہوائی ہو گی۔" اسما سر جھٹک کر رہ گئی۔

"ہرگز نہیں...... ساری کالونی کی آنٹیوں کو خبر ہے۔" اسے برا لگا...... اپنی بات کا جھٹلایا جانا اسے کبھی پسند نہیں تھا۔

"تو مامی نے نشر کیا ہو گا سارا پروگرام...... پوری کالونی میں ان سے زیادہ اچھا کمنٹیٹر کون ہے۔" گو کہ اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہا تھا پھر بھی اسمارا نے سن لیا...... اس کے کان بہت پتلے تھے۔ اور پھر اسے یہ بات بھی بری لگی۔

"تم امی کو افواہیں پھیلانے والا سمجھ رہی ہو؟"

"نہیں، میں نے مامی کو کمنٹیٹر کہا ہے یعنی کہ

مبصر، تبصرہ کرنے والی۔'' اسمانے جان چھڑالی تھی۔ تاہم اسمارا کو بڑا گراں گزرا تھا۔ پھر شاید اس نے مامی کو بھی بتادیا تھا۔ تبھی مامی کا تین دن منہ پھولا رہا تھا۔ بعدازاں اسما پھر ہاسٹل چلی گئی تھی تب ایک مرتبہ پھر اسمارا کے لیے، لمبے میسج ملنے لگے۔ خطوط سے وہ میسجوں پر آگئی تھی۔ خط لکھنا اس نے چھوڑ دیا تھا کیونکہ عاشر پوسٹ کرنے نہیں جاتا تھا۔

''اللہ اس گلناز کی بچی کو ہدایت دے۔ آنٹی زیتون بیگم کے بیالیس سالہ کنوارے شہزادے نے ببانگ دہل اعلان کردیا ہے کہ وہ شادی کرے گا تو ہماری پڑوسن گلو سے...... حد ہے یار...... گلناز تو پوری کالونی میں شر پھیلا رہی ہے۔'' اسمارا کا میسج ملتے ہی اسما کو بڑی زبردست کھد بد ہوئی تھی...... بھلا گلناز کیسے آنٹی زیتون بیگم کے بیٹے کی باتوں میں پھنس گئی۔ وہ تو کیریکٹروائز ذرا بھی اچھا نہیں تھا۔

''اگر آنٹی زیتون بیگم کا بیٹا گلناز کے عشق میں مر رہا ہے تو اس میں گلناز بیچاری کا کیا قصور......؟'' اسمانے جواباً لکھا...... تو اسمارا نے ایک سڑا ہوا اسٹیکر بھیج دیا جو اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ پھر کچھ دن ہی گزرے تھے کہ اسمارا کی طوفانی فون کال آگئی۔ اس کا موبائل بند تھا تو اس نے ہاسٹل والوں کا ناطقہ بند کردیا...... مجبوراً اسے موبائل آن کرکے اسمارا کو کال کرنا ہی پڑی تھی۔ جیسے ہی اس نے ہیلو کہا اسمارا نان اسٹاپ شروع ہوگئی۔

''سن لو ذرا تم...... اپنی لاڈلی گلناز کے کرتوت...... سدرہ آنٹی کے فیانسی کو پھنسالیا۔ اللہ، اللہ کرکے آنٹی کی پینتیس سال کی عمر میں شادی ہونے والی تھی...... یہ آنٹی کے گھر ٹیوشن پڑھنے گئی تو انکل بھی وہاں آئے ہوئے تھے...... انہوں نے اس موٹی آٹے کی بوری کو دیکھا اور اپنے گھڑے جتنے من میں بسالیا۔ اگلے ہی دن انکل کا رشتہ تمہاری لاڈو کے لیے آگیا۔ جس کی تیکھی باتوں کو، اصلی کرتوتوں کو تم نقلی خیال کرتی ہو، دیکھ لو یہ انکلوں کو بھی بخشنے سے گریز نہیں کررہی ...... لونی کو انگلی پر نچا...... رکھا ہے۔ دیکھ ج

نظم

میرا لہجہ نہیں بنتا
میں جب کوئی
شعر پڑھتی ہوں
کہ میری ساری غزلوں میں
محبت ساتھ ہوتی ہے
مجھے جینے نہیں دیتی
مجھے مرنے نہیں دیتی
مجھے یہ کوئی بھی مصرعہ
کبھی پڑھنے نہیں دیتی
میں اس سے لڑ بھی پڑتی ہوں
کہ مجھ کو چھوڑ دے ظالم
مگر یہ ہنس کے کہتی ہے
جا...... میں تجھ سے نہیں ڈرتی

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

اخلاق

خالق کی خوشنودی اور مخلوق میں ہر دلعزیزی ...حاصل کرنے کے لیے اخلاق سب سے بڑا سب سے بہتر اور سب سے زیادہ آسان ذریعہ ہے۔ انسان ہزار عالم و فاضل اور عابد و زاہد ہو اگر وہ اعلیٰ اوصاف و اخلاق سے محروم ہے تو اس کا علم و فضیلت اور عبادت و زہد سب ہیچ ہیں...... عقیدے کے طور پر انسان خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو لیکن اس میں حقیقی جوہر انسانیت ہونا چاہیے۔

عورت

میں سرخ گلاب کی
وہ بند پنکھڑی تھی
جو جینے کی آرزو میں
کانٹوں میں الجھ کر
بے نقاب ہوگئی ہے

مرسلہ: سیما گل، ملتان

نے یعنی کہ دیسی بھینس۔'' اسمارا نے جہاں اسٹاپ کیا تھا اسما وہیں سے رسان بھرے لہجے میں بولی تھی۔

''یہ تو انکل کی بدنیتی ہوئی۔ وہی تھالی کے بینگن نکلے...... گلناز بیچاری اِدھر بھی بے قصور نکلی۔'' اس کی بات سن کر اسمارا جل بھن کر کباب ہو گئی تھی۔

''بڑا درد اٹھتا ہے تمہارے دل میں اس فارمی ککڑی کے لیے......'' وہ غصے میں گلناز کو بھینس سے ککڑی بنا گئی تھی۔

''اگر اتنا ہی احساس ہے تو اپنی بھابی بنالو...... میں تمہارے بھائی سے دستبردار ہو جاتی ہوں۔ کم از کم گلناز کے شر سے کالونی والوں کے شوہر، منگیتر اور انکل تو بچ جائیں گے۔'' اسمارا بری طرح سے کھول اٹھی تھی۔

بھابی تو میری تم بنوگی...... ورنہ عاشر ہمارے کباب بنا ڈالے گا وہ تمہارے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔'' اس کے جواب نے اسمارا کو فوراً ٹھنڈا کردیا تھا...... دوسری طرف امن چھایا تو اسما نے فون بند کر کے کتابوں میں سر گھسا دیا تھا۔

لیکن اس وقت اسما کو اسمارا کی وہ تمام باتیں سچ معلوم ہو رہی تھیں۔ کیا خبر، گلناز نے......؟ وہ سارا وقت گلی میں گیٹ کے اندر سے لٹک، لٹک کر باہر جھانکتی تھی۔ کیا خبر، ہادی گیا ہو...... اور گلناز نے اسے دیکھ لیا ہو...... پھر گلناز ہی اسما بن کر ہادی سے باتیں کرتی ہو؟ تصویریں اسمارا کی' باتیں فون پر گلناز کی...... آواز گلناز کی...... شکل اسمارا کی اور پھر ان دونوں میں اسما خود کہاں تھی؟

آخر یہ کیا گورکھ دھندا تھا؟ یہ کیا کہانی تھی؟ اس کا دماغ تھک ہار کر بکھر گیا تھا۔ کوئی سوچ ایک نکتے پر نہیں ٹھہر رہی تھی۔ سب کچھ دماغ میں گڈمڈ ہو کر منتشر ہو رہا تھا۔

لیکن اس کے خیال میں ایک بات تو طے تھی...... اسمارا مر کے بھی ہادی کو فون کال نہیں کرسکتی تھی۔ اس سے ملنا تو دور کی بات، وہ اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی...... وہ عاشر کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ان دونوں کی بچپن سے محبت مثالی تھی...... اور اب تو وہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو چکے تھے۔ تو پھر یہ گھٹیا کارنامہ گلناز نے سرانجام دیا تھا؟

اسما کے اندر تنفر کی تیز لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر پنڈی جائے اور گلناز کا گریبان پکڑ کر اسے پوری طرح کالونی کے سامنے ذلیل کرے جس طرح اس نے اسما کو ذلیل وخوار کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن اسما ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ وہ گلناز جتنی گھٹیا نہیں ہو سکتی تھی پھر گلناز سے بازپرس کرنے کا مطلب تھا امی اور اسمارا کو سب کچھ بتا دینا...... اور یہ چیز اسے مر کے بھی گوارا نہیں تھی۔

☆☆☆

گھڑی کی ٹک ٹک نے اور اس کی ساس کے محبت بھرے لمس نے اسما کو خیالوں کی یورش سے کھینچ کر باہر نکالا تھا۔ وہ چونک کر ہادی کی امی کے شفیق چہرے کو دیکھنے لگی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے قریب کرلیا تھا۔

یہ ان کی ملائمت، اعتماد اور قربت کا احساس تھا جو اسما کے اندر اپنائیت کے کئی احساس جاگزیں کر گیا تھا جب اس نے ہادی کی والدہ کو آنٹی کہا تو انہوں نے...... بے ساختہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں تمہاری ماں ہوں اسما! مجھے اماں کہا کرو...... ہادی کی طرح...... جب میں ہادی کی ماں ہوں تو پھر تمہاری بھی ماں ہوں۔''

محبت بھرے چند بول خون کو اتنا گرما دیتے ہیں جسم میں ایسی توانائی بھر دیتے ہیں، آج سے پہلے اسما کو احساس نہیں تھا۔ میٹھے لفظوں اور ملائم لہجوں میں مقناطیس کی سی طاقت ہوتی ہے۔ اسما کا دل جیسے اس بات پر ایمان لے آیا تھا۔

''مجھ سے وعدہ کرو، تم نے رونا نہیں اب......''

بہت دیر اس سے باتیں کرنے کے بعد جب اچانک انہوں نے وعدہ لینا چاہا تو اسما لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا گئی تھی۔

"اسما! میں تم سے وعدہ چاہتی ہوں۔" انہوں نے اس کی سوچتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوبارہ اپنے الفاظ دُہرائے تو اسما کا اعتماد لحہ بہ لحہ اور بھی بحال ہوتا گیا تھا۔ یہ اماں کی اپنائیت اور انسیت کا ہی اثر تھا جو اسما نے بڑے صاف اور سیدھے لہجے میں انہیں جتا دیا۔

"اگر آپ کے بیٹے نے رُلایا تو؟" اس کے سوال پر اماں کو اس کی حاضر جوابی پر پیار آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھیں ان کی بہو بہت ذہین، سمجھدار اور معاملہ فہم ہے...... وہ بات کو بگاڑنے کے بجائے سنوارنے کی کوشش کرے گی۔

"تو تم بھی اسے رُلا دینا...... میں تمہیں گرو مان جاؤں گی۔" اماں کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ "ارے رلانے والوں کو رونے کے بجائے الٹا رُلا دینا چاہیے...... تمہیں پتا تو ہوگا...... لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے، زہر کی کاٹ زہر سے ہی ہوتی ہے۔" اماں کی بات سمجھ کر پہلی مرتبہ اسما کے ہونٹوں پر مسکان کی کلی چٹکی تھی۔ اماں اس کی مسکراہٹ پر نہال ہو گئیں۔

"دیکھو بیٹا! بگڑے ہوئے کو اپنی عقل، فہم اور ذہانت سے سنوارنا چاہیے نہ کہ بگڑے ہوئے کو اور بگاڑا جائے، اس کی نفی کر کے یا اس سے ٹکرا کر...... دونوں صورتوں میں نقصان ہوتا ہے۔ ہادی دل کا برا نہیں...... تھوڑا بے صبرا اور جذباتی ہے۔ اس کے دل پر چوٹ آئی ہے۔ تھوڑا صدمے اور شاک میں ہے جیسے ہی سنبھل کر دماغ سے سوچے گا اسے سب کچھ واضح دکھائی دے گا۔ یہ بھی کہ میری بہو بہت پیاری ہے۔ اس کا من روشن اور اجلا ہے۔ اور مجھے تمہارے بابا نے بتایا ہے۔ میری بہو بہت لائق اور قابل ہے۔ اپنے اسکول، کالج میں ٹاپ کرتی رہی ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے بیٹا! کیسے اپنی فہم سے ہادی کے دل کو اپنی طرف مائل کرتی ہو۔ جو اس کے دماغ میں فیڈ کیا گیا ہے، اس کو تم نے ہی باہر نکالنا ہے۔ وہ غلط فہمی کا خناس ہے یا کچھ اور...... تم اس کی بیوی ہو جتنا قریبی تمہارا رشتہ اس کے ساتھ ہے اور کسی کا نہیں...... تم اسے سمجھ سکتی ہو...... سمجھا سکتی ہو پیار سے بھی...... دھونس سے بھی...... غصے سے بھی...... مجھے تم سے بڑی امیدیں ہیں...... باقی تم میرے گھر کی روشنی ہو...... زری، فدا کے ساتھ کھوٹا ہوتی ہے۔ عزہ، صائم کے ساتھ ترکی میں...... میرے گھر کی رونق تو تم سے ہے...... ہادی اور تم نے میرا گھر آباد کرنا ہے۔ میرے گھر میں رونقیں بکھیرنی ہیں۔" انہوں نے اتنے پیار سے اس کا ماتھا چوما اور گلوگیر لہجے میں وعدہ لیا کہ اسما ان کی محبت کے سامنے زیر ہو گئی وہ انہیں یہ تک نہیں کہہ سکی...... ان کے ہادی کو سدھارنا آسان نہیں...... اپنی طرف مائل کرنا تو بالکل بھی آسان نہیں۔

"ہادی کی طبیعت بہت منہ زور ہے۔ مزاج بھی بہت اچھا ہے۔ فرمانبرداری میں اس کا ثانی کوئی نہیں...... وہ اگر ہمارا فرمانبردار بیٹا ہے تو تمہارا فرمانبردار شوہر بنے گا۔ اس کے لیے کوشش ضروری ہے بیٹا! اس کے ذہن میں جو گرہ بندھی ہے تم اس کو کھول لو گی تو سب کچھ اپنی جگہ پر آ جائے گا۔" اماں نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھپتھپایا تو وہ سخت بے چین ہو گئی تھی۔ وہ خود تک رسائی آنے دیتا تو اس کے ذہن کی تھاہ پا لی جاتی تھی ناں......

"ہادی کے پیچ دار رویے کی گرہ تو تب کھول سکوں گی جب انہوں نے مجھے ایسا کوئی اختیار دیا۔" وہ حد سے زیادہ مایوس تھی۔

"اختیار تو تمہیں خدا نے دیا ہے بیٹی۔ قانون اور شریعت نے دیا ہے، وہ کون ہوتا ہے تمہیں روکنے والا۔" اماں نے ناصحانہ انداز میں سمجھایا۔ وہ اسے برابر حوصلہ دے رہی تھیں اور وہ بڑی بیچارگی سے انگلیاں مسلتی سر جھکائے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

"لایعنی اور بے معنی سوچوں میں خود کو مت الجھاؤ...... ابھی ناشتا منگواتی ہوں۔ اچھی طرح پیٹ بھرو...... رات سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ آج رات کو ولیمے کی تقریب ہو گی...... تمہیں تروتازہ نظر آنا

چاہیے۔ چاہو تو ناشتے کے بعد آرام کر لینا۔" وہ اسے پیار سے سمجھاتی ہوئی اٹھ کر جانے لگیں تو اسما نے جلدی سے انہیں بازو سے پکڑ کر سہارا دیا۔ پھر وہ انہیں باہر تک چھوڑنے کے لیے آئی تھی۔ تب لاؤنج میں داخل ہوتے صائم نے اسے بڑے خوشگوار تاثرات کے ساتھ دیکھا تھا۔ اسما کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنے اس چھوٹے سے عمل کی وجہ سے صائم کے دل میں پہلی ملاقات سے پہلے ہی مقام پا گئی تھی۔

☆☆☆

"آداب بھابی!"

ابھی وہ کمرے میں دوبارہ آ کر اماں کی ایک بات پر غور بھی نہ کر پائی تھی جب دروازہ پھر سے کھلا تھا۔ اور کوئی ٹرے اٹھا کر اندر چلا آیا...... اس نے گردن گھما کر دیکھا اور دھک سے رہ گئی تھی۔ سامنے ہادی کا بھائی صائم کھڑا تھا۔ روشن آنکھوں والا ہادی سے ملتے جلتے نقوش والا...... اور اس کے ہاتھ میں ناشتے کے لوازمات سے بھری ٹرے تھی۔ اسما اسے ٹرے اٹھائے دیکھ کر بوکھلا گئی...... آخر وہ اس کے لیے ناشتا کیوں لایا تھا؟ گھر کی خواتین کہاں تھیں؟ اس نے مسکراتے ہوئے ٹرے صوفے کے سامنے رکھی کرسٹل ٹیبل پر رکھ دی تھی پھر مسکراتے ہوئے سلام بھی اپنے انداز میں کیا، اسما اتنی ہونق تھی کہ سلام کا جواب بھی نہ دے سکی۔

"مجھے صائم زئی کہتے ہیں، یقین واثق ہے...... میرے الو کی دم جیسے گدھے بھائی نے ہمارا تعارف تک نہیں کروایا ہوگا...... اسے اپنے ہی سیاپے پڑ گئے ہیں۔"

صائم نے مسکرا کر گفتگو کا آغاز کیا تو لمحوں میں بے تکلفی کی فضا قائم ہو گئی...... صائم بڑی شگفتہ طبیعت کا مالک تھا...... اسما کو کچھ ہی دیر میں احساس ہوا کہ وہ کل کے بعد صرف چند لمحوں میں کتنی ہی مرتبہ بے ساختہ ہنس چکی ہے۔

"میں تمہارے لیے ناشتا لایا ہوں...... یہ مت سمجھنا، اپنی بیوی کی خاطریں بھی ایسے کرتا ہوں...... یہ تو تمہارے اعزاز میں خود کو زحمت دی ہے۔ سوچا، تمہارے ساتھ ناشتا کروں...... وہ نالائق تو ابھی تک غصہ دکھا رہا ہے۔ اینی وے، آؤ تم ناشتا کرو...... گھبراؤ نہیں، ہم ایسے ہی جوتوں سمیت بے تکلف ہوتے ہیں......" وہ اس کی جھجک محسوس کر کے بے تکلفی سے بولا تھا۔ اسما کو اس کے اصرار پر ایک سلائس اٹھا کر کھانا پڑا۔

"یہ ناشتا جو سوکھے سلائس، سڑے ہوئے آملیٹ اور بے مزہ چائے پر مشتمل ہے اس گھر کے دستور عام یا رواج کے سخت خلاف ہے۔ کبھی ہم بھی جی بھر کے نہاری اور پائے کھایا کرتے تھے، حلیم کو انجوائے کرتے تھے جب سے اماں کچن سے ریٹائر ہوئی ہیں تب سے ہمارا کچن پھولن دیوی (ملازمہ) اور کبھی کبھار زری کے رحم و کرم پر چلا جاتا ہے اور اس گھر کی دونوں بہوؤں کو کوکنگ کے نام پر سلاد کاٹنا، چاول ابالنا اور بس کھانا آتا ہے...... جو پکاتی ہیں وہ بس ہادی کے پالتو جانور ہی کھا سکتے ہیں...... بہت ہی بدذائقہ کوکنگ کرتی ہیں زری اور عزہ...... یہ تو اُن کی قسمت اچھی ہے جو ہم دونوں کھوتوں کو اپنی، اپنی بیوی سے محبت ہے کوئی اور ہوتا ناں تو اٹھا کر باہر پھینک دیتا۔" صائم ناشتے سے بھرپور انصاف کر رہا تھا۔ معاً دروازہ کھول کر عزہ آ گئی تھی اور اس کے پیچھے زری بھی۔

"تم اسما کو ہمارے خلاف کون سے سبق پڑھا رہے ہو؟" یہ زری تھی جس کے تیور بتا رہے تھے اس نے صائم کی چند باتیں سن لی ہیں۔

"لو، میری مجال ہے؟" صائم، عزہ کو دیکھ کر صاف مکر گیا تھا۔

"تمہیں کسی باورچن سے شادی کرنی چاہیے تھی جو تمہیں پورا دن پکا، پکا کر ٹھنساتی رہتی۔ اور تم زنیرا بھینس سے موٹے اور بھدے ہو جاتے۔" عزہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ صائم گڑبڑا کر رہ گیا۔

"دیکھو، لڑائی میں بددعاؤں پر مت اترا کرو۔"

صائم نے اسے وارننگ دی۔

"اور تم بھی ہر جگہ بیٹھ کر ہمارے گلے مت کیا کرو...... جہاں بھی موقع ملے تمہیں......فوراً پرانے زمانے کی ساسوں کا رول پلے کرنا شروع کردیتے ہو۔" عزہ نے حساب برابر کیا تھا......صائم دانت کچکچا کر رہ گیا۔

"تم میرا کھایا پیا حرام کرنے پہنچ جایا کرو...... آخر تمہیں کس نے انوی ٹیشن بھیج کر بلایا ہے؟" وہ چڑ کر گویا ہوا۔

"یہ میرا اپنا گھر ہے، مجھے کسی کے بلاوے کی ضرورت نہیں۔" اس نے تنک کر جواب دیا، صائم اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

"کیا دھونس ہے بھئی۔"

"اسے دھونس نہیں...... منہ توڑ جواب کہتے ہیں۔" زری کو جی بھر کے مزہ آیا تھا۔

"تم دونوں کیا ارادے لے کر آئی ہو؟ اسما کو آخر کیا سبق دینا چاہتی ہو؟ تمہاری طرح زبان دراز ہوجائے۔" صائم کو بالآخر چڑھائی کرنے کے لیے ایک پوائنٹ مل گیا تھا۔

"ہم اسے ٹریلر دکھا رہے ہیں تاکہ وہ اپنے مورچے مضبوط کرلے۔ تم سب بھائیوں کے ساتھ نمٹنے کے لیے بھاری توپوں کی ضرورت ہوتی ہے۔" زری نے ترنت کہا۔

"اور اسے ہم سکھا رہے ہیں......دشمنوں کے دانت ایسے کھٹے کرتے ہیں۔" عزہ نے بھی حصہ لیا۔

"اور بھاری نفری کے بجائے بھاری لفظوں کے گولے استعمال کرتے ہیں۔" زری مسکرائی تھی۔ صائم سے چائے پینا دوبھر ہوگیا۔

"تم دو صوبیداروں کے سامنے مجھ معمولی سپاہی کی کیا اوقات؟ مجھے اکیلا تصور کر کے چڑھائی مت کرو......میرا گروپ ذرا صدمے اور سوگ کے اثر سے نکل لے پھر دیکھوں گا تم دونوں کی بولتی کیسے بند ہوتی ہے۔" صائم نے انہیں دھمکایا۔

"ہمیشہ ہادی کے کندھے پر بندوق رکھ کر مت چلایا کرو...... کبھی اکیلے بھی میدان میں آنے کی جرأت کرو......گروجی کے بغیر تم آنے کے نہیں......" زری نے اس کا صاف مذاق اڑایا تھا۔ اسما کا ہنسی روکنا محال ہوگیا۔ وہ ان کی مزیدار تکرار میں ایسے کھوئی جیسے سالوں سے اسی ماحول اور اسی تکرار کو انجوائے کرتی آرہی تھی۔

"ارے، گروجی سے یاد آیا...... یہ ہادی کہاں ہے؟" زری کو اچانک خیال آیا۔

"بڑی جلدی خیال آگیا ہے۔" صائم نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"چلو آتو گیا ناں......دیر سے ہی سہی......" زری بغیر شرمندہ ہوئے مسکرائی تھی۔

"کون......ہادی؟" صائم چونکا تھا۔

"نہیں، خیال، بائی داوے ہادی کہاں ہے؟" زری نے پورے کمرے پر طائرانہ نگاہ ڈال لی تھی۔ ہادی کے آثار کہیں نہیں تھے۔ کیا وہ رات سے غائب تھا؟ زری کے دل میں اندیشے جاگے تھے۔ پھر تمام تر صورتِ حال کا خیال بھی آگیا۔

"ہادی کی بیوی سے پوچھو......" صائم نے جان بوجھ کر اسما کا نام لیا تو زری کی ایکسرے مشین کی سی نگاہیں اسما کے چہرے پر جم گئی تھیں......اسما ایک دم گھبرا گئی......ہادی کہاں تھا......؟ وہ تو خود لاعلم تھی۔ اماں سے پوچھنا چاہتی تھی مگر جھجک آڑے آگئی پھر صائم سے بھی پوچھنے کا خیال آیا تھا پر اس کی باتوں میں محض خیال ہی رہا......اور اب وہ ان سب کو کیا جواب دیتی......؟ ہادی کہاں تھا؟ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ رات سے غائب ہے؟ اسما کے اندر باہر بے چینیاں اتر آئی تھیں۔

"اسما کو کیا پتا......" عزہ نے اسے مشکل میں پھنسے دیکھ کر کہا۔

"پھر ہادی کہاں چلا گیا؟" زری کا مارے تفکر کے برا حال تھا...... سارے اندیشے ایک مرتبہ پھر جاگ گئے تھے۔

"تم جا کر اپنے ڈرامے باز شوہر کی خدمتیں

کرو...... جو بخار کا نقلی بہانہ بنا کر بستر میں اینٹھ رہا ہے ابھی تک...... ہمیں ائر پورٹ لینے بھی نہیں گیا...... بیچارے تئے نکور دولھا کو جانا پڑا......" صائم نے لگے ہاتھوں زری کو کھری، کھری سنائی تو وہ حقیقت میں شرمندہ ہوگئی۔

"سچی اصلی بخار تھا...... ہاتھ لگا کر چیک کرو......اب بھی ایک سو آٹھ نہ ہوا تو زری کی جو مرضی سزا سنا دینا۔" اسی پل فدا نے بھی گردن اندر نکال کر جھانکا تھا...... پھر پورے کا پورا اندر آ گیا۔ اسما پر نگاہ پڑی تو سلام عرض کیا...... ان سب کا انداز اتنا اپنائیت بھرا اور بے تکلف تھا کہ رات کی ساری کثافت دھلتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

اندر آتے ہوئے اس نے ہادی کے بارے میں زری کی بات سن لی تھی۔

"ہادی کہاں ہے؟" جبھی فدا نے فکرمندی سے پوچھا۔

"گھر چھوڑ کر چلا گیا......" صائم نے فدا کو ستانے کے لیے کہا تھا مگر اسما کا رنگ فق ہوتا دیکھ کر اسے جلدی سے بتانا پڑا۔

"ہمارے پاس تھا...... برابر والے گھر۔"

"اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا؟" فدا نے سابقہ تفکر بھرے لہجے میں اسما کی طرف دیکھ کر صائم سے پوچھا۔ اسما خواہ مخواہ شرمندہ ہوگئی تھی۔ جیسے اس سارے معاملے میں، ہادی کا موڈ بگاڑنے میں اور اس کو گھر سے بے گھر کرنے میں سارا قصور اسی کا تھا۔

اسے شرمندہ دیکھ کر صائم اور فدا نے بات بدل دی۔ وہ اسما کو معمولی سی بات پر بھی ڈی گریڈ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے باہر نکلتے ہی اسما نے سر تھام لیا کچھ دیر پہلے ساری رونق اداسی میں لپٹ کر ضائع ہوگئی تھی۔

☆☆☆

صائم سے ساری صورتِ حال سمجھ کر فدا اور وہ دونوں انتہائی متفکر سے برابر والے کاٹیج میں پہنچے تو ہادی ابھی تک سابقہ پوزیشن میں آنکھوں پر بازو رکھے ساری دنیا سے ناراض نیم دراز تھا۔ صائم نے پہلے سمجھا وہ سو گیا ہے، اس لیے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ رات بھر کا تھکا ہوا جل رہا تھا۔ بہتر تھا دو گھڑی سکون لے لیتا...... لیکن اس کا ہلتا ہوا پاؤں کا انگوٹھا دیکھ کر وہ دونوں ہی رک گئے تھے پھر فدا جلدی سے اس کے قریب آیا۔ اس نے ہادی کا بازو آنکھوں سے ہٹایا تو اس نے اپنی سوجی، گیلی سرخ آنکھیں کھول دی تھیں۔ فدا کے دل کو دھکا سا لگا۔

"ہادی! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے.... اٹھو، منہ ہاتھ دھو کر آؤ بلکہ نہاؤ، تازہ دم ہو کر آؤ۔ اندر کی کثافت دھلے، غصہ اترے...... اٹھو شاباش۔" فدا نے اسے زبردستی اٹھا کر بٹھایا۔

"میرے تازگی کے دن کوچ کر چکے ہیں۔" تب ہادی نے انتہائی سرخ نگاہوں سے اسے دیکھ کر بہتر لہجے میں کہا۔ اس کا لہجہ بے پناہ تھکا اور شکستہ تھا۔ صائم بھی گہری سانس کھینچ کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کو منکر نکیر بنے دائیں بائیں بیٹھے دیکھ کر ہادی نے سر جھٹک دیا تھا۔

"اب تم مجھے سمجھانے آئے ہو؟ کیا میں عقل سے پیدل ہوں؟ یا اپنا اچھا برا نہیں سمجھتا؟"

"ہادی! ہم نے یہ کب کہا؟ لیکن تمہارا رویہ بھی ٹھیک نہیں...... گھر میں مہمان ہیں اور تم اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد اِدھر بنا کر بیٹھے ہو...... اپنا حجرہ ادھر لگا رکھا ہے...... اماں اور بابا کس، کس کو جواب دیں گے؟ اور تمہاری بیوی؟ تم نے رات سے ایک مرتبہ بھی اپنی بیوی کے بارے میں سوچا ہے؟ تم نے اس کی کس قدر آکورڈ سچویشن بنا رکھی ہے؟ تم نے اسے کس، کس کی نگاہ میں شرمندہ کر رکھا ہے، وہ اپنے آپ میں کتنی دفعہ ٹوٹی اور جڑی ہوگی؟ عزہ اور زری کے سامنے کس قدر لاچار اور شرمسار ہوگی...... محض تمہاری وجہ سے...... تمہاری جذباتیت کی بنا پر...... گو کہ عزہ اور زری بات کھینچنے والی یا اسما کو ٹیز کرنے والی نہیں ہیں۔ اگر وہ ایسی

ہوتیں تو اس بیچاری لڑکی کا جینا محال ہو جاتا......'' فدا نے ایک ہی سانس میں بڑے رسان کے ساتھ اس کی کھنچائی کرتے ہوئے اسے اس کے برے رویّے کا احساس دلایا تھا۔ اس کی غلطیوں کی نشاندہی کی تھی۔

ہادی چپ چاپ سنتا رہا۔

''جو ہونا تھا ہو چکا...... اچھا یا برا...... جس نے بھی کیا اب جو تمہاری قسمت تھی اسے قبول کرو...... اپنی بیوی کو اپناؤ...... اسے یوں سب کی نگاہوں میں سوالیہ نشان مت بناؤ......'' صائم نے بھی اس کا شانہ تھپتھپایا۔

''تم دونوں چاہتے ہو، میں یہاں سے بھی چلا جاؤں؟ اماں، بابا کو دکھ دوں......؟ اس گھر سے دور چلا جاؤں؟'' اس نے دھیمے سلگتے ہوئے لہجے میں اُن کے حواس معطل کر دیے تھے۔

''ہادی......'' وہ دونوں لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گئے...... تو کیا وہ گھر چھوڑنے ،اُن سے دور چلے جانے تک کا بھی سوچ چکا تھا؟ وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے تھے...... ہادی سمجھنے کے بجائے کچھ اور بگاڑنے پر تلا ہوا تھا۔

''تم ایسا کوئی بھی قدم نہیں اٹھاؤ گے...... جس سے ہمارے ماں باپ کا دل دکھے...... سنا تم نے...... اماں بیمار ہیں، کیا انہیں اور بیمار کرو گے؟ جب سے تم اِدھر آئے ہو وہ مسلسل رو رہی ہیں۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے۔ جب تم انتہائی سفاکی کے ساتھ اِدھر سے بھی چلے جانے کا فیصلہ کرلو گے تب اماں کا کیا حال ہوگا؟'' فدا نے اسے بری طرح گھُرک کر مزید کسی انتہائی اقدام سے باز رہنے پر مائل کرنا چاہا، وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

''ہادی! وہ اچھی لڑکی ہے، ہم اس سے مل کر آئے ہیں...... تم ایک موقع تو اسے دو......'' صائم اور فدا نے نرمی سے اسے مزید سمجھایا۔ وہ لوہا نرم ہوتا دیکھ رہے تھے۔ یہ نہیں جانتے تھے لوہا پہلے سے بھی گرم ہے۔

''بات کسی کی اچھائی یا برائی کی نہیں ہے۔ اور برائے مہربانی! اس کی وکالت کرنا چھوڑ دو...... اس نے ایک ہی رات میں مفت کے وکیل ہائر کر لیے ہیں...... ہر کوئی اس کی حمایت میں مرا جا رہا ہے۔ کسی کو میرا احساس تک نہیں......'' وہ دھیمے سلگتے لہجے میں بولا پر پہلے کی نسبت کچھ مدھم لگ رہا تھا۔ یعنی بہتری کے کچھ آثار موجود تھے۔ اگر وہ ہادی کے پہلو سے دیکھتے تو انہیں ہادی حق بجانب لگتا تھا کہاں ہادی اور کہاں اسما...... مجموعی طور پر وہ ہادی کے ہم پلہ نہیں تھی۔ قد کاٹھ سے، شکل صورت سے، رنگت و روپ سے۔ لیکن وہ ہادی سے زیادہ متحمل مزاج، باوقار، ٹھنڈی، میٹھی، بامروت، ذہین اور سمجھدار لگتی تھی۔ وہ ایک مکمل اور اچھی لڑکی تھی۔

اب وہ پہلے کی طرح یہ نہیں کہہ رہا تھا۔

''وہ دقیانوسی ہے، میرے ساتھ چلتی اچھی نہیں لگے گی...... لوگ مذاق اڑائیں گے، اس کا رنگ سانولا ہے۔'' وہ خاموش تھا، بالکل خاموش...... اور اس کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی تھی۔

وہ ہونٹ چباتا خاصا مضطرب لگ رہا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس انداز میں کہ اس کے الجھے بکھرے بال گردن جھکانے سے ماتھے پر آ گرے تھے۔ وہ اس انداز میں روٹھا، روٹھا بھی بلا کا وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کے دونوں بھائیوں کے دل کو کچھ ہوا...... انہیں ہادی بڑا پیارا تھا۔ اپنی اچھی عادتوں ،فرمانبرداری اور نیک دلی کے علاوہ بھی...... جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا کہیں سے بھی انسانیت کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ کسی کے جذبوں اور احساسات کا مذاق اڑانا' تماشا دیکھنا...... ڈراما کھیلنا...... کوئی حد سی حد تھی۔

اگر وہ لڑکی ان کے سامنے ہوتی تو اسے مزہ چکھا دیتے...... ایسی اخلاق سے گری ،انسانیت سوز حرکت کا جرم معمولی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ لوگ چاہتے تھے ہادی اس صورتِ حال کو ذہنی طور پر قبول کر لے...... اپنی بیوی کو اپنا لے...... اگر وہ لڑکی

یعنی ہادی کی بیوی اسما بھی اس سازش میں شریک ہوتی؟ تو پھر کیا ہونا تھا؟ کیا پھر وہ لوگ ہادی کو اسے اپنانے پر فورس کر سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔

لیکن جب تک حقیقت آشکار نہ ہوتی تب تک تو ہادی کو اپنا رویہ بدلنا چاہیے تھا۔ اماں، بابا کے لیے ہی سہی گھر میں موجود مہمانوں کا احساس کر کے کم از کم دنیا داری کے تقاضے تو نبھاتا...... لیکن وہ تو کسی بھی چیز کی پروا نہیں کر رہا تھا۔ معاً کمرے کی خاموش فضا میں موبائل فون کی بپ بجی تھی۔ ہادی کے ساتھ، ساتھ وہ دونوں بھی چونک گئے تھے۔

ہادی اپنی جیبیں ٹٹول رہا تھا تب صائم نے صوفے کے کشن تلے دبے اس کے فون کو اٹھا کر ہادی کی طرف بڑھایا...... اجنبی نمبر تھا۔ اس نے الجھتے ہوئے کال پک کرلی۔ دوسری طرف سے اپنائیت بھری پرجوش آواز آ رہی تھی۔

''کیا حال ہے ہادی! سب خیریت تھی، میں صبح سے اسما کے نمبر پر کال کر رہا ہوں۔ نمبر آف جا رہا ہے۔ کیا تم اسما سے بات کروا سکتے ہو؟''

''اسما؟'' ہادی کو جھٹکا لگا تھا...... اس کے اردگرد اسما، اسما کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ اس کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔

''اسما؟ کون اسما؟'' وہ پوچھنا چاہتا تھا مگر رک گیا...... مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے گہری سانس کھینچ کر اندر کی پھر اِک نظر صائم اور فدا کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آئی تھنک موبائل آف ہو گا...... بیٹری ڈیڈ نہ ہو......'' یہ دو چھوٹے جملے بولنے کے لیے اسے کئی مرتبہ سوچنا پڑا تھا۔

''تم بات کروا سکتے ہو؟'' عاشر نے نہایت اپنائیت اور احترام سے پوچھا تھا۔ یہ احترام خاص طور پر اپنے نئے، نئے بہنوئی کے لیے مختص تھا۔

''میں اس وقت گھر سے باہر ہوں۔'' ہادی کو خود نے لگا...... کیا ضرورت تھی مروت نبھا کر اتنے مہذب انداز میں بات کرنے کی۔

''کب تک گھر جاؤ گے؟'' اگلا سوال ترنت آیا تھا...... ہادی پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی۔

''فی الحال نہیں......''

''گھر جا کر بات کرواؤ گے؟'' عاشر نے جلدی سے پوچھا تھا۔ اس کا لیا دیا اجنبی سا رویہ عاشر کے دل میں کچھ خدشات جگا گیا تھا۔ اس کا پہلے سے پریشان دل کچھ اور پریشان ہو گیا...... اسے ہادی کا انداز بلا کا روکھا اور خشک لگا تھا۔

''کوشش کروں گا......'' ہادی کا جواب عاشر کو مطمئن نہیں کر سکا۔ پھر ہادی نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔ وہ مزید مروت نبھانے کی اداکاری نہیں کر سکتا تھا۔

''کس کا فون تھا؟'' صائم نے اس کا موڈ بگڑتے دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

''اس کے بھائی کا......'' ہادی نے بہ مشکل زہر پھونکنے سے پرہیز کیا تھا۔

''اچھی طرح سے تو بات کر لیتے......'' فدا اسے ٹوکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جواباً ہادی نے اسے ایسی آگ اگلتی نگاہ سے گھورا کہ فدا کو خاموش ہونا پڑا تھا۔

☆☆☆

پھر وہ صائم اور فدا کے ایڑیاں رگڑنے اور ناک کی لکیریں نکالنے کے باوجود بھی اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ جیسے، جیسے وقت گزر رہا تھا سوئیاں آگے بڑھ رہی تھیں صائم اور فدا کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ دعوتِ ولیمہ مغرب کے بعد تھی...... اور اسما کے گھر والے بھی پہنچنے کے قریب تھے اور ہادی تھا کہ ابھی تک اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔

''میں اس شادی کو تسلیم نہیں کرتا تو ولیمہ کیوں کروں؟'' اس کا ایک ہی دو ٹوک جواب تھا...... صائم اور فدا ناک تک عاجز آ چکے تھے۔ اُدھر اماں کی حالت غیر تھی...... ان کا بلڈ پریشر نارمل نہیں ہو رہا تھا۔ بابا بھی شدید پریشان تھے۔

تنگ آکر ہادی نے فیصلہ کیا۔ وہ صائم کے گھر سے نکل کر کہیں اور چلا جائے...... کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔ اس نے فیصلہ کیا اور عمل کا ارادہ بھی کرلیا...... اس کا سامان گھر میں رکھا تھا۔ اس کے اپنے کمرے میں...... جہاں وہ چڑیل موجود تھی۔ جس کی شکل دیکھنے کا بھی وہ روادار نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں اچانک اتنے سوال در آئے تھے۔ ہادی کو اپنے ڈاکومنٹس چاہیے تھے۔ آئی ڈی کارڈ اور کچھ رقم بھی...... ظاہر ہے گھر سے نکل کر کہیں ٹھکانا بھی بنانا تھا۔ اور پیٹ بھی بھرنا تھا۔ گھر سے بے گھر ہوکر ذلت و خواری تو اٹھانا ہی تھی، تاہم وہ اس ذلت سے بہرحال کئی گنا کم تھی جو وہ اس وقت محسوس کررہا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہاں تک جائے کیسے کیونکہ وہ اپنے گھر اور کمرے تک بھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ اور گھر کے کسی فرد سے توقع نہیں تھی جو اس کارِ خیر میں حصہ ڈال کر ہادی کی مدد کرسکے...... عزہ اور صائم کو ...بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے تھی۔ ہادی کو بروقت اسٹینڈ لینا تھا۔ وہ ابھی نہ نکل سکتا تو پھر کبھی نہیں نکل سکتا تھا۔ ان سب نے اسے پھانس لینا تھا۔ اور باہر نکلنے سے پہلے یعنی گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کرنے سے پہلے وہ اپنے تمام تر ضروری کاغذات کو ضرور ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ جاب تلاش کرنے کے لیے ڈاکومنٹس کا ہونا ضروری تھا۔

بابا کی سٹریس فیکٹری کے سارے مزے آج کے بعد خیال ہونے والے تھے۔ کہاں وہ ہادی عبدل زئی بن ٹھن کر مرضی سے آدھی دوپہر کو نیندیں پوری کرکر کے فیکٹری جاتا تھا اور کہاں آج کے بعد جانے کس، کس کی چاکری کرکے دھکے کھانے تھے۔ محض اس بھوتنی کی وجہ سے جس نے اس کی زندگی میں بھونچال کھڑا کردیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر نفرت و زہر کے احساس سے پاگل ہونے لگا۔

صائم اور عزہ کے کمرے سے نکل کر وہ بالکونی میں آیا تو اچھی بھلی صائم کے ساتھ رومانس بھگارتی،

ہنس، ہنس کر باتیں کرتی عزہ سارا رومانس درمیان میں چھوڑ کر لپکتی ہوئی ہادی کے پیچھے بالکونی میں آئی تھی۔ ہادی نے اسے مشکوک نگاہوں سے خود کو دیکھتا پایا تو چڑ کر بولا۔

”تم اپنا رومانس وہیں سے شروع کرو جہاں سے بریک لے کر آئی ہو...... صائم مجھے گالیاں دے رہا ہوگا۔“ وہ اسے اپنا پیچھا کرتا دیکھ کر جل کر رہ گیا۔

”تم کیا کرنے آئے ہو یہاں...... آرام سے لیٹے.... رہتے.... اندر......ٹی.... دیکھتے......کارٹون لگالیتے......“ عزہ نے لاڈ سے کہا، وہ جانتی تھی اسے کارٹون بہت پسند تھے۔ وہ اس کے مشورے پر سرتاپا سلگ اٹھا۔

”میں کوئی فالج کا مریض نہیں...... جو آرام کرتا، خواہ مخواہ لیٹا رہتا...... اور تم بے فکر ہوکر اندر چلی جاؤ۔“

”لیکن تم ٹیرس پہ کیا لینے آئے ہو؟“ عزہ کا انداز اب بھی مشکوک تھا۔

”یو ڈونٹ وری...... کم از کم خودکشی کرنے نہیں آیا۔“ وہ پھاڑ کھانے کو دوڑا تھا تب عزہ کچھ مطمئن ہوگئی۔

”ایسی گھٹیا حرکت کرنا بھی نہیں......“ عزہ اسے وارننگ دیتی پلٹ گئی تھی۔

ہادی کے کھولتے دماغ پر قابو پاتا اپنے گھر کی طرف دیکھنے لگا کل تک یہی گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ برقی قمقموں سے پور، پور سجا ہوا تھا...... دلہن کے مانند...... اُف...... پھر دلہن...... کیا حواسوں پر سوار تھی دلہن...... بھوتنی، چڑیل، ڈائن...... وہ دلہن کہاں تھی؟ وہ تو اس کے سپنوں کی قاتل تھی۔ اس کے خوابوں کی دشمن تھی۔ اس کا دل اجاڑنے والی تھی۔

وہ زہر خند سا سوچتا رہا...... کس طرح اپنے گھر، اپنے کمرے تک جائے؟ تاکہ کسی کی نگاہ بھی نہ پڑے...... پھر کچھ سوچ کر وہ ٹیرس سے پلر کے ذریعے بڑے آرام سے لان میں اتر آیا تھا پھر باڑ پھلانگ کر اپنے گھر کی طرف آگیا...... دائیں جانب

سے برآمدے کا دروازہ کھلا تھا۔ یہاں سے گیلری کی شروعات تھی۔ آگے ایک طرف کچن اور دوسری طرف کارنر پہ اس کا کمرا تھا...... وہ دھڑکتے دل کے ساتھ چوروں کی طرح اپنے ہی کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ محتاط قدموں سے چلتا ہوا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس کے گھر میں شادی والے گھر کی طرح چہل پہل تھی۔ لنچ کے بعد کچن سمیٹا جا رہا تھا۔ پھولن دیوی سامنے ہی برتن دھوتی دکھائی دی تھی۔ ہادی کچھ اور محتاط ہوا تاکہ پھولن دیوی کی نظر نہ پڑے۔

دائیں، بائیں، اوپر، نیچے سے آوازیں آ رہی تھیں...... کوئی کپڑے استری کر رہا تھا، کوئی نہانے کے لیے واش روم میں باری کا منتظر تھا۔ لاؤنج میں لڑکیاں کچھ بال اسٹریٹ کر رہی تھیں اور کشف، فلک بالوں میں کرل ڈال رہی تھیں۔

"سنو، دلہن کے بال بہت خوب صورت ہیں...... اوپر سے اسٹریٹ، نیچے سے کرل...... گول گول بڑے بڑے لچھے...... انتہائی چمکدار بال ہیں...... کرل ڈلوانے کا جھنجٹ ہی نہیں۔" فلک شاید کشف کے ساتھ، ساتھ ارد گرد بیٹھی کزن کو بھی بتا رہی تھی۔

"بیچاری کے پاس دلہن کی تعریف میں صرف ایک ہی پلس پوائنٹ تھا۔" ہادی استہزائیہ مسکرایا۔ اور تو کوئی خوبی ہی نہیں تھی جسے اس کی بہنیں بیچاریاں بیان کر کے شمار لیتیں۔

"سنا ہے تمہاری بھابی بہت لائق اور قابل ہے۔ گولڈ میڈلسٹ باہر کا اسکالر شپ بھی ملا تھا......؟" کسی کزن نے بڑی دلچسپی کے ساتھ پوچھا تھا۔ تبھی فلک بھی جوش سے بتانے لگی۔

"تم نے ٹھیک سنا ہے...... بھابی ہماری بہت انٹیلی جینٹ ہے۔" وہ خواہ مخواہ مغرور ہو رہی تھیں۔ بھلا گولڈ میڈل اور ڈگریاں چولھے میں جھونکنی تھیں؟ منہ نہ متھا...... اوپر سے اتنا بڑا کھلم کھلا دھوکا۔ "میری بے توقیری کہ انسلٹ...... میں کبھی بھی اسے معاف نہیں کروں گا۔ چاہے سونے کی بن کر آ جائے...... جتنا مجھے ذلیل کیا ہے، اتنا ہی اسے خوار نہ کیا تو ہادی نام نہیں میرا...... بیٹھی رہے میرے نام پر یہاں عمر بھر...... کبھی منہ نہیں لگاؤں گا...... کبھی اپناؤں گا نہیں، کبھی بیوی نہیں بناؤں گا...... اسے سزا دوں گا، عمر بھر کی سزا......" وہ زہریلی سوچوں میں اتنا محو ہوا کہ ہینڈل گھما کر بے دھیانی میں اندر چلا آیا۔

ایک مہکتی رُوح میں اتر جانے والی خوشبو نتھنوں سے ٹکرائی تو اس کی سانس بند ہونے لگی...... خواہ مخواہ اندر چکراتی خوشبو پہ بھی غصہ آ رہا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ کا سامان بکھرا تھا۔ اور وہ چڑیل ولیمے کے لیے سنگھار مکمل کر کے میک اپ کا سامان ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اس کی ہادی کی جانب پشت تھی۔ ہادی نے موقع غنیمت جانا اور سیدھا اپنی الماری میں گھس گیا۔

اسما نے کھٹکے پر پلٹ کر دیکھا اور لمحہ بھر کے لیے سن ہو گئی...... کچھ دیر بعد اس نے اپنے تاثرات پر قابو پالیا تھا۔ اب وہ بڑی پُر اعتماد سی ہادی کی کارروائیاں ملاحظہ کر رہی تھی۔

وہ تیزی کے ساتھ اپنے لاکر سے ڈاکومنٹس نکال رہا تھا پھر اس نے اپنے کپڑوں کا ڈھیر باہر نکالا...... دراز کھول، کھول کر جانے کیا چیز تلاشنی چاہی تھی جو مل کر نہیں دے رہی تھی۔ پھر اس نے ایک بیگ نکالا اور اپنے کاغذات، کپڑے اور مزید ضرورت کا سامان بیگ میں بھر لیا۔

اسما کا سارا اعتماد جاتا رہا۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ ہادی کہاں جا رہا تھا؟ کیا گھر چھوڑ کے......؟ اس کا دم نکل گیا...... پھر ہادی نے دوبارہ ایک، ایک دراز کھنگالی اس پر جھنجلاہٹ سوار تھی۔ اسے کوئی چیز مل نہیں رہی تھی۔ اسما نے کھوجتی نگاہ آس پاس ڈالی تو اسے پھولدار کارپٹ پر چمکیلا سا کارڈ دکھائی دیا۔ اس نے غیر محسوس انداز میں جھک کر کارڈ اٹھا لیا...... یہ آئی ڈی کارڈ تھا...... اسما نے اسے چھپا لیا جو شاید ڈاکومنٹس

فائل سے اس کی بے پروائی سے نیچے گر گیا تھا۔
ہادی نے ایک، ایک دراز کھول کر ہر چیز الٹ پلٹ کردی تھی۔ شدید غصہ اور جھلاہٹ سوار ہونے لگی پھر اس نے اپنے بیگ کی زپ بند کی۔
اس نے ہادی کی جھنجلاہٹ دیکھ کر اسے پکارا۔ ہادی اپنے دھیان اور غصے میں تھا...... اس سے کلام نہ کرنے کا عہد کرنے کے باوجود وہ بے خیالی میں پلٹا۔
''کیا......؟'' اس کا انداز بدتہذیبی سے پُر تھا۔ اسما لمحہ بھر کے لیے اپنا اعتماد بحال کرتی رہی...... رات کی نسبت وہ کچھ بہتر لگ رہی تھی۔ رات والی تھکاوٹ اور شکستگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کا اعتماد ہادی کے سر پر بجلی بن کر گرا...... وہ اتنی پُرسکون، مطمئن اور تن کے کھڑی تھی جیسے اس نے کوئی جرم، کوئی گناہ نہ کیا ہو۔
ہادی کے لیے اس کا اعتماد ایک جھٹکے سے کم نہیں تھا۔ وہ جو رات بھر سے ذہنی اذیت، غم و غصے، بے خوابی اور ذلت و رسوائی کے احساس میں بھڑ بھڑ جل رہا تھا اور یہاں پہ ایسی کسی کیفیت کی پرچھائی تک نہیں تھی۔ ہادی کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا تھا۔ جبکہ وہ ہادی کی اندرونی کیفیات سے بے نیاز اندر سے ٹوٹ پڑتی بے قراری پر قابو پاکر بہ مشکل بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔
''کک...... کہاں جارہے ہیں آپ؟'' اس کی نگاہیں ہادی کے بیگ پر جم گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف سا پھیل رہا تھا۔
''تم سے مطلب......؟ میں جہاں بھی جاؤں...... یہ گھر دوزخ سے کم نہیں رہا...... اس میں تمہارا ابھیانک وجود موجود ہے۔'' ہادی نے اس کے پُرسکون وجود کی تنی ہوئی عمارت کو ہلا دیا تھا۔ وہ ایسا ہی چاہتا تھا۔ اگر ہادی مضطرب تھا تو وہ کیوں چین سے رہتی۔
''آپ کیوں جارہے ہیں؟ آپ کو اندازہ نہیں...... آپ کیسا قدم اٹھا رہے ہیں؟ اپنا گھر چھوڑ کر مت جائیں۔'' اسما نے اپنی دھیمی ٹھنڈی پُرسکون رواں

آواز میں کہا...... ہادی کے لیے اس کا رواں لہجہ کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ اس کا دماغ سنسنانے لگا تھا۔ اس کے دماغ سے دھواں نکلنے لگا تھا۔

''تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی۔''

''آپ نہیں جانتے کیا؟ مجھے دُہرانا پڑے گا؟'' اسما کے اگلے الفاظ اس کا دماغ بھک سے اڑا گئے تھے۔

''شٹ اپ......'' ہادی کو ایک دم آگ لگ گئی۔ ''تم وہ نہیں ہو، جسے میری بیوی بنا کر لایا گیا تھا۔ میں تمہیں جانتا بھی نہیں۔'' اس کے لفظ، لفظ میں حقارت تھی۔ اسما کے دل کو بڑے زور کا دھچکا لگ لیکن پھر بھی اس نے خود کو کمزور پڑنے سے بچایا۔

''تو اب جان جائیں گے۔ دو اجنبی لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے ہوتے۔ نکاح کے مقدس بندھن میں بندھنے کے بعد ایک ہو جاتے ہیں۔ میں بھی آپ کو نہیں جانتی تھی لیکن اب جان گئی ہوں......'' اس نے نرمی اور ملائمت سے ہادی کو اپنے اور اس کے درمیان اس پاکیزہ اور مقدس رشتے کا احساس دلایا جسے وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔

''کیا جان گئی ہو؟'' وہ پھٹ پڑا۔

''یہی کہ آپ میرے شوہر ہیں...... باقی جاننے کے لیے عمر پڑی ہے۔'' اسما نے اس کے اندر تہلکہ مچا ڈالا تھا۔ وہ دھواں، دھواں ہوتا گیا...... یہ کیسے تن کے کھڑی اسے احساس دلا رہی تھی۔ کیسی بے دید اور ڈھیٹ لڑکی تھی۔ اس کا اشتعال مزید بڑھ گیا۔

''کیا جاننا چاہتی ہو میرے بارے میں؟'' وہ زہر خند ہوا...... اسما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ عجب عذاب میں پھنس گئی تھی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا، اتنا ٹیڑھا اور پیچیدہ شوہر ملے گا۔

''ہادی! میری بات سنیں پلیز آپ اس طرح گھر چھوڑ کر مت جائیں۔ یہاں اتنے مہمان ہیں اور میرے گھر والے بھی پہنچنے والے ہیں...... آپ کو اس وقت نہیں جانا چاہیے......'' پہلی مرتبہ وہ شدید مضطرب ہوئی تھی۔ آنے والے حالات کو سوچ کر جب اسے ہر ایک بندے کی سوالیہ نگاہ کا سامنا کرنا پڑتا...... ہر ایک کی انگلی اس کی طرف اٹھتی...... ہادی کو بڑا سکون کا احساس ہوا تھا...... اسے بے سکونی میں جتلا دیکھ کر۔

''اوہ...... تو تمہیں اتنی عقل ہے؟'' وہ زہر خند ہوا...... پھر اس کا انداز بدل گیا تھا...... اس نے تھوڑی دیر کے لیے کچھ سوچا پھر معنی خیزی سے مخاطب ہوا تھا۔

''چلو...... ایک ڈیل کر لیتے ہیں...... میں گھر نہیں چھوڑ کر جاتا...... ویسے تک یہیں رہوں گا...... لیکن تمہیں یہاں سے جانا پڑے گا...... کہو منظور ہے......؟''

ہادی کا انداز اب بھی دھیما، سلگتا ہوا، غیظ بھرا تھا۔ اسما کے ہونٹ سختی کے ساتھ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے۔ یوں جیسے دوبارہ کھلیں گے کہیں...... اس کی رنگت پہلی بار متغیر ہوئی تھی...... بہت دیر معنی خیز سی خاموشی دونوں کے درمیان چھائی رہی...... جسے اسما کی مضبوط آواز نے توڑا تھا۔

''میں یہاں جانے کے لیے نہیں آئی۔'' اس کے جواب نے ہادی کے دماغ کی بتی گل کر دی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر زہر، زہر ہو گیا۔

''تو تمہیں یہ ڈیل نامنظور ہے؟'' اس کی آنکھوں میں کروٹیں لیتا تنفر چھلکنے لگا۔ اسما نے بھینچے لبوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

''جس طرح اتنے لوگوں کے ہمراہ بذاتِ خود آپ مجھے دلہن بنا کر یہاں لائے ہیں۔ اس طرح اپنے ہاتھوں سے جنازہ اٹھا کر قبرستان بھی لے کر جانا...... اس سے پہلے کی مدت تک میں یہیں ہوں...... یہاں سے جانے والی نہیں...... ہمارے ماں باپ یہی کچھ گھٹی میں پلا کر پھر ڈولی میں بٹھا کر بھیجتے ہیں۔'' اسما کے مضبوط مگر چبھتے ہوئے جواب نے ہادی کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

اسے اب اندازہ ہوا تھا پڑھی لکھی بیوی کی قابلیت کا...... جو مقرر، مبصر اور مفسر سب کچھ تھی۔ جس کے پاس دلائل بھی تھے، جواز بھی تھے، الفاظ بھی تھے۔ منہ میں زبان بھی تھی۔ اور اپنے حق میں بولنا بھی آتا

تھا۔ہادی کو اب احساس ہوا تھا۔وہ اسے ٹیز کر کے ڈی گریڈ کر کے میٹلی ٹارچر کر کے نہ دبا سکتا تھا نہ اس گھر سے نکال سکتا تھا۔نہ اس کی زبان کو روک سکتا تھا۔یعنی وہ بہت برا پھنسا تھا۔اس کے خیال میں اس شاطر اور چلتر لڑکی نے اسے بڑی منصوبہ سازی کے ساتھ پھنسایا تھا۔اس نے اسمارا جیسی معصوم، بے کس اور لاچار لڑکی کو راستے سے ہٹایا تھا۔وہی اسمارا جس کی موہنی صورت اس کا چین، سکون لوٹ کرلے گئی تھی۔ جو اس کے سامنے ہمیشہ امی ہی رہی......شاید اس کا نام اسمارا ہی تھا۔اس نے کبھی اپنا پورا نام نہیں بتایا۔ہادی نے خود ہی امی سے فرض کرلیا اسما......حالانکہ وہ اسما نہیں تھی۔ وہ دراصل اسمارا تھی۔شکیل انکل کی بیٹی......اس کا دل امی کو کھودینے کے کرب سے لبالب بھر گیا۔امی کی باتیں، اس کا نم لہجہ، اس کے الفاظ اس کی محرومیاں......ہادی کو اب احساس ہو رہا تھا۔اس کی ڈھکی چھپی باتوں میں کیسے اندیشے تھے۔ کاش وہ اسے کھل کر اپنے حالات بتا دیتی، تب یہ سب کچھ نہ ہوتا...... نہ اسما کا منصوبہ کامیاب ہوتا اور نہ ہادی کی زندگی برباد ہوتی...... جب ہادی نے اس نہج پر سوچا تو اسے امی (اسمارا) پوری بے گناہ نظر آئی تھی۔سارا جرم اسما کا دکھائی دے رہا تھا۔جس نے امی کا پتا کاٹ کر اپنے لیے راہیں ہموار کرلی تھیں۔

اس کے کانوں میں ابھی تک امی کا نم، نم لہجہ اور نم، نم آواز گونج رہی تھی۔

"محبت میں اُڑ سکنے کی خواہش اور نہ اُڑ سکنے کے بے بسی عزت دار لڑکیوں کو تمام عمر رلاتی ہے۔" اس کی ان باتوں کا کیا مفہوم تھا؟ وہ کس بے بسی اور لاچاری کی بات کرتی تھی۔اس کے لہجے کا شوخ پن دھیرے، دھیرے کیوں ختم ہو رہا تھا؟ جس ترنگ میں وہ بات کیا کرتی تھی اس ترنگ کو آزردگی کی چاٹ کیوں لگ گئی تھی؟ ہادی اندر تک بے چین ہو گیا تھا۔

امی کے اندیشے غلط نہیں تھے۔کوئی تو تھا جو اس کی خوشیوں پر گھات لگا کر بیٹھا تھا جو اس کے سامنے موجود تھا۔تن کر پورے کروفر سے کھڑا......اسی طرح یہ (اسما) امی کو اپنے کروفر سے پچھاڑ کر یہاں موجود تھی۔ہادی کے سامنے اپنے ازلی اعتماد سے کھڑی......اور ہادی اس کی اصلیت جان چکا تھا۔اس پر اسما کی چالاکی، مکاری اور عیاری کھل گئی تھی۔ اسے امی کی ایک، ایک بات یاد آگئی۔جب دماغ ٹھکانے پر آیا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں تو اسے ساری صورتِ حال اور اسما کی مکارانہ چال کا پتا چل گیا اور اسی حساب سے اس کا غم وغصہ اور اشتعال بڑھ گیا تھا۔

"تم بہت بڑی چال باز عورت ہو۔ میں تمہاری سازش کو جان گیا ہوں۔تمہارا منصوبہ کھل گیا ہے۔تم اپنے مکروہ عزائم میں کبھی کامیاب نہیں ہوگی...... میں تمہیں کبھی نہیں اپناؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" ہادی نفرت و حقارت کی آخری حد پر کھڑا چلایا تھا۔اسما کے دل میں اس کا ایک، ایک لفظ تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔

"آپ مجھے بالکل نہ اپنائیں مگر اس طرح گھر کو چھوڑ کے مت جائیں، اپنے والدین کو دکھ مت دیں، اپنے بہن بھائیوں کے لیے تکلیف کا باعث نہ بنیں۔" اسما بہ مشکل اپنے بھرائے۔لہجے پر قابو پا سکی۔ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ اپنے اوپر چڑھایا مضبوطی کا خول اتار پھینکے......اور دھاڑیں مار، مار کر اپنی کھوٹی قسمت پر بین کرے۔

"جہاں تک واپسی کا خیال ہے تو ہمارے معاشرے میں ایک شادی شدہ لڑکی کا واپس اپنے میکے جانے کا سفر محال ہو جاتا ہے، دشوار ہو جاتا ہے۔ میں واپس نہیں جا سکتی......اسی گھر کے ایک کونے میں پڑی رہوں گی مگر اپنے بیمار باپ کو تکلیف نہیں دوں گی۔"

"آئی ڈونٹ کیئر......تم جہنم میں جاؤ......اس گھر میں رہو یا زہر کھا کے مر جاؤ......بس مجھے دکھائی مت دو......میں سب کچھ معاف کر سکتا ہوں......درگزر کر سکتا ہوں......لیکن دھوکے فراڈ، مکاری اور سازش کو نہیں......تم نے میرے ساتھ ہی نہیں......اس معصوم کے ساتھ بھی فراڈ کیا ہے......میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا......نہ تمہاری صورت

دیکھوں گا...... اسی لیے یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تم جہنم میں جاؤ...... میری بلا سے مجھے تم سے نفرت ہے۔'' وہ زہر پھونکتا بیگ کاندھے پر ڈال کر نکل گیا۔ اسما کے سارے الفاظ لبوں پر دم توڑ گئے۔ وہ لب بھینچے ہادی کو خود سے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا دیکھ رہی تھی۔ وہ باہر نکل گیا تو اسما نے ہتھیلی میں دبا آئی ڈی کارڈ سامنے کیا...... ہادی کا نام اور تفصیل درج تھی۔ اس کی آنکھوں میں دھند بڑھتی رہی...... کیا وہ ہادی کو عمر بھر کے لیے کھو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ تن فن کرتا گیلری میں سے گزر رہا تھا۔ اسما سے تکرار اور دوبدو گفتگو کے بعد اس کا دماغ ابلتے پانی کی طرح کھول اٹھا تھا، اسی لیے وہ ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر آندھی و طوفان کی طرح جانے لگا۔ معاً پھولن دیوی کی نگاہ ہادی پر پڑی تو وہ اونچی آواز میں اپنا بھونپو آن کر کے چیخ پڑی۔

''ہادی پائی جان! کہاں جا رہے ہیں؟ اُدھر آپ کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے؟ عزہ بھابی اور صائم پائی جان سارے جگ میں آپ کو تلاش کر رہے ہیں۔ تلاشِ گمشدہ کا اشتہار لگوانا باقی رہ گیا۔ اور تو ساری کسر نکل گئی۔ وہ پورے گھر میں آپ کی گمشدگی کا طوفان کھڑا کیے بدحواس تھے۔ اماں جی نے سنا تو دل پکڑ لیا...... یہاں لینے کے دینے پڑے ہیں۔ آپ کے گواچنے کا غم بھول کر سب کو اماں جی کی جان کے لالے پڑ گئے...... اور آپ کا دل تو مانو اخروٹ سے بھی سخت ہے۔ کیسے اماں جی کو بسترِ مرگ پر ڈال کر بیگ کندھے پر ڈالے چوروں کی طرح گھر سے بھاگ رہے ہیں جی...... آپ کو احساس تک نہیں...... اپنی نوی نکور دلہن کو چھوڑ کر یا ان کو بھی ساتھ لے جانا ہے؟''

پھولن دیوی اپنے پکے لہوری اسٹائل میں بڑے، بڑے آملے جتنے ڈیلے نکال کر بڑی دلچسپی کے ساتھ تقریر جھاڑ رہی تھی اور ہادی کا دماغ بھک سے اڑ گیا...... پھولن دیوی نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ وہ اس بات پر غصہ کیے بغیر اس کی ساری بکواس کا منہ توڑ جواب دینا

بھول کر اپنی ماں کے لیے بے قرار ہو گیا...... اس کا بیگ بازو سے گر پڑا۔ پھر اس نے بیگ اٹھایا اور بھاگتا ہوا اماں کے کمرے میں آ گیا۔ وہاں پر پورا گھر جمع تھا۔ صائم، فدا، زری، عزہ اور مہمان بھی...... سب کے سب اسے شکایتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے اماں کی اس حالت کا ذمے دار صرف اور صرف ہادی تھا۔

اور اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ بے قرار سا اماں کی طرف بڑھا اور زار و قطار روتی اماں سے لپٹ گیا۔ وہ اسے گھر میں موجود دیکھ کر تسلی ہو جانے کے بعد بھی زار، زار رو رہی تھیں...... ان کا دل قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اور ہادی کو اماں کے آنسو پونچھنا اور چپ کروانا محال تھا۔ وہ خود بھی ضبط نہ کر سکا اور اس کا بھرا دل پھٹ پڑا۔

فدا نے ان دونوں کو تنہائی فراہم کرنے کے لیے سب کو کمرے سے جانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ویسے بھی مہمانوں کے سامنے وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ہادی کچھ الٹا سیدھا بول دے۔ اس لیے سب ہی بہانے سے نکل گئے۔ اماں اور بابا کے ساتھ ہادی اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے آنسو پونچھتا بڑا بے بس تھا۔ اس کے آنسو ایک تواتر سے گرنے لگے۔ اس کی ماں اس کے چلے جانے کا اتنا صدمہ محض سن کر نہ سہہ پائی تھیں اگر وہ سچ مچ چلا جاتا تو اماں کے دل پر کیا گزرتی۔ وہ اماں اور بابا کا بہت لاڈلا تھا۔ وہ ان کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دونوں بھائی اپنی، اپنی بیویوں کے ہمراہ پردیس میں تھے۔ یعنی گھر سے دور...... اماں اور بابا سے دور......

شادی کے اگلے ہی دن ولیمے سے پہلے ان کے گھر یہ سب کیا ہورہا تھا۔ گھر والے تو گھر والے...... گھر کے نوکر اور باہر سے آئے مہمان بھی کچھ نہ کچھ بھانپنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس مشکل صورتِ حال کو آخر کون قابو کرتا؟ ہادی...... یا اس کے اماں، بابا...... یا پھر اسما خود...... یہ سب جاننے کے لیے پڑھیے چوتھا حصہ



کمال اللہ دتہ

شیریں حیدر

"دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے تیرے...... تجھ سے یہ کس نے کہا کہ تو اپنا چیک اپ کروا...... تجھ سے بڑا بے وقوف کوئی اور ہو سکتا ہے بھلا!" جنت بی بی نے جمیل کو خوب لتاڑا تھا۔

"اماں آپ کے کہنے پر ہی تو میں مریم کو ڈاکٹرنی کے پاس لے کر گیا تھا، اس ڈاکٹرنی نے کہا کہ پہلے مجھے اپنا چیک اپ کروانا چاہیے اور پھر اسی نے مجھے اس ڈاکٹر کا پتا دیا تھا جس سے میں نے چیک اپ کروایا

تھا۔'' جمیل نے اپنی صفائی پیش کی۔
''پر تو مجھ سے تو پوچھ لیتا چیک اپ کروانے سے پہلے......'' اماں کا غصہ اترنے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ ''اور پھر جانے کون، کون سے جاہل ہیں جو چپے، چپے پر دکانیں سجائے بیٹھے ہیں، ڈاکٹری کی الف بے کا پتا نہیں اور بتاتے پھرتے ہیں ایسی فضول باتیں...... بھلا مرد بھی کبھی بانجھ ہوتے ہیں؟'' اس نے جمیل کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''اور کوئی ضرورت نہیں کسی کو بتانے کی بھی کہ تم نے اپنا ٹسٹ کروایا یا اس کا کیا نتیجہ نکلا......''
''اچھا......'' اس نے تھوک نگل کر سر ہلا کر... بہ مشکل کہا۔
''مریم کو تو بالکل بھنک نہیں پڑنی چاہیے اس بات کی۔'' انہوں نے اس سے رازداری سے کہا۔ ''جس عورت کے ہاتھ میں اپنے مرد کی کوئی کمزوری آجاتی ہے وہ اس پر راج کرتی ہے اسی کمزوری کے بل پر!'' اپنے پیار بھرے نرم رویے، خاموشی اور خدمت سے جمیل کے دل پر راج کرنے والی بیوی، مریم کی طرف سے اماں کو جانے کیا کیا اندیشے تھے۔
''مریم کو تو علم ہونا چاہیے ناں اماں!'' اس نے حجت کی۔ ''بیوی ہے وہ میری......''
''بیوی ہے تو نہیں رہے گی کیا ناں کوئی ضرورت نہیں ہے......'' اماں نے انگلی اٹھا کر یوں تنبیہ کی جیسے چھوٹے بچے کو کرتے ہیں۔
''مگر......'' اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''اگر مریم کی ڈاکٹر نے دوبارہ پوچھا اگلی بار تو...... اسے کچھ نہ کچھ بتانا تو پڑے گا ناں اماں؟''
''کوئی ضرورت نہیں ہے اب اسے کسی بھی ڈاکٹر کے پاس لے کر جانے کی، جانا ہوگا تو میں خود لے جاؤں گی۔'' اس نے بیٹے کو سمجھایا۔ ''میں معاملہ خود سنبھال لوں گی، تم بھی اپنا علاج خاموشی سے کرواؤ، ضروری نہیں کہ ہر بات بیویوں کو بتا کر انہیں سر پر چڑھایا جائے۔''
''مریم کو علم ہے اماں کہ میں نے ٹسٹ کروایا ہے، وہ تو پوچھے گی کہ کیا نتیجہ رہا؟'' اس نے نکتہ اٹھایا۔
''بتا دینا اسے کہ سب ٹھیک ہے......'' اماں نے فوری حل پیش کیا۔ ''بیویوں کو زیادہ جرح کرنے کی اجازت ہونی چاہیے نہ خاوند کی بات پر شک کرنے کی!'' اماں نے اسے زندگی کا ایک اور سنہری سبق سکھایا۔ جمیل جانتا تھا کہ مریم اس کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لے گی، ان دونوں کے مابین اعتماد کا رشتہ تھا، اب بھی اتنے اہم معاملے کو وہ قطعی چھپانا نہیں چاہتا تھا مگر اماں نے اسے کئی طرح کے ڈراوے دے کر سمجھا لیا تھا کہ اس بات کو وہ مریم سے بھی شیئر نہیں کرے گا۔
''ٹھیک ہے اماں ...... جیسے آپ مناسب سمجھیں۔'' اس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اچھا مریم اپنے میکے سے واپس کب آئے گی؟''
''کہتی تو تھیں اس کی اماں کہ شام کو بھائی واپس چھوڑ جائے گا۔'' اماں نے کہا۔
''میں لے آؤں جا کر اسے اماں؟'' اس نے اجازت طلب کی۔
''کوئی ضرورت نہیں اتنے سال کے بعد بھی اس طرح کے نخرے اٹھانے کی، جانے کہاں قسمت پھوٹنا تھی، ارے میں بھول کر ان کے گھر کو جا نکلی اور ان کی غریبی کو دیکھ کر ان پر ترس کھا لیا...... ایک نہ دو، پوری سات بیٹیاں اور ایک بھائی، بڑی کو ہم کیا بیاہ کر لائے ہیں سمجھو راستہ ہی کھل گیا ہے، ہر چوتھے دن کوئی نہ کوئی اس کی بہنوں کے رشتے دیکھنے کو چلا آرہا ہوتا ہے، کبھی کسی کی بات پکی ہو رہی ہوتی ہے کبھی کسی کی......'' انہوں نے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔
''چلیں اچھا ہے ناں اماں ......'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''اچھی لڑکیاں ہیں ساری مریم کی طرح، سمجھ دار اور محنتی، اللہ ان سب کے نیک سبب لگائے، ان کی شادیاں بھی تو ہونا ہی ہیں۔''
''پر بیٹا اس وقت تو میرے اس چھوٹے سے سر میں یہ بات نہ سمائی کہ یہ تو مسلسل خرچوں والا گھر ہے، بہنوں اور بھائیوں کے بیاہ ہوں گے تو کیا مریم خرچہ

نہیں کرے گی، تمہیں تو کنگال کر چھوڑے گی بیٹا!'' انہوں نے ہاتھ مل کر کہا۔ بیٹے کے ہاتھوں مریم کی تعریف نے انہیں حسد میں مبتلا کر دیا تھا۔ ''اب بھی جاتی ہے تو جانے کیا، کیا ان کے ہاتھ میں دے کر آتی ہوگی۔'' انہوں نے قیافہ لگایا۔

''اماں ڈاکر انکل ایسے نہیں ہیں، آپ کو یاد ہے ناں کہ ہماری شادی کے وقت آپ نے ان کی مدد کی خاطر کچھ رقم دینے کی کوشش کی تھی تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ بیٹی کو تین جوڑوں میں بھلے رخصت کر دیں گے مگر کسی کا احسان لینا ان کی غیرت گوارا نہیں کرتی۔'' جمیل نے سسر کی غیرت مندی کا اعتراف کیا۔

''ارے سب ڈھکوسلے ہوتے ہیں یہ۔'' انہوں نے ابرو اچکا کر کہا۔ ''گنگا بہہ رہی ہو تو کون اشنان نہیں کرتا...... بیویوں پر ایسا اندھا اعتماد ٹھیک نہیں ہوتا بیٹا، میں تو تمہاری اس تنخواہ میں بھی کچھ نہ کچھ بچا لیتی تھی اور دو، دو کمیٹیاں ڈال کر میں نے گھر کی مرمت بھی کروائی اور تمہارا بیاہ بھی ایسا کیا کہ محلے اور برادری والے مریم کی قسمت پر رشک کرتے تھے...... پر اب دیکھو...... اسی تنخواہ میں گزارہ بھی مشکل سے ہوتا ہے، مریم کچھ نہ کچھ سلائی کڑھائی کا کام کرتی ہے تو اس سے بھی کچھ نہ کچھ آمدن تو ہوتی ہی ہوگی ناں؟''

''اماں چھ سالوں سے اس گھر کا نظام مریم چلا رہی ہے، اس نے کبھی مجھ سے ایک پائی بھی فالتو نہیں مانگی جتنا میں اسے دے دیتا ہوں، اسی میں سے وہ بچت بھی کرتی ہے، ایک، ایک پائی کا حساب لکھتی ہے اور انتہائی سوچ سمجھ کر خرچ کرتی ہے...... بے جا مطالبات ہیں اس کے نہ کوئی فرمائش، اس نے بچت کر کے بینک میں پیسے جمع کر رکھے ہیں جس سے ہم جلد ہی کسی نئی آبادی میں کوئی چھوٹا سا پلاٹ لے کر نئے انداز کا گھر بنائیں گے، یہ گھر اب بہت پرانا اور بوسیدہ ہو گیا ہے، اس کی مرمت جتنی بھی کروائیں مگر نئے جیسا تو نہیں بن سکتا ناں...... اپنا نیا گھر ہم دونوں کا مشترکہ خواب ہے اماں اور اس کے لیے ہم دونوں ہی محنت اور کوشش کر رہے ہیں۔'' جمیل نے اماں کو تفصیل بتائی تو ان کا منہ پھر بھی سیدھا نہ ہوا، جمیل کی شادی سے پہلے وہ اس گھر کی مالکِ کُل تھیں مگر اس کی پوری تنخواہ لے کر بھی وہ تنگدستی کا رونا روتیں، اسی لیے جمیل نے انہیں گھر کا خرچہ چلانے کی فکر سے آزاد کرنے کی خاطر اپنی تنخواہ شادی کے بعد مریم کو دینا شروع کر دی، اس میں سے وہ ایک چھوٹی سی رقم اماں کو دیتا تا کہ وہ اپنی دوا دارو یا اپنے لیے کچھ خریدنا چاہیں تو...... غالباً اماں کو اپنا اختیار چھن جانے کی کسک اب تک تڑپاتی تھی۔

سادہ دل سی مریم نے گھر کے کام کار کی طرح، گھر کا خرچہ چلانے کی ذمے داری بھی احسن طریقے سے سنبھال لی تھی اور کبھی جمیل کو ایسا موقع ہی نہ دیا کہ جو وہ اسے پھوہڑ یا فضول خرچ سمجھتا۔

☆☆☆

''کمال......'' اپنے دوست کے پاس بیٹھے ہوئے جمیل نے رازداری سے کہا۔ ''تم سے کوئی بات کہنا تھی مجھے، اپنی کوئی ذاتی بات۔''

''کہو یار......'' کمال نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''تمہیں مجھ سے کوئی بات کہنے کے لیے اتنی رازداری یا اجازت لینے کی ضرورت کب سے پیش آ گئی؟''

''بس یار، مسئلہ ہی ایسا ہے، اماں نے بھی کہا تھا کہ میں یہ بات کسی سے نہ کہوں مگر یار...... میرے دل پر بڑا بوجھ ہے!''

''کہو یار کیا بات ہے، پہیلیاں نہ بجھواؤ!'' کمال نے بے چینی سے کہا، جواب میں جمیل کی آواز سرگوشی سے بھی دھیمی ہو گئی تھی، کمال اس کی بات پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ ''ہوں......'' اس کی بات کے اختتام پر اس نے ہنکارا بھرا۔ ''کہتی تو خالہ ٹھیک ہی ہیں، اس بات کا کسی کو بھی علم نہیں ہونا چاہیے، اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔''

''مگر میرے ضمیر پر بڑا بوجھ ہے کمال...... میں نہیں چاہتا کہ میں مریم کو اس رشتے میں مجبوری اور

دھوکے سے باندھ کر رکھوں، دیکھو ناں! اگر مریم بانجھ ہوتی تو میری ماں ایک دن کی تاخیر کیے بغیر میری دوسری شادی کروا دیتیں، اگر ہر مرد کو باپ بننے کا شوق ہوتا ہے تو ماں بننا بھی ہر اس عورت کا بنیادی حق ہے۔''
جمیل نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔
''کہتے تو تم ٹھیک ہو!'' کمال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''مگر میں سمجھتا ہوں کہ مرد اور عورت کے معاملے میں صورت حال مختلف ہوتی ہے، مرد تو چار شادیاں بھی کر سکتا ہے جبکہ عورت دوسری شادی صرف اسی صورت میں کر سکتی ہے جب اس کو پہلا خاوند طلاق دے دے۔''
''جانتا ہوں......'' جمیل نے آہستگی سے کہا۔
''تو کیا تم اس کو طلاق دینا چاہتے ہو؟'' کمال نے حیرت سے پوچھا، جانتا تھا کہ مریم ایک بہت اچھی بیوی تھی اور جمیل اس کے ساتھ بہت مطمئن تھا، پہلی بار اس نے مریم کو دیکھا تو اسے حیرت ہوئی کہ اس جیسا ہیرا جمیل کو کیوں ملا تھا اور خود اسے کیوں نہیں......
''ہرگز نہیں......'' اس نے فوراً کہا۔ ''مگر یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ میری کمی کی وجہ سے ایک نامکمل زندگی گزارے...... میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں کمال اور چاہتا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح اپنا علاج کروا لوں تاکہ مریم محروم نہ رہے...... تم تو پوری دنیا گھومتے ہو، تم بتاؤ اگر کسی بھی جگہ کوئی ایسی دوا ملتی ہو یا میرا علاج ممکن ہو تو، میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''
''اچھا میں بات کروں گا کسی سے، کہیں نہ کہیں تو اس کا علاج ہوگا ہی......'' کمال نے اس کا کندھا تھپک کر اسے تسلی دی، اس کا شیطانی ذہن کوئی اور منصوبہ ترتیب دے رہا تھا، اگلے ہی ہفتے وہ دو ماہ کے لیے جرمنی چلا گیا۔

☆☆☆

''تیرے لیے ایک بہت اچھی خبر ہے جمیل......'' اس نے واپس پہنچ کر اسے کال کی۔
''اچھا!'' کمال خوشی سے چلایا، اسے علم تھا کہ وہ اچھی خبر اس کے علاج کی بابت ہی ہو سکتی ہے۔
''مگر اس کے لیے تجھے جرمنی جانا پڑے گا جمیل، چھ مہینے کا علاج ہے، وہاں رہے گا تو سستا پڑ جائے گا، ورنہ یہاں دوا منگوا کر تو دگنا خرچہ ہو جائے گا۔''
کمال نے اسے بتایا۔
''کتنا خرچہ ہوگا یہاں رہ کر دوا منگوانے کا؟''
جمیل نے آہستگی سے پوچھا۔
''تو یہاں کو چھوڑ یار، چل میرے ساتھ جرمنی، وہ بہتر ہے......''
''اس طرح میں مریم کو کیا بتاؤں گا......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رکا۔
''کہہ دینا کہ جرمنی جا رہے ہو، کام ڈھونڈنے کے لیے یا میرے ساتھ گھومنے پھرنے کا بہانہ کر دینا۔''
''مریم کو علم ہے کہ مجھے کام کے لیے باہر جانے کا کوئی شوق نہیں اور یوں بھی میرے ساتھ بیمار ماں کی مجبوری ایسی ہے کہ ملک چھوڑ کر جا ہی نہیں سکتا...... رہی بات تیرے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے جانے کی تو وہ بھی امیروں کے چونچلے ہیں یار، میرے جیسے دو اور دو چار کر کے زندگی گزارنے والے کے لیے نہیں۔''
''مگر یہاں پر رہ کر، باہر سے دوا منگوا کر علاج کے لیے دگنا خرچہ ہوگا، سوچ لے تو یار...... کچھ مدد کی ضرورت پڑی تو میں بھی قرض دے دوں گا۔'' کمال نے سخاوت کا مظاہرہ کیا اور ساتھ ہی اسے یہیں رہ کر علاج کروانے کا خرچہ بتایا۔
''میں کرلوں گا کچھ نہ کچھ......'' جمیل نے دل ہی دل میں بینک سے قرض لینے کا سوچا جواب تک کی اس نے اپنی بینک کی ملازمت میں کبھی نہ لیا تھا، یہی سوچ رکھا تھا کہ جب گھر بنانے کا وقت آئے گا تو لے لے گا...مگر اب اسے لگا کہ اس کے ہاں اولاد ہونا اس کے گھر بنانے سے زیادہ اہم تھا، اولاد ہوتی تو ہی گھر کی ضرورت بھی ہوتی ورنہ اسے گھر بنا کر کس کے لیے چھوڑ کر جانا تھا۔
مطلوبہ رقم کمال کو ملی تو اس نے بڑے سے سائز

کی ایک بوتل میں بھرے ہوئے دو سو کیپسول جمیل کو دیے کہ اسے ہر روز ایک کیپسول دودھ کے ساتھ کھانا تھا اور اہم بات یہ تھی کہ گھر پر کسی کو علم بھی نہ ہو۔

''اپنی اماں کو بھی نہ بتانا، تمہیں لاکھ رازداری کا کہیں مگر عورتیں خود پیٹ کی بہت ہلکی ہوتی ہیں، ان کے منہ سے کہیں بھی بات نکل سکتی ہے، نہ ہی یہ ہو کہ وہ کہیں کہ فلاں کے لیے بھی دوا منگوا دو اور فلاں کے لیے بھی، تمہیں تو علم ہے کہ باہر کے ملک میں ہماری طرح بغیر ڈاکٹری نسخے کے کوئی دوا نہیں دیتا، یہ تو میں نے اپنے بڑے خاص دوست سے کہہ کر، اپنے ایک بڑے خاص دوست کے لیے دوا منگوائی ہے...... اس لیے اس بوتل پر سے میں نے لیبل بھی پھاڑ دیے ہیں کہ کسی کو کوئی شک بھی نہ ہو۔'' کمال نے اسے بتایا تھا۔

''اگر پھر بھی کبھی پکڑے جاؤ تو کہہ دینا کہ وٹامن کی گولیاں ہیں۔'' مگر اس سے بھی زیادہ رازداری کے لیے جمیل نے یہ کیپسول اپنے دفتر میں ہی رکھ لیے تھے اور وہیں ایک پیکٹ دودھ منگوا کر ٹی بریک میں اپنا کیپسول کھالیتا، دل ہی دل میں وہ خوش بھی تھا اور... پُرامید بھی کہ جلد ہی وہ کوئی خوش خبری سن لے گا، حالانکہ کمال نے اسے بتایا بھی تھا کہ اگر ان دو سو کیپسول سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوئے تو ممکن ہے دو سو کے بعد مزید کیپسول بھی کھانا پڑیں۔

☆☆☆

کمال کا جمیل کے گھر پر بھی بچپن سے ہی آنا جانا تھا اور جمیل کی اماں، کمال کو بھی اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتی اور اس سے پیار کرتی تھی...... اس روز بھی کمال دن بھر سے ان کے ہاں تھا جب خالہ سے اس نے پوچھا کہ کمال کی شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا تھا مگر ابھی تک وہ دادی نہیں بنی تھیں۔

''خالہ اسے کہیں کہ بہت سال اس نے تنہا رہ کر زندگی کے مزے لوٹ لیے، اب ذمے داری سنبھالنا سیکھے، باپ کے عہدے پر فائز ہو خالہ، ورنہ اسے اولاد کیا بڑھاپے میں ملے گی؟'' خالہ کے چہرے پر کئی

بس اتنا یاد ہے

تیرا ہر اک غم مجھے اپنا ہی غم لگا
تیری ہر ایک خوشی مجھے مانوس سی لگی
کیوں تجھ سے ہے تعلقِ خاطر پتا نہیں
اتنا مگر ضرور ہے اِک آشنا مہک
جب تجھ کو دیکھتی ہوں میرے پاس آتی ہے
دھندلے کچھ نقوش اجاگر سے ہوتے ہیں
دھندلی سی اِک شکل دکھائی جو دیتی ہے
وہ چہرہ کس کا تھا مجھے اب یاد بھی نہیں
بس اتنا یاد ہے کہ مجھے تو عزیز تھا...... عزیز ہے

شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

رنگ آ کر گزر گئے، اپنے بیٹے کی کمزوری جانتی تھیں ...... دل ہی دل میں سوچا کہ شکر ہے جمیل نے یہ بات اپنے دوست کمال کو بھی نہیں بتائی، دونوں میں دانت کاٹے کی دوستی تھی اور جمیل اور کمال اپنی ہر بات ایک دوسرے کو بتاتے تھے۔

''اگر بھابی میں کوئی مسئلہ ہے تو ان کا علاج کروا کر دیکھ لیں ورنہ میرا یار ایک بار پھر سہرا باندھ لے۔'' اس نے دانستہ یہ سب بلند آواز میں کہا تھا، باورچی خانے میں جمیل کے اس ''مخلص'' دوست کے لیے رات کا کھانا پکاتی ہوئی مریم کے کانوں تک یہ الفاظ پہنچے تو اس کا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا، جمیل کی دوسری شادی کا تصور ہی بڑا پریشان کن تھا، کہیں وہ اسے طلاق دے دیتا یا دوسری شادی کر لیتا تو اس کے والدین کے لیے کئی طرح کے مسائل کھڑے ہو جاتے، لوگ جو اُن کے ہاں چھ لڑکیوں کے رشتے دیکھنے آتے تھے ان کے منہ سے کوئی بھی بات بعید نہ ہوتی، دل میں سو طرح کے وہم پالے ہوئے وہ کام میں مصروف رہی۔

اس کی ساس اسے کئی دائیوں کو دکھا چکی تھی

جنہوں نے علاج کے کئی طریقے آزمائے تھے، کئی درباروں اور پیروں فقیروں کے آستانوں پر جا کر منتیں بھی مانی تھیں مگر اللہ کی طرف سے ابھی تک کوئی خوش خبری نہیں ملی تھی۔

''بس بیٹا...... جب اللہ کو منظور ہوگا، اللہ اسی سے دے گا۔'' جمیل کی اماں نے ہولے سے کہا تھا، مریم دل سے عظیم ساس کی عظمت کی قائل ہوگئی۔

''انشاء اللہ خالہ جی!'' کمال نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر انہیں تسلی دی۔ ''ایک بہت اچھی ڈاکٹرنی ہے، میرے دوست کی بیوی ہے، باہر کے ملک سے پڑھ کر آئی ہے، اس کے ہاتھ میں بانجھ پن کی بڑی شفا ہے، میں جمیل اور بھابی دونوں کو خود اس کے پاس لے کر جاؤں گا، ویسے تو اس کے پاس وقت ہی نہیں، مہینوں پہلے کی اپائنٹمنٹ پہلے سے طے ہوتی ہیں۔ مگر اپنے یار کے لیے میں اسے مجبور کر کے بھی وقت لے لوں گا، اسی ہفتے کوشش کرتا ہوں، میں جمیل کو سمجھا دوں گا کہ کن دنوں میں اس ڈاکٹرنی کو دکھانا ہوتا ہے...... جمیل بھابی سے پوچھ کر مجھے بتا دے گا، اسی کے مطابق میں وقت لے لوں گا۔''

''ٹھیک ہے...... پر تم صرف مریم کے لیے ہی وقت لینا، جمیل کو عورت کو دکھانے کی کیا ضرورت ہے، اگر ضرورت پڑی تو کسی مرد ڈاکٹر کو دکھا لے گا۔'' جمیل کی اماں نے حجت پیش کی، کمال تو پہلے ہی جانتا تھا۔

''چلیں...... جمیل ویسے ہی ساتھ چلے، بھابی میرے ساتھ اکیلی تو نہیں جا سکتیں ناں!'' کمال نے کمالِ بے نیازی سے کہا۔

''کیا فرق پڑتا ہے......'' وہ فٹ سے بولیں۔

''بھائی جیسے ہو تم کمال کے، وہ تو اللہ نے مجھے اولاد ہی ایک دی، ورنہ میرا کوئی اور بیٹا ہوتا تو تم ہی ہوتے۔'' انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اس میں کوئی شک نہیں خالہ جی، میری ماں ہی تو ہیں آپ!'' اس نے بھی جواباً پیار سے کہا۔ ''میرے سارے اپنے تو جرمنی میں ہیں، پاکستان تو میں آتا ہی آپ اور اپنے یار جمیل کے لیے ہوں۔''

☆☆☆

جمیل امید کا دامن پکڑے ہر روز باقاعدگی سے کیپسول کھائے جا رہا تھا، اس کے علاوہ اس کی نمازوں کے بعد دعائیں بھی طویل ہوگئی تھیں، ساتھ ہی وہ مریم سے بھی کہتا کہ اللہ سے گڑگڑا کر اپنے لیے اولاد کی نعمت مانگے...... اس کی اماں کے وظیفے بھی جاری تھے، کوششیں بھی اور دعائیں بھی...... چپکے، چپکے وہ جمیل سے بھی کہتی رہتی تھیں کہ وہ اپنا علاج کروائے اس طرح کہ کسی کو علم نہ ہو، اس نے اماں کو بتایا کہ وہ چپکے، چپکے اپنا علاج کروا رہا تھا مگر اماں کو اصل بات نہ بتائی کہ وہ ناراض ہوں گی کہ میں نے ان کے کہنے کے باوجود وہ بات کمال کو کیوں بتائی تھی اور اس روز کی کمال کی باتیں اور اداکاری اماں کے لیے اس بات کا بین ثبوت تھیں کہ کمال جیسا دانت کاٹے کا دوست بھی ان کے بیٹے کی کمزوری سے لاعلم تھا۔

کمال نے جمیل کی اماں کو فون کر کے بتایا تھا کہ اس کی بات ڈاکٹرنی سے ہوئی تھی اور وہ آج کل کراچی میں تھی، اس نے مزید بتایا تھا کہ کچھ ٹسٹوں اور ان کے نتائج کا انتظار کرنے کے لیے مریم کو تین چار دن وہاں ڈاکٹر کے پاس ہی رہنا ہوگا...... ''خالہ اگر جمیل کو چھٹی نہیں مل سکتی تو آپ چلی چلیں ساتھ۔'' کمال نے ان سے کہا۔

''جمیل سے بات کر کے دیکھتی ہوں بیٹا، وہ تمہیں بتا دے گا۔'' جمیل سے بات کی تو اس نے نہ صرف سفر کے دُہرے اخراجات کا بتایا بلکہ یہ بھی کہا کہ مریم تو اسپتال میں رہے گی، کمال کسی دوست کے ہاں پڑا رہے گا مگر اماں وہاں قیام کہاں کریں گی، اتنا بڑا شہر ہے، کسی ہوٹل وغیرہ میں رہیں گی تو اکیلی کیسے رہیں گی اور پھر خواہ مخواہ میں اتنا خرچ جو ہوگا۔ ان کے ذہن میں تو یہ نکتہ آیا ہی نہ تھا۔

''پھر تم چلے جاؤ بیٹا، جہاں کمال رہے گا وہیں تم بھی رہ لینا۔''

گاڑی کا اِک لمبا سفر

وہ اور میں
آمنے سامنے سیٹوں پر بیٹھے
اِک دوجے کی جانب دیکھیں
رونا چاہیں لیکن ہنس دیں
ہونٹوں کے کونوں پر پھیلی
پھیکی سی مسکان کے پیچھے
آنے والے کل کا ڈر
جب جدا ہو جائیں گے
اِک دوجے سے
اور ہم دونوں کی آنکھوں میں
گزرے دنوں کی یادوں کا ایک ماتم
چند دن بعد
مجھ سے دور، بہت ہی دور
اس نے سات سمندر پار
لمبے سفر پر جانا تھا
اس کی جدائی سے درد اٹھا سینے میں
اور میں کھانسا
اس نے میری جانب دیکھا
اور بولی
شرٹ کے بٹن بند کرو
سینے پر ہوا لگی، تو تم بیمار پڑ جاؤ گے
اس کے بعد اِک لمبی چپ تھی
کتنے سال بیت چکے ہیں
سرما کے اس لمبے سفر کو

شاعر: شاہد بھٹی

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

''اور جو اس ڈاکٹرنی نے مریم کے سامنے میرے ٹسٹ وغیرہ کی کوئی بات کر دی اماں، کمال بھی اُدھر ہوگا، سارا بھید کھل جائے گا۔'' وہ بھی جانتا تھا کہ مریم کو ڈاکٹر کو دکھانے کا ڈراما تو صرف کمال کے ذہن کی پیداوار تھا فقط مریم کو یہ جتانے کے لیے کہ کمی اسی میں تھی ورنہ تو جب بھی کمال کے لائے ہوئے کیپسول اثر کرتے، اسے خوش خبری ملنے ہی والی تھی۔

''یار کمال اس سارے ڈرامے میں کراچی کا سفر ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''پاگل ہو گئے ہو تم جمیل...... لاہور کے کسی بھی ڈاکٹر کو دکھائیں تو بھابی زندگی میں کسی بھی وقت دوبارہ اس کے پاس جا سکتی ہیں اور تمہارا سارا بھید کھل جائے گا، میرے ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگا اور تمہارے ساتھ، ساتھ میری بھی بے عزتی ہوگی، نہ بابا نہ...... رہنے دو تم پھر یہ سب، خود ہی کرو جو کچھ کرنا ہے۔'' کمال کی بے نیازی اور دھمکی سے اس کے خلوص پر رہا سہا شک بھی ختم ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے یار...... تم واقعی بہت دور کی سوچتے ہو، خرچہ تو بہت ہے، پہلے ہی دوا پر اتنا خرچہ ہو گیا ہے، اب تم جہاز سے جانے کی بات کر رہے ہو۔'' جمیل نے اپنی مجبوری بتائی۔

''تو نے باپ بننا ہے انشاء اللہ جمیل تو میں بھی تو چاچا بنوں گا نا یار...... تو اتنے سے خرچے کی فکر میں اپنا خون نہ جلا، یار ہوں تیرا اور بھائی بھی، میں لے لوں گا ٹکٹیں اور اگر تیرے پاس لوٹانے کی سکت ہوئی تو لوٹا دینا میرے پیسے جب بھی ہوئے، ورنہ میں اسے اپنے بھتیجے یا بھتیجی کی خوشی میں تجھے معاف کر دوں گا۔'' دوست کے خلوص پر جمیل کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ قدرت نے موقع دیا تو وہ اس سے بڑھ کر اپنے یار کے لیے کچھ کرے گا۔

''ہاں! اس دوا سے تجھے خود میں کوئی فرق محسوس ہو رہا ہے؟'' کمال نے سوال کیا۔

''ہاں...... میں خود کو کافی چست اور توانا محسوس

کرتا ہوں۔'' جمیل نے اعتراف کیا۔

''ہاں، وٹامن کھا کر انسان خود کو چست و توانا محسوس کرتا ہی ہے۔'' کمال نے دل ہی دل میں کمینگی سے سوچا تھا، ان گولیوں کی اتنی قیمت وصول کر لی تھی کہ اس میں سے کراچی کے اخراجات نکالنا مشکل نہ تھا۔

☆☆☆

ہفتے بھر کا سامان لے کر مریم، کمال کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہوگئی، جانے سے قبل اس نے کئی دن کا کھانا پکا کر رکھا تھا، جمیل کے ہفتے بھر کے کپڑے استری کر کے ہینگروں پر لٹکائے تھے، ساس کی اجازت لے کر وہ پُرامید گھر سے کمال کے ساتھ نکلی، اسے جھجک بھی آرہی تھی مگر سادہ دل تھی اور کم تعلیم یافتہ بھی سو اس نے اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ جمیل دوسری شادی نہ کر لے، باقی سب جذبات کو پسِ پشت ڈال دیا...... شرم، جھجک اور خوف......

☆☆☆

ایک ہفتے کے بعد وہ علاج کروا کر اور ضمیر پر بھاری بوجھ لے کر کراچی سے لوٹ آئی تھی۔ کمال نے وہاں اسے بتایا تھا کہ جمیل دوسری شادی پر تلا ہوا تھا مگر کمال نے ہی اسے مریم کے علاج کا بہانہ کر کے روکا ہوا تھا۔ اس نے اس کے مستقبل کا ایسا بھیانک نقشہ دکھایا تھا کہ کمال کی بات مانے بغیر مریم کو کوئی چارہ نظر نہ آیا تھا۔ کئی سالوں سے وہ اپنی سسرال میں آسودہ اور خوشگوار زندگی گزار رہی تھی، اگر جمیل اسے طلاق دیتا تو وہ لوٹ کر اس گھر میں جاتی جہاں اس کے بعد کی چھ بہنیں مشکل حالات میں اپنی زندگیوں کی جنگ لڑ رہی تھیں، یہ تصور ہی کافی بھیانک تھا اور پھر اس کا حالات پر اختیار بھی کہاں رہا تھا کہ وہ کمال کی بات نہ مانتی۔ کراچی پہنچ کر کمال ائرپورٹ سے سیدھا اس ہوٹل میں اسے لے گیا تھا جہاں کے ڈبل روم کی اس نے مسٹر اور مسز کمال کے نام سے بکنگ کروا رکھی تھی۔ مریم کو منانے کے لیے اس کے پاس کافی جواز تھے، طلاق کی صورت میں تاریک مستقبل کا نقشہ ہی مریم کے لیے کافی تھا۔

کمال کا منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا۔ جلد ہی جمیل اور اس کی ماں کو خوش خبری مل گئی کہ مریم امید سے تھی، کمال واپس جرمنی جا چکا تھا، شاید اس کے بعد کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے...... چند ماہ کے بعد اسے صبح سویرے کال موصول ہوئی۔

''کمال میرے جگر...... میرے دوست، میں کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں، تو چاچا بن گیا ہے میرے بھائی، اللہ نے تیری مہربانی کی وجہ سے مجھے بیٹا عطا کیا ہے ابھی ابھی، سب سے پہلے تجھے ہی خبر دے رہا ہوں، میرے پاس تیرا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں یار...... بس تیرے شکریے کے لیے اتنا کر رہا ہوں کہ اس کا نام اللہ دتہ کمال رکھ رہا ہوں......''

''بہت مبارک ہو یار!'' کمال کے دل میں اک عجیب سے احساس نے چھل ماری، اللہ دتہ کمال، دنیا کی نظر میں جمیل کا بیٹا اور......'' تم نے اس کا نام اللہ دتہ جمیل رکھنا تھا ناں یار، بچے کے نام کے ساتھ باپ کا نام......''

''نام کچھ بھی رکھوں، ہے تو میرا ہی ناں، باپ کا نام ساتھ لگاؤں یا دنیا کے عظیم ترین چاچے کا کیا فرق پڑتا ہے، تیرا نام رکھا ہے تو تیرا شکریہ بھی ادا ہو جائے گا اور تو ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا کہ یہ سب تیری مہربانی ہے۔ میں اور مریم دونوں تیرے احسان مند ہیں یار!'' جمیل نے بات کر کے فون بند کیا اور مریم کی طرف بڑھا، اسے بھی تو ماں بننے کی مبارک باد دینا تھی جو آنکھیں بند کیے، ہچکیوں سے آنسو بہا رہی تھی۔

''روتی کیوں ہو پگلی، اللہ نے اتنا بڑا احسان کیا ہے ہم پر، دیکھو تو کتنا پیارا ہے ہمارا بیٹا، اللہ دتہ کمال......'' مریم نے سسکی لے کر اپنے بھولے بھالے شوہر کو دیکھا جس نے اعتبار کے نام پر اپنے دوست کے ہاتھوں دھوکا کھایا تھا، جس میں وہ بھی شریک تھی...... اور پھر اس کا احسان مانتے ہوئے انجانے میں اس بچے کو اس کے باپ کا ہی نام دے دیا تھا۔

وہ اس اسپتال میں اس سے پہلے سیکڑوں بار آ چکی تھی مگر آج اس جگہ سے اسے ایک نامعلوم سا... خوف آ رہا تھا۔ ڈاکٹر اشعر صرف ایک ماہر آرتھوپیڈک ہی نہیں تھے بلکہ فزیوتھراپی میں اس کے استاد بھی تھے۔ ان کے ساتھ اس نے ایک بار نہیں بلکہ ڈھیروں بار مریضوں کے کیس ہسٹری پر بحث کی تھی۔ ڈاکٹر اشعر کے لبوں سے نکلنے والے چند جملے اس کی زندگی کو یکسر تبدیل بھی کرسکتے تھے۔ اس کے شوق بلکہ جنون کا

ناولٹ

محبت کے گلاب

نبیلہ نازش راؤ



خون بھی کر سکتے تھے۔
"عانیہ! ڈاکٹرز کالنگ یو۔" سسٹر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اسی لمحے کی منتظر تھی اور اسی سے ہراساں بھی...... اگر آنکھیں بند کر لینے سے مسائل ختم ہو جاتے تو شاید شہر کے سارے باسی کبھی آنکھیں ہی نہ کھولتے...... ڈاکٹر اشعر کے تجربے کار چہرے پر شفقت کی گہری مسکراہٹ چسپاں تھی۔ وہ خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔
"عانیہ! تمہارے منہ پر پونے بارہ کیوں بج رہے ہیں۔ بی بولڈ، جائے ہوگی۔" وہ مسکرائے...... عانیہ خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
"آپ کے پاس میرے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے......؟" وہ شاید پوچھ رہی تھی۔ "یہی بات ہے ناں......" اسے اُن کی شفقت سے خوف آرہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے۔
"عانیہ حوصلہ کرو...... میرے خیال میں تو میرے پاس تمہارے لیے اچھی خبر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ خبر تمہارے لیے اس قدر اچھی نہ ہو مگر تم خود ایک فزیو تھراپسٹ ہو...... میں نے تمہیں پہلے معائنے پر ہی بتا دیا تھا کہ تمہارا داہنا گھٹنا بہت بری طرح متاثر ہوا ہے اور یقین کرو کہ ان چند سٹنگز میں اس میں جتنی امپرومنٹ ہوئی ہے اس نے مجھے بھی حیران کیا ہے۔ کیا یہ تمہارے لیے اچھی خبر نہیں ہے کہ تم چل سکتی ہو، بھاگ سکتی ہو، دنیا کا ہر کام کر سکتی ہو مگر...... صرف ٹینس نہیں کھیل سکتیں۔"
عانیہ کو یک دم لگا کہ جیسے آسمان کی وسعتوں میں اڑتی ڈولتی پتنگ ایک دم کٹ کر زمین پر آگری ہو۔ اس کا پورا وجود کان بنا ہوا تھا۔ "ہم یہ سمجھے تھے تیرا درد گوارا ہوگا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ ڈاکٹر اشعر اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ خود اس خبر سے خوف زدہ تھی مگر امید کی ایک چھوٹی سی لو نے اس کے گرد مدھم سہی مگر روشنی کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر اشعر کے صاف لفظوں نے اسے حقیقت کی دنیا میں لا پھینکا تھا۔ وہ اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر بہت سنجیدہ ہو گئے۔

"عانیہ! ٹینس تمہارا شوق ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم قومی چیمپئن شپ تک پہنچ چکی ہو مگر یہ بھی تو دیکھو کہ تمہارے گھٹنے والا نقصان ٹینس کی ہی مرہونِ منت ہے اور پھر ایک کامیاب زندگی کے لیے ٹینس کا کھلاڑی ہونا یقیناً لازمی بات نہیں ہے۔ تمہاری یہ چوٹ تمہیں زندگی بھر کے لیے معذور بھی کر سکتی تھی۔" وہ ایک لمحے کو رکے۔ "عانیہ تم نے سیکڑوں لوگوں کو وہیل چیئر پر بھی زندگی گزارتے دیکھا ہوگا جن کے لیے میں یا یہ فزیو تھراپی کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ہم معجزے نہیں کر سکتے۔ زندگی تمہارے سامنے ہے اور راستے کھلے ہوئے ہیں۔ خوش رہنا ایک ہنر بھی ہے اور مائی ڈیئر تمہیں یہ ہنر ضرور آنا چاہیے۔"
عانیہ نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ ایسی تسلیاں وہ خود بھی بہت سے لوگوں کو دے چکی تھی پھر ڈاکٹر اشعر کی ساری باتیں حقیقت پر مبنی تھیں۔
"شکریہ سر!" وہ کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔
اسپتال سے گھر تک کا فاصلہ اس نے خود کو سمجھاتے ہوئے طے کیا۔ تسلی کے لفظ بعض اوقات اپنی ساری معنویت کھو دیتے ہیں۔ اس کی زندگی ایک البم کی صورت میں اس کی نظروں سے گزر رہی تھی جس کی سب سے پہلی تصویر ڈیڈی کی تھی۔ ڈیڈی جو ٹینس کے قومی چیمپئن بھی تھے اور اس کے آئیڈیل بھی، بچپن سے ریکٹ اور گیند اس کے تصوراتی کھیل رہے تھے۔ ہم جن لوگوں سے محبت کرتے ہیں شاید لاشعوری طور پر ان کی پسند وناپسند، شوق اور جنون ہمارے احساسات پر حاوی ہوتے جاتے ہیں...... ڈیڈی نے اسے ٹینس کی تربیت دی تھی۔ یہ شوق بچپن سے اس کے ساتھ جوان ہوا تھا اور اب جبکہ یہ ایک ہرا بھرا درخت بن چکا تھا، اسے جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے کا حکم صادر ہوا تھا بلکہ قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔ اس کے دل و دماغ شکوے سے بھرے ہوئے تھے۔
اگلے صفحے کی اہم تصویر ممی تھیں۔ جو ڈیڈی اور پھر

عانیہ کے ٹینس کھیلنے سے مفاہمت نہیں کر سکتی تھیں۔ بقول ان کے ایک ذرا سی گیند کے پیچھے اِدھر اُدھر دیوانہ وار بھاگتے پھرنا انتہائی حماقت تھی۔ اور یہ وہی تھیں جنہوں نے اسے فزیو تھراپسٹ بنا کر دم لیا تھا۔

''کیا ہوا عانیہ کچھ بات بنی؟'' ڈیڈی اسے گاڑی سے اترتا دیکھ کر اس کے قریب آ گئے۔ ''ابھی مزید کتنی سٹنگز باقی ہیں؟'' وہ ان کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی۔

''ڈیڈی شاید میرے مستقبل میں صرف فزیو تھراپسٹ رہنا ہی ہے۔''

''اوہ......!'' ڈیڈی اس کی پشت تھپکنے لگے۔ ''بی بریو مائی گرل...... زندگی میں مشکلات آتی رہتی ہیں مگر اچھا اسپورٹس مین وہی ہے جو کہیں بھی اسپورٹ مین اسپرٹ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔'' وہ بھی جواباً مسکرائی اور اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ اسے اپنے کمرے میں قید ہوئے تین گھنٹے گزر رہے تھے یا تین دن وہ اس خیال سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ بعض اوقات زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں جب وقت کے گزرنے کا بھی احساس نہیں ہوتا صرف اپنے زیاں کا خیال رہ جاتا ہے۔ ممی اور ڈیڈی کئی، کئی گھنٹے اسے سمجھاتے۔ بات اس کی سمجھ میں آ بھی گئی تھی مگر اسے تسلیم کرنے کے لیے جس حوصلے کی ضرورت تھی شاید وہ بیدار نہیں ہو رہا تھا یا پھر وہ خود کسی اتفاق یا معجزے کے انتظار میں تھی۔ آج صبح سے وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔

''عانیہ! ڈاکٹر اشعر کا فون ہے۔'' ممی اس کا سر سہلاتے ہوئے بولیں تو وہ چونک اٹھی۔

''ہیلو عانیہ! کیا تم انڈر گراؤنڈ چلی گئی ہو۔'' ڈاکٹر اشعر کی ہر دم تازہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''تم میری بریلیئنٹ اسٹوڈنٹس میں سے ایک رہی ہو...... مجھے تم سے اس قسم کے رویے یا ردعمل کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ مجھے علم ہے کہ تمہیں دکھ ہوا ہے مگر تم اس طرح اپنی ذمے داریاں بھول جاؤ گی، اس کی مجھے امید نہیں تھی۔''

''ذمے داریاں......؟'' عانیہ حیران تھی۔

''ہاں...... شاید تم بھول رہی ہو کہ تم ایک فزیو تھراپسٹ بھی ہو اور تمہارے مریضوں کو تمہاری اشد ضرورت ہے...... اس وقت میرے پاس ایک ایسا کیس موجود ہے جس کے متعلق میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ تم ہی اسے ہینڈل کرو گی۔''

''مگر سر......!''

''کل صبح تمہیں اسپتال میں دس بجے مجھے رپورٹ کرنی ہے۔ اوکے دین گڈ بائی......''

عانیہ ریسیور کو چند لمحے دیکھتی رہی۔ زندگی شاید اسے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی اور اپنے رویے پر غور کرنے لگی۔ اس کے کپڑے سلکجے ہو رہے تھے اور بال بکھرے ہوئے۔ اس حقیقت کو اسے تسلیم کرنا تھا خواہ وہ کتنی ہی تکلیف دہ، بے رحم کیوں نہ ہو۔ اسے اپنے آپ کو سمجھانا تھا۔ وہ کافی دیر اپنے حالات پر غور کرتی رہی۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے اگر آپ کچھ کرنے کی ٹھان لیں تو آپ وہ کر گزرتے ہیں۔ کئی دنوں بعد اسے رات کو پُرسکون نیند آئی تھی۔ اگلی صبح وہ جلد بیدار ہو گئی۔ ابھی مکمل روشنی نہیں پھیلی تھی مگر چڑیوں کا خوب صورت گیت صبح کی آمد کی نوید دے رہا تھا، وہ خدا کے حضور جھک گئی۔ ممی اسے دوبارہ مطمئن دیکھ کر خوش نظر آ رہی تھیں۔

آج کے لیے اس نے خاص طور پر نارنجی رنگ کا سوٹ نکالا تھا اور تیار بھی خاصے اہتمام سے ہوئی تھی۔ شاید اس طرح وہ اپنی ہمت کو سراہنا چاہتی تھی یا پھر اندر کی بے رنگی کو رنگوں کا لبادہ پہنا کر چھپانا چاہتی تھی۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر ایک لمحے کو خود اسے بھی حیرت ہوئی۔ اس کا مطمئن سراپا دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پچھلے دنوں اس کے اندر کس قدر توڑ پھوڑ ہوئی ہے۔ اوپر کی پُرسکون لہریں طوفان کو اپنی گرفت میں لے کر تہ میں کہیں چھپا دینے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر اشعر نے اسے دیکھ کر سر ہلایا۔ ان کی

نظروں میں ایک مطمئن سی پسندیدگی تیر رہی تھی جیسے وہ بغیر بتائے یہ سب کچھ جان چکے ہوں اور اس کے فیصلے پر خوش ہوں۔

''ہیلو عانیہ......! کیا حال ہے، بیٹھو، میں ابھی تمہیں کیس ہسٹری دکھاتا ہوں۔ تمہیں آج ہی سے کام شروع کرنا ہے۔'' وہ بغیر کسی تمہید کے بولے۔ ''عمان احمد کا نام تو تم نے سنا ہوگا مشہور مجسمہ ساز...... جس کے ایک مجسمے کو پچھلے دنوں بین الاقوامی مجسمہ فیسٹول میں مسلسل دوسرا انعام مل چکا ہے۔ آج وہی ہمارا مریض ہے۔ مسلسل مجسمہ سازی نے ہی اس کے ایک بازو کے عضلات پر بہت برا اثر ڈالا ہے یوں سمجھو کہ اس کا بازو مکمل طور پر شل ہوگیا ہے۔ میں نے اسے بتادیا ہے کہ اب وہ کبھی مجسمہ سازی نہیں کر سکے گا اور بازو کو اس کی اصل حالت پر لانے کے لیے ریگولر فزیو تھراپی بھی بے حد ضروری ہے۔ فی الحال وہ اس بازو کو حرکت نہیں دے سکتا...... میرا خیال ہے کہ تم اس کے مسئلے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ لوگی کیونکہ مجسمہ سازی اس کا شوق نہیں جنون ہے اور اب وہ اس سے دور ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں وہ پُرتشدد ہوگیا ہے۔ اسے ہینڈل کرنا اب تمہاری ذمے داری ہے۔ فی الحال روزانہ اور پھر ہفتے میں دو، تین دفعہ تمہیں اس کا ٹریٹ منٹ کرنا ہوگا۔ ایم آئی کلیئر؟''

''یس سر!'' عانیہ مسکرائی۔ ''میں یہ کرلوں گی۔''

''تمہیں ابتدا میں اسے اس کے گھر پر کنسلٹ کرنا ہوگا اس کی ممی مسز اکمل میری پرانی واقف ہیں اور انہوں نے مجھ سے اس کے لیے ذاتی طور پر درخواست کی ہے۔'' وہ بھی جواباً مسکرائے۔

''ٹھیک ہے سر...... آپ مجھے موبائل نمبر اور ایڈریس وغیرہ دے دیجیے۔ آئی وِل ہینڈل اِٹ۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اب میں چلتی ہوں سر۔''

''اوکے عانیہ، مجھے تم پر فخر ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔

''تھینک یو سر......!'' وہ مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

عمان احمد کے ساتھ پہلی سٹنگ نے ہی عانیہ کو خاصا پریشان کردیا۔ وہ تعاون پر بالکل آمادہ نہیں تھا۔ نہ ہی اسٹوڈیو کو چھوڑنے پر تیار تھا۔ اس کے اسٹوڈیو کو دیکھ کر ایک بار تو عانیہ بھی متحیر ہوگئی تھی۔ لمبے سے ہال میں جگہ، جگہ پتھروں کو خوب صورت شکلوں میں تراش کر عمان احمد نے اپنے ہنر کو زندہ جاوید کردیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں واقعی جادو تھا اور اب یہ جادو اس سے چھن رہا تھا۔ وہ اس کے درد کو سمجھ سکتی تھی۔ شکوے کی دبی، دبی لہر ایک بار پھر اس کے وجود میں مچلنے لگی تھی۔ آج وہ تیسری بار یہاں آئی تھی۔ عمان احمد اب تک حقیقت کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔

''عمان صاحب اگر آپ تعاون پر آمادہ نہیں ہوں گے تو حالات مزید بگڑتے ہی جائیں گے۔'' وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''تو آپ کے خیال میں یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ سب کچھ درست ہے؟ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ باریک خوب صورت آری، چھینی، یہ ہتھوڑا اور پتھر ان سے بچھڑ کر عمان احمد کی زندگی میں کچھ بچ جاتا ہے۔ مس فزیو تھراپسٹ یہ میری پہچان ہیں اور پہچان سے کٹ کر جینے کا جواز بہت مشکل ہے۔'' وہ لمبا چوڑا مرد بچوں کی طرح الجھ رہا تھا۔

''میں سمجھ رہی ہوں عمان صاحب مگر آپ نے اپنی اس پہچان کو حد سے زیادہ استعمال کرلیا ہے۔ قدرت نے آپ کو مصلحت کا جو اکاؤنٹ دیا تھا آپ اس سے اوور ڈرافٹ تک لے چکے ہیں اور یہی وجہ ہے۔''

''کہ اب میرا یہ ہاتھ بیکار ہوگیا ہے۔ یہی کہنا چاہتی ہیں ناں آپ......؟''

''میں کچھ نہیں کہنا چاہتی...... میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ ایک باشعور فرد کی طرح سوچیں اور اپنے اچھے برے کا فیصلہ خود کرلیں۔ یوں زمانے بھر سے منہ موڑ کر بیٹھے رہنے سے یا کبوتر کی طرح آنکھیں بند

کر لینے سے حقیقت ختم نہیں ہو جائے گی۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید یہ کوئی ڈراؤنا خواب ہے تو یقین کریں یہ حقیقت ہے اور جب بھی آپ آنکھیں کھولیں گے حقیقت کی تیز دھوپ آپ کی منتظر ہو گی۔ دیر کرنے کی صورت میں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ آپ وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں جو اب کر سکتے ہیں۔"

عانیہ جانتی تھی کہ اس کے سچے لفظوں کی درانتی عمان احمد کے جذبوں کو زخمی کر رہی ہو گی مگر اس وقت اس کا واحد علاج نشتر لگانا ہی تھا۔ چند لمحے توقف کر کے وہ مزید بولی۔

"اگر آپ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ آپ کو میری ضرورت نہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔ ویسے بھی میں سائیکاٹرسٹ نہیں ہوں اور پھر فیصلہ آپ کو خود کرنا ہے۔" اس نے جھک کر اپنا بیگ اٹھایا اور دروازے کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ بے حد دکھی ہو رہی تھی۔

"مس عانیہ!" عمان احمد کی ٹوٹی ہوئی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ "شاید آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔" پتھروں کو تراش کر صورتیں بخشنے والے اس ماہرِ فن کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"تھینک یو عمان صاحب! آپ یقین کریں آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔" وہ مسکرائی۔

اس دن کے بعد سے عانیہ کو عمان احمد کے کیس میں کوئی خاص مشکل درپیش نہیں ہوئی۔ وہ اس سے خاصا تعاون کر رہا تھا۔ ڈاکٹر اشعر اور خود عانیہ کا خیال بھی تھا کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو وہ جلد مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے گا۔ مسز اکمل واقعی کمال کی خاتون تھیں۔ ان کی زبانی عانیہ کو معلوم ہوا کہ عمان احمد سے بڑا بیٹا شہباز احمد بھی تھا جو اپنی زمینوں پر ہوتا تھا اور جلد ہی واپس آنے والا تھا۔

☆☆☆

اس روز موسم خاصا ابر آلود ہو رہا تھا۔ عانیہ ابھی بستر میں تھی کہ موبائل کی رنگ نے اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

”ہیلو......“

”ہیلو عانیہ......! بیٹے میں مسز اکمل بول رہی ہوں۔“ ان کی بوڑھی آواز لرز رہی تھی۔

”جی مسز اکمل...... خیریت تو ہے۔“ وہ صبح ہی صبح ان کی آواز سن کر حیران رہ گئی۔

”نہیں بیٹے، میں کافی دیر اشعر کا فون ملا رہی تھی مگر وہ مل نہیں رہا۔ عمان پوری رات اسٹوڈیو میں رہا ہے۔ اب بھی دروازہ بند ہے اور اندر سے اس کے کام کرنے کی آوازیں مسلسل آرہی ہیں۔“

”اوہ...... یوں تو سب محنت برباد ہو جائے گی۔“ وہ گھبرا گئی تھی۔ ”آخر عمان صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ میں ابھی آرہی ہوں۔“

”ہاں بیٹے آجاؤ......“ مسز کمال نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

ممی کو تمام صورتِ حال سے باخبر کرنے کے بعد وہ مسز کمال کے گھر کی جانب روانہ ہو گئی تھی۔

اب عمان احمد کا بازو خاصی بہتر حالت میں تھا وہ نہ صرف اسے حرکت دے سکنے میں کامیاب ہو رہا تھا بلکہ چیزوں کو مضبوطی سے تھامنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھنے کے امتحان میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔

جس وقت وہ وہاں پہنچی اسٹوڈیو کا دروازہ بند تھا۔ مسز اکمل پریشانی کی حالت میں وہیں موجود تھیں۔

”عمان صاحب......“ عانیہ دروازہ کھٹکھٹا کر بولی۔ ”دروازہ کھولیں۔ کچھ دیر کی کوششوں کے بعد اسٹوڈیو کا دروازہ کھل گیا تھا۔ عمان احمد بکھرے ہوئے بالوں اور سرخ چہرے کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھینی موجود تھی اور وہ انجان نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ عانیہ اسے دکھی نظروں سے دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔

”یہ آپ نے کیا، کیا عمان صاحب......؟“

”وہی جو مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ میں تم لوگوں کی فضول تھراپی کی خاطر اپنے فن سے مزید دور نہیں رہ سکتا۔“

”آپ کیا سمجھتے ہیں کہ کیا اس طرح آپ کامیاب ہو جائیں گے؟“ اس کے سوال پر وہ خاموشی سے زمین کو دیکھتا رہا۔ عانیہ اسٹوڈیو میں داخل ہو گئی اور اس مجسمے کو دیکھنے لگی جو نامکمل ہونے کی وجہ سے کوئی واضح صورت اختیار نہیں کر سکا تھا۔ اسے اپنی محنت کے زیاں کا بہت دکھ ہو رہا تھا۔

”آپ نے گزشتہ تمام دنوں کی محنت کو ضائع کر دیا ہے عمان صاحب......! میرا خیال ہے...... اب آپ کو ڈاکٹر اشعر سے دوبارہ چیک اپ کرانا پڑے گا۔ آپ کی یہ ضد آپ کے حق میں بہت بری ثابت ہو گی۔ آخر آپ یہ سب کچھ کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟“

”مس فزیو تھراپسٹ...... آپ لوگوں کو تسلیاں دینے اور ان کی امیدیں توڑنے کی شاید اس قدر عادی ہو گئی ہیں کہ آپ کسی کی آنکھوں میں چمکتی شوق کی کرنوں کو نہیں دیکھ پاتیں...... آپ کو یہ نہیں معلوم ہے کہ زندگی کا حاصل اگر چند لمحوں میں آپ سے چھین لیا جائے تو دل و دماغ پر کیا گزرتی ہے۔“ وہ ایک جذب کے عالم میں بولے جا رہا تھا۔

”جی ہاں، چلیں مان لیتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ نہیں جانتی مگر آپ بھی کچھ نہیں جانتے مسٹر عمان! شاید آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ میں جو آپ کو صرف ایک بے حس فزیو تھراپسٹ نظر آتی ہوں۔ میرے بھی کچھ خواب تھے۔ بچپن سے میرے تصور میں قومی ٹینس چیمپئن شپ کی ٹرافی تھی اور میں اس کی جانب سالہا سال سے قدم گن، گن کر چل رہی تھی مگر میں جب اس سے صرف دو قدم دور تھی تب یہ ہوا کہ......“ وہ سسکی تھی پھر ایک گہری سانس بھر کر مزید بولی۔ ”میں اب ٹینس نہیں کھیل سکتی کیونکہ میرا داہنا گھٹنا شدید پریکٹس سے متاثر ہو چکا ہے۔ آپ یقیناً یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم صرف خواب دیکھ سکتے ہیں تعبیروں کا حق کسی اور غیر مرئی ہاتھ ہے۔ اور جو کچھ آپ کو مل جاتا ہے اسے ہنسی خوشی قبول کر لینا چاہیے...... میں چونکہ اس حقیقت کو پا چکی تھی اسی لیے...... مگر آپ نے اپنی دنیا جیتے جاگتے انسانوں کی

جگہ پتھروں تک محدود کرلی اور اب خود بھی پتھر کے ہو چکے ہیں اور آپ کو اب کسی کے مشورے یا ساتھ کی ضرورت نہیں ہے۔'' عانیہ اپنے رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں سے بھی بے خبر نظر آرہی تھی' عمان احمد اسے چند لمحے حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ بہت شرمندہ نظر آرہا تھا۔ پھر یکلخت اس نے تمام اوزار ہاتھ سے پھینک دیے۔

''عانیہ مجھے افسوس ہے۔'' وہ دھیرے سے مگر... پُرتاسف لہجے میں بولا۔'' میرے لفظوں سے آپ کو افسوس ہوا ہوگا مگر میں...... پتا نہیں میں کیوں اپنے حالات سے مفاہمت نہیں کر پا رہا ہوں۔ کوئی چہرہ دیکھ کر کوئی تصور، سوچ کر یا منظر دیکھ کر میرے ہاتھ بے چین سے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت مجھے خود پر قابو نہیں رہ پاتا، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔''

عانیہ دھیرے، دھیرے چلتی ہوئی ان کے پاس پہنچی...... ''عمان صاحب! کیا آپ نے یہ کبھی نہیں سنا کہ اگر ایک در بند ہو جائے تو کئی دوسرے دروازے کھل جاتے ہیں، اگر کوئی ایک نعمت چھن جائے تو کوئی نہ کوئی اس کا بدل ضرور مل جاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو ہم پا نہ سکیں اس کے لاحاصل ہونے کی خلش ضرور رہ جاتی ہے۔ آپ کے اندر کے تخلیقی انسان کو اظہار کے ذریعے کی ضرورت ہے اور یہ ذریعہ اسے ضرور ملنا چاہیے مگر کیا یہ ضروری ہے کہ آپ یہ اظہار قدرت سے لڑ کر ہی کریں۔ آپ کے سامنے ایک راستہ اور بھی تو ہے۔''

''راستہ، کون سا راستہ؟''

''آپ مجسمہ نہیں بنا سکتے مگر آپ کا بازو جسے آپ نے اس ایک رات میں بے حد نقصان پہنچایا ہے...... برش کا بوجھ تو بہ آسانی سہار سکتا ہے۔ آپ ہر چہرہ، منظر یا تصور مجسمے کے ذریعے نہ سہی پینٹنگ کے ذریعے تو پیش کر ہی سکتے ہیں۔''

''واقعی مس عانیہ! آپ درست کہتی ہیں......'' وہ یک دم تازہ نظر آنے لگا تھا۔''

''آپ درست کہتی ہیں، کمال ہے مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا شکریہ...... بہت، بہت شکریہ آپ میرے اس بازو کو دیکھیں...... میرا آپ سے وعدہ ہے بلکہ درخواست ہے کہ میں اپنی سب سے پہلی پینٹنگ آپ کی بناؤں گا...... اجازت ہے ناں......'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا عانیہ بھی اقرار میں سر ہلا کر ہنس دی۔

اور عمان احمد نے اپنی بات کر دکھانے کی ٹھان لی تھی۔ ڈاکٹر اشعر اور عانیہ نے اسے روزانہ ایک گھنٹا پینٹ کرنے کی اجازت دی تھی اور وہ پہلی پینٹنگ عانیہ کی ہی بنا رہا تھا۔ اس نئے آئیڈیے نے اس میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ عمان نے تین ماہ بعد ہونے والی تصویروں کی ایک مشترکہ نمائش میں شرکت کا مصمم ارادہ بھی کرلیا تھا۔ اس روز بھی وہ اسے اپنے سامنے بٹھائے کینوس پر بنائے ہوئے خاکے میں رنگ بھرنے میں مصروف تھا۔

''عمان صاحب! آج اپنے مقررہ وقت سے زیادہ ٹائم پینٹ کر چکے ہیں۔''

''ہاں عانیہ...... اگر اب میں تیز کام کرنا چاہتا ہوں آپ کو معلوم ہے کہ نمائش میں کتنا کم وقت رہ گیا ہے۔''

''میں یہ سب نہیں جانتی، مجھے صرف اتنا علم ہے کہ سر نے آپ کو اوور ورک کی اجازت نہیں دی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی اتنے دنوں کے ساتھ نے ان دونوں کو دوستی کے ایک دھاگے میں باندھ دیا تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے عمان کے ہاتھ سے برش کھینچ لیا۔

''اوہ عانیہ، ابھی کام بہت باقی ہے، پلیز پندرہ منٹ اور......''

''جی نہیں......'' وہ برش ہوا میں لہرا رہی تھی اور پینٹ کے چند قطرے اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پر لگ گئے تھے۔

''گڈ شو۔'' دروازے پر بجنے والی تالیوں نے ان دونوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی تھی۔

''عمان! کیا تم نے مجسمہ سازی کے بعد اب اسٹیج شوز کا کام شروع کر دیا ہے۔'' نو وارد نے عانیہ کو سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ارے نہیں شہباز، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم آج ہی آئے ہو ناں اسی لیے تمہاری عانیہ سے ملاقات نہیں ہے۔ یہ میری فزیوتھراپسٹ ہیں اور مجسمہ سازی سے جدائی کے بعد یوں سمجھو کہ میں تو بالکل ختم ہو چکا تھا...... مجھ میں زندگی کی روح پھونکنے والی یہی عانیہ ہے۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔'' شہباز آہستہ سے بولا۔

''اور عانیہ' یہ شہباز ہے میرا بھائی...... ممی نے تمہیں شہباز کے بارے میں بتایا تھا ناں۔ یہ آج ہی صبح واپس آیا ہے۔ ویسے میرے اس بھائی کو آرٹ سے قطعی دلچسپی نہیں ...... یہ تو کھیتوں اور دیہاتوں میں زیادہ خوش رہتا ہے۔''

''جی ہاں اجڈ سا آدمی ہوں اس لیے پرانی روایات سے محبت بھی کرتا ہوں...... بہرحال آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔''

''مجھے بھی......'' عانیہ دھیرے سے بولی۔ وہ شہباز کی نگاہوں میں ناپسندیدگی کی واضح لہر کو صاف طور پر پڑھ چکی تھی۔ اور اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش ان کھوجتی ہوئی طنز کرتی ہوئی نگاہوں سے دور ہو جانا تھا۔

''مجھے دراصل ممی نے بھیجا تھا چائے پر آپ لوگوں کا انتظار ہو رہا ہے چلیں۔''

''ہاں بھئی عانیہ، آؤ چلیں......'' عمان بولا۔

چائے پیتے ہوئے تمام وقت عمان احمد اپنی تصویروں کی نمائش کے بارے میں بتاتا رہا مگر عانیہ یہ سب کچھ خالی الذہنی کی حالت میں سن رہی تھی اور پھر وہ جلد ہی وہاں سے نکل آئی تھی۔ شہباز احمد کی نظریں اسے ڈسٹرب کرنے کے لیے کافی تھیں۔ ذہن سے جھٹکنے کے باوجود وہ خود کو ان کے حصار سے آزاد کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔

دوسرے دن عمان احمد کے فون کے باوجود وہ اس طرف نہیں جا سکی۔ اگرچہ اپنی اس بزدلی پر تمام دن وہ خود کو صلواتیں سناتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیوں اتنی کانشس ہو رہی ہے۔ جب اس کی کوئی خطا نہیں ہے تو پھر وہ کیوں خود کو سزاوار سمجھ رہی ہے۔

سہ پہر کی دھوپ ڈھل رہی تھی، وہ ممی کے ساتھ لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ عمان احمد کی گاڑی کے ہارن نے اسے واقعی گڑبڑا دیا تھا۔ گاڑی میں صرف عمان ہی نہیں بلکہ مسز اکمل، شہباز احمد اور دو لڑکیاں بھی موجود تھیں۔

''عانیہ! کیا حال ہے؟'' عمان نے ڈرائیو وے پر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی تھی۔

''ٹھیک ہوں، آپ لوگ گاڑی سے اتر کیوں نہیں رہے۔'' وہ انہیں بدستور بیٹھا دیکھ کر حیران ہو کر بولی۔

''اس لیے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ رہی ہیں۔'' عمان مسکرایا۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد ایک پکنک کا پروگرام بنایا ہے اور ہم لوگ تمہیں پک کرنے آئے ہیں۔''

''مگر اس وقت؟'' وہ گھبرا گئی۔

''ہاں آ جاؤ بیٹی، تم ہمارے فیملی ممبر کی طرح ہی ہو۔'' مسز اکمل گاڑی سے اتر کر قریب آتے ہوئے بولیں۔

کافی تذبذب کے بعد اور ممی کے زور دینے پر وہ ان کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی تھی۔ سمندر کے ساحل پر قدرے کم آباد کونے میں ان سب نے اپنی چوکڑی جمائی تھی۔ سمیرا اور تارش، عمان احمد کی ماموں زاد بہنیں تھیں۔

''یوں لگ رہا ہے، ہم سب اتنی دور سے صرف ساحلِ سمندر پر بیٹھ کر کھانے پینے کے لیے آئے تھے، اس سے تو اچھا تھا کہ گھر میں ہی پانی کی بالٹی سامنے رکھ کر بیٹھ جاتے۔'' تارش منہ بنا کر بولی۔

''اور کیا ذرا پانی کے قریب چلیں تو مزہ آئے۔''

"میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں رہے گا۔" شہباز بولا۔

"جی نہیں، بھئی ہم انجوائے کرنے آئے ہیں۔ انجوائے کریں گے۔" عمان احمد نے فیصلہ دیا۔

وہ سب تھوڑا سا اور آگے آ گئے۔ تارش کے کسی لطیفے پر ہنستے ہوئے اچانک عانیہ کو لگا جیسے اس کے بائیں پیر کو کسی چیز نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور پھر یہ گرفت بڑھتی ہی چلی گئی وہ ڈگمگا کر گری۔ سامنے سے آتی ہوئی تیز لہر گویا اسے اپنی آغوش میں لینے کے لیے بے قرار تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ وقتِ آخر ہو۔ یوں خاموشی سے اس طرح غرقاب ہونے کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

ایک بڑی عجیب بات یہ تھی کہ اس کے ذہن میں آخری سوچ جو آئی وہ یہی تھی کہ اس کے اس طرح مر جانے سے اس ناراض، اجنبی شہباز احمد کو بے حد خوشی ہوگی۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی مہربان ہاتھ نے اس کے پیروں کو اس...... شکنجے سے نجات دلا دی ہو اور وہ جیسے وہ مہربان ہاتھ اسے بازو سے پکڑ کر اس آبی قبر سے باہر نکال رہا ہو۔ عانیہ کے حواس بحال ہوئے تو اس نے کئی سائے خود پر جھکے ہوئے پائے۔ چند لمحوں میں ان سایوں نے شکل صورت کے لبادے اوڑھے۔ مسز اکمل کی پریشان شکل، تارش، نگار اور عمان احمد کی پریشانی اور شہباز احمد کا بری طرح بھیگا ہوا سراپا اس کے سامنے تھا۔

"کیا اب آپ بالکل ٹھیک ہیں؟" شہباز احمد کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی...... اس آواز میں وہی پہلے دن والا غصہ تھا۔

"میں آپ لوگوں کو پہلے ہی منع کر رہا تھا۔ آپ کے پیروں کو دراصل سمندری گھاس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور آپ نے اس بے اختیار انداز میں خود کو اس کے سپرد بھی کر دیا تھا، کیا آپ کو کبھی کسی نے تیرنا نہیں سکھایا؟" وہ ناراضی کے عالم میں بولے جا رہا تھا۔ عانیہ اب تک اس بھیانک تجربے کے اثر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

"آپ پورے بھیگ گئے ہیں۔" شہباز احمد کے بھیگے سراپے کو دیکھ کر اسے پہلا جملہ یہی سوجھا تھا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے غصے نے پہلے حیرت اور پھر ایک ہلکی سی ہنسی کی جگہ لے لی۔ اس سے بھی عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ عانیہ کا خوف اور ڈر بھی ایک دم غائب ہو گیا تھا۔ شہباز احمد کے پتھریلے چہرے پر پھیل جانے والی زندہ ہنسی نے اسے ایک عجیب خوشی بخشی تھی۔

"چلو بچو......! اب فوراً گھر چلو...... میرے تو حواس ہی قابو میں نہیں آ رہے۔" گاڑی میں رکھے ٹاول سے اس نے اپنا آپ کسی حد تک خشک کر لیا تھا۔

مسز اکمل کی آواز اسے دوبارہ حقیقت کی دنیا میں لے آئی تھی۔ وہ سب گاڑی میں بھر گئے۔ عانیہ کو گھر پر شہباز احمد نے اسے اندر تک چھوڑ آنے کی ذمے داری لی۔

"شہباز صاحب...... پلیز امی کو یہ بات مت بتایئے گا۔" وہ پورچ کے قریب آ کر بولی۔

"بہتر......" وہ دھیرے سے بولا۔ عانیہ جاتے، جاتے پھر رک گئی تھی۔

"اور یہ کہ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے میری زندگی بچائی ہے۔" وہ بہ مشکل بولی۔

"کتابی جملے حقیقی دنیا میں کچھ بے معنی سے لگتے ہیں۔" وہ بھی دھیرے سے بولا۔ "اب آپ خود سے اندر چلی جائیں گی ناں......" وہ مڑا اور پھر یک دم رک کر بولا۔ "مس عانیہ میں نہیں جانتا کہ آپ اس بات پر کتنا یقین رکھتی ہیں مگر ایک چینی کہاوت ہے کہ اگر کوئی کسی کی جان بچاتا ہے تو اس دن سے اس شخص کی زندگی بچانے والے کی ہو جاتی ہے۔ شب بخیر......" وہ لمبے، لمبے ڈگ بھرتا چند لمحوں میں گیٹ سے باہر جا چکا تھا۔ عانیہ چند لمحے وہیں کھڑی اس کے جملے پر غور کرتی رہی۔ شہباز نے اسے ایک چینی کہاوت سنائی تھی مگر وہ یہ بات بخوبی جانتی تھی کہ یہ کہاوت اس معاملے میں زندگی بچانے سے پہلے ہی سچ ثابت ہو چکی تھی۔

شہباز احمد اپنی تمام ناپسندیدگی کے باوجود اس کے حواس پر حاوی ہو چکا تھا اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ اس کا سبب بھی جانتی تھی۔ اس رات عانیہ کا ذہن اپنی زندگی کی اس جگ ساپزل کو جوڑنے میں لگا رہا۔ شہباز کے جملے، جاتے ہوئے اس کی نگاہیں اسے ایک اور ہی نغمہ سنا رہی تھیں۔ ایک ایسا نغمہ جس کی لے پر خود اس کا دل رقص کرنے کو بے تاب تھا مگر اس کی نگاہوں کی بے گانگی، غصہ اور بے وجہ ناپسندیدگی کا سبب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اس کے رویے کا یہ تضاد اسے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

☆☆☆

اگلے دو دن اپنے ساتھ کوئی خاص تبدیلی نہیں لائے اس کا پورٹریٹ اب بالکل آخری مراحل میں تھا۔ عمان احمد نے اب تک خود اسے بھی اسے دیکھنے کی اجازت نہیں دی تھی اور بقول عمان آج شام کی چائے پر وہ اپنی پانچ تصاویر جنہیں وہ نمائش میں رکھنا چاہتا تھا۔ پبلک کے معائنے کے لیے پیش کرنے والا تھا۔ وہ شہباز احمد سے گفتگو سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر جب بھی اس کی نظر اس طرف اٹھتی، وہ اسے اپنی جانب دیکھتا محسوس ہوا تھا۔

"بھئی عمان! اب تصویریں لے بھی آؤ۔" مسز اکمل نے آواز دی۔

"بس لا رہا ہوں ممی...... آخر آرٹ کی کچھ ویلیو ہوتی ہے۔ آپ لوگ انتظار کریں۔"

عمان کی بنائی ہوئی پانچوں تصاویر واقعی بے حد خوب صورت تھیں۔ دو تو لینڈ اسکیپ تھے جبکہ بقیہ دو میں سے ایک دیہاتی عورت کی اور دوسری تین مختلف ادوار کے بچوں کی تھیں۔ آخری تصویر عانیہ کا خوب صورت پورٹریٹ...... عانیہ اسے دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔

"واقعی آپ کی انگلیوں میں جادو ہے عمان......" وہ بالآخر بولی۔ "مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ یہ میری تصویر ہے۔"

"یہ پورٹریٹ میری سب سے خوب صورت تخلیق ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ نمائش میں بہت کامیابی حاصل کرے گی۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"مگر میں تو سمجھی تھی کہ آپ اسے نمائش میں نہیں رکھیں گے۔"

"پلیز عانیہ...... یہ میری سب سے بہترین تصویر ہے اور میں اسے ضرور نمائش میں رکھنا چاہتا ہوں۔" عمان احمد نے گویا بات ختم کر دی تھی۔ عانیہ نے شہباز کے چہرے پر ایک سایہ سا چھاتے دیکھا۔ عانیہ ... چند لمحے سوچتی رہی پھر وہ کندھے اچکا کر کسی اور کام میں مصروف ہو گئی۔

"شہباز پلیز تم عانیہ کو چھوڑ آنا۔ مجھے نمائش کے سلسلے میں ایک جگہ جانا ہے۔" عمان احمد اندر جاتے ہوئے بولا۔ عانیہ دم بخود کچھ سوچتی رہی۔ پھر دل کڑا کر کے شہباز کے ساتھ پورچ کی جانب چل دی۔ شہباز کے چہرے پر اس دن والی نرمی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ وہی پتھریلے تاثرات جیسے ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ راستہ خاموشی سے طے ہو رہا تھا۔

"عمان نے واقعی تصویروں میں کمال کر دیا ہے۔" بالآخر عانیہ ہی بولی۔

"جی ہاں، وہ شروع ہی سے ٹیلنٹڈ ہے۔" عانیہ، شہباز کے اس جملے اور لہجے سے یہ اخذ نہیں کر پائی کہ یہ جملہ اس نے سرسری انداز میں کہا ہے یا اس پر طنز کیا ہے۔

باقی راستہ دونوں خاموش رہے تھے۔ عانیہ کے گھر کے گیٹ پر ہی شہباز نے اسے اتارا اور ابھی وہ جھک کر شکریہ ادا کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ تیزی سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

عانیہ چند لمحے حیرانی سے پل، پل دور ہوتی گاڑی کے عقب میں اڑنے والی گرد کو دیکھتی رہی اور پھر گھر میں داخل ہو گئی۔ شہباز احمد کے اس عجیب سے رویے نے اس کے اندر غصے کی آگ بھڑکا دی تھی۔ ایک بات جو وہ بڑی وضاحت سے محسوس کر رہی تھی کہ وہ اس کے لیے اس کی محبت تھی مگر کیا اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ بلاوجہ اس کی توہین کرے۔ بغیر کسی بات کے

اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے...... وہ یہی سوچتی رہی اور اس بات کی صبح عانیہ کے ایک فیصلے کے ساتھ طلوع ہوئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ شہباز احمد سے نہیں ملے گی۔

☆☆☆

دن پر دن گزر رہے تھے۔ ان تین ہفتوں میں وہ صرف دو بار مسز اکمل کے گھر گئی تھی اور ان دونوں بار شہباز سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ ویسے وہ خود بھی چاہتی تھی مگر ہر بار واپس لوٹتے ہوئے وہ کچھ مایوس سی ہوئی تھی۔ یوں جیسے دل میں موجود امید کی کوئی کونپل مرجھا گئی ہو۔ تصویروں کی نمائش میں صرف ایک روز رہ گیا تھا۔ عمان احمد کو اس نمائش سے بہت سی توقعات تھیں اور تصاویر کی نمائش اور ان سے ملنے والی پبلسٹی نے... درحقیقت یہ امیدیں پوری بھی کردی تھا۔

"عانیہ......! اس میں جہاں تک میرے ٹیلنٹ یا محنت کا دخل ہے اسی قدر تمہاری حوصلہ افزائی بھی ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری تصویر کو سب سے زیادہ سراہا گیا ہے۔" عمان احمد بے خوش تھے۔

"مجھے ساری خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کو ایک ڈگر مل گئی ہے۔"

"ڈگر؟ تو...... ارے یہ ... تو پورا راستہ ہے اور میں اگلے ماہ اٹلی بھی جارہا ہوں۔"

مسز اکمل بیٹے کی خوشی میں خوش نظر آرہی تھیں۔ شہباز احمد بھی خوش تھے مگر عانیہ کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس پر نگاہ پڑتے ہی ان کے چہرے کی سختی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

"واقعی!" عانیہ مسکرادی تھی۔

"ہاں اور تم لوگوں کو ایک مزے کی اطلاع دینا تو میں بھول گیا۔ کل ایک فلم کے پروڈیوسر صاحب بھی آئے تھے۔ وہ ان خاتون سے ملنا چاہ رہے تھے جن کی پورٹریٹ نمائش میں شامل تھی۔ کیا خیال ہے مس فزیو تھراپسٹ، فلمی ہیروئن بننا ہے اور ہاں ایک اور اچھی بات یہ ہوئی کہ آج ہی آرٹ کا کوئی قدردان اسے خرید کر بھی لے گیا ہے۔ عانیہ اس تصویر سے مجھے بہت منافع ہوا ہے... پھر کہو کرنا ہے فلم میں کام......؟" وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولے۔

"میں......!" عانیہ ہنس دی۔ "کبھی نہیں، ویسے خیر میں کسی ہیروئن سے کم بھی نہیں ہوں۔" وہ اس کے چھیڑنے کے جواب میں اداکاری کرتے ہوئے بولی۔

"ممی...... میں ذرا اشتیاق کے گھر جارہا ہوں......" شہباز احمد ایک دم کھڑا ہوا۔

"یار...... ذرا تم ان مس ہیروئن کو بھی گھر چھوڑتے ہوئے چلے جانا۔" عمان بولا۔

"مجھے ذرا جلدی ہے۔"

"کوئی بات نہیں، میں خود چلی جاؤں گی۔" عانیہ نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"نہیں بیٹا! شہباز تمہیں چھوڑ دے گا۔" مسز اکمل نے فیصلہ دے دیا۔

وہ شہباز کے ہمراہ گھر سے نکلی۔

''آپ تو آج بہت اداس ہوں گی۔'' شہباز نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''اداس......؟ کیوں......؟'' بات واقعی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

شہباز احمد اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن کے شدید تاثرات تھے۔ اس کے بعد تمام راستہ دونوں خاموش ہی رہے تھے۔

☆☆☆

عمان احمد کافی حد تک صحت مند ہو چکا تھا۔ عانیہ بھی اپنی اسپتال کی مصروفیات میں لگ چکی تھی۔ وقت لاکھ سنبھالنے پر بھی اس کی مٹھی سے سمندر کی ریت کے مانند پھسل جاتا تھا۔ عمان احمد اور مسز اکمل سے کبھی کبھار گفتگو ہو جاتی تھی۔ عمان کئی بار اس کے گھر آیا تھا مگر عانیہ نے ان کی طرف نہ جانے کی قسم کھائی تھی۔ اس روز بھی صبح ہی سے وہ خاصی مصروف تھی۔ لنچ کے بعد ڈاکٹر اشعر سے تھوڑی سی گفتگو رہی انہوں نے عمان احمد کے فون کی بابت اسے بتایا تھا۔ فراغت کے لمحے پا کر اس نے عمان کے اسٹوڈیو فون کرنے کا سوچا تھا۔ دوسری طرف عمان ہی نے فون اٹھایا تھا۔

''ہیلو بی وزیر اعظم صاحبہ...... مانا کہ تم بے حد مصروف خاتون ہو مگر کچھ وقت دوستوں کے لیے بھی ہونا چاہیے۔''

''نہیں عمان، یہ بات نہیں ہے۔'' وہ ہنسی...... ''ویسے میں تمہیں ایک دم بہت یاد نہیں آ گئی۔''

''جی ہاں، تین کالز کی ہیں میں نے...... گھر سے پتا چلتا ہے اسپتال میں ہیں، اسپتال سے معلوم ہوتا ہے کہ مصروف ہیں۔ دراصل میرے پاس تمہارے لیے ایک خبر بھی ہے اور کچھ مشورہ بھی کرنا ہے۔''

''کیسی خبر...... اور کیسا مشورہ......؟ بتاؤ ناں؟''

''اس وقت کچھ نہیں بتا سکتا، شام کو گھر آؤں گا اگر ممکن ہو تو کچھ وقت دے دینا۔ یا ڈائری دیکھ کر بتاؤ گی۔'' وہ مکمل طنز کے موڈ میں تھا۔

''ٹھیک ہے بابا، میں انتظار کروں گی۔'' وہ ہنسی...... شام تک عمان احمد سے ملنے والی خبر کے اشتیاق نے اسے تھوڑا سا اپ سیٹ رکھا تھا۔ کبھی اس اجنبی شہباز کا خیال آتا کبھی کچھ اور عمان بھی کچھ تاخیر سے پہنچا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا کہ خدا جانے آپ موجود ہوں گی یا نہیں......'' وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''بیٹھیں اور پلیز مجھے خبر سنائیں کب سے انتظار میں گھل رہی ہوں۔'' وہ چائے کا کپ دیتے ہوئے بولی۔

''ہاں خبر بھی دوں گا۔ مشورہ بھی لوں گا اور...... مدد بھی مانگوں گا۔ یار ایک بات بتاؤ...... کیا واقعی محبت سب کو احمق بنا دیتی ہے۔ کم از کم میرے معاملے میں تو ایسا ہی ہوا۔'' وہ سر جھکا کر بولا۔

''اوہ...... تو یہ بات ہے جناب......'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔ ''آپ کو محبت ہو گئی ہے۔ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ ایسا کون سا چہرہ ہے جس نے آپ کی زندگی میں رنگ بھر دیے ہیں۔''

''تمہیں معلوم ہے ناں، میں اٹلی گیا ہوا تھا۔ وہیں سارہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ بہت اچھی پینٹر ہے۔ اس کے پاپا پاکستانی تھے جبکہ ممی اٹالین...... اب تو دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی خالہ کے ساتھ رہتی ہے اور آج کل پاکستان آئی ہے۔ عانیہ سچ بتا رہا ہوں وہ بہت پیاری ہے۔''

''پیاری...... یعنی آپ بھی وہی عام سے آدمی نکلے...... صورت کے پجاری......''

''صورت کی بات نہیں اور تم نے وہ نہیں سنا کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ مجھے تو شاید اس کی برائیاں بھی خوبیاں لگتی ہوں۔ تم اس سے ملنا تو تم اسے ضرور پسند کرو گی۔''

''اور وہ آپ کو پسند کرتی ہے؟''

''ہاں، ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور میرے کہنے پر ہی وہ پاکستان آئی ہے۔''

''تو پھر دیر کیا ہے، آنٹی سے بات کی کیا؟''

''یہی تو مسئلہ ہے، بات کی تھی اور توقع کے بالکل برخلاف ممی نے پرانی فلموں والی ماں کی طرح بڑے ہی آمرانہ انداز میں یہ اعلان کر دیا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی اور وجہ یہ بتائی کہ وہ کبھی میرے کسی معاملے میں نہیں بولیں لیکن میری شادی ان ہی کی مرضی سے ہوگی۔ اور یوں میرا آج کل بسیرا اسٹوڈیو میں ہی ہے۔''

''تم نے شہباز سے بات کی۔''

''نہیں، اب تک تو نہیں کی۔ وہ کافی عرصے سے زمینوں پر ہے اور پتا نہیں پچھلے کئی مہینوں سے اسے کیا ہو گیا ہے، ہنستا ہے نہ بولتا ہے۔''

''میں آنٹی سے بات کروں؟'' عانیہ بولی۔

''ہاں، وہ تمہاری بات مانتی ہیں اگر تم منا سکو تو یہ میرے لیے بہت بڑی بات ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، میں انہیں منانے کی کوشش کروں گی مگر تم مجھے سارہ سے کب ملوا رہے ہو۔''

''جب تم کہو......'' عمان احمد ہنس دیا۔ ''دراصل سب سے بڑا مسئلہ سارہ کی شہریت کا بھی ہے۔ وہ یہاں ایک خاص مدت سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے فیصلہ جلد کرنا ہے اور میری خواہش ہے کہ ممی کی مرضی سے سب کچھ ہو۔''

☆☆☆

اگلے دو ہفتے بے حد معروف گزرے تھے۔ آنٹی اس معاملے میں کچھ سننے کو تیار نہیں تھیں۔ مگر عانیہ نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ انہیں منا کر چھوڑے گی۔ وہ کبھی اپنی خواہشات کا حوالہ دیتیں تو کبھی اپنے حق کا...... اور عانیہ انہیں دلائل کی روشنی میں حقیقت کی دنیا میں لے جانا چاہتی تھی۔ اور بالکل آخری لمحے پر جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ انہیں کبھی تیار نہیں کر پائے گی وہ یکا یک مان گئی تھیں۔ اس خبر پر جتنے عمان احمد اور سارہ خوش تھے عانیہ بھی اسی قدر مسرور تھی۔ سارہ کے قیام کی مدت ختم ہونے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا اسی لیے اس ہفتے میں ہی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ سارہ کو عانیہ اپنے گھر لے آئی تھی اور عمان سے اس کا باقاعدہ پردہ کروا دیا گیا تھا۔ شہباز کو بھی بلوایا گیا تھا۔ عانیہ باقاعدہ تمام رسمیں کرنا چاہتی تھی اور یوں ایک دم معروفیات کا گراف آسمان تک جا پہنچا تھا۔

اس وقت بھی وہ شاپنگ کر کے واپس آئی تھی کہ امی نے اسے بتایا کہ شہباز احمد کافی دیر سے اس کا انتظار کر رہا ہے۔ چند لمحے وہ خاموشی سے زمین کو تکتی رہی۔ شہباز سے سامنا ہونے کا لمحہ یقیناً آنا تھا۔ وہ خود بھی یہ جانتی تھی مگر پتا نہیں کیوں اسی لمحے سے وہ گریزاں بھی تھی۔ بہت سے سوال اس کے دل میں مچل رہے تھے مگر جوابوں کے ڈنک سے بچنے کے لیے وہ انہیں نظر انداز کر رہی تھی۔ شہباز اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ گزرے دنوں نے اس کی آنکھوں کے گرد حلقے سے بنا کر اپنا نشان چھوڑا تھا۔ مگر اس کے علاوہ ایک اور تبدیلی جس نے عانیہ کو متحیر کر دیا تھا وہ اس کی آنکھوں کا موسم تھا جس میں محبت کے رنگ کھلے ہوئے تھے مگر وہ خوب جانتی تھی کہ یہ موسم بے اعتبار سے ہیں۔

''بیٹھیے شہباز صاحب......! کیسے ہیں؟ کب پہنچے اور سب خیریت ہے ناں؟''

''اتنے بہت سے سوالوں کا جواب مجھے تن تنہا ہی دینا ہے بہر طور خاصا ٹھیک ہوں۔ کل پہنچا ہوں اور سب خیریت ہے، آپ کیسی ہیں، جب سے آیا ہوں آپ کے قصیدے سن رہا ہوں۔ بقول عمان آپ ایک ایسی مسیحا ہیں جو ہر غم دور کر دیتا ہے۔ یہ سب سنا تو سوچا کہ آج اپنے دل کا سپنا بھی آپ کو دکھا دوں۔ شاید آپ منزل کا پتا مجھے بھی دے سکیں۔ شاید میرے درد کی دوا آپ کے پاس ہو...... ورنہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ابنِ مریم ہوا کرے کوئی؟''

''آپ کس لیے پریشان ہیں؟'' وہ رک، رک کر بولی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اب وقت کا ظالم لمحہ کوئی ایسی بات اس کے کان میں نہ گھول دے کہ دل دھڑکنا ہی بھول جائے۔

''میں صرف پریشان ہی نہیں پشیمان بھی ہوں۔ بیتے لمحوں سے بھی شرمندہ ہوں کہ انہیں میں نے سنگ،

سلگ کر ضائع کر دیا ہے۔ کبھی آپ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جو منزل تک پہنچ بھی گیا ہو۔ جسے یہ علم بھی ہو کہ اس کی منزل سامنے ہے اور پھر وہ بدگمانیوں کی دھند میں پھنس جائے۔ ایسے میں اپنا آپ ہی نہیں پوری زندگی بے معنی نظر آنے لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمام خوب صورت مناظر کو آگ لگا دی جائے۔''

''آپ کو کیا ہو گیا ہے شہباز صاحب؟'' عانیہ حیرت سے بولی۔

''عانیہ! مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ سے ناراض بھی ہوں گی۔ شاید بدگمان بھی...... مگر میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں، کیا آپ میرے ساتھ چلیں گی۔''

''کہاں؟''

''گھر تک...... ہمارے گھر تک۔''

''مگر شہباز صاحب......''

''پلیز عانیہ......! یہ میری درخواست ہے۔''

عانیہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ بہر طور ممی سے کہہ کر وہ اس کے ساتھ باہر نکلی۔ شہباز احمد تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔

''ممی اور عمان زیورات کے سلسلے میں بازار گئے ہیں۔''

''آپ مجھے کیا دکھانا چاہتے ہیں۔'' وہ کچھ خفا سی ہو کر بولی۔

''آپ آئیں تو......'' وہ اسے اپنے کمرے تک لے کر آیا اندر داخل ہو کر اس نے ایک دیوار سے پردہ سرکا دیا...... اس دیوار پر عانیہ کا وہی پورٹریٹ لگا ہوا تھا جو عمان احمد نے بنایا تھا، وہ پورٹریٹ دوسرے روز ہی کسی فن پرست نے مہنگے داموں خرید لیا تھا۔

''یہ آپ کے پاس کہاں سے آئی؟''

''نمائش سے......''

''آپ نے اسے کیوں خریدا تھا؟''

''کیا اب بھی آپ کچھ نہیں سمجھیں...... عانیہ اب آپ مجھے جتنا بھی برا آدمی سمجھیں مگر میں نے جس روز پہلی بار آپ کو دیکھا تھا اسی روز جان لیا تھا کہ یہ میری منزل ہے مگر پھر مجھے یہ گمان گزرا کہ شاید آپ اور عمان......''

عانیہ نے ایک دم سر اٹھا کر اسے گھورا۔

''میں یہی سمجھتا رہا...... مگر مجھے اس بات پر بھی یقین نہیں تھا۔ میں اپنے آپ کو سمجھاتا تھا کہ اگر ایسا ہے بھی تو مجھے یہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ مگر یقین کریں عانیہ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر تھا۔ شاید محبت بے حد پوزیسو ہو جانے کا نام ہے۔ عانیہ مجھے معلوم ہے کہ یہ سب کچھ یک طرفہ نہیں تھا۔ میں نے آپ کی آنکھوں میں جھانکتے جذبے بھی دیکھے تھے اور شاید اسی وجہ سے میں دو متضاد سوچوں میں گھر گیا تھا۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

عانیہ حیرت اور غصے کی لپیٹ میں تھی۔ اب اسے شہباز احمد کے بہت سے سمجھ میں نہ آنے والے رویوں کا سراغ مل رہا تھا اور وہ اسے مسلسل دیکھ رہی تھی۔

''عانیہ......! پلیز اگر آپ کو مجھ پر غصہ آ رہا ہے تو بھی کچھ بولیں۔''

''کہنے کو بہت کچھ جی چاہ رہا ہے شہباز صاحب......! عمان نے مجھ سے ایک بار پوچھا تھا کہ محبت آدمی کو احمق کیوں بنا دیتی ہے مگر آج ایسا لگ رہا ہے کہ محبت آدمی کو کمزور بھی بنا دیتی ہے۔ اصولاً تو مجھے آپ کو بہت کچھ کہنا چاہیے مگر میں کہوں گی وہی جو اس وقت میرے دل میں ہے۔''

''عانیہ! میں نے اپنی محبتوں اور بدگمانیوں کے تمام راز آپ پر آشکار کر دیے ہیں۔ آپ کی ہر بات میرے لیے قابلِ قبول ہے مگر......''

وہ خاموش ہو گیا...... اس کی پریشانی اس کے چہرے اور آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔

''میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں شہباز صاحب کہ آپ نے محبت اور بدگمانی کو ایک بنا دیا جبکہ کسی نے کہا ہے کہ محبت تو سدا کی خوش گماں ہے۔'' وہ مسکرائی...... شہباز احمد اس کی جانب دیکھتے رہے اور پھر چند لمحوں بعد اس کی زندہ ہنسی نے خاموش کمرے کو بھر دیا۔

نیگ

ہاجرہ ریحان



میں جاگ گئی تھی، اچانک صرف ایک سوال پر...... صدیوں سے بند آنکھیں کھل گئیں بس ایک خواہش پر...... ایک طلب کی تکمیل پر...... میں نے حیرت سے اپنے اردگرد دیکھا...... میں کہاں تھی۔ اب تک جو میں تھی تو کیا واقعی میں ہی تھی یا پھر مجھ سا کوئی تھا۔ دنیا نئی سی لگنے لگی اور کچھ عجیب بھی...... واقعی کبھی، کبھی کوئی واقعہ، کوئی لمحہ انسان کو ایسے ہی جگا دیتا ہے۔

اس نے پانچ ہزار کا نوٹ برگر والے کو پکڑایا تھا جو اس ٹھیلے والے نے لے کر وہیں اپنے ٹھیلے میں چھولوں کی بڑی سی ٹرے کے پاس رکھ دیا تھا۔

یہاں تک تو یاد ہے مجھے...... اس کے بعد میری نیند کا عالم شروع ہو گیا۔ مجھے لگا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ ٹھیلے والے نے اس کا گریبان پکڑ رکھا تھا۔ اردگرد کے ٹھیلوں پر کام کرنے والے اور کچھ بیرے اس کو گھیر چکے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے ہی اوجھل ہو گئے کہ ان کے گرد لوگوں کا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ منی رکشے میں بیٹھی بیٹھی رونے لگی اور میں...... میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے...... یہ کس کو چور بنا کر پیٹا جا رہا ہے...... میں تقریباً چھلانگ لگا کر رکشے سے باہر کودی اور بھاگنے لگی۔ پہلے میں نے ہجوم کی طرف دوڑ لگائی پھر آدھے راستے سے واپس آ کر منی کو دلاسا دیا جو میری پیروی میں میرے پیچھے آنے کو تھی۔

''میرے پاس وقت نہیں ہے منی، سمجھداری سے بیٹھو۔'' میں نے اسے تنبیہہ کی، وہ سہم کر اپنے ننھے ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر بیٹھ گئی جیسے وہ ہمیشہ ڈراؤنی فلم کے دوران کرتی تھی...... میں ہجوم میں گھستی چلی گئی...... اس رش میں جس میں اب اضافہ ہو چکا تھا، وہ

بری طرح سے پٹ چکا تھا...... خون کے چھینٹے اُڑ اُڑ کر ہجوم کو پاک کر رہے تھے۔ سب اپنا، اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔ میرا ارادہ تو کچھ اور تھا مگر میری آواز سننے کا ہوش مجھے خود بھی نہیں تھا۔ میں اس پر بے دھڑک گر پڑی...... اور اس کے خون بھرے وجود کو سمیٹ لیا۔

''پیچھے ہٹو سب...... چھوڑ دو...... پیچھے ہٹو۔'' میری چیخ نکلی اور پھر نکلتی ہی چلی گئی۔ ہجوم میں موجود لوگ بھی کسی نیند سے جاگے اور ہم دونوں جو سمٹ گئے تھے اپنے اردگرد کچھ ہوا محسوس کرنے لگے...... میں نے سر اٹھا کر دیکھا...... ''ٹھیلے والا؟'' نہیں کوئی اس کے جیسا ہی تھا...... اس کی آنکھوں میں حیرت تھی وہ اپنے خون بھرے ہاتھ اپنے ایپرن پر ملتا دور ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ سب کے سب اپنے کاموں میں ایسے جت گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''کیا واقعی تم نے پانچ ہزار چرائے ہیں؟'' میں نے کپکپاتی آواز میں دھیمے سے اس سے پوچھا۔ میرے اندر سمائے خون سے بھرے ہوئے وجود سے ایک ہاتھ کانپتا ہوا سا باہر نکلا...... مڑا تڑا سا پانچ ہزار کا نوٹ...... جس سے خون ٹپ، ٹپ بہہ رہا تھا اور وہ خود ایک بڑا اچھا سا جملہ ہے جو ہم ایسے وقتوں پر سُن سُن کر پکے ہو گئے ہیں۔

''وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔''

اور میں یکسر بدل گئی...... کام تو پہلے بھی کرتی تھی مگر اچانک مجھے لگا کہ جیسے میں عورت نہیں رہی۔ مرد بن گئی ہوں اور تھوڑے ہی دنوں میں میری داڑھی مونچھیں بھی نکل آئیں...... میں انتھک محنت پہلے بھی کرتی تھی مگر اب میرے سر پر کسی مرد کا سایہ نہیں تھا...... اکیلی عورت ایک ننھی سی بچی کے ساتھ بس پر سوار ہو تو ڈرائیور گھٹیا ترین گانے زور شور سے چلانے لگتا ہے...... کنڈیکٹر بھی کچھ کم خباثت کا مظاہرہ نہیں کرتا...... ان دونوں سے بچیں تو مرد سواریاں...... فیکٹری میں فورمین صاحب کی دھمکیاں...... لالچ...... ضد...... کہاں تک خود کو بچاتی۔ کب نہ کب میرے اندر کی عورت سو گئی...... دن...... سال...... عید...... بقر عید...... سب گزرنے لگے اور میں عالم خواب میں جینے لگی۔

☆☆☆

''خون صرف رشتے دار ہی رشتے دار کو دے سکتے ہیں۔'' نرس کا جملہ سن کر میں پیچھے ہٹ گئی تھی مگر وہ آگے بڑھ کر جلدی سے بولا۔

''ارے تو ہیں ناں ہم رشتے دار ہی تو ہیں...... کیوں آپا؟ یہ میری رشتے کی بہن ہی تو ہیں میری آپا...... بس آپ جلدی سے خون لیں۔''

نرس نے حیرت سے میری اور اس کی شکل صورت، کپڑوں کو بغور دیکھا تھا...... زمین آسمان کا فرق تھا جو وہ میرے ساتھ بے تکلفی دکھا کر ختم کرنا چاہتا تھا۔ میں رات کی ڈیوٹی کر کے واپس جا رہی تھی...... رات میں بڑے بس اسٹاپ تک پیدل جانا پڑتا تھا اور راستے میں وہ سرکاری اسپتال پڑتا تھا اس نے مجھ سے التجا کی تھی کہ اس کا دوست روڈ حادثے کا شکار ہو کر خون کی طلب میں ہے اس کی آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں سے متاثر ہو کر میں خون دینے کے لیے راضی ہو گئی...... اسپتال جا کر پتا چلا...... کیونکہ غربت سے تنگ آ کر لوگ اپنا خون بھی بیچنے لگے ہیں اس لیے اسپتال میں خون دینے والوں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی...... نرس نے.... بادل ناخواستہ مجھ سے گروپ پوچھا اور وہ بیچ میں کود پڑا۔

''آپا آپ کو پتا ہے نہ کہ بلڈ گروپ کس کو کہتے ہیں؟'' میں مسکرا اٹھی۔ نرس چند ایک معمول کے سوالات کر کے مجھے وارڈ میں لے گئی...... میں خون دے کر باہر آئی تو وہ جوس کی بوتل لیے کھڑا تھا...... جوس لیتے ہوئے دیکھا کہ اس کا دوسرا ہاتھ مٹھی کی صورت کانپتا ہوا سا میرے سامنے آیا...... مڑا تڑا سا پانچ ہزار کا نوٹ تھا...... میں جو اب تک سُڑ سُڑ کر کے نلکی سے جوس پینے میں مشغول ہو چکی تھی گڑبڑا گئی پھر مجھے اس کی کم عمری کا خیال آ گیا...... اور اپنی کمتری کا بھی مگر سویا ہوا انسان دوبارہ نہیں سو سکتا۔ اسے دوبارہ نیند میں

غزل

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا
ہم تو سمجھے تھے کہ اِک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگِ جاں میں اتر جائے گا
وہ ہواؤں کی طرح خانہ بجاں پھرتا ہے
ایک جھونکا ہے جو آئے گا، گزر جائے گا
وہ جب آئے گا تو پھر اس کی رفاقت کے لیے
موسمِ گل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا
آخرش وہ بھی کہیں ریت پہ بیٹھی ہو گی
تیرا یہ پیار بھی دریا ہے، اتر جائے گا
مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث
جرم یہ بھی مرے اجداد کے سر جائے گا

انتخاب: پروین شاکر کی خوشبو سے
مرسلہ: رفعت مبین رنی، یو ایس اے

جانے کے لیے پہلے جاگنا پڑے گا۔ میں نے اس کی بغل میں دبے اپنے گھسے ہوئے پرانے سے پرس کو چھینا اور اسپتال سے تیزی سے باہر آ گئی۔ اس نے میرا پیچھا نہیں کیا۔ مگر اکثر رات کی ڈیوٹی کے بعد جب میں واپس جارہی ہوتی تو وہ مجھے ویسے ہی اسپتال کے باہر ٹہلتا ہوا ملتا۔ بات چیت کی نوبت میں آنے نہیں دیتی تھی مگر مجھے اس کی ستی ہوئی صورت دیکھ کر بڑا مزہ آتا۔ یہ نازک مزاج امیر لڑکے...... ذرا سی محنت کر کے کیسے مرجھا جاتے ہیں۔

☆☆☆

عید کے دن قریب تھے۔ ہر طرف جہاں رمضان کی رونق تھی وہاں عید کی تیاریاں بھی عروج پر تھیں۔ میں نے تینوں شفٹوں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ننھی ننھی خواہشات...... مالک مکان کی بیٹی کی شادی...... اس کو تین مہینے کا کرایہ ایک ساتھ چاہیے تھا۔ شفٹ پوری کرے سنسان راستے پر چلتی جارہی تھی کہ وہ اسی طرح اسپتال کے باہر کھڑا ملا۔ میں کترا کر نکل جاتی مگر آج وہ راستہ روک چکا تھا۔ میں نے سوچا آج اس کا دماغ ٹھکانے لگا ہی دیتی ہوں۔ اس نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے ہوئے تھے، مجھے رکتے دیکھ کر وہ گویا ہوا۔

”آپا...... وہ کیا ہے کہ عید کے دن قریب ہیں ناں تو...... آپ کی ضرورت کے خیال سے میں ایک دفعہ پھر سے......“

اس کی کپکپاتی ہوئی سی آواز سنائی دی اور مجھے غصہ آ گیا۔

”تو خود کو سمجھتا کیا ہے بہت پیسہ ہے تیرے پاس...... غریب کے خون کی قیمت لگا رہا ہے...... ہم غریب کسی پر احسان نہیں کر سکتے...... اور اگر کبھی کوئی احسان تم لوگوں پر ہو بھی جائے تو اسے خریدنے کی کوشش کرتے ہو......؟“

میں ان ہی جملوں میں سے کچھ اس پر برسانے والی تھی کہ اس کا کانپتا ہوا سا ہاتھ جیب سے باہر نکلا...... اور دوسرے ہی لمحے دوسرا ہاتھ بھی میری نظروں میں آ گیا...... میں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی...... کسی نے جھنجوڑ کر مجھے جگا دیا تھا...... میں نے خود کا جائزہ لیا...... کیا واقعی یہ میں ہوں...... یا مجھ سا کوئی ہے...... میں جاگی ہوئی تھی یا اب سوگئی ہوں...... میں کیا ہوں؟ کہاں ہوں؟ پہلی دفعہ کسی نے میری طلب کو پہچانا تھا مگر کچھ یوں کہ مجھے خود بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مہندی کا پیکٹ تھا اور ایک میں رنگ برنگی چوڑیوں کا چھوٹا سا بنڈل...... اور میری آنکھوں میں وہی آنسو تھے جو ہر بہن کی آنکھوں سے اس وقت ابل پڑتے ہیں جب کوئی بھی بھائی اپنی بہن کو یہ نیگ دیا کرتا ہے۔

اے عشق ترے ہیں کھیل عجب

ڈرِ ثمن بلال

وہ کمال ہنر یوں بھی کرتا گیا
زخم دیتا گیا زخم بھرتا گیا
دور اُس کی نگاہوں سے منزل ہوئی
جادۂ عشق میں جو بھی ڈرتا گیا
رات پھولوں پہ شبنم برستی رہی
رنگ پھولوں کے رخ کا نکھرتا گیا

عشق، محبت، چاہت، پیار ایک جذبے کے کتنے اظہار ...یہ جذبہ ہر کسی کے دل میں پنپ سکتا ہے بشرطیکہ دل کا ظرف وسیع اور خلوص کے موتیوں سے مرصّع ہو، زیرِ نظر کہانی اسی جذبے کے اتار چڑھاؤ کو بے حد متاثر کن انداز میں قاری کو ایک نئی سوچ سے روشناس کراتے ہوئے بڑھتی ہے۔

عشق کے آفاقی جذبے کو ایک نئے انداز میں بیان کرتی دلکش تحریر





عنایہ بیڈ پر لیٹی زارون کو مسلسل کال کر رہی تھی۔ پچھلے کئی گھنٹے سے عنایہ کا زارون سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا' اس کا کوئی میسج بھی نہیں آیا تھا۔ زارون کا نمبر پچھلے کئی گھنٹے سے بند تھا۔ اسے رہ رہ کر زارون پر غصہ آ رہا تھا۔

''پتا نہیں کہاں ہے یہ...... کیوں فون بند کر رکھا ہے۔ اس سے پہلے تو اس نے ایسا کبھی نہیں کیا۔'' عنایہ غصے میں بڑبڑاتی جھنجلا کر موبائل بیڈ پر پھینک کر سامنے دیوار میں لگی ایل ای ڈی آن کر کے کوئی پروگرام دیکھنے لگی۔

اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔

''یس کم آن......'' عنایہ نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا۔

دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا تھا...... جس کے اندر داخل ہوتے ہی ایک مخصوص اور قیمتی پرفیوم اور تازہ پھولوں کی مہک نے کمرے کو معطر کر دیا تھا...... وہ جو عام سے حلیے میں پلازو پہ سلیولیس ٹاپ پہنے اوندھی لیٹی ٹی وی دیکھ رہی تھی، ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی...... قدموں کی چاپ قریب آ رہی تھی۔ عنایہ نے بے یقینی سے پلٹ کر دیکھا تو خوشی سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

"Oh God zaroon, you ? I can,t belive this....."

عنایہ بیڈ سے چھلانگ مار کر اتری اور خوشی سے بے ساختہ اور بے یقینی کے عالم میں زارون سے لپٹ گئی۔

"this is very pleasent surprise"

''خوب صورت لوگ ہی ایسے خوب صورت سرپرائز دیتے ہیں۔'' عنایہ کے لبوں سے بے ساختہ ادا ہونے والے جملے پہ زارون دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا اور اس نے دھیرے سے فلاور باسکٹ اس کی طرف بڑھائی۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا...... تم میرے سامنے ہو...... میرے پاس ہو۔'' عنایہ نے پھولوں کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے محبت سے کہا۔

''تو پھر بتاؤ مجھے...... کیسے یقین دلاؤں میں تمہیں کہ میں تمہارے سامنے ہوں، تمہارے پاس ہوں؟'' زارون نے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے عنایہ کو ایک بار پھر خود سے قریب کیا۔

عنایہ نے اس کے حصار سے نکلنے میں ہی عافیت جانی اور بڑھ کر سائیڈ ٹیبل پر فلاور باسکٹ رکھی۔

''تمہیں مجھے یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے...... آ گیا ہے یقین مجھے......'' عنایہ کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔

''لیکن میرا تو دل چاہ رہا ہے تمہیں یقین دلانے کو......'' وہ مسکراتا ہوا اس کے عقب میں اس کے بے حد قریب آ کھڑا ہوا...... اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

عنایہ بلش ہوئی۔

''اپنے دل کو سمجھاؤ...... ابھی ایسی فرمائش مت کرے۔'' اس نے پلٹ کر زارون کو دیکھا۔

زارون پینٹ کوٹ میں ملبوس سینے پر بازو لپیٹے اسے وارفتگی سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''یعنی اب میں اپنے دل کے بجائے تمہاری باتیں مانوں؟''

''ہاں، شادی تک تمہیں میری باتیں ماننی پڑیں گی......'' وہ مسکراتی ہوئی اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔

''اور شادی کے بعد......؟'' زارون نے اسے شانوں سے تھام کر خود سے اور قریب کیا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' عنایہ نے بلش ہوتے ہوئے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے پرے کیا اور اس کے قریب سے نکلنا چاہا۔ زارون نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

''مگر مجھے پتا ہے...... شادی کے بعد میں صرف اپنے دل کی سنوں گا...... صرف اپنے دل کی مانوں گا......''
زارون نے فیصلہ سناتے ہوئے محبت سے چور لہجے میں اسے کلائی سے پکڑ کر ایک بار پھر خود سے قریب کیا۔
''تمہارا دل بہت اسٹوپڈ ہے، مجھے پتا ہے وہ ہمیشہ غلط فرمائشیں ہی کرے گا۔'' عنایہ نے اس کی ٹائی کی ناٹ کو ڈھیلا کیا۔
''محبت کرنے والا دل اسٹوپڈ ہی ہوتا ہے...... ہے ناں؟'' زارون نے اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو پرے ہٹایا۔
''اچھا ناں...... اب بس بھی کرو......'' اب وہ اس کی قمیص کے بٹنوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کے لبوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔
''کیا بس کروں؟'' زارون آج اسے بھرپور تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔
''اسٹاپ اٹ زارون...... تم روز بروز کتنے بے شرم ہوتے جارہے ہو۔'' عنایہ نے اس کے کندھے پر مکا مارا...... انداز مصنوعی خفگی لیے ہوئے تھا۔
''اور مجھے بے شرم ہونے پر مجبور کون کرتا ہے؟ تم...... تمہاری محبت...... تمہارا حسن......'' زارون نے محبت بھرے لہجے میں بولتے ہوئے اس کی کلائی مروڑ کر خود سے قریب کرلیا تھا۔

☆☆☆

سارہ جب ہوش میں آئی تو...... سب کچھ ختم ہوچکا تھا، وہ اسجد کے بیڈ پر تھی اور اسجد اس کے قریب بیٹھا تھا۔ سارہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔
''سارہ میری جان! پلیز اس طرح سے مت روؤ......''
''کیسے نہ روؤں......؟ میری زندگی برباد ہوگئی اور تم کہہ رہے ہو کہ میں روؤں نہیں؟''
''پلیز جانِ اسجد...... محبت میں ایسی غلطیاں ہوجاتی ہیں۔'' اسجد نے پیار سے اسے چپ کرواتے ہوئے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹانے چاہے۔
''مت کرو مجھ سے بات...... تم نے میرا اعتبار توڑا ہے۔ میرا مان توڑا ہے۔ کچھ نہیں بچا میرے پاس...... میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل تک نہیں رہی۔'' وہ بری طرح سے رو رہی تھی۔
''کم آن سارہ پلیز میری جان...... جو ہونا تھا وہ ہوچکا...... ایسا ہوجاتا ہے پیار میں...... تم کیوں پریشان ہوتی ہو......؟ میں ایک ہفتے کے اندر، اندر امی کو تمہارے گھر رشتے کے لیے بھیجوں گا۔ پھر مہینے تک نکاح کر کے تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے پاس اس گھر میں لے آؤں گا۔ آئی پرامس میری جان۔'' اسجد اسے اپنے بازو کے حصار میں لے کر ایک بار پھر اسے مستقبل کے خواب دکھانے لگا تھا مگر وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آج اس نے اپنے باپ کی عزت کو اپنی نام نہاد محبت کی بھینٹ چڑھا دیا تھا، اسے مٹی میں رول دیا تھا۔ ان کی عزت کا جنازہ نکال دیا تھا...... اسے رونا چاہیے تھا اسے بین کرنے چاہیے تھے۔
''سارہ پلیز...... پلیز ہوش میں آؤ اس طرح تو تم بیمار پڑ جاؤ گی...... تمہارے گھر والوں کو شک ہوجائے گا...... اس طرح پرابلم ہوجائے گی تمہیں بھی اور مجھے بھی۔'' اسجد نے اسے سمجھاتے ہوئے سائڈ ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر اس کے لبوں سے لگایا۔
سارہ نے پانی کا گلاس پیچھے کردیا...... اس نے پانی نہیں پیا تھا۔ بس وہ روئے جارہی تھی۔
''دیکھو سارہ اگر تم ایسے ری ایکٹ کرو گی تو تمہارے گھر والوں کو شک ہوجائے گا...... اٹھو شاباش، اپنا حلیہ درست کرو...... میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیتا ہوں...... اور پلیز...... اس غلطی کا ذکر کبھی بھول کر بھی کسی سے نہ

کرنا...... میں اسی ہفتے امی کو تمہارے گھر بھیجوں گا...... پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' اسجد، سارہ کو تسلیاں دے رہا تھا، اسے سمجھا رہا تھا۔
مگر وہ چپ تھی...... البتہ اسجد کے سمجھانے پر وہ اٹھ گئی تھی...... اس نے اسی طرح خاموشی سے باتھ روم میں جا کر منہ دھویا، اپنے بال سمیٹے اور بیڈ سے نیچے لٹکتی چادر اٹھا کر اپنے سر پر لے لی تھی...... چادر لیتے ہوئے وہ ایک بار پھر رو پڑی تھی...... جیسے وہ چادر کا مذاق اڑا رہی ہو۔
اسجد اس کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر لے آیا تھا۔
جب وہ یہاں آئی تھی تو اس کے پاس دنیا کی سب سے قیمتی چیز موجود تھی مگر یہاں سے واپس جاتے ہوئے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔
اس سے محبت کرنے والے نے وہ قیمتی چیز ''لوٹ'' لی تھی، چھین لی تھی۔ اسے تہی داماں کر دیا تھا۔
اب وہ گھر کے مین گیٹ سے باہر نکل آئے تھے۔ اسجد نے گھر کو لاک لگایا اور بائیک اسٹارٹ کر دی...... سارہ خاموشی سے بائیک پر بیٹھ گئی۔ واپسی پر اس نے اپنے چہرے پر نقاب نہیں چڑھایا تھا۔ تمام راستے وہ بالکل خاموش رہی۔ بیس منٹ کے بعد بائیک سارہ کے گھر کے بجائے گلی کے قریب رک گئی تھی۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح بائیک سے اتر گئی۔
''سارہ پلیز...... پریشان نہیں ہونا......'' اسجد نے تسلی دی۔ مگر اس نے تو جیسے اسجد کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اسی طرح خاموشی سے مرے، مرے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ گئی تھی۔
جوں، جوں اس کے قدم گھر کی جانب اٹھ رہے تھے اس کا دل اسے ملامت کر رہا تھا۔ وہ کس منہ سے اپنے گھر جائے گی؟ وہ کیسے اپنے گھر والوں سے نظریں ملائے گی......؟ دماغ بار، بار اس سے سوال کر رہا تھا اور وہ اسجد کی دی ہوئی تسلیوں سے اپنے دل کو اپنے دماغ کو بہلا رہی تھی۔
اپنی گلی میں داخل ہوتے ہی اسے بہت سے لوگ اپنے گھر کے سامنے چٹائیاں بچھاتے نظر آئے تھے...... لاشعوری طور پر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، اس کے قدم تیز ہو گئے تھے...... جب وہ گھر کے قریب پہنچی تو اسے چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور یہ چیخیں تو اماں، زارا اور زویا کی تھیں۔ اس کے جسم سے جیسے کسی نے رہی سہی جان بھی نکال لی تھی۔ وہ حیرت کا بت بنی کانپتی ٹانگوں سے گھر کے اندر داخل ہوئی تو اس کے ارد گرد جھکڑ سے چلنے لگے۔ دماغ ماؤف ہونے لگا...... وہ پھٹی نگاہوں سے سامنے دیکھنے لگی۔ اس کے قدم گھر کی چوکھٹ پر جم گئے تھے۔ شاکر حسین کا مردہ وجود صحن کے بیچ رکھی چارپائی پر پڑا تھا...... سیما بیگم، زارا، نگہت بیگم اور زویا سب شاکر حسین کی چارپائی کے پاس بیٹھی زاروقطار رو رہی تھیں۔ زویا رو، رو کر نڈھال سی شاکر حسین کی چارپائی سے سر لگائے اب گم صم سی انہیں دیکھ رہی تھی۔
سارہ کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا...... اس کا جسم جیسے بے جان ہو گیا تھا۔ زارا روتی ہوئی دروازے میں کھڑی سارہ کی طرف لپکی۔
''سارہ...... ابا چلے گئے...... ہم بے آسرا ہو گئے سارہ...... ابا چلے گئے...... ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔''
زارا کی چیخ و پکار سن کر خضر باہر سے اندر آیا...... مگر اگلے ہی لمحے سارہ چکرا کر فرش پر گر چکی تھی۔ کئی عورتیں دوڑ کر اس کی طرف آئیں۔
''پانی لاؤ...... سارہ بے ہوش ہو گئی ہے...... جلدی کرو۔'' خضر نے اپنی چھوٹی بہن کو عجلت میں آواز دی۔

☆☆☆

زارون کے آتے ہی عنایہ اور وہ شاپنگ میں مصروف ہو گئے تھے۔ interior designer زارون کے بیڈروم کو اس کی شادی کے حوالے سے نیو فرنیچر، پردوں اور نیو کلر اسکیم سے مزید شاندار بنانے میں مصروف ہو چکا تھا۔

ان دونوں کی شادی کے تینوں فنکشنز کے لیے پی سی ہوٹل میں بکنگ کروادی گئی تھی۔ شادی کی مووی شوٹ کرنے کے لیے ملک کے مشہور مووی میکر "معاذ اسٹوڈیو" والوں سے رابطہ کرلیا گیا تھا۔ سب تقریبات کے لیے تمام گھر والوں کے ڈریسز مشہور ڈیزائنرز سے تیار کروائے جا رہے تھے۔

بلاشبہ زارون اور عنایہ کی ہونے والی شادی بڑی اور یادگار شادیوں میں شمار ہونے والی تھی، نور منزل میں نیو جنریشن میں ہونے والی اس پہلی شادی کو لے کر سب گھر والے بہت پُرجوش اور خوش دکھائی دے رہے تھے۔ بس اب اقصم کی آمد کا انتظار تھا...... اس کے اینول ایگزامز ہو رہے تھے...... دوسری طرف ایشال کا ہاتھ اب بالکل ٹھیک ہو چکا تھا...... کچھ دن کے بعد وہ باقاعدگی سے ڈاکٹر عمر کے ساتھ اسپتال جانے لگی تھی۔

پہلے وہ مجبوراً جاتی تھی۔ اب وہ شوق سے جانے لگی تھی۔ شاید یہی وہ سوچ تھی یا تبدیلی کہ وہ میڈیکل کے شعبے کو سیریس لینے لگی تھی اسے احساس ہونے لگا تھا کہ عام آدمی اور ڈاکٹرز کی زندگی میں کتنا فرق ہوتا ہے کہ ڈاکٹر کو کس قدر ذمے دار ہونا پڑتا ہے۔ انہیں کتنا اپنے پیشے سے مخلص ہونا چاہیے، اللہ کی ذات کے بعد مریض کے لواحقین ڈاکٹرز کی ذات پر کتنا یقین اور کتنی امید و آس رکھتے ہیں...... ان سب باتوں کا احساس اسے ڈاکٹر عمر کے ساتھ رہ کر ہوا تھا۔ موسم بدل رہا تھا اور بدلتے موسم میں سب سے زیادہ بچے ہی اثر انداز ہوتے ہیں سو آج اسپتال میں مریض بچوں کی تعداد بہت زیادہ تھی...... بچے زیادہ تر بخار، نزلہ، زکام جیسے وائرل انفیکشن میں مبتلا تھے۔ صبح سے مسلسل مریض بچوں کو چیک کرتے، کرتے اب ڈاکٹر عمر نے پندرہ منٹ کی ٹی بریک لی تھی۔

ڈاکٹر عمر اپنے اور ایشال کے لیے چائے بنانے لگے تو ایشال قریب کھڑی ہوگئی۔

"عمر بھائی آپ بیٹھیں، میں چائے بناتی ہوں۔" ایشال نے آفر کی۔

"نہیں، میں بنا لوں گا...... تمہارے کیے ہوئے کام بہت مہنگے پڑتے ہیں۔" ڈاکٹر عمر کی بات پر ایشال مسکرا دی۔

"ہاتھ جلانے کا مجھے ایک فائدہ تو ہوا کہ مجھے چائے بنانی آگئی...... لائیں میں بنا دیتی ہوں۔" ایشال نے ان کے ہاتھ سے کیتل لے لی۔ اور پھر حیرت انگیز طور پر اس نے کوئی نقصان کیے بغیر چائے بنا کر ڈاکٹر عمر کے سامنے رکھ دی...... اور خود بھی ان کے مقابل چیئر پر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر عمر نے مگ اٹھا کر لبوں سے لگایا اور ایک گھونٹ لیا۔

"good very nice trial"

"تھینکس......" ان کی تعریف پہ ایشال نے مسکراتے ہوئے اپنا مگ اٹھالیا۔ ڈاکٹر عمر نے چائے پیتے ہوئے لحظہ بھر اپنے سامنے بیٹھی ایشال کو دیکھا۔ وہ کچھ دنوں سے محسوس کر رہے تھے اب وہ پہلے والی نان سیریس سی ایشال نہیں رہی تھی...... وہ زیادہ تر خاموش رہتی...... اب ڈاکٹر عمر کو اسے کسی بات پر ٹوکنا بھی نہیں پڑتا تھا...... وہ گھر میں جیسا بھی لباس پہنتی تھی مگر اسپتال میں اب وہ مہذب لباس پہن کر آتی، اس کے کندھوں پر دوپٹا ہوتا...... اب وہ اسپتال میں صرف ٹائم گزارنے نہیں آتی تھی۔

آج وہ بے بی پنک کلر کی شلوار قمیص میں ملبوس تھی اس نے کندھوں پر وائٹ دوپٹا لے رکھا تھا۔ وہ ایشال کو بے ساختہ دیکھتے ہوئے دس سال پیچھے چلے گئے تھے۔

سبرینہ کا فیورٹ کلر یہی تھا اور وہ اکثر اس کلر کے ڈریسز پہن کر کالج آیا کرتی تھی۔ ڈاکٹر عمر کے یوں دیکھنے پر ایشال جھینپ سی گئی۔ اچانک انہوں نے گڑبڑا کر سر جھکا لیا تھا۔

☆☆☆

اقصم اینول ایگزام دے کر پاکستان آگیا تھا۔ اس کے گھر آتے ہی گھر میں مزید رونق ہوگئی تھی۔ نور منزل میں جیسے خوشیاں اتر آئی تھیں...... سمیرا بیگم نے بھی اپنی سوشل ایکٹویٹیز ترک کردی تھیں، اب ان کا وقت بھی زیادہ تر گھر میں ہی گزرتا تھا آج چونکہ سنڈے تھا سو سب گھر میں موجود تھے اور سب اکھٹے ناشتا کررہے تھے۔ پنّو اور اسلم انہیں ڈائننگ ٹیبل پر سرو کررہے تھے۔ اقصم کی آمد پر اسلم (بٹلر) نے آج خاص طور پر ناشتے میں اچھا خاصا اہتمام کررکھا تھا۔

''اسلم یار...... کمال کردیا ہے تم نے...... دو سال کے بعد اتنا شاندار اور پاکستان کا یہ روایتی سا ناشتا کررہا ہوں میں......'' اقصم نے نہاری کھاتے ہوئے تعریف کی۔

''شکریہ چھوٹے صاحب......'' اسلم اپنی تعریف پر مسکرایا۔

''چھوٹے صاحب میں نے آپ کے لیے حلوا پوری بھی بنائی ہے وہ بھی ٹرائی کریں۔''

''یار تم نے میرے ڈائٹ پلان کی ایسی کی تیسی پھیر دی ہے۔ میں نے انگلینڈ میں دو سال میں اتنا نہیں کھایا جتنا تم نے مجھے اس ایک ہفتے میں کھلا دیا ہے۔'' اقصم ڈائننگ ٹیبل پر موجود تمام ڈشز کو تھوڑا تھوڑا چکھ رہا تھا۔

''تو تھوڑا کھاؤ ناں...... زارون بھائی نے اپنی شادی پر موٹے لوگوں کا داخلہ ممنوع کررکھا ہے۔'' ایشال نے اسے چھیڑا۔

''فکر نہ کرو تم سے کم ہی کھاتا ہوں میں...... موٹی لڑکی......'' اقصم نے بھی حساب برابر کیا۔

''میں، میں تمہیں موٹی نظر آتی ہوں؟'' ایشال نے غصے سے اسے دیکھا۔ ان دونوں کی تکرار پر ڈائننگ ٹیبل پر موجود تمام افراد مسکرادیے...... ان دونوں کی نوک جھونک کوئی نئی بات ہرگز نہیں تھی، بچپن سے ہی اقصم اور ایشال کو ایک دوسرے سے خدا واسطے کا بیر تھا۔

''تو موٹے لوگ موٹے ہی نظر آتے ہیں بھئی۔'' اقصم نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ اک مدت سے وہ ایشو سے لڑنے کو ترس رہا تھا سو آج موقع ملا تھا اسے۔

''ہاں خود تو جیسے بڑے ہینڈسم ہوناں تم......'' ایشال کو غصہ آگیا۔

''ہاں وہ تو میں ہوں...... مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اقصم اترایا۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو...... یہ بتاؤ اب تک اپنے علاج سے کتنے مریضوں کو اوپر بھیج چکی ہو؟''

اقصم کی بات پر سب گھر والوں نے بہ مشکل اپنی ہنسی دبائی تھی...... مگر ایشال کا پارہ ہائی ہوگیا تھا۔

''بکواس مت کرو...... اللہ کا شکر ہے اب تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔''

''یہ تو عمر بھائی ہی بتائیں گے تم تھوڑی بتاؤ گی۔'' اقصم کو اسے زچ کرکے، اسے چھیڑ کر مزہ آیا کرتا تھا۔

''پوچھ لینا تم عمر بھائی سے...... اور کرلینا تم اپنی تسلی۔'' ایشال نے لٹھ مار جواب دیا...... نور منزل کے مکیں ان دونوں کی تکرار سے واقف تھے سو ایک عرصے کے بعد ان دونوں کی ہونے والی تکرار کو انجوائے کررہے تھے۔

''ویسے ایشو تمہیں انسانوں کا ڈاکٹر بننے کے بجائے جانوروں کا ڈاکٹر بننا چاہیے تھا۔''

''بڑے پاپا آپ سمجھالیں اپنے بیٹے کو...... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' ایشال نے اپنے سامنے بیٹھے کافی پیتے داؤد چوہدری کو مخاطب کیا۔

''اقصم بری بات بیٹا...... کیوں میری ایشو کو تنگ کر رہے ہو؟''
''پاپا میں تو اس موٹی کو مخلصانہ مشورہ دے رہا تھا۔''
''تم نے پھر مجھے موٹی کہا؟'' ایشال غصے میں اپنی چیئر سے اٹھی۔
''تو موٹی کو موٹی نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟'' اقصم ہنوز شرارت کے موڈ میں تھا۔
''کم آن ایشو...... اقصم تمہیں چھیڑ رہا ہے اور تم خواہ مخواہ سیریس ہو رہی ہو۔'' عنایہ نے براؤن بریڈ کھاتے ہوئے اسے سمجھایا۔
''عینی تم تو ہمیشہ اپنے دیور کی ہی سائڈ لیتی ہو۔'' ایشال نے منہ پھلایا۔
''اقصم مت تنگ کرو میری بہن کو۔'' زارون نے مسکراتے ہوئے اقصم کو سرزنش کی۔
''بھیا میں کہاں تنگ کر رہا ہوں، میں تو اسے حقیقت بتا رہا ہوں...... دو سال میں یہ کھا، کھا کر کتنی گول گپو سی ہو گئی ہے۔ میں تو اسے پہچان ہی نہیں پایا۔'' اقصم نے شرارت سے زارون کو آنکھ مار کر ایشال کو مزید غصہ دلایا۔
''دادو...... بڑی مما آپ دیکھ رہی ہیں، یہ آتے ہی میرے ساتھ پرانی دشمنی نکال کر بیٹھ گیا ہے۔'' وہ روہانسی ہوئی۔
''اقصم تم پٹو گے میرے ہاتھوں سے۔'' سمیرا بیگم نے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اقصم کو ڈپٹا۔
''مما مجھے کیا ضرورت ہے اس ''چڑیل'' سے دشمنی پالنے کی۔''
''پہلے تم نے مجھے موٹی کہا...... اور اب تم مجھے چڑیل کہہ رہے ہو؟ I will kill you'' ایشال غصے میں جارحانہ انداز میں اس کی طرف لپکی۔
اقصم نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔
''اللہ جانے یہ دونوں شادی کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ کیسے رہیں گے؟'' نور بیگم نے سر تھام لیا...... ایشال، اقصم کے پیچھے بھاگتے، بھاگتے لان میں پہنچ گئی تھی۔ ڈائننگ روم میں سب گلاس وال سے ان دونوں کو بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔
''اماں آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ آپ تو جانتی ہیں بچپن سے ہی یہ دونوں ایک دوسرے کو چڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے...... اس کے باوجود دونوں میں پیار بھی ہے اور دوستی بھی۔'' داؤد چوہدری نے گلاس وال سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے نور بیگم کو تسلی دی۔
''اور تھوڑی دیر کے بعد دیکھیے گا...... باہر سڑک پر یہ دونوں roller skates پہن کر اکھٹے اسکیٹنگ کرتے نظر آئیں گے۔'' زارون نے نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے اپنی رائے دی۔
''بھئی سمیرا تم آج کل میں اقصم سے ایشال کے سلسلے میں بات کرو...... اور عینی بیٹا، ایشال چونکہ تمہارے بہت قریب ہے تم اپنی طرف سے اس سے اقصم کے حوالے سے بات کرو، میں چاہتا ہوں جلد از جلد ان دونوں کو بھی منگنی کے بندھن میں باندھ دیا جائے تاکہ ان کی لڑائیوں سے ہمیں بھی چھٹکارا مل سکے۔'' آخری جملہ انہوں نے مسکراتے ہوئے ادا کیا تھا۔
''ڈونٹ وری بڑے پاپا میں ایشو سے بات کرلوں گی۔'' عنایہ نے جوس پیتے ہوئے انہیں مطمئن کیا۔

☆☆☆

لان میں مالی نے پانی کا پائپ لگا رکھا تھا۔ اور وہ پودوں کو پانی دے رہا تھا جب مسلسل اقصم کے پیچھے بھاگنے کے باوجود وہ ہاتھ نہ آیا تو ایشال نے مالی کے ہاتھ سے پائپ جھپٹ لیا۔ اور پائپ سے اقصم کو بھگونا

چاہا......مگر اقصم کمال پھرتی سے اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا البتہ گیٹ سے داخل ہو کر لان کی طرف آتے ڈاکٹر عمر ضرور بھیگ گئے تھے۔

قریب کھڑا اقصم اس دلچسپ صورت حال پہ ہنسنے لگا...... بالی بابا نے دوڑ کر پانی کا نل بند کر دیا تھا......مگر وہ بے یقینی سے اپنی جگہ پر یونہی پائپ پکڑے حیرت کا بت بنی کھڑی تھی۔

ڈاکٹر عمر بھیگے کپڑوں کے ساتھ ایشال کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے اسے سخت سست سنانے کے لیے آگے بڑھے تو ایشال پائپ وہیں پھینک کر سرپٹ اندر کی طرف بھاگی۔

''السلام علیکم......! عمر بھائی کیسے ہیں آپ؟'' اقصم نے آگے بڑھ کر ان سے سلام لیا۔

''وعلیکم السلام...... بھائی پانچ منٹ پہلے تو بالکل ٹھیک تھا مگر اب ٹھیک نہیں ہوں۔'' ڈاکٹر عمر نے اپنے بھیگے وجود کو دیکھتے ہوئے جھنجلا کر کہا تو اقصم قدرے شرمندگی سے سر کھجاتے ہوئے بولا۔

''سوری عمر بھائی، آپ کو تو پتا ہے ایشو ہمیشہ ایسے ہی الٹے سیدھے کام کرتی ہے۔ اینی ویز آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں اندر آئیں ناں؟''

''نہیں یار...... ان بھیگے کپڑوں میں اندر جا کر خود کا مذاق بنانے سے بہتر ہے میں واپس چلا جاؤں...... میں پھر آؤں گا...... میری گاڑی باہر کھڑی ہے، میں چلتا ہوں۔ مما تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں، فارغ ہو کر تم گھر کا چکر لگا لینا۔'' ڈاکٹر عمر کی بات پر وہ دھیرے سے مسکرا دیا...... ابھی وہ ایک دن پہلے ہی ساجدہ پھپھو اور مناب سے مل کر آیا تھا۔

''جی عمر بھائی...... میں تو آج کل فارغ ہی فارغ ہوں، میں شام کو چکر لگاؤں گا۔''

''اوکے پھر شام میں ملتے ہیں، میں اب چلتا ہوں۔'' ڈاکٹر عمر، اقصم سے ہاتھ ملا کر گیٹ کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

مناب آج کل ایک مشہور ٹی وی چینل کے لیے اسکرپٹ لکھ رہی تھی...... سو وہ بہت مصروف تھی...... گزشتہ دنوں ایک چینل پر اس کی لکھی ہوئی ٹیلی فلم نے بھی ڈراما انڈسٹری میں دھوم مچا دی تھی۔

مناب اپنے کمرے میں رائٹنگ ٹیبل پر جھکی بڑے انہماک سے اسکرپٹ لکھنے میں مصروف تھی کہ اچانک کچھ جانی پہچانی آوازوں نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ اگلے ہی لمحے اقصم مسکراتا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

''کیسی ہیں رائٹر صاحبہ......؟ اور کیا لکھا جا رہا ہے آج کل؟'' اقصم کا ایک ہاتھ اس کی چیئر پر تھا اور دوسرا اس کی رائٹنگ ٹیبل پر......

''ایک چینل کے لیے اسکرپٹ لکھ رہی ہوں، تم سناؤ کیسے ہو؟ اور کیسا لگ رہا ہے پاکستان آ کر؟'' مناب نے آنکھوں سے سائیڈ گلاسز اتار کر اقصم کو دیکھا۔

''ٹھیک ہوں...... اور آف کورس یہاں اپنے گھر، اپنے لوگوں میں آ کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' اقصم نے بغور مناب کا چہرہ دیکھا...... وہ تھوڑی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

''کوئی پریشانی ہے کیا؟''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''ہر وقت میرے دل میں رہتی ہو... میری آنکھوں میں سمائی رہتی ہو مجھے کیسے پتا نہیں چلے گا؟'' اس نے دل

میں سوچا۔
''بچپن سے آپ کو جانتا ہوں۔'' اقصم کا انداز جتانے والا تھا۔
''ہاں میں واقعی پریشان تھی۔'' مناب مسکرا دی۔
''مگر کیوں......؟''
''ولی...... زارون کی شادی پر نہیں آسکے گا...... اس کے بغیر سب کچھ ادھورا لگے گا مجھے۔'' بولتے، بولتے مناب کے لہجے میں اداسی اتر آئی تھی۔
''شکر ہے نہیں آرہا ہے ورنہ کباب میں ہڈی ضرور بنتا وہ۔'' اقصم کو یہ خبر سن کر ایک عجیب سی خوشی محسوس ہوئی تھی۔
''اوکے یار آپ اداس نہ ہوں، سیریسلی آپ اداسی میں بالکل بھی اچھی نہیں لگتی ہیں۔ چلیں اٹھیں، میرے لیے کافی بنائیں میں اسپیشلی آپ کے ہاتھ کی کافی پینے آیا ہوں۔'' اقصم نے اسے بازو سے پکڑ کر چیئر سے اٹھایا۔
''اچھا تو تم یہاں صرف اپنی من پسند کافی پینے آئے ہو؟ میں ایویں سمجھی تھی کہ تم مجھ سے اور مما سے ملنے آئے ہو۔''
''ملنے تو صرف آپ سے آتا ہوں، کافی کا صرف بہانہ بناتا ہوں۔'' اس کے دل نے دہائی دی مگر ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے دل کی آواز کو زبان تک آنے کی اجازت نہیں دی۔
''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے...... اتنا بے مروت نہیں ہوا میں...... ایشو اور میں دراصل آپ سے اور پھپو سے ملنے ہی آئے ہیں...... میں نے سوچا کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔'' اقصم مسکرایا۔
''چھوٹو...... تمہاری عادتیں کبھی نہیں بدلیں گی۔'' مناب مسکراتی ہوئی چیئر سے اٹھ کھڑی ہوئی...... جب وہ دونوں باتیں کرتے، کرتے کچن میں پہنچے تو ایشال اور ساجدہ بیگم پہلے سے کچن میں موجود تھیں۔
''ہائے مناب......! کیسی ہو؟'' ایشال بے اختیار آگے بڑھ کر مناب کے گلے لگی۔
''فائن یار...... اچھا کیا تم بھی چھوٹو کے ساتھ آ گئیں...... تم دونوں کے آنے سے ہمارے گھر کی خاموشی ٹوٹ جاتی ہے۔'' مناب کی بات پر ایشو دھیرے سے مسکرا دی اور ایشال شیلف پر رکھے ایک باؤل میں انڈے پھینٹنے لگی۔
اقصم یہ منظر دیکھ کر حیران ہوا۔
''ایشو یار جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کچن کا اور تمہارا تو دور دور تک کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا...... تمہیں تو چائے تک بنانی نہیں آتی تھی پھر یہ کایا پلٹ کیسی؟''
''ساری زندگی انسان ایک جیسا نہیں رہتا، ایک جیسی زندگی نہیں گزار سکتا...... کبھی کبھی وقت اتنی خاموشی سے انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے کہ اسے خود کو بھی علم نہیں ہوتا...... کہ وہ کب اور کیسے بدل گیا۔'' ایشال نے سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے سنک پر ہاتھ دھوئے اور فریج سے چکن رولز کی ٹرے نکالنے لگی۔
''یار ایشو تم تو مفکروں والے جملے بولنے لگی ہو۔'' مناب نے مسکراتے ہوئے کافی کے لیے دودھ ابلنے کو چولھے پر رکھا۔
''میری ایشو کو تم سب نے سمجھ کیا رکھا ہے بھئی......؟ میری بیٹی بہت سمجھدار ہے۔'' ساجدہ بیگم نے دہی بڑے بنا کر ڈونگا فریج میں رکھا...... اور پیار سے ایشال کو دیکھا۔
''ویسے ایشو بقول تمہارے...... تمہارا آدھا دن ایک ہٹلر ٹائپ شخص کے ساتھ گزرتا ہے اور باقی کا دن تم اس اسٹوپڈ علینہ کے ساتھ رہتی ہو...... پھر یہ سقراط، بقراط ٹائپ کی باتیں کس کی صحبت میں سیکھ رہی ہو؟'' اقصم ڈائننگ

چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گیا...... اس کے انداز میں شرارت تھی۔
"تمہاری طرح تمہارے سوال بھی فضول ہی ہوتے ہیں، اسی لیے فضول لوگوں کے فضول سوالوں کے جواب دینا فضول ہی سمجھتی ہوں میں۔" ایشال اب رول انڈے میں ڈپ کر کے فرائی کرنے لگی۔
"محترمہ میرا اکیڈمک ریکارڈ تم سے ہمیشہ شاندار رہا ہے...... بچپن سے لے کر اب تک ٹاپ کر رہا ہوں...... بڑی آئی خلیل جبران کی اسٹوڈنٹ......" اقصم کے انداز پر مناب مسکرا دی...... اور سب کے لیے کافی بنانے لگی۔ ساجدہ بیگم اب اقصم کے ساتھ دوسری ڈائننگ چیئر پر بیٹھ گئی تھیں۔
"توبہ...... تم دونوں کا بھی جواب نہیں...... ہر وقت ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہی رہتے ہو...... کیا بنے گا تم دونوں کا؟" ساجدہ بیگم پریشان ہوئیں۔
"پھپھو آپ پریشان نہ ہوں...... میں اس کی فضول باتوں کو سیریس ہی نہیں لیتی ہوں۔" ایشال نے رول فرائی کرنے کے بعد سنک پر ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔
"اور میں تو جیسے تمہاری باتوں کو اپنے دل پر لکھتا ہوں ناں...... دیوانہ ہوں تمہارا...... موٹی کہیں کی۔" اقصم نے اس کا مذاق اڑایا۔
"نان سینس...... چھوڑو...... اگر اب تم کچھ بولے ناں ایشو سے تو تمہاری خیر نہیں ہے۔" مناب نے مسکراتے ہوئے اقصم کو تنبیہ کی۔
"اپنی لاڈلی کو بھی سمجھالیں...... خواہ مخواہ الٹے سیدھے جواب دیتی ہے مجھے۔" اقصم نے اٹھ کر فریج کھولا...... اور پانی کی بوتل نکال کر پانی پیتے ہوئے دوبارہ اپنی چیئر پر آبیٹھا۔
پاکستان آتے ہی اس کے اندر کا وہ شرارتی سا اقصم زندہ ہو گیا تھا جسے ایشال سے خدا واسطے کا بیر تھا...... اور کچھ شاید وہ ولی کے پاکستان نہ آنے کی وجہ سے بھی خوش تھا۔
"ویسے پھپھو...... یہ نور منزل والے بہت بدذوق ہو گئے ہیں، اتنے عرصے بعد واپس آیا ہوں، ہم سب کو کہیں ناردن ایریاز وغیرہ جا کر کچھ ویکیشنز گزارنی چاہئیں...... کیا نہیں؟"
"بڑے پاپا نے تمہارے لیے اس saturday گھر میں اتنی شاندار پارٹی رکھی تو ہے۔" ایشال بھی ڈائننگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"اقصم بیٹا دراصل گھر میں عنایہ اور زارون کی شادی کی تیاریاں بھی تو ہو رہی ہیں، اس لیے آج کل سب مصروف ہیں۔" ساجدہ بیگم کی وضاحت پر اس نے سر ہلایا۔
"آئی نو پھپھو...... مگر زارون بھائی اور عنایہ بھابی کی شادی میں ابھی بیس دن باقی ہیں...... شادی کے بعد زارون بھائی تو دو مہینے کے لیے یورپ اپنے ہنی مون ٹرپ پر نکل جائیں گے اور میں پاپا کے ساتھ بزنس میں بزی ہو جاؤں گا۔"
"ویسے اقصم تمہارا آئیڈیا برا نہیں ہے...... اتنا عرصہ ہو گیا ہے ہمیں ویکیشنز کہیں باہر گزارے ہوئے۔" ایشال نے اقصم کے آئیڈیے پر خوشی کا اظہار کیا۔
"ایشو کیا خیال ہے، کیوں نہ پاپا سے دادو کی سفارش کروائی جائے؟" اقصم نے ایشال سے رائے لی تو ساجدہ بیگم مسکرا دیں۔
"بڑے شارپ ہو تم...... سفارش بھی ان سے کرواؤ گے جن کا حکم دادو بھائی کے لیے پتھر پہ لکیر کی طرح ہوتا ہے۔"

اس دوران مناب بھی سب کے لیے کافی بنا کر ڈائننگ ٹیبل پر لا چکی تھی اور خود بھی ایشو کے ساتھ چیئر پر بیٹھ گئی۔

''پھپھو یار سمجھا کریں ناں...... بچپن سے ہی دیکھتا آرہا ہوں میں...... جو کام پاپا ہمارے کہنے پر نہ کریں' وہ دادو کے ایک بار حکم کرنے پر فوری کر دیتے ہیں۔'' اقصم مسکرایا۔

''پھپھو آپ سب بھی ہمارے ساتھ ناردرن ایریا چلیں گے ناں۔'' ایشال نے ساجدہ بیگم کے ہاتھوں کو محبت سے اپنے ہاتھوں میں لیا۔

''بھئی میں تو آج کل ایک اسکرپٹ کے سلسلے میں بہت بزی ہوں...... میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاسکوں گی......'' مناب نے صاف انکار کیا۔

''ویسے مجھے پتا تھا کہ آپ کی طرف سے ایسا سڑا ہوا جواب ملے گا...... میں کچھ نہیں جانتا آپ ہمارے ساتھ جائیں گی۔'' اقصم نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''چھوٹو...... یہ کیسی دھونس ہے بھئی......؟'' مناب جھنجلائی۔ ''میں واقعی بہت مصروف ہوں۔''

''آپ تو چوبیس گھنٹے مصروف ہی رہتی ہیں۔''

''چھوٹو میں سچ کہہ رہی ہوں......اور ویسے بھی دو چار دن تک میں کراچی جارہی ہوں۔''

''مگر کیوں......؟''

''ٹی وی چینل والے میرے اسکرپٹ کے حوالے سے کچھ ڈسکس کرنا چاہ رہے ہیں مجھ سے۔''

''تو تم کتنے دن رہو گی وہاں اور کب جاؤ گی؟'' ایشال نے اس سے سوال کیا۔

''اسی ہفتے جانے کا ارادہ ہے یار...... بٹ ڈونٹ وری...... میرا ٹور وہاں دو چار دن کا ہی ہوگا۔'' مناب نے تفصیل بتائی۔

''آپ کا جو بھی ارادہ ہے، آپ کو جہاں بھی جانا ہے فی الحال آپ اپنے پروگرام کو ملتوی کریں...... میں کچھ نہیں جانتا بس آپ ہمارے ساتھ جائیں گی۔'' اقصم نے اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

''مما آپ دیکھ رہی ہیں' آپ کا بھتیجا کتنا دھونسو اور خودسر ہو رہا ہے......'' مناب نے مسکراتے ہوئے اس کا کان پکڑا۔

''بھئی میں کچھ نہیں کہہ سکتی...... یہ تم دونوں کا معاملہ ہے......'' ساجدہ بیگم مسکرائیں۔

''اُف کان تو چھوڑیں میرا۔'' اقصم مسکرایا...... وہ اپنی تمام باتیں مناب سے اسی طرح منوا لیا کرتا تھا...... صرف ایک بات ایسی تھی جو وہ منوا نہیں سکتا تھا۔

''اقصم ٹھیک کہہ رہا ہے مناب...... تمہارے بغیر ہمیں بالکل مزہ نہیں آئے گا۔ تم پلیز ہمارے ساتھ چلو......'' ایشال نے بھی اصرار کیا۔

''او کے بابا چلی جاؤں گی۔'' مناب نے برا سا منہ بنایا تو ایشال اور اقصم مسکرا دیے۔

''اور عمر بھائی......؟ وہ کیا ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟'' ایشال نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''عمر بھائی کو کہیں ساتھ لے جانے کے لیے فورس کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے اور میں اس اوکھے کام کے لیے ہامی نہیں بھر سکتا...... اس بار عمر بھائی کو ہمارے ساتھ جانے پر آپ آمادہ کریں گی۔'' اقصم، مناب سے مخاطب ہوا۔

''چھوٹو تم ہمیشہ مشکل سے مشکل کام مجھ سے کرواتے ہو۔'' مناب نے کافی پیتے ہوئے اسے گھورا۔
''عمر بھائی سے یاد آیا...... کافی دیر سے وہ دکھائی نہیں دیے؟ گھر پر ہیں یا کہیں گئے ہوئے ہیں؟'' اقصم نے جواب طلب نظروں سے ساجدہ بیگم اور مناب کو دیکھا۔
''اپنے کمرے میں ہوگا...... تم لوگوں کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہ اسلامک انسٹی ٹیوٹ سے آیا تھا، عمر ہر سنڈے کی شام وہاں جاتا ہے۔ اپنے کمرے میں آرام کر رہا ہوگا...... بلکہ ایشو بیٹا تم جا کر ذرا عمر کو بھی بلا آؤ...... وہ بھی ہمیں جوائن کرلے گا۔'' ساجدہ بیگم...... ایشال سے مخاطب ہوئیں۔
''او کے پھپھو......'' ایشال چیئر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

ایشال نے ڈاکٹر عمر کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ایشال نے دوسری بار اور پھر تیسری بار دستک دی تب بھی اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔
ایشال نے ڈرتے، ڈرتے ان کے کمرے کا ہلکا سا دروازہ کھولا اور دھیرے سے اندر جھانکا...... کمرے میں بیڈ کے دونوں سائیڈ ٹیبلو پر رکھے لیمپ روشن تھے۔ کمرا نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا...... اور ڈاکٹر عمر کمرے میں موجود نہیں تھے، واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی...... ایشال اب ان کے کمرے کے اندر آچکی تھی...... اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ ڈاکٹر عمر یقیناً شاور لے رہے تھے۔ اچانک ایشال کی نظر ڈاکٹر عمر کے بیڈ پر پڑی۔ بیڈ پر کچھ کارڈز رکھے تھے...... اور بیڈ پر ہی رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر ڈاکٹر عمر کے ساتھ کھڑی لڑکی کی تصویر نے ایشال کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی تھی۔ تصویر میں ڈاکٹر عمر کے ساتھ کھڑی لڑکی انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی جبکہ اس لڑکی کے بے حد قریب کھڑے ڈاکٹر عمر کے لبوں پر بھی بڑی دلفریب مسکراہٹ رقصاں تھی یقیناً وہ تصویر آٹھ دس سال پرانی تھی جب ڈاکٹر عمر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں اسٹوڈنٹ تھے۔
ایشال نے اس لڑکی کے صرف قصے ہی سن رکھے تھے مگر آج وہ پہلی بار اسے تصویر میں دیکھ رہی تھی بلاشبہ وہ بہت خوب صورت تھی۔
ایشال غیر ارادی طور پر متجسس انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی...... اور بیڈ پر بیٹھ کر کارڈز اٹھا کر دیکھنے لگی...... جو ہبرینہ نے مختلف مواقع پر ڈاکٹر عمر کو دیے تھے۔ ہر کارڈز پر مختلف محبت بھری تحریر رقم تھی۔
ایک کارڈز پر لکھی تحریر نے اسے متاثر کیا تھا...... وہ کارڈ ڈاکٹر عمر کی برتھ ڈے پر دیا گیا تھا۔

If you love something let it go...
If it comes back to you its yours,
If it doesn't it never was...

کارڈ ابھی ایشال کے ہاتھ میں تھا...... بیڈ پر کارڈز کے قریب ایک خوب صورت کرسٹل کا تاج محل رکھا تھا...... یقیناً یہ بھی کسی موقع پر اس لڑکی نے ہی ڈاکٹر عمر کو دیا تھا...... ایشال اب وہ تاج محل ہاتھوں میں لیے محویت سے دیکھنے میں گم تھی...... کہ اچانک واش روم کا دروازہ کھلا تھا اور ڈاکٹر عمر اپنی ہی دُھن میں ٹراؤزر پہنے بغیر شرٹ کے بالوں میں ٹاول رگڑتے کمرے میں آئے تو ایشال کو اپنی پرسنل ترین چیزیں دیکھتے ہوئے دیکھ کر بھونچکا رہ گئے...... شدید غصے اور حیرت نے ان کے تن بدن میں جیسے آگ لگا دی تھی...... دوسری طرف اپنے سامنے اپنی طرف غصے میں تن فن آتے ڈاکٹر عمر کو دیکھ کر وہ عجلت میں بیڈ سے اٹھی تھی۔ پریشانی اور گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ میں پکڑا تاج محل...... ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا...... جس کے نتیجے میں کرسٹل کے اس تاج محل کی کرچیاں فرش پر بکھر گئی تھیں۔

ڈاکٹر عمر نہایت غصے میں تاول گلے میں لٹکائے بغیر کسی شرٹ یا بنیان کے ایشال کے روبرو کھڑے ہو کر دھاڑے۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ تم یہاں میرے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟ تمہیں اجازت کس نے دی یہاں میری اجازت کے بغیر آنے کی؟"

"کک کچھ نہیں عمر...... بھائی...... مم...... میں تو بب...... بس آپ کو بلانے آئی تھی۔" ایشال نے مری ہوئی آواز میں بہ مشکل جملہ مکمل کیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

ڈاکٹر عمر نے غصے میں اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"میری اجازت کے بغیر میری پرسنل چیزیں دیکھنے کی تمہیں جرات کیسے ہوئی؟" وہ اس کے سامنے اس کے بے حد قریب کھڑے تھے...... ایشال انہیں بغیر شرٹ کے یوں اپنے مقابل کھڑے دیکھ کر نظریں جھکا گئی۔ ان کے ہاتھوں کی گرفت اس کے کاندھوں پر اتنی سخت تھی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"بولو...... جواب دو...... میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں؟"

"سس...... سوری......" ایشال کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"تمہارے ہر الٹے سیدھے کام پر تمہیں ہر بار معافی نہیں دی جا سکتی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم اب مہذب ہو گئی ہو، سمجھدار ہو گئی ہو...... مگر نہیں تم ہمیشہ سے نان سینس تھیں اور ہمیشہ رہو گی۔" ڈاکٹر عمر نے ایک جھٹکے سے اسے پیچھے کیا اور غصے میں بولتے وارڈروب کی طرف بڑھ گئے۔ انہیں شاید احساس ہو گیا تھا کہ کس کے سامنے کھڑے تھے۔

ایشال کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے اور وہ ان کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ قصور اس کا اپنا ہی تھا مگر

جانے کیوں اس کے دل کو آج عجیب طرح سے ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ ڈاکٹر عمر کے انداز پر...... ان کے لہجے سے ہرٹ ہوئی تھی۔

☆☆☆

شاکر حسین کو اس دنیا سے گئے ہوئے دس روز ہو چکے تھے...... ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ان کے دماغ میں کوئی اندرونی چوٹ آئی تھی، جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے...... ان کے جانے سے جیسے سب کچھ ہی ختم ہو گیا تھا۔

گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا، سیما بیگم عدت میں تھیں...... ساری زندگی انہوں نے شاکر حسین کی عزت اور قدر نہ کی تھی...... اور اب جب وہ اس دنیا سے جا چکے تھے تو سیما بیگم کو ایسے لگتا جیسے ان کے سر سے سائبان چھن گیا ہو۔

گلو مہینے بھر کا راشن ڈال کر سیما بیگم کو ایک موٹی سی رقم دے کر چلا گیا تھا۔

زارا کی اس بار اللہ نے سن لی تھی، تین بیٹیوں کے بعد باپ کے قل والے دن اس کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔ زارا کو خوشی ملی بھی تو باپ کے مرنے کے بعد...... سو زارا کے ہاں بیٹے کی پیدائش نے سب کو مطمئن ضرور کیا تھا مگر خوش نہیں...... کیونکہ گھر کا ماحول انتہائی سوگوار تھا...... زویا اور سارہ اب بھی شاک کی کیفیت میں تھیں...... زویا کے سامنے شاکر حسین نے جان دی تھی...... اس کے لبوں پر ایک چپ لگ گئی تھی۔ نہ وہ بولتی تھی نہ وہ کچھ کھاتی تھی...... نہ اسے کپڑے بدلنے کا ہوش تھا...... شاکر حسین کی موت، گلو کا جھوٹ اور اس امیرزادے کی بے رحمی نے اسے ذہنی طور پر اس قدر ڈسٹرب کر دیا تھا کہ وہ جہاں بیٹھتی، کئی کئی گھنٹے وہاں ہی بیٹھی رہتی......

خضر شام کو جاب سے واپسی پر ان کے ہاں روز چکر لگا تا سب کی خیر خیریت پوچھتا۔ زویا کو سمجھاتا...... سارہ کو تسلی دیتا...... انہیں زندگی کی طرف واپس لانے کی کوشش کرتا۔

دوسری طرف سارہ کی حالت بھی زویا سے مختلف نہیں تھی...... اس نے بڑے شوق سے آسٹریلین طوطے پال رکھے تھے جو اس کی توجہ نہ ملنے کی صورت میں ایک، ایک کر کے مرتے جا رہے تھے...... سارہ کو ہر وقت یہ احساس جرم ستاتا...... جیسے وہ اپنے باپ کی مجرم ہو...... اپنے باپ کی عزت کو اس نے چند کمزور لمحوں کی رفاقت میں کیسے مٹی میں رول دیا تھا...... اس کا اندر میلا ہو گیا تھا، داغ دار ہو گیا تھا۔

''چچ، چچ ایک اور طوطا مر گیا ہے۔'' زویا پنجرے میں پانی اور دانہ ڈالنے لگی تو مردہ طوطے کو دیکھ کر افسوس کرنے لگی۔

سارہ برآمدے کی سیڑھی پر ستون سے ٹیک لگائے گم صم سے انداز میں بیٹھی تھی اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔

زویا نے دروازہ کھولا...... حنا اندر داخل ہوئی تھی۔

زویا سے سلام دعا کے بعد وہ برآمدے کی سیڑھی پر بیٹھی سارہ کے پاس آ گئی۔ زویا دروازہ بند کر کے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ زارا کا بیٹا مسلسل رو رہا تھا...... شاید اسے فیڈر کی ضرورت تھی...... اور زارا اسے آواز دے رہی تھی۔ اب صحن میں صرف حنا اور سارہ بیٹھی تھیں۔

''سارہ کیسی ہو؟ اور یہ...... یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟'' حنا کو اس کی حالت پر افسوس ہوا۔

سارہ خاموشی سے سر جھکا گئی۔

''دیکھو سارہ...... اپنے ساتھ ایسے مت کرو...... مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا...... میں جانتی ہوں ماں، باپ جیسا عظیم اور انمول رشتہ اس دنیا میں اور کوئی نہیں مگر مسلمان ہونے کے ناتے ہم سب کا یہ عقیدہ ہے کہ ہم سب کو ایک نہ ایک دن لوٹ کر واپس جانا ہے۔'' حنا اس کے قریب اس کے ساتھ بیٹھی دھیرے، دھیرے اسے

سمجھانے لگی۔
سارہ اسی طرح خاموشی سے سر جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔
''سارہ تمہارا موبائل بھی مسلسل بند ہے، اسجد تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہا ہے اور وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے، کل وہ مجھے کالج کے گیٹ پر ملا تھا...... میں نے اسے شاکر انکل کی ڈیتھ کا بتایا تو وہ بہت پریشان ہوا...... دراصل مجھے اسی نے تمہارے پاس بھیجا ہے...... تم اپنا فون آن کرو...... اسجد تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' حنا نے اصرار کیا۔
''مجھے اس سے کوئی بات نہیں کرنی ہے...... میں اس کا فون واپس بھجوا دوں گی۔''
''سارہ پاگل مت بنو...... وہ تم سے محبت کرتا ہے اور تم سے شادی کا خواہش مند ہے۔ وہ تمہارے لیے بہت پریشان تھا، وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے، تم ایک بار فون تو آن کرو...... اس کی بات تو سنو......'' حنا اسجد کی وکیل بن کر آئی تھی سو خوب اس کی وکالت کر رہی تھی وہ ابھی یہ نہیں جانتی تھی کہ اسجد نے آخری ملاقات میں اس نے سارہ کے ساتھ کیا...... کیا تھا۔ سارہ نے بھی اسے اسجد کی اس حرکت کا نہیں بتایا تھا اور وہ بتاتی بھی تو کیسے؟ وہ تو اپنی ہی...... نظروں میں گر گئی تھی۔ سارہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔
''آنٹی اور زارا بجو کہاں ہیں؟'' حنا نے پوچھا۔
''وہ کمرے میں ہیں...... امی عدت میں اور بجو چھلے میں ہیں۔''
''اور بچیاں نظر نہیں آرہی ہیں؟''
''وہ ابا کے کمرے میں ہوم ورک کر رہی ہوں گی۔'' سارہ آہستگی سے اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔
''زویا آپی بھی کمرے میں ہیں...... موقع اچھا ہے، میں اسجد کو کال ملاتی ہوں تم اس سے بات کرلو......'' حنا نے اپنے موبائل سے اسجد کو کال ملائی اور فون سارہ کے کان سے لگا دیا۔
''سارہ میری جان...... کیسی ہو تم......؟'' دوسری طرف اسجد نے بے تابی سے اس کا حال پوچھا۔
''زندہ ہوں۔'' مختصر جواب۔
''سارہ میری جان ایسے مت کہو...... تمہیں میرے لیے اپنا خیال رکھنا ہے۔ مجھے تمہارے والد کی ڈیتھ کا سن کر بہت افسوس ہوا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔''
''آمین......'' ایک بار پھر مختصر جواب۔
''سارہ تم کالج کب آؤ گی؟''
''پتا نہیں......''
''پلیز سارہ...... ایسی باتیں کر کے تم اپنے ساتھ، ساتھ مجھ پر بھی ظلم کر رہی ہو، میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اسجد نے بے قراری سے کہا۔
''مگر میں نہیں مل سکتی ہوں اب......''
''لیکن کیوں......؟''
''یہ تم بہت اچھی طرح سے جانتے ہو۔''
''مگر سارہ...... میں نے...... میں نے امی سے تمہاری اور اپنی شادی کی بات کرلی ہے جونہی تمہارے والد کا چالیسواں ہو جائے گا میرے والدین آکر تمہارا رشتہ مانگ لیں گے...... پھر تم...... اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟''
''میری سمجھ میں نہیں آرہا۔'' سارہ رونے لگی۔

''سارہ میری بات سنو......'' اگلے ہی لمحے سارہ نے روتے ہوئے فون بند کردیا۔
''کیا ہوا اتنی جلدی فون بند کردیا؟ کیا تم دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا ہے؟'' حنا نے سوال کیا۔
''نہیں بس...... ایسے ہی......'' سارہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔
''سارہ یار تم کالج آنا شروع کرو...... اینول ایگزامز سر پر ہیں اور ویسے بھی اس طرح تم گھر میں بیٹھ بیٹھ کر بیمار پڑ جاؤ گی...... اور تمہارا سال بھی ضائع ہو جائے گا۔'' حنا ایک بار پھر اسے سمجھانے لگی۔
''اس کا سال ضائع نہیں ہوگا...... اور یہ انشاء اللہ کل سے کالج جائے گی۔'' زویا نے ان کے قریب آ کر حنا کی بات کو آگے بڑھایا تھا۔
بہر حال سارہ اگلے دن تو کالج نہیں گئی تھی مگر کچھ دن کے بعد زویا نے اسے کالج جانے پر آمادہ ضرور کرلیا تھا...... پندرہ سولہ دن کے بعد سارہ جب کالج آئی تو حنا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ سارہ اپنا موبائل کالج لے آئی تھی، حنا کے سمجھانے پر اس نے پنا موبائل آن کرلیا تھا آدھے گھنٹے کے بعد اسجد کی کال آگئی تھی۔ اسجد اس سے باہر ملنے کی خواہش کرر ہا تھا۔
سارہ کے انکار پر...... اسجد نے اس سے آخری بار ملنے اور ایک ضروری بات ڈسکس کرنے کا بہانہ بناتے ہوئے اسے تھوڑی دیر کے لیے باہر ملنے پر بالآخر آمادہ کر ہی لیا تھا۔ سارہ جب کالج گیٹ سے باہر نکلی تو اسجد اس بار بائیک کے بجائے گاڑی لیے کھڑا تھا سارہ فرنٹ ڈور کھول کر آگے بیٹھ گئی...... اسجد بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔
''کیسی ہو جانِ اسجد؟'' اسجد نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے خاموش بیٹھی سارہ سے پوچھا۔
''ٹھیک ہوں......'' سارہ خالی نظروں سے سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھ رہی تھی۔
''صرف ٹھیک......؟ میرے ساتھ ہوتے ہوئے تو تمہیں بالکل ٹھیک ہونا چاہیے میری جان۔'' اسجد نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔
سارہ خاموش رہی...... آج اسے اسجد کی ایسی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں...... اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا۔
''کم آن سارہ، کیا ہوگیا ہے تمہیں؟'' اسجد نے حیرت سے اسے دیکھا۔
''ایسی کون سی بات آپ نے ڈسکس کرنا تھی مجھ سے...... جو فون پر نہیں ہو سکتی تھی؟'' سارہ نے جواب طلب نظروں سے اسجد کو دیکھا۔
اسجد گاڑی ایک اجنبی راستے کی اجنبی سڑک پر لا چکا تھا۔
''بتاتا ہوں...... اتنی جلدی بھی کیا ہے؟''
''آپ کو نہیں ہے مگر مجھے ہے جلدی...... میں زیادہ دیر آپ کے ساتھ نہیں رک سکتی۔'' سارہ نے وضاحت کی۔
اسجد نے گاڑی ایک سائڈ پر روک لی۔
''مگر کیوں......؟''
''اسجد ہر کیوں کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا ہے...... آپ مجھے وہ بات بتائیں جسے بتانے کے لیے آپ مجھے یہاں لائے ہیں۔''
''سچ بتاؤں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی...... بس تمہارا دیدار کرنا تھا...... تمہارے ساتھ کچھ پل گزارنے

تھے...... تمہیں اپنی محبت کا احساس دلانا تھا......'' اسجد نے اسے شانوں سے پکڑ کر خود سے قریب کرنا چاہا...... مگر اگلے ہی لمحے سارہ نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

''مجھے ابھی اور اسی وقت واپس چھوڑ کر آئیں، میں شادی سے پہلے مزید یہ سب کچھ نہیں کر سکتی ہوں۔''

''مگر جانِ اسجد...... میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری محبت کا جواب ہمیشہ محبت سے دو......'' اسجد نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

سارہ نے سرعت سے اس کے ہاتھ پیچھے کر دیے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' اسجد کو غصہ آیا۔

''آپ مجھے ہاتھ مت لگائیں۔''

''کیوں نہ لگاؤں تمہیں ہاتھ؟ سات پردوں میں رہنے والی کوئی نیک پروین لڑکی نہیں ہو تم......'' اسجد نے غصے میں اس کی کلائی پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے خود سے قریب کیا...... اتنے مہینوں میں پہلی بار سارہ نے اسجد کو یوں غصے میں دیکھا تھا۔

''چھوڑیں مجھے...... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' سارہ نے بے بسی سے اسجد کو دیکھا۔

''تمہیں یہاں میں نے اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے چھوڑنے کے لیے نہیں بلایا۔'' اسجد کا غصہ ہنوز برقرار تھا۔

''اسجد یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اور کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ چھوڑیں مجھے۔'' سارہ نے از حد حیرت سے اسجد کو دیکھا اور اپنا آپ اس کی گرفت سے چھڑانے کی بھرپور کوشش کی...... اور گاڑی سے نکلنا چاہا۔

اسجد نے اگلے ہی لمحے اس کے گاڑی سے نکلنے کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے واپس کھینچ لیا...... اور گاڑی لاک کر دی۔

''آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ روہانسی ہوئی۔

''بات سنو میری......'' اسجد نے سختی سے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ ''میں نے ایک ہوٹل میں کمرا بک کروا رکھا ہے...... چپ چاپ میرے ساتھ چلو......'' اس نے دوٹوک لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

''میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں آپ؟ کیوں......'' سارہ اس کی ڈیمانڈ سن کر رو پڑی۔

''میرا جب دل چاہے گا میں تمہیں بلاؤں گا اور تمہیں میرے بلانے پر اسی طرح آنا ہوگا...... بہت اٹھالیے میں نے تمہارے ناز نخرے...... اب اور نہیں۔'' اسجد کی باتیں سن کر اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔

''میں بازار سے خریدی ہوئی کوئی چیز نہیں ہوں تمہارے لیے...... جسے جب جی چاہے گا تم استعمال کرو گے...... میں اب تمہارے ساتھ کسی بھی گناہ میں شریک نہیں ہو سکتی۔ اپنی پہلی اور آخری غلطی کر کے جو میں قیمتی چیز کھو چکی ہوں وہ میں بار، بار کبھی نہیں کر سکتی۔'' سارہ کے حتمی انداز پر اسجد ہنسا۔

''اتنے بڑے دعوے......؟''

''دعوے نہیں کر رہی، فیصلہ سنا رہی ہوں تمہیں۔'' سارہ کے لہجے میں درشتی تھی۔

''میری جان یہ تو وقت بتائے گا کہ تم آؤ گی اور میرے بلانے پر ہر بار آؤ گی۔''

''چھوڑو مجھے ورنہ...... ورنہ میں شور مچا کر لوگوں سے مدد مانگ لوں گی۔'' سارہ نے ایک بار پھر زور لگایا......

اسجد نے ایک ہاتھ سے اسے قابو کیا اور دوسرے ہاتھ سے ڈیش بورڈ سے اپنا موبائل اٹھا لیا۔

”ایسے دعوے بعد میں کرنا پہلے اپنی یہ وڈیوز تو دیکھ لو......“ اسجد نے موبائل سے وڈیوز نکالیں......سارہ کا جسم بے جان ہونے لگا......اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو تھیں......وہ جب، جب اسجد سے باہر ملی تھی......اسجد نے جس، جس طرح سے اس سے اپنی محبتوں کا اظہار کیا تھا وہ سب مناظر سارہ کے سامنے تھے......آخری وڈیو اسجد کے گھر بنائی گئی تھی......وڈیو میں سارہ، اسجد کے بیڈ پر بیٹھی تھی جبکہ وہ اس کے بے حد قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اسجد نے اس کے سر سے چادر اتاری تھی۔ اور پھر......اگلے مناظر وہ پھٹی، پھٹی نگاہوں سے ورطۂ حیرت میں جتلا دیکھ رہی تھی۔ اسجد کے ساتھ اس کی محبت میں ڈوبے لمحات......اس کا سر چکرانے لگا۔ سارہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو۔

”اس دن تمہیں کولڈ ڈرنک میں نشہ آور سیرپ ملا کر پلایا تھا میں نے......اسی لیے تو ہوش وخرد کی دنیا سے بیگانہ ہوگئی تھیں تم...... بہرحال میری بات کان کھول کر سن لو......اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو اس وڈیو کی سی ڈیز بنوا کر تمہارے گھر، تمہارے محلے اور تمہارے تمام رشتے داروں کے گھر بھجوادوں گا......اور نیٹ پر اپ لوڈ کردوں گا...... یہ تمام وڈیوز......پھر تمہاری عزت کا جو جنازہ نکلے گا وہ تمہارے گھر والوں کے ساتھ پوری دنیا بھی دیکھے گی۔ اس لیے میری جان آئندہ اتنے بڑے دعوے مت کرنا اور نہ ہی مجھ سے الجھنے کی کوشش کرنا......میں جب جہاں تمہیں بلاؤں، تمہیں وہاں میرے ساتھ چلنا ہوگا......“ اسجد کے اس ہولناک انکشاف، اس کے دھوکے اور مکروہ وجود نے سارہ کو جیسے ساتویں آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا۔

یہ تھی اس کی محبت؟ یہ تھا اس کا عشق......؟ اتنا بڑا دھوکا اتنا بڑا فریب......؟ یہ کیسا عشق کر بیٹھی وہ جس کا اتنا بڑا تاوان لیا تھا اس سے اس نامراد عاشق نے......اس کا وجود کرچی، کرچی ہونے لگا۔

اس سے محبت اور عشق کے نام پر جھوٹی قسمیں کھانے والا، شدید گرمی میں سڑک پر گھنٹوں کھڑا اس کا انتظار کرنے والا......اس کو شادی کے سہانے اور حسین سپنے دکھانے والا وہ شخص......کیا اس کا یہ روپ بھی ہوسکتا تھا؟ وہ شخص جسے سارہ نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ وہ اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے اسے یوں بلیک میل بھی کرسکتا تھا؟ سارہ کی محبت اس فریب پہ، اس دھوکے پہ چیخ رہی تھی......دہائی دے رہی تھی، بین کررہی تھی۔

زندگی کی گاڑی نے اسے محبت اور عشق کے نام پر دھوکا دینے والے ایک ایسے اسٹیشن پر اتارا تھا جہاں صرف بدنامی کی دلدل تھی۔ سارہ کے پاس اسجد کو کہنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک زندہ لاش کی طرح بے جان وجود کے ساتھ اسجد کے ساتھ گاڑی میں آبیٹھی تھی اسجد گاڑی کو جانے کن راستوں سے گزار کر ہوٹل کے اس روم میں اس کا ہاتھ تھامے لے گیا تھا جو اس نے بک کروا رکھا تھا......اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہوچکا تھا......وہ کسی روبوٹ کی طرح اسجد کے ساتھ اس کمرے میں آگئی تھی جہاں اسے آکر لگا تھا جیسے سارہ نے شاکر حسین کو دوسری بار خود مارا ہو......دوسری بار ان کی عزت کی دھجیاں اڑائی گئیں......اور ایسا اب بار، بار ہونا تھا، اسے اب روز مرنا تھا......اسے اب روز اس بھیانک وڈیو کے ذریعے بلیک میل ہونا تھا......اور خود کو برباد کرنا تھا۔ عشق نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا تھا۔ جس کا تاوان اسے آئے دن وصول کرنا تھا۔ گھر سے نکالے ایک غلط قدم نے اسے برائی کی ایسی دلدل میں لا دھکیلا تھا جہاں روز بروز اسے نیچے ہی نیچے دھنسنا تھا۔

وہ تو پہلے دن ہی مرگئی تھی اور اب وہ صرف سانس لیتی ایک لاش تھی۔

پہلے اس سے غلطی سے ایک گناہ ہوا تھا اور اب اسے اس گناہ میں بار، بار ایسی غلطیاں کرنا تھیں۔

☆☆☆

ایشال ہر بار ڈاکٹر عمر کی ڈانٹ کے بعد ایسے ہی افسردہ ہوجاتی تھی اور پھر دو چار دن کے بعد خود ہی ٹھیک بھی

دل کی باتیں

☆ محبت کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کرتی جس کے ساتھ رہا جائے محبت تو ایسے شخص کو تلاش کرتی ہے جس کے بغیر نہ رہا جائے۔

☆ لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے زندہ رہے تو پھر ملیں گے مگر تم سے مل کر ایسا لگا ملتے رہے تو زندہ رہیں گے۔

☆ جب دیواروں میں دراڑیں پڑتی ہیں تو دیواریں گر جاتی ہیں اور جب...... دلوں میں دراڑیں پڑتی ہیں تو دیواریں بن جاتی ہیں۔

از: حمیرا نوشین، منڈی بہاؤالدین

خوب صورت بات

ایک جوکر نے لوگوں کو ایک جوک سنایا تو سب لوگ بہت زیادہ ہنسے...... اس نے وہی جوک پھر سنایا تو کوئی بھی نہیں ہنسا۔ تو پھر اس نے ایک بہت خوب صورت بات کہی۔

''اگر تم لوگ ایک خوشی کو لے کر بار، بار خوش نہیں ہو سکتے تو پھر ایک غم کو لے کر بار، بار روتے کیوں ہو؟''

از: ایمن زرناب ڈوگر، کمالیہ

ہو جاتی تھی۔ اور سب کچھ بھول بھال جاتی تھی۔

مگر اس بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ کچھ ٹوٹ سا گیا تھا اس کے اندر...... اس کے اندر ایک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیٹھے، بیٹھے اسے کچھ یاد آتا اور اس کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ اب بھی وہ لاؤنج میں رکھے خوب صورت سے جھولے میں آدھی ترچھی لیٹی پلازمہ ٹی وی پر غائب دماغی سے کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو ایشو، کیسی ہو سویٹ ہارٹ کیا ہو رہا ہے؟'' عنایہ بالوں میں رولر لگائے ہاتھ میں فروٹ سیلڈ کی پلیٹ پکڑے اس کے پاس جھولے میں بیٹھ گئی۔

''کچھ خاص نہیں...... بس ایسے ہی لیٹی تھی۔'' ایشال نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اپنے کھلے بالوں کا جوڑا بنایا۔

''ایشو مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی......'' عنایہ نے سلاد کھاتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

''کیا بات کرنی ہے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں......؟'' ایشال نے الجھ کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر اطمینان تھا۔

''ایشو، اقصم بہت اچھا ہے...... ہمارا فرسٹ کزن ہے اگر تم اقصم کو اپنے لائف پارٹنر کے حوالے سے سوچو تو...... آئی تھنک وہ تمہارے لیے بہترین ثابت ہو گا کیا خیال ہے تمہارا؟'' ایشال کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا......

''ایسا سوچنا سراسر بے وقوفی ہے، غلط ہے۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی...... نو ڈاؤٹ...... اقصم بہت جینئس ہے، بہت ہینڈسم ہے اس کا فیوچر بھی بہت برائٹ ہے، وہ کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا ہے مگر میں نے اسے کبھی اس حوالے سے نہیں دیکھا۔'' اب عنایہ کا اطمینان غائب ہو چکا تھا۔

''ایشو میں مانتی ہوں کہ بچپن سے ہی تم دونوں کا زیادہ وقت لڑائی جھگڑا کرتے ہی گزرا ہے مگر ایک دوسرے کو جب لائف پارٹنر کے حوالے سے دیکھو گے تو ایک دوسرے کے لیے فیلنگز بھی ڈیولپ ہو جائیں گی...... تم اقصم کے حوالے سے سوچو تو سہی...... میری جان...... چلو اتنی جلدی جواب مت دو...... کچھ دن اچھی طرح سے سوچ لو...... اقصم ایک کمپلیٹ پیکج ہے...... اور ویسے بھی ہم سب کی خواہش ہے کہ تم ہمیشہ اسی گھر میں رہو...... ہمارے پاس...... ہمیشہ ہمارے ساتھ......'' عنایہ نے پیار و شفقت سے اسے سمجھایا۔

''عینی آپی تو...... تم سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہو...... مگر پلیز مجھے اس پروپوزل کے لیے فورس مت کرو...... اقصم کے لیے میرے دل میں کبھی فیلنگز ڈیولپ نہیں ہو سکتیں...... وہ میرے لیے ایک ناٹی فرینڈ کی طرح

ہے جس کے ساتھ میں لڑتی جھگڑتی ہوں اور ہم پھر سے ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں......بس اس کے علاوہ اقصم سے کوئی اور رشتہ جوڑنا ناممکن ہے میرے لیے......'' ایشال نے جیسے اپنی حتمی رائے دے دی تھی۔

اور عنایہ اس کی باتوں پر چند لمحے یونہی خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''کیا تمہاری زندگی میں کوئی اور ہے جس کی وجہ سے تم یوں انکار کررہی ہو؟''

''کم آن عینی......ایسا کچھ نہیں ہے......تم اچھی طرح سے جانتی ہو میری زندگی میں ایسا کوئی مرد نہیں ہے جو میرے لیے اس حوالے سے اتنا اہم ہو۔'' عنایہ کو مطمئن کرتے، کرتے نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں کے سامنے ڈاکٹر عمرآن کھڑے ہوئے تھے۔

''اوکے، میں بڑے پاپا تک تمہاری رائے پہنچادوں گی......اور ہاں......'' عنایہ اٹھتے، اٹھتے ایک بار پھر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ سلاد کی پلیٹ عنایہ نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ ایشال کا جواب سن کر اس کی بھوک ختم ہوگئی تھی۔

''کچھ دن پہلے کی بات ہے تم اقصم کے ساتھ ساجدہ پھپو کی طرف گئی تھیں۔ اس دن شام کو عامر انکل اپنی مسز کے ساتھ آئے تھے۔ وہ بڑے پاپا اور بڑی ماما سے ارسل کی خواہش پہ تمہارے لیے ارسل کا پروپوزل لے کر آئے تھے......ابھی بڑے پاپا نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا......فی الحال انہیں ٹال دیا ہے۔'' ارسل کا نام سنتے ہی ایشال کا پارہ ہائی ہوگیا تھا۔

''ارسل کی اتنی ہمت کہ وہ میرے لیے اپنا پروپوزل بھیجے......اس کی تو ایسی کی تیسی......'' ایشال شدید غصے میں جھولے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ایشو اس میں اتنا غصہ کرنے والی کون سی بات ہے؟ اس نے تمہارے لیے شریف لوگوں کی طرح سیدھے سادے طریقے سے پروپوزل بھیجا ہے، تمہیں بیوی بنانا چاہتا ہے، تم سے دوستی کرکے تمہیں گرل فرینڈ نہیں بنانا چاہتا وہ۔'' عنایہ نے اسے سمجھایا۔

ایشال غصے میں پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی......اور عنایہ نے اپنا سر تھام لیا۔ نہ جانے وہ کیا چاہتی تھی؟ کمرے میں آکر ایشال غصے میں تھوڑی دیر ٹہلتی رہی پھر اس نے اپنے موبائل سے ارسل کو کال ملائی......دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کرلی گئی۔

''زہے نصیب کیا میں اتنا خوش نصیب بھی ہوسکتا ہوں کہ ایشال چوہدری نے مجھے خود کال کی؟'' دوسری طرف ارسل کی آواز میں خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔

''شٹ اپ......مجھے تمہاری اس حرکت پر اتنا غصہ آرہا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔''

''کون سی حرکت......؟ کیسی حرکت......؟ اب میں نے کیا کردیا ہے؟'' وہ انجان بنا۔

''تم نے میرے لیے اپنا پروپوزل بھیجا ہے؟'' ایشال نے دانت پیسے اور دوسری طرف ارسل نے قہقہہ لگایا۔

''اچھا تو میری اس حرکت پر آپ کو اتنا غصہ آرہا ہے......واؤ......''

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم میرے لیے اپنا پروپوزل بھیجو......'' ایشال کا غصہ کسی صورت بھی کم نہیں ہورہا تھا۔

''مجھ سے فرینڈشپ آپ کرنا نہیں چاہتیں......تو میں نے سوچا کیوں نہ آپ کو اپنی بیوی بنا کر اپنے پاس لے آؤں......ان فیکٹ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔'' ارسل کا اطمینان اسے اندر تک تپا گیا۔

''شٹ اپ......تم مجھے بہت برے لگتے ہو......سنا تم نے......'' ایشال نے چیخ کر جواب دیا اور فون بند کر کے سائڈ ٹیبل سے اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر غصے میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

جاری ہے

زندگی کے پیچ وخم سلجھاتے، سلجھاتے وہ خود سے الجھنے لگا، آج تو جیسے عابدہ نے پورا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا، اس گھٹن زدہ ماحول میں سانس لینی مشکل ہونے لگی تو وہ خاموشی سے تازہ ہوا کھانے ٹیرس کی جانب چل دیا۔

"یہ لوگ سنڈے کو ثمرانہ کے گھر رشتہ لے کر جانے والا تھے......اس سے پہلے ہی "یہ" ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔" وہ بالوں میں بلاوجہ انگلیاں چلاتے ہوئے جھلایا۔

بدگمانی

صدف آصف



''اس مسئلے کا کوئی تو حل نکالنا پڑے گا۔'' تمثیل نے خود کو تسلی دی اور ریلنگ پر تھوڑا سا جھک کر پڑوس والے گھر میں جھانکا مگر اُدھر بھی سکوت طاری تھا۔

''یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں......؟'' وہ ایک دم خوف زدہ ہوگیا۔

کل تک وہ کتنا خوش تھا۔ جب اماں نے بابا کی بات مانتے ہوئے نیم رضامندی سے اثبات میں سر ہلادیا، بے پایاں مسرت نے اسے اپنے حصار میں لے لیا، وہ فتح مندی اور سرشاری کے جذبے سے لبریز ہو کر جھوم اٹھا۔ بلاوجہ باہر کے بھی کئی چکر لگا ڈالے، ایک بار ثمرانہ رسی پر سے کپڑے اتارتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرائی تو من کی مراد پا جانے پر جھوم اٹھا۔

عابدہ نے بیٹے کے اتاؤلے پن پر گھورنے کی جگہ صرف نگاہ سے کام لیا اور اٹھ کر کچن میں ترکاری پکانے چل دیں۔

آج شام کو جب اس کی آفس سے واپسی ہوئی تو سب کچھ بدل چکا تھا...... حالات کل کے برعکس نکلے۔

عابدہ...... ثمرانہ اور رفعت کا نام تک سننے کو تیار نہیں تھیں...... وہ سمجھا، سمجھا کر ہار گیا مگر جانتا تھا کہ ماں کے دماغ میں ایک بار جو بات بیٹھ جائے اس کا اتنی آسانی سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے...... وہ بہت جلد لوگوں سے بدگمان ہوجاتی تھیں۔

''اماں...... جو کچھ آپ سمجھ رہی ہیں...... وہ بات غلط بھی تو ہوسکتی ہے۔'' تمثیل نے ایک بار پھر انہیں سمجھانے پر کمر کسی۔

''یہ کیا بات ہوئی...... کوئی...... سنی سنائی تھوڑی ہے...... آنکھوں دیکھی بات ہے...... ہم کوئی بچے ہیں جو غلط سمجھیں گے؟'' عابدہ نے پھولے منہ سے بیٹے کو دیکھ کر کہا اور لکڑی کی میز پر ڈسٹر پھیرا جہاں چائے کے کپ رکھنے سے گول دائرے بن گئے تھے۔ اس کے بعد فرنیچر پر کپڑا مار کر ان دیکھی گرد اڑائی۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ رفعت آنٹی ایسی نہیں ہیں...... ہوسکتا ہے کہ کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی ہو...... ایک دفعہ ان سے پوچھ لینے میں کوئی حرج تو نہیں۔'' تمثیل نے لہجے میں نرمی پیدا کی اور ان کے پیچھے لپکا۔

''نہ...... بس...... بہت ہوگیا۔ اب ان لوگوں سے کوئی بات ہوگی نہ ہی کوئی رشتہ رکھا جائے گا۔ بھلا دیکھو تو بھی .... ہمارے خلوص کا کیسا مذاق اڑایا گیا۔'' وہ ڈسٹر ہاتھ میں لہراتی ہوئی ایک دم چمک کر بولیں۔

''آپ جس انداز میں سوچ رہی ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ سب کچھ ایسے ہی وقوع پزیر ہوا ہو...... ہر بات کے پیچھے ایک ٹھوس دلیل ہوتی ہے۔ اگر وہ معلوم کرلی جائے تو کیا برائی ہے......'' تمثیل نے منمنا کر ایک بار پھر پڑوسیوں کی صفائی پیش کی۔

''ہمیں کیا ضرورت ہے کہ لوگوں کے گھروں میں جا، جا کر وضاحتیں طلب کرتے پھریں اور تم کیسی ناخلف اولاد ہو۔ اتنا کچھ سن کر بھی ان لوگوں کی حمایت میں پاگل ہوئے جارہے ہو۔'' عابدہ نے کھڑکیوں کی جالی پر جھاڑو ماری تو وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔

''اماں...... پلیز......'' وہ رو دینے کو ہوا، عابدہ منہ پھیر کر کام میں لگی رہیں۔

''کان کھول کر سن لو...... اگر تم ثمرانہ کے آس پاس بھی دکھائی دیے تو خیر نہیں ہوگی...... آج سے ہی یہ باب بند کردو۔'' عابدہ نے بیٹے کو ٹیرس کی طرف بڑھتے دیکھا تو کچھ سوچ کر کڑی وارننگ دی۔

''آہ......'' تمثیل نے ٹھنڈی سانس بھری اور ماں کی جانب افسردگی سے دیکھتا ہوا واپس آکر صوفے پر نیم دراز ہوگیا اور اپنے ماضی میں کھو گیا۔

☆☆☆

ایسی چمکیلی خوشگوار شام اس کی زندگی میں اس سے قبل کبھی نہیں اتری تھی، جب پڑوس میں رہنے والی ثمرانہ سے اس کی نگاہیں ٹکرائیں اور وہ پہلی نظر کی محبت کا شکار ہوا۔ موسم صبح ہی سے ابر آلود ہورہا تھا۔ شام ہوتے ہی بارش شروع ہوگئی اور ماحول سرد ہونے

لگا۔ تمثیل کمرے میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر اپنے دفتر کی ایک فائل پر کام کر رہا تھا کہ اچانک گرج چمک کے ساتھ تیز بارش شروع ہوگئی اس نے گردن اٹھا کر کھڑکی سے باہر جھانکا، رم جھم برکھا کی جھڑی ...... اسے اپنی جانب بلانے لگی۔ وہ منہ بنا کر جلدی سے کام مکمل کرنے میں جت گیا۔ گھنٹے بھر میں سارا کام ختم ہوگیا۔ ایک طویل انگڑائی نے کرستی کے غلبے کو دور بھگایا۔

ایسے موسم میں چائے کی طلب بڑی شدت سے محسوس ہوئی تو کچن کی جانب بڑھا۔ عابدہ اور رضا علی کسی رشتے دار کی فوتگی میں گئے ہوئے تھے۔ ان کی واپسی دیر سے متوقع تھی...... تمثیل نے ایک کپ چائے بنائی اور بڑا سا مگ ہاتھ میں تھامے ٹیرس پر چلا آیا۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا، اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس نے نیچے جھانکا تو حیران رہ گیا۔ اپنے گھر کے نزدیک ایک کار کی ہیڈ لائٹ کی روشنی دکھائی دی۔

''اس موسم میں کون آ گیا؟'' وہ بڑبڑایا اور باہر نکل کر دیکھنا چاہا۔

ایک پرانے ماڈل کی سیاہ کرولا دروازے سے تھوڑی سی دوری پر سڑک پر کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی کافی تیز تھی۔ وہ چلتا ہوا جب کار کے پاس پہنچا تو حیران رہ گیا۔ سبز لباس میں ملبوس، براؤن بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹے ایک خوب صورت لڑکی بونٹ اٹھائے انجن پر جھکی ہوئی تھی۔ لڑکی کے چہرے پر پھیلے تاثرات سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ گاڑی کے حوالے سے زیادہ معلومات نہیں رکھتی۔

''ہائے...... آپ کی گاڑی کو کیا ہوگیا؟'' تمثیل نے اس کے پاس پہنچ کر پوچھا۔

''پتا نہیں ...... اچانک بند ہوگئی...... اب اسٹارٹ نہیں ہو رہی۔'' اُس نے چونک کر پہلے اپنے سامنے کھڑے اسمارٹ سے لڑکے کو دیکھا اس کے بعد پریشانی سے جواب دیا۔

''کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟'' تمثیل نے بونٹ پر جھکتے ہوئے پوچھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی سائڈ میں جا کر کھڑی ہوگئی۔

''ایسا لگ رہا ہے کہ انجن میں کوئی خرابی ہوگئی ہے...... کسی مکینک کو دکھانا پڑے گا۔'' اس نے تھوڑی جانچ پڑتال کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا تو ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کے برابر میں کھڑے ہو کر بولا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں نے پاپا کو کال کر دی ہے...... وہ کسی کو بھیج رہے ہیں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''آپ کو واپسی میں دقت ہوگی۔ تھوڑی دیر میرے گھر میں بیٹھ کر مکینک کا انتظار کرلیں یا کہیں تو میں ڈراپ کر دوں؟'' اس نے اپنے گھر کی جانب اشارہ کیا۔ تمثیل کو اس لڑکی میں ایک انوکھی سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بات کو بلاوجہ طول دینے لگا۔

''ارے...... بالکل بھی نہیں۔'' وہ ایک دم زور سے کھلکھلائی۔

''کوئی ہنستے ہوئے اتنا پیارا بھی لگ سکتا ہے۔'' وہ اس کی ہنسی کی جھنکار میں گم اسے دیکھتا رہ گیا۔

''میرا نام ثمرانہ ہے...... ہم لوگ تھوڑے دن پہلے ہی آپ کے پڑوس والے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔ آپ کو پہلی بار دیکھا ہے ورنہ عابدہ آنٹی اور انکل سے تو کئی بار ملاقات ہو چکی ہے۔'' اس سے یہ تفصیلات سن کر تمثیل کے تجسس کا خاتمہ ہوا۔

''انشاء اللہ ہم سے بھی اب بار بار ملاقات ہوتی رہے گی۔'' تمثیل بڑبڑایا۔

''جی...... کچھ کہا!'' ثمرانہ نے حیرانی سے اس کے ہلتے ہونٹوں کو دیکھ کر پوچھا تو اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

''ویسے جی آپ کا شکریہ......'' وہ اخلاق کا مظاہرہ کرنے لگی۔

''اچھا...... جی...... کوئی بات نہیں ''پڑوسی'' ہونے کی حیثیت سے یہ تو میرا فرض تھا۔'' اس نے پڑوسی پر زور دیتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

''او کے...... اب میں چلتی ہوں۔'' وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی سفید فولادی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ تمثیل وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر مسکرا کر اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

تمثیل فریج سے پانی کی بوتل نکال رہا تھا کہ اس کی نظر شیشے کے باؤل میں رکھی فیرنی پر جم گئی...... بادام پستے کی ہوائیاں دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ میٹھا ویسے بھی اس کی کمزوری تھی۔ کچن سے جاکر چمچہ اور چھوٹا پیالا لے آیا اور تھوڑا سا میٹھا نکال کر کھانا شروع ہو گیا۔

''واہ...... اماں...... ! کیا فیرنی بنائی ہے مزہ آ گیا......'' وہ پیالی تھامے ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا تو ماں باپ کو بیٹھا دیکھ کر مسکراتے ہوئے تعریف کی۔

''بیٹا...... مزیدار ہے ناں...... میں بھی تمہاری اماں کو یہ ہی کہہ رہا تھا مگر ان کا تو فوراً منہ بن گیا۔'' رضا علی نے شرارت سے پاس بیٹھی بیوی کو دیکھ کر کہا۔

''کیوں...... اماں؟ اچھی تو بنائی ہے۔'' تمثیل نے الجھن زدہ انداز میں ماں سے پوچھا۔

''میں کب برائی کر رہی ہوں مگر تمہارے بابا کو ہمیشہ پڑوس سے آنے والی ہر چیز میں ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ میں کچھ بھی پکاؤں...... انہیں بد ذائقہ ہی لگتا ہے۔'' عابدہ نے منہ پھلا کر بیٹے سے فریاد کی تو وہ ساری بات سمجھ گیا۔

''اوہ...... اچھا...... تو یہ بھی پڑوسیوں کی عنایت ہے۔'' تمثیل نے سر ہلا کر کہا اور میٹھے کا آخری چمچہ منہ میں رکھ کر خالی پیالا میز پر ٹکا دیا۔

''اوہو اسے تو لے جاکر سنک میں رکھو ابھی یہاں کی صفائی کی تھی۔'' عابدہ نے ناک بھوں چڑھا کر بیٹے کو جھاڑا۔

''ویسے رفعت آنٹی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے...... مگر میری اماں جیسا مزیدار کھانا کوئی پکا ہی نہیں سکتا۔'' اس نے ماں کے پیچھے کھڑے ہو کر کاندھا دباتے ہوئے مسکا لگایا اور باپ کو بھی آنکھ سے اشارہ کیا تا کہ وہ بیوی کا بگڑا ہوا موڈ ٹھیک کر سکیں۔

''میں نے کب اس بات سے انکار کیا ہے...... بس شرط یہ ہے کہ عابدہ کوئی اچھی چیز پکائیں تو بھی......'' رضا علی نے مسکرا کر بیوی کو دیکھ کر صاف لہجے میں جتایا۔

''کیا مطلب ہے؟ ساری زندگی اتنا اچھا پکا، پکا کر کھلایا۔ چار دن سے بیمار کیا پڑ گئی سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔'' وہ شوہر کی بات پر پہلے گرم ہوئیں پھر چھکوں پھکوں رونا شروع ہو گئیں۔ تمثیل نے سر پر ہاتھ مارا اور باپ کی جانب ناراضی سے دیکھا۔

''ارے بابا...... میں تو مذاق کر رہا تھا۔'' وہ ایک دم گھبرا گئے۔ بیوی کے سفید جھوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے انہیں منانے میں لگ گئے۔

''ہاں نہیں...... تو ہمیشہ اس گھر میں، دوسروں کی تعریف ہوئی ہے۔ میں تو کام کر کر کے مر بھی جاؤں ناں تو بھی قدر نہیں ہوگی۔ اب یہ پڑوسی اور آ گئے۔ ان کو بھی ہمارے یہاں آگ لگانے کا بہت شوق ہے، کوئی اچھی چیز پکی نہیں۔ پیالا بھر کر یہاں بھیج دیا۔ بھلا اتنا شو آف کس کام کا؟'' عابدہ کا سارا نزلہ ثمرانہ کے گھر والوں پر گرنے لگا۔

''اب کیا ہوگا؟'' ماں کے منہ سے ان لوگوں کے خلاف باتیں سن کر تمثیل کی جان ہی نکل گئی۔ ابھی تو ثمرانہ اور اس کے پیار کی پتنگ نے بلندی کی جانب پرواز کرنا شروع کیا تھا اور عابدہ نے ڈور کاٹنے کی سوچ لی۔ وہ ان لوگوں کی اچھائیوں پر بھی بدگمان ہو گئیں۔

☆☆☆

''بابا پلیز...... آپ کچھ کریں۔'' اس نے باپ سے مارننگ واک کے دوران باقاعدہ ہاتھ باندھ کر التجا کی۔

''بیٹا...... میں کیا کر سکتا ہوں۔ پچیس سال قبل ایک کام کیا تھا۔ اسی پر آج تک پچھتا رہا ہوں۔'' وہ گراؤنڈ کی گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے شوخی سے بولے۔

''کون سا کام؟'' تمثیل نے حیران ہو کر پوچھا۔ صبح کی شگفتہ فضاؤں نے ان کا مزاج خوشگوار کر دیا تھا، مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''تمہاری ماں سے شادی کا اور کیا!'' انہوں نے ہنستے ہوئے بیٹے کے کاندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ مار کر کہا۔

''پا...... پا...... میں یہاں اپنی نیا پار لگانے کی بات کر رہا ہوں، آپ ماضی کے قصے لے کر بیٹھ گئے۔'' وہ زچ ہونے لگا تو رضا علی نے بے اختیار اسے دیکھا، بلیو دھاری دار ٹریک سوٹ میں وہ اپنے دراز قد اور کسرتی جسم کے ساتھ بہت جچ رہا تھا۔

''بیٹا جی اب ہم تمہارے سامنے نشانِ عبرت ہیں...... اب بھی وقت ہے سبق حاصل کر لو۔'' رضا علی اسے چھیڑنے سے باز نہیں آئے۔

''ٹھیک ہے میں نے تو آپ کی بھلائی سوچی تھی مگر جب انسان کو اپنی پروا نہ ہو تو دوسرا اس کے لیے کیا کر سکتا ہے۔'' وہ منہ موڑ کر جوگرز کے تسمے باندھتے ہوئے ڈراما کرنے لگا۔

''ہماری بھلائی......؟ اِیں...... برخوردار! شادی آپ کی ہو رہی ہے اس میں بھلا ہمارا کیا فائدہ؟'' وہ بیٹے پر سوچتی نگاہ ڈال کر پوچھ بیٹھے۔

''کچھ نہیں چھوڑیں۔'' اب اس کی ستانے کی باری تھی۔

''ایسے کیسے چھوڑ دیں۔'' وہ اسے گھورنے لگے۔

''چلیں، گھر چلتے ہیں۔'' تمثیل نے تولیا اٹھا کر باپ کو پکڑایا اور آگے بڑھا۔

''نہیں...... اب تو پوری بات سن کر ہی یہاں سے جائیں گے۔'' وہ بینچ پر دراز ہو کر پاؤں ہلاتے ہوئے بولے تو وہ مسکرا دیا۔

''صاف بات یہ ہے کہ ثمرانہ اگر اس گھر میں بہو بن کر آئے گی تو...... آپ کو روزانہ مزے، مزے کے کھانے ملیں گے۔ وہ بھی رفعت آنٹی کی طرح ایک سے ایک میٹھا پکانا جانتی ہے۔'' تمثیل نے باپ کے برابر میں بیٹھ کر خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تو ہے......'' وہ بھی بیٹے کی تقلید میں خلاؤں میں دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگے۔

''سوچیں...... اگر اماں اپنے خاندان سے کوئی لڑکی لے آئیں تو وہ بھی پھیکے سیٹھے کھانے پکانے کی ماہر ہو گی۔ روزانہ دال، سبزی بنا کر اپنی جان چھڑائے گی پھر آپ کا اور میرا کیا ہو گا؟'' تمثیل نے باتوں ہی باتوں میں باپ کو شیشے میں اتار لیا۔ رضا علی گہری سوچ میں پڑ گئے۔

یہ ان کی زندگی کی ایک تلخ حقیقت تھی، وہ شروع سے چٹ پٹے پکوانوں کے شوقین تھے۔ ان کی والدہ کے ہاتھ کے ذائقے کی دھوم پورے خاندان میں مچی ہوئی تھی، بھنیں دال بھی پکائیں تو بندہ انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔ ایسے گھر کے پروردہ رضا علی کے ساتھ ظلم کی انتہا یہ ہوئی کہ ان کی شادی کے لیے جس لڑکی کو پسند کیا گیا، اسے صفائی ستھرائی کا مراق تھا۔ ان کی ماں بہنوں نے اسی بات کو لڑکی کی سلیقہ مندی جانا اور بیاہ کر لے آئیں۔ یہ عقدہ تو بعد میں کھلا کہ عابدہ چولھا چوکی سے دو فٹ دور بھاگتی تھیں۔

اب ان کے یہاں صفائی کے بھی درجات بن گئے، روزانہ، ہفتہ وار اور ماہانہ...... دن میں دو مرتبہ ڈسٹنگ کرنا ان کا معمول تھا۔ ہر مہینے، دو مہینے میں فرنیچر کی سیٹنگ تبدیل ہو رہی ہے۔ کھڑکی دروازے کے شیشے چمکائے جا رہے ہیں۔ جالے اتارنے کے لیے بانس پر کپڑا باندھا جا رہا ہے۔ دیواروں کی رگڑائی ہو رہی ہے۔ ہفتے میں ایک بار کچن کا پورا سامان نکال کر مسالوں کے ڈبوں کی تجھائی کی جاتی...... سنک میں سوڈا ڈال کر رگڑا جاتا، اوون کی جالیاں تک دھو کر دھوپ میں لے جا کر سکھائی جاتیں کچھ اور نہیں ملتا تو وہ ایک دن پورا گھر دھو ڈالتیں مگر جہاں بات کھانا پکانے کی آتی تو وہ مارے باندھے پکاتیں۔ رضا علی کی سسرال میں بھی بہت سادہ کھانا کھایا جاتا تھا۔ اس لیے عابدہ کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا...... وہ اسی طرح کے ذائقوں کی

عادی تھیں۔
شادی کے شروع دنوں میں تو وہ گھر میں ہی میٹھا دہی جما کر روٹی سے کھانے پر اصرار کرتیں مگر شوہر کے احتجاج پر ہر دوسرے دن ماش یا چنے کی بھنی دال پکنے لگی۔ بڑی بچی، بچی کے بعد ہفتے میں ایک دو بار گوشت کی ہنڈیا پکاتیں، رات کے کھانے پر اہتمام کرنا ہوتا تو وہ کوئی آسانی سے پک جانے والی ترکاری یا بھجیا پکا لیتیں اور کچھ نہیں اور جس دن صفائی کا زیادہ کام ہوتا، اس دن کالی مسور کی دال، بگھارے چاولوں کے ساتھ یا آلو کی تہری پکا کر ہری چٹنی پیس کر ساتھ رکھ دیتیں...... جس دن یہ مینیو ترتیب پاتا۔ اس دن باپ بیٹے کی جان ہی جل کر رہ جاتی...... عابدہ نے شوہر کی اس خواہش کو کبھی سمجھا ہی نہیں۔ تمثیل کے یاد دلانے پر دل پر لگے زخم ہرے ہو گئے اور وہ کچھ سوچ کر مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

''توبہ...... ایک گھنٹے سے کچن میں کھڑی ہوں۔ پاؤں دکھ گئے۔'' عابدہ نے پکوڑوں کی پلیٹ اور چائے کا مگ لا کر شوہر کے سامنے پٹخا اور منہ بنا کر شکوہ کیا۔

''شکریہ...... ویسے اس کے ساتھ سوجی کا حلوا بھی بناتیں...... تو برسات کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔'' انہوں نے گرما گرم پکوڑوں سے لطف اٹھاتے ہوئے بیوی کو عادت کے مطابق چھیڑا۔

''ہاں اور کچھ رہ گیا ہو تو وہ بھی بتا دیں...... ایک ساتھ سب پکا کر لے آؤں......'' انہوں نے بھنا کر کہا تو رضا علی نے چائے کی چسکی لے کر نفی میں سر ہلایا۔

''میری تو کسی کو فکر ہی نہیں...... اکیلی جان سارا دن گھر کے کام دھندے کیسے نمٹاتی ہوں۔ سچ میں تھک کر چور ہو جاتی ہوں۔ اللہ نے بیٹی بھی نہیں دی کہ اس کے ہونے سے ہی کچھ سہولت ہو جاتی۔ ایک بیٹا ہے ...... وہ بھی زمانے بھر کا نکما اور کچھ نہیں تو انسان خود ہی اپنی بیوی کا خیال کر لے مگر عمر گزر گئی جناب کو صرف اپنے پیٹ کی فکر رہی۔'' وہ جل کر سناتی چلی گئیں۔

''عابدہ کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو...... اسی بات پر ایک بڑا اچھا خیال ذہن میں آیا ہے...... کیوں ناں ہم بیٹے کی شادی کر کے بہو گھر لے آئیں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔ اسی وقت اندر داخل ہونے والے تمثیل کا دل زور سے دھڑکا اور کان ان دونوں کی باتوں پر لگ گئے۔

''واہ...... میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔'' انہوں نے زندگی میں پہلی بار شوہر کی کسی بات کی یوں پُرزور حمایت کی۔

''بس تو میں کل آفس سے واپس آ جاؤں تو بڑی آپا کی رانیہ کا رشتہ لے کر چلتے ہیں۔'' انہوں نے آخری پکوڑا چٹخارہ لے کر ختم کرتے ہوئے اپنا خیال پیش کیا۔ تمثیل باپ کی بات پر ہکا بکا رہ گیا۔

''میں نے بابا کو ثمرانہ کے بارے میں سب بتا دیا تھا پھر بھی......'' وہ دکھی انداز میں سوچتے ہوئے اپنا چوڑا سینہ مسلتے ہوئے جا کر کونے میں سکڑ کر بیٹھ گیا۔

''کیا......؟ آپ کی بہن کی لڑکی ...... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا...... میں تو اپنے چھوٹے بھائی کی روزینہ کو اس گھر کی بہو بناؤں گی۔'' وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر میدان میں اتر آئیں۔ تمثیل ایک اور صدمے سے دوچار ہوا، اس نے بالوں کو نوچتے ہوئے باپ کو کٹیلی نگاہوں سے دیکھا۔ جن کے ہونٹوں کے کناروں سے شرارتی مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی۔

''بیگم...... ایک بات کان کھول کر سن لو اگر میرے خاندان کی کوئی لڑکی تمہیں بہو کے روپ میں پسند نہیں تو تمہارے میکے سے بھی تمثیل کی دلہن اس گھر میں نہیں آئے گی۔'' وہ اخبار ایک طرف پھینک کر بیٹے کو آنکھ مارتے ہوئے جوش سے بولے۔ تو اس کی جان میں جان آئی۔

''اچھا...... بابا کان گھما کر پکڑ رہے ہیں۔'' تمثیل نے ٹی وی لاؤنج میں جاری اس جنگ میں اب جا کر دلچسپی لینی شروع کی۔

"یہ تو بڑی مصیبت ہوگئی......تو کیا میرے بیٹے کے سر پر سہرا ہی نہیں سجے گا۔" عابدہ نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد دھیرے سے کہا۔

"ایک......بیچ کا راستہ ہے مگر تم اس پر بھی اکڑ جاؤ گی۔" رضا علی نے بیوی کے سامنے کھڑے ہو کر تھوڑا بن کر کہا۔

"بھلا کون سا راستہ......؟" وہ بے چینی سے ٹہلتے ہوئے بولیں......یہ ان کی عادت تھی جب بھی کسی بات پر ڈیپریس ہوتیں تو کمرے میں ہی چہل قدمی شروع کر دیتیں۔

"یہ جو پڑوس میں احتشام اختر صاحب رہتے ہیں۔کافی شریف اور دیکھے بھالے لوگ ہیں۔ان کی بچی ثمرانہ مجھے بہت پیاری اور تمیزدار لگتی ہے۔تمثیل کو بھی پسند ہے۔وہاں رشتہ لے کر چلتے ہیں۔" انہوں نے دھماکا کیا، عابدہ نے آنکھیں پھاڑ کر پہلے تو باپ بیٹے کو گھورا پھر فوراً ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

"چلو ٹھیک ہے......پھر کل بڑی آپا کے گھر جانے کے لیے تیار ہو جانا، میں مٹھائی کا ڈبا راستے سے لیتا آؤں گا۔" رضا علی نے ہاتھ اٹھا کر فیصلہ سنایا تو وہ گھبرا گئیں۔ بڑی نند کی بیٹی کو بہو بنانا ان کے لیے ناممکن بات تھی۔

"سنیں تو......" وہ شوہر کو منانے میں لگ گئیں۔کافی بحث و مباحثے کے بعد ان دونوں نے آخر عابدہ کو ثمرانہ کے لیے رضامند کر ہی لیا۔

"میں کل آفس کی طرف سے حیدرآباد جا رہا ہوں۔واپس آجاؤں تو اس مسئلے پر مزید بات ہوگی......ویسے میری ذاتی رائے ہے کہ اس اتوار کو رشتہ لے کر چلتے ہیں......چھٹی والا دن ہے......ان کے یہاں بھی سب لوگ موجود ہوں گے......باقی تم سوچ لینا۔" رضا علی نے فاتحانہ انداز میں صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا اور سونے کے لیے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔تمثیل نے بھی یہاں سے نکلنے میں ہی عافیت جانی۔اسے فون کر کے ثمرانہ کو یہ خوش خبری بھی سنائی تھی۔عابدہ سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئیں۔

☆☆☆

رضا علی کو حیدرآباد سے لوٹتے ہوئے رات ہوگئی، ان کا تکان سے برا حال ہو رہا تھا، بیوی نے کھانے کا پوچھا تو انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا اور ایک کپ چائے پینے کی خواہش کی۔عابدہ سر ہلاتی کچن کی طرف بڑھ گئیں۔اور وہ کپڑے بدل کر آئے تو صوفے پر ریلیکس ہو کر بیٹھ گئے۔

"سنو تمثیل بیٹا ایک کام کرو۔میں ربڑی کے تین پیک لایا ہوں......وہ کمرے میں ہی رکھے ہوئے ہیں اس میں سے ایک تو احتشام بھائی کے یہاں دے آؤ۔ان کے گھر سے کتنی بار مزے، مزے کی چیزیں آئی ہیں مگر ہم کچھ بھیجتے ہی نہیں......کیوں عابدہ؟" انہوں نے بیٹے کو ہدایت دیتے ہوئے چائے لیے اندر داخل ہوتی بیوی کو بھی گفتگو میں شامل کر لیا۔

کسوٹی

بیوی اس وقت تک اچھی نہیں کہلا سکتی جب تک شوہر اس کی تعریف نہ کرے۔شوہر بھی تب تک اچھائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک بیوی اس سے خوش نہ ہو......اسی طرح ساس، بہو، دیور، بھابی، نند و دیگر رشتے ایک دوسرے کی تعریف کے مرہونِ منت ہیں......(اپنے منہ میاں مٹھو چہ معنی) سوائے ماں، باپ کے جنہیں راضی کرنے کا خدا نے حکم صادر کر رکھا ہے۔مگر ہر بندے کی تعریف اسلام کی کسوٹی پر کرنی چاہیے نہ کہ ذاتی صوابدید پر اور ذاتی غرض کے لیے......بہتر ہے دوسروں سے اپنی تعریف و تنقید سننے کے بجائے خود کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھتے رہیں......پھر یوں ہوگا کہ اپنی برائی نظر آتی رہے گی اور دوسروں کی برائی کرنے سے بچ جائیں گے۔

از: کوثر خالد، جڑانوالہ

''جی...... ٹھیک ہے اور باقی دو کس کے لیے ہیں؟''
عابدہ نے سر ہلا کر حامی بھری اور پھر تجسس سے پوچھا۔
''ایک تو ہمیشہ کی طرح تم لوگوں کے لیے لایا ہوں...... اور دوسرا ایک باس نے خاص طور پر فرمائش کر کے منگوایا تھا......'' وہ مسکراتے ہوئے جوش سے بولے۔
''ہاں یہ تو اچھا کیا مگر ابھی تو نہیں کل ہی کھائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے عابدہ نے ٹشو سے ٹرے پر پھیلے چائے کے قطرے صاف کرتے ہوئے سر ہلایا، جو رضا علی کے کپ رکھنے پر چھلک گئے تھے۔

☆☆☆

پڑوس میں دیے جانے والا ربڑی کا یہ پیک ہی مصیبت کی جڑ بن گیا تھا۔ تمثیل جب دفتر سے واپس لوٹا تو ماں کو ٹہل ٹہل کر بڑبڑ کرتے پایا۔ اس نے حیران ہو کر وجہ پوچھی تو وہ جیسے پھٹ پڑیں۔
''ارے...... یہ رفعت خود کو سمجھتی کیا ہے؟ تم جو بھاگے، بھاگے رات کو ربڑی دینے گئے تھے۔ انہوں نے صبح اٹھتے ہی چپ چپاتے...... باس کے کچرا خانے میں پھنکوا دی۔'' انہوں نے بل کھا کر بیٹے کی بھی کلاس لی۔
''کیا...... مطلب...... ربڑی پھینک دی...... مگر کیوں...... اور آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی؟'' وہ لیپ ٹاپ کا بیگ میز پر رکھ کر گڑبڑا کر پوچھنے لگا۔
''میں نے سوچا...... چلو آج مکس سبزی پکاؤں...... ہمت کر کے صبح تھیلا تھام کر پچھلی روڈ پر واقع سبزی کی دکان جانے کے لیے نکلی تو دیکھا، رفعت کی ماسی زرینہ ہاتھ میں ربڑی کا وہ ہی شاپر تھامے کچرے خانے کی جانب تیز، تیز قدموں سے جا رہی تھی...... میں اس کے مشکوک انداز پر چونکی۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کیا...... وہ لوٹی تو میں نے پکڑ لیا...... اس سے پوچھا کہ کیا اس میں خالی پیک تھا؟ تو اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔
''ربڑی کیوں پھینکی؟'' میں نے پوچھا تو وہ ایک دم گھبرا گئی۔

''تو بی بی...... ہمیں کیا پتا...... باجی نے بس یہ ہی کہا تھا کہ ڈبا جلدی سے پھینک کر آؤں...... انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ زرینہ دھیان سے جانا پڑوسیوں کی نظر نہ پڑے مگر آپ نے خود ہی دیکھ لیا تو ہمارا کیا قصور...... مہربانی ہوگی باجی سے کچھ نہیں کہیے گا۔'' اس نے پریشان ہو کر جواب دیا اور گھر کے دروازے میں گھس گئی۔ عابدہ نے بیٹے کو پوری روداد سنائی۔
''اچھا...... یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے۔'' تمثیل نے پریشان کن نگاہوں سے ماں کو دیکھ کر کہا۔ وہ تو مجھ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔
''سب...... ہماری طرح سے نہیں سوچتے۔ ان کے یہاں کی ہر چیز کتنے شوق سے تعریفیں کر کر کے کھائی جاتی ہیں اور یہاں سے پہلی بار کچھ گیا تو انہوں نے منہ میں بھی نہیں رکھا، اٹھا کر کچرے کی نذر کر دیا۔'' وہ جلال میں کوئی معقول بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔ تمثیل خاموشی سے اٹھ گیا۔
''اتنی مشکل سے تو اماں...... ثمرانہ کے لیے مانی تھیں۔ اب تو ان کو انکار کا موقع مل گیا...... جانے رفعت آنٹی نے یہ حرکت کیوں کی۔ ثمرانہ بھی فون نہیں اٹھا رہی کہ کچھ پتا چل سکے۔'' تمثیل نے ٹیرس میں رکھی آرام دہ کرسی پر دراز ہو کر غصے میں سیل فون کو واپس جیب میں رکھا۔

☆☆☆

''عابدہ! کہاں ہو بھئی...... آج تو بڑا غضب ہو گیا......'' رضا علی نے گھر میں داخل ہوتے ہی شور مچا دیا۔
''شکر ہے بابا کی واپسی ہوئی۔'' تمثیل باپ کی آواز سن کر پُرسکون ہوا اور بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔
''غضب تو یہاں ہوا ہے......'' وہ بھی جوش میں میاں کو پڑوسیوں کی حرکت بتانے کے لیے کمرے سے نکلیں۔
''اچھا پہلے...... میری بات سنو پھر اپنی رام لیلا سنانا۔ اس بار ربڑی والے نے مروا دیا...... باسی ربڑی پکڑا دی...... صاحب نے جیسے ہی بڑے شوق سے

پیک کا ڈھکن کھول کر چمچہ بھر کر منہ میں رکھا......تھو......تھو......کرتے واش روم کی جانب بھاگے......میں نے حیران ہو کر انگلی سے ربڑی چاٹی تو عجیب سی بساند اٹھ رہی تھی، وہ کھٹی ہو چکی تھی۔ اتنی شرمندگی محسوس ہوئی کہ کیا بتاؤں......دس بار معذرت کی ان سے۔'' رضا علی کے انکشاف پر عابدہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، تاہم تمثیل نارمل کھڑا رہا۔ اس کی ثمرانہ سے بات ہو چکی تھی......وہ اصل بات سے واقف تھا۔

''میں تو یہ ہی سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ کہیں تم لوگ خراب ربڑی نہ کھالو......مگر دفتر میں اتنا مصروف دن گزرا کہ فون کرنے کا سوچتا ہی رہ گیا۔ جانے اختر بھائی کی فیملی کیا سوچ رہی ہوگی، سچ میں اتنا برا لگ رہا ہے۔ ہمارے گھر سے پہلی بار ان کے یہاں کوئی چیز بھیجی گئی وہ بھی سڑی ہوئی نکلی۔'' رضا علی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر اظہارِ افسوس کیا، ساری تفصیل سن کر جیسے عابدہ کی بولتی بند ہو گئی۔

''اچھا......تم کیا بات بتا رہی تھیں؟'' انہوں نے بیوی کی خاموشی اور اتری صورت بغور دیکھی تو پوچھا۔

''اماں......یہ ہی وجہ تھی کہ رفعت آنٹی نے خاموشی سے اسے کچرے خانے میں پھنکوا دیا، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ یہ بات آپ کو پتا چلے اور افسوس ہو......اسی لیے انہوں نے اپنی ماسی سے کہا تھا کہ خاموشی سے سب سے چھپا کر کچرے میں پھینک آؤ۔'' تمثیل نے دھیرے سے وضاحت پیش کی۔

''مجھ سے غلطی ہو گئی......جذبات میں آکر میں نے رفعت کی اچھائی نہیں دیکھی اور لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔'' عابدہ نے کھلے دل سے اپنی......بے وقوفانہ سوچ کا اعتراف کیا اور سارا واقعہ شوہر کے گوش گزار کر دیا۔

''اسے کہتے ہیں بلاوجہ کی بدگمانی......ایک مشہور طبیب کا کہنا ہے کہ بدگماں انسان کا علاج کرنا، اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنا دریا میں خودکشی کی نیت سے چھلانگ لگانے والے شخص کو بچانا۔'' رضا علی نے بیوی کو افسوس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے نصیحت کی۔

''بس......میں ان کی نیت کو سمجھ نہیں پائی۔'' عابدہ نے صفائی پیش کی۔

''بابا......اصل میں ساری بات ہمارے سوچنے کے انداز سے جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ جیسے کچھ لوگ ایک برتن کو آدھا بھرا دیکھ کر کہیں گے کہ آدھا خالی اور کچھ اسے آدھا بھرا ہوا کہیں گے۔ بس یہ منفی اور مثبت اندازِ فکر ہے......'' تمثیل نے باپ کو دیکھتے ہوئے ماں کو سمجھایا۔

''یہ بات تو سچ ہے......فی زمانہ......بدگمانی بڑھتی چلی جا رہی ہے......ہم کسی کے عمل میں سے مثبت نتیجہ ڈھونڈنے کے بجائے اس کے منفی پہلو پر نگاہ ڈالتے ہیں اور اپنے دل میں خواہ مخواہ کے ہی اندیشے پال کر بدگماں ہوتے چلے جاتے ہیں۔'' رضا علی نے ٹھوس انداز میں دلیل دی۔

''بس بھی کردیں۔ میں سچ میں بہت شرمندگی محسوس کر رہی ہوں۔'' عابدہ نے شوہر کو آنکھیں دکھائیں۔

''چلو شکر ہے......بات آپ کی سمجھ میں آ گئی۔'' انہوں نے مسکرا کر بات ختم کر دی۔

''بیگم ایک بات کہوں......ہم تو اپنی ہونے والی سمدھن کو مان گئے، انہوں نے کیسی خوش اسلوبی سے سارا معاملہ ہینڈل کیا، اگر وہ بھی کوئی منفی سوچ رکھتیں تو ہم سب کے خلاف بلاوجہ کا عناد پال کر ہمارے خلوص کو غلط رنگ دے سکتی تھیں اور یہاں آکر آپ سے لڑتیں کہ خراب چیز اُن کے گھر کیوں بھیجی گئی......مگر وہ بات کی تہ تک پہنچ گئیں......یہ ہی ان کی عقل مندی کی دلیل ہے......'' رضا علی نے بیوی کو چھیڑتے ہوئے سچائی بیان کی۔

''ٹھیک بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ ثمرانہ بھی اس گھر کی بہو بننے کے بعد اپنی ماں کی طرح اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرے گی اور ہم سب کے ساتھ مل جل کر رہے گی......'' اس بار عابدہ نے کھلے دل سے رفعت کو سراہا تو تمثیل کے وجود میں یک گونہ سکون بھر گیا تھا۔



مکمل ناول

سود و زیاں

عقیلہ حق

گاڑی دھول اڑاتی کچی سڑک پر چلے چلی جا رہی تھی۔

''اور کتنا رستہ باقی ہے؟'' سیاہ چادر میں اپنے وجود کو لپیٹے V8 کے خنک ماحول اور کشادہ صوفے نما آرام دہ سیٹ پر بے حد بے آرام بیٹھی اس عورت نے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھی اپنے وجود میں سمٹی ملازمہ سے پوچھا۔

''بس بیگم صاب تھوڑی دور رہ گیا ہے۔'' ہر آدھے گھنٹے میں اس کی تیسری مرتبہ پوچھے گئے سوال کا



اس کی ملازمہ نے وہی جواب دیا جو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے دے رہی تھی۔

اس نے ایک تھکی ہوئی نظر اپنی ملازمہ پر ڈالی اور پھر گہری سانس لے کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی...... اس کی سانسوں کی تھکن اس کی ملازمہ کو تکلیف دینے لگی...... ہاجراں نے ہمدردی سے اپنی مالکن کو دیکھا۔

اس وقت ایک عورت، دوسری عورت کی تکلیف کو محسوس کررہی تھی۔

''بی بی تھک گئیں کیا......؟ پانی دوں......'' ہاجراں نے اس کے چہرے پر بے حد تھکن دیکھ کر ہمدردی سے پوچھا۔

وہ خاموش رہی کہ بھلا صدیوں کی پیاس کبھی ایک گلاس پانی سے بھی بجھی ہے۔

''بی بی پریشان نہ ہوں، دیکھیے گا اللہ کیسا کرم کرے گا...... آپ مجھے ہاتھ اٹھا کر دعا دیں گی۔'' ہاجراں نے نرمی سے اس کے گھٹنوں کو دباتے ہوئے کہا۔ اسے اپنی مالکن سے بہت محبت تھی...... وہ چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتی تھی...... اس کے ہر دکھ کی گواہ تھی۔

اس نے ایک نظر ہولے، ہولے پیر دباتی ہاجراں کو دیکھا اور پھر بہت ضبط کے ساتھ آنکھ میں مچلتے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کی لیکن پھر بھی اس کی آنکھوں کے نم گوشے ہاجراں کی جہاندیدہ نظروں سے چھپ نہ سکے...... ہاجراں کے دل کو تکلیف ہوئی۔

''بی بی آپ کیوں غم کرتی ہیں...... آپ اس طرح نہ روئیں...... مجھے بہت تکلیف ہورہی ہے، میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔''

''محبت......'' لفظ محبت اس کے سینے میں چبھا...... اس نے چونک کر اپنی ملازمہ کی طرف دیکھا اور پھر سیاہ شیشوں کے پار جیسے کچھ ڈھونڈنے لگی۔

☆☆☆

سیاہ جارجٹ کی ساڑی میں کچھ چھپا کچھ جھلکتا بدن، بہترین پارلر سے ہوا میک اپ، صراحی دار گردن میں سجا ہیرے کا نیکلس...... کانوں میں جھولتے ڈائمنڈ کے ائر رنگز...... خوب صورت ریشمی بالوں کا گردن پر ڈھلکا ہوا بڑا سا جوڑا...... ہاتھوں میں شعائیں مارتا ڈائمنڈ کا بریسلیٹ...... مخروطی انگلیوں میں سجی قیمتی ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں...... وہ اس وقت قلوپطرہ کو مات دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ اس نے ایک شانِ تفاخر سے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھا۔

وہ حسین تھی...... اسے حسین نظر آنا آتا تھا۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل پر سجی بہت ساری پرفیوم کی بوتلوں میں سے اس نے اپنی پسند کی بوتل اٹھا کر اپنے وجود کو مہکایا پھر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا، علی کے آنے کا وقت ہورہا تھا...... باوقار طریقے سے چلتی ہوئی وہ کمرے سے باہر آگئی۔

ہاجراں نے کینڈل روشن کرتے ہوئے اپنی مالکن کو دیکھا اور اس کی آنکھ کا اشارہ پاتے ہی سارے ملازمین کو ان کے کوارٹرز میں بھیج دیا۔

اس نے ایک نظر نفاست سے سجی ڈائننگ ٹیبل کو دیکھا...... ٹیبل کے بیچ میں جلتے شمع دان میں سجی خوب صورت موم بتیاں ایک سحر انگیز رومانوی تاثر پیدا کررہی تھیں...... اس نے ہاجراں کو جانے کا اشارہ کیا...... اور پھر وہ لاؤنج میں چلی آئی۔

لاؤنج میں لگے گلاس وال سے نظر آتے وسیع و عریض لان میں جلتی دودھیا روشنی جب سوئمنگ پول پر پڑتی تو ایک حسین عکس گلاس وال پر پڑتا۔

اس نے کارنر ٹیبل پر چاندی کے فریم میں سجی اپنی شادی کی تصویر کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا...... وقت نے اس کو کتنا بدل دیا...... ایک لمحے کو وہ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔

آج اس کی ویڈنگ اینورسری تھی۔ وہ اسے اپنے محبوب شوہر کے ساتھ اکیلے ہی سیلی بریٹ کرنا چاہتی تھی جبھی کسی پارٹی کا اہتمام نہیں کیا تھا اور اس نے علی کو صبح خاص تاکید کی تھی کہ جلد گھر آجائے...... اور علی نے

وعدہ کیا تھا۔

وہ بے حد بے چین تھی...... علی کا موبائل فون بند جا رہا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر سجی خوب صورت موم بتیاں اس کے وجود کی طرح جل رہی تھیں...... گھڑی کی سوئیاں کب کسی کا ساتھ دیتی ہیں...... وہ دوڑے چلی جا رہی تھیں۔ اس نے موبائل اٹھا کر علی کا نمبر ایک بار پھر ڈائل کیا...... لیکن فون بند تھا۔

رات آہستہ، آہستہ بھیگ رہی تھی اس کی آنکھوں کی طرح لان میں جلتی دودھیا روشنی بند ہو گئی تھی۔ موم بتیاں جل، جل کر ختم ہو چکی تھیں۔ وہ آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہوئی اسے ہر آہٹ سے تکلیف ہو رہی تھی۔ چند گھنٹوں پہلے ہنستی مسکراتی ڈریسنگ ٹیبل نہ جانے کیوں شرمندہ، شرمندہ سی تھی۔ اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس سے آنکھیں چرائیں۔ اور پھر آہستگی سے سارا زیور اتار دیا۔

جوڑے سے پن نکال کر...... آبشاروں کو شرماتے بال کھول دیے اور پھر ان ہی بالوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی...... ہر سال کی طرح......

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، اس کی آنکھ کھل گئی...... چند لمحوں تک وہ اندھیرے میں آنکھیں کھولے لیٹی رہی...... اور جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں تو اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل پر رکھا لیمپ آن کر دیا۔

ذرا گردن ترچھی کر کے اس نے برابر رکھے تکیے کی طرف دیکھا...... تکیہ آج بھی اکیلا تھا اور بستر بے شکن...... کئی لمحوں تک غیر ارادی طور پر وہ خالی بستر پر ہاتھ پھیرتی رہی...... آج بستر پر کوئی ہلچل نہیں اس کی زندگی کی طرح ... اعصاب شکن لمحوں کے بعد وہ اٹھ بیٹھی...... کئی لمحے دبیز اٹالین قالین پر وہ بے خیالی سے پیروں سے چپل ٹٹولتی رہی۔

نرم و ملائم فر والی چپل میں پیروں کو ڈال کر وہ کھڑی ہو گئی...... سامنے آئینے میں اس کا عکس تھا، وہ آج بھی روزِ اول جیسی تھی۔ چند لمحے وہ خاموش کھڑی آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھتی رہی کہیں کوئی کمی...... کوئی نقص...... کچھ...... کچھ تو لیکن بے سود......

پہلے وہ خوب صورت تھی اور اب حسین...... چند لمحے وہ اپنے حسین چہرے کو دیکھتی رہی...... کمرے میں گھٹن کا احساس بڑھنے لگا تو اسے سانس لینے میں تکلیف محسوس ہونے لگی اور وہ نرم دبیز قالین کو اپنے حسین پیروں سے روندتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی۔

سارے گھر میں ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ قیمتی فرنیچر، اعلیٰ ڈیکوریشن، قیمتی پینٹنگ سے سجی دیواریں...... نفاست سے سجا گھر اس کو گھر نہیں مکان لگا۔

وہ چند لمحوں تک خالی، خالی نظروں سے سامان سے سجے پُرتعیش مکان کو دیکھتی رہی...... سامنے دیوار پر لگی قدِ آدم تصویر میں اس کے دائیں بائیں اس کے دونوں بیٹے کھڑے تھے...... بے اختیار دائیں اور بائیں گردن گھما کر اس نے اپنے بیٹوں کو ڈھونڈا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ زندگی کے بہت سے مقامات کی طرح اس وقت بھی وہ اکیلی تھی...... تنہائی اس کے اندر بلکنے لگی۔

تنہائی کی سسکیوں کو دباتی وہ ٹیرس پر چلی آئی...... دور...... دور تک پھیلا ہوا وسیع و عریض لان، آسمان پر چمکتا چودھویں کا چاند، وہ خاموشی سے کھڑی چاند کو تکتی رہی...... اس کا دل چاہا وہ چاند کی بڑھیا سے بیٹھ کر بہت ساری باتیں کرے...... لیکن وہ اس کی دسترس سے دور تھی۔ بہت ساری چیزوں کی طرح...... وہ اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔

وہ بے حد خوب صورت تھی...... پُرتعیش گھر میں رہتی تھی، وہ ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ دو لائق بیٹوں کی ماں تھی۔ وہ ایک بہت کامیاب بزنس مین کی بیوی تھی۔ کوئی خواہش ایسی نہیں تھی جو پوری نہ ہوئی ہو...... وہ جو چاہتی مل جاتا، وہ جو سوچتی ہو جاتا۔ اس کا پرس ڈالرز، اے ٹی ایم کارڈز اور کریڈٹ کارڈز

سے بھرا رہتا۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں تھا جہاں وہ نہیں گئی ہو۔

بظاہر ایسا لگتا کہ دنیا اس کی مٹھی میں ہے...... لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے...... مائیں اپنی بیٹیوں کے لیے اس جیسے نصیب کی دعا کرتیں۔ لیکن اس کے باجود اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ وہ سسک رہی تھی۔

گیٹ پر کھڑا گارڈ اسے ٹیرس پر کھڑے دیکھ چکا تھا لہٰذا الرٹ بیٹھا اور پھر گیٹ پر گاڑی کا ہارن بجنے لگا۔

باوردی ڈرائیور گاڑی اندر لے کر آرہا تھا، رات گہری تھی لیکن وہ دیکھ سکتی تھی اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا...... جسے دیکھنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

زندگی میں بہت سارے لمحے ایسے ہوتے ہیں کہ ان لمحوں میں ہم اپنے زندہ رہنے پر حیران رہ جاتے ہیں اور ایسے ہی ایک لمحے میں وہ کھڑی تھی۔

اسے ایسا لگا اگر چند لمحے وہ یونہی کھڑی رہی تو پتھر کی ہوجائے گی...... مرجائے گی...... لیکن اس کے باوجود وہ کھڑی ہوئی تھی۔

دھندلی ہوتی آنکھوں سے وہ اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموش تھی...... ساکت تھی...... لیکن اس کی روح سسک رہی تھی...... اس کا دل دہائیاں دے رہا تھا۔ اس کے لب ایک دوسرے میں پیوست تھے اور اس کے جسم کا رواں، رواں کہہ رہا تھا کہ نوبت یہاں تک آپہنچی......

☆☆☆

''بالآخر نوبت یہاں تک آگئی۔'' دیبا ہنسی۔

''اوہ یس مائی ڈیئر......'' رومی کی خوشی اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

''یا اللہ دیبا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ......''

''بس بہن رہنے دو، تم تو اس قدر مر رہی تھیں، اس قدر نفلیں اور وظیفے تم نے پڑھے ہیں اگر وہ تیمور بھائی کے لیے نہیں پڑھے ہوتے اور تم ان کا ثواب اپنی آخرت کے لیے ذخیرہ کرلیتیں تو یقیناً تمہاری قبر میں جنت کی کھڑکی کھل جاتی۔'' دیبا نے ہاتھ سے کھڑکی کا اشارہ کیا۔

''یا اللہ میں تو ہر وقت یہ سوچتی رہتی تھی کہ تم کو اگر تیمور بھائی نہ ملے تو کسی نہ کسی دن تم ہم سب کو پنکھے میں لٹکی نظر آؤ گی۔''

''خیر اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' رومی نے آنکھوں میں مصنوعی خفگی بھر کر کہا۔

''مائی ڈیئر دیبا، کل خالہ جان آرہی ہیں میرے لیے تیمور کا رشتہ لے کر...... تم سوچ نہیں سکتیں دیبا میں کتنی خوش ہوں۔ آج تو میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں بھی پیار کرلوں۔'' رومی نے کہتے، کہتے ایک آنکھ دباتے ہوئے دیبا کو بتایا۔

''تو بہن جتنا تم ان کے عشق میں لیلیٰ بنی پھر رہیں تھیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا ناں۔'' دیبا نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

''تم اپنی بکواس بند ہی رکھو، خدا کی قسم دیبا تم کتنا بولتی ہو۔'' دیبا کی کھری، کھری باتوں پر رومی جل ہی گئی۔

''ارے میری جان میں تو مذاق کررہی تھی۔'' دیبا نے ہنستے ہوئے رومی کو گلے سے لگالیا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ دیبا، رومی سے بے حد محبت کرتی تھی لیکن اس کی پارہ صفت اور جلد باز فطرت سے اکثر خائف بھی ہوجاتی تھی۔

دیبا ایک ڈسپلینڈ لڑکی تھی...... اور وہ چاہتی تھی کہ رومی کے مزاج میں بھی ٹھہراؤ آجائے۔

''پتا ہے دیبا، تیمور نے خود میرے لیے خالہ جان سے کہا ہے...... میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تیمور...... تیمور خود میرے لیے خالہ جان سے کہیں گے۔'' رومی کا لہجہ عجب یقین اور بے یقینی کی کیفیت لیے تھا۔

''کیوں، تم میں کیا کمی ہے؟ جو تم کو حیرت ہورہی ہے...... ارے مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ موصوف بڑے سنجیدہ بنے پھرتے ہیں...... لیکن ان کے روز...... روز کے چکر ضرور رنگ لائیں گے۔'' دیبا نے رومی کو چھیڑا۔

''خیر ایسی کوئی بات نہیں ہے، تیمور تو بابا کے پاس آتے تھے......'' رومی نے اپنا کمزور سا دفاع کیا۔

''اوہ...... ابھی تو تمہاری خالہ آئی بھی نہیں ہیں اور بھائی کا لاحقہ ہٹ گیا...... اور تیمور بھائی، تیمور ہوگئے...... اب مجھے لگتا ہے چند دنوں کے بعد تم ان کو تمی وغیرہ نہ کہنے لگو...... ویسے رومی تم ان کو تمی نہ کہنا...... میری پھپھو کے ڈوگی کا نام تمی ہے۔'' دیبا نے حد درجہ سنجیدگی سے کہا تو رومی اس کی حرکت پر کھول کر رہ گئی۔

''جاؤ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' رومی نے منہ پھلایا۔

''ارے، ارے میری جان...... میری جذباتی حسینہ میں تو تم کو چھیڑ رہی تھی۔ سوچا آخری موقع ہے میں چھیڑ لوں پھر تو تیمور بھائی...... اوہ معاف کیجیے گا آپ کے تیمور آپ کو چھیڑا کریں گے۔'' دیبا نے اسے گدگدایا تو وہ ہنستی چلی گئی۔

''اور میری جان انکل سے ملنے آنا تو فقط ایک بہانہ تھا...... دراصل وہ دیدارِ یار کے لیے آتے تھے اور تم شکر کرو کہ میں کتنی ذہین ہوں کہ سب سے پہلے میں نے ہی تم سے کہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے لیکن میرے خیالوں اور میری سوچ سے بھی زیادہ یہ تو پوری دال ہی کالی نکلی......''

اور دیبا کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی رومی کا اس کے اندازِ بیان پر قہقہہ نکل گیا تھا۔

☆☆☆

تیمور، رومی کا خالہ زاد تھا...... رومی کی ایک ہی تو خالہ تھیں جن کے تین بچے تھے سب سے بڑے تیمور جو ایم بی اے کرنے کے بعد ایک فرم میں ملازمت کر رہے تھے...... پھر رضا جو یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور سب سے چھوٹی نازیہ جو رومی کی ہم عمر تھی۔

رومی اپنے ماں، باپ کی ایک ہی بیٹی تھی۔ احمد علی سرکاری ملازم تھے اور کیونکہ وسائل اور مسائل کا ٹکراؤ نہیں ہوتا تھا تو زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔

خالہ فردوس ساری زندگی بہاول پور میں رہی تھیں...... چند سال پہلے شوہر کی وفات کے بعد وہ کراچی منتقل ہوئیں تو برسوں میں ملنے والے کزن اکثر ملنے لگے اور رسمی دعا سلام دوستیوں میں بدل گئی...... چھ فٹ سے نکلتا قد اور چوڑے شانوں والا سنجیدہ سا تیمور...... دیکھتے ہی رومی کے دل میں اتر گیا۔ وہ جو محبت کو فضول کہتی تھی...... تیمور کی محبت میں ڈوبتی چلی گئی...... تیمور نے کبھی اشارتاً بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی...... لیکن وہ سوچتی، تیمور اس سے محبت کرے یا نہ کرے وہ تو اسے چاہتی رہے گی۔

چند ماہ سے احمد علی کافی بیمار تھے۔ جب بھی انہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہوتا تو تیمور چلا آتا...... جس کے ساتھ وہ ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے...... وہ واقعی ان کے بیٹے کی کمی بھی پورا کر رہا تھا۔

تیمور کی شخصیت سحر انگیز تھی یا اس کا اخلاق بہت شاندار تھا۔ رومی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے...... ہاں لیکن وہ اتنا ضرور جان گئی تھی کہ وہ تیمور کی محبت میں بہت شدت سے گرفتار ہوگئی ہے...... وہ چپکے، چپکے تیمور کو دیکھتی...... اس کی پسند اور ناپسند کو نوٹ کرتی...... وہ کس بات پر ہنستا ہے اور کس بات پر ناراض ہوتا ہے...... رومی سب جاننے لگی تھی...... وہ دن رات تیمور کی پسند میں ڈھلنے کی کوشش کرتی...... کبھی، کبھی اسے احساس ہوتا کہ وہ یک طرفہ محبت کا شکار ہے...... اور یک طرفہ محبت کیسے دکھ دیتی ہے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

بہت دفعہ ایسے مواقع بھی آئے کہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور اسے ایسا لگا کہ بس اب۔ اب تیمور اس سے اظہارِ محبت کرنے والا ہے...... لیکن چند سیکنڈز کے بعد ہر چیز اپنے مقام پر واپس آجاتی اور اسے ایسا لگتا...... جیسے وہ صحرا میں سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔

وہ اپنی عزیز از جان دوست دیبا کے آگے دل کھول کر رکھتی...... اور دیبا اسے تسلی دیتی کہ تیمور خواہ مخواہ ہی ہیرو بنتا ہے۔ درحقیقت وہ بھی رومی کو چاہتا ہے۔

"دیکھ لینا وہ کتنی جلدی اپنے حالِ دل سے باخبر کرے گا تمہیں۔"

اور دیبا کی تسلی اسے پھر سے نئے خواب بننے پر مجبور کر دیتی...... لیکن تیمور کی لاتعلقی اسے اکثر مایوس کر دیتی...... لیکن آج جب وہ کالج سے گھر پہنچی تو اماں کی باتوں نے جیسے اس پر دھنک انڈیل دی۔

اور اس وقت دیبا کے سامنے وہ یقین کی سیڑھیوں پر کھڑی بے یقینی کی باتیں کر رہی تھی۔

"اور تمہاری امی کی کیا رائے ہے؟" دیبا نے پوچھا۔

"لو امی اور ابا کو تو تیمور دل و جان سے پسند ہیں، وہ دونوں تو بے حد خوش ہیں...... یا اللہ دیبا، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھے میری محبت اتنی آسانی سے مل جائے گی۔"

"پھر وہی بات...... میڈم میں نے آپ سے پہلے بھی کہا ہے آپ کو آسانی سے تو خیر نہیں ملی...... جتنا تم نے تیمور بھائی کے لیے دعائیں کی تھیں اگر اللہ سے ہدایت مانگتیں تو وہ بھی ملتی اور بیچ میں تیمور صاحب بھی مل جاتے۔ خیر تمہیں بہت، بہت مبارک ہو...... اب اتنی خوشی کا اظہار نہ کرو کہ تمہاری امی کو یہ احساس ہو جائے کہ بیٹی پاگل ہو گئی ہے۔" دیبا نے ہنستے ہوئے کہا تو رومی بھی ہنس پڑی۔

☆☆☆

"تم...... تم میری جان ہو رومی...... جب میں نے تم کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا...... تو مجھے ایسا لگا تھا میں جسے ڈھونڈ رہا تھا وہ تم ہو...... تم صرف میرے لیے بنی ہو...... مجھے اب تک کوئی لڑکی اس لیے اچھی نہیں لگی کیونکہ تم...... تم کو اللہ نے میرے لیے بنایا تھا۔" وہ شب وصل تھی...... جو تیمور اپنی بے تابیاں اس کے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔

"زندگی بہت حسین ہے۔" وہ تیمور کی بانہوں میں کھی سوچ رہی تھی۔ "مجھے تیمور مل گئے اب زندگی میں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

کیا واقعی اسے کچھ اور نہیں چاہیے تھا۔

☆☆☆

تیمور کے کندھے ذمے داریوں سے جھکے ہوئے تھے۔ بیمار ماں، بھائی کی پڑھائی اور جوان بہن، رومی کے والدین گو کہ مالدار نہیں تھے لیکن گھر میں مسائل کم اور وسائل زیادہ تھے سو رومی بہت ناز و نعم سے پلی تھی۔

لیکن شادی کے بعد اس پر زندگی کی بہت ساری حقیقتیں آہستہ آہستہ کھلیں......

اس کی شادی کے چند ماہ بعد ہی ایک رات تیمور کی ماں جو سوئیں تو پھر اُن کی آنکھ نہ کھل سکی...... رضا کی پڑھائی اور نازیہ کی ذمے داری اس کے کندھوں پر آ گئی۔ جسے تیمور کی محبت کے سہارے اس نے خوش اسلوبی سے نبھایا۔

وہ جو ہمیشہ بے قرار رہتی تھی اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

☆☆☆

رومی، تیمور کے ساتھ بہت خوش اور مطمئن تھی اس کی سارے دن کی تھکن تیمور کی ایک محبت بھری نظر سے دور ہو جاتی اور وہ پھر سے تازہ دم ہو جاتی۔

وہ دونوں روز شام کو موٹر سائیکل پر ناشتا لینے جاتے تو راستے میں رک کر تیمور اس کو میٹھا پان ضرور کھلاتا اور جو جب اجازت دیتی تو کبھی، کبھی اس کی کلائیوں میں موتیا کے گجرے بھی سجا دیتا...... اور پھر ساری رات موتیا کی خوشبو اُن کی محبت کی طرح جاگتی رہتی۔

پھر ان دونوں کی محبتوں کی گواہی کے طور پر اللہ نے رومی کو دو بیٹوں سے نوازا۔

تیمور اور رومی بہت خوش تھے، دو کمروں اور کچے صحن والا گھر جس کے آنگن میں اس کے بچے کھیلتے تھے اور جس میں بچھے تخت پر وہ چاندنی راتوں میں تیمور کے کندھے پر سر رکھ کر تاروں سے باتیں کرتی تھی۔ تیمور اس کا احسان مند تھا کہ اس نے اس کے مکان کو گھر بنا دیا تھا اور وہ بہت مطمئن اور خوش تھی کہ اللہ نے اس کو زمین پر جنت کا ایک ٹکڑا دے دیا۔

وہ اکثر تیمور سے کہتی کہ اس کی زندگی اس کی

محبتوں سے مالا مال ہے اور وہ دنیا کی مالدار ترین عورت ہے اور اسے اب کسی چیز کی طلب نہیں ہے۔

کیا واقعی اس کی زندگی مکمل تھی۔

کیا واقعی اب اسے کچھ اور نہیں چاہیے..... کون جانے۔

☆☆☆

آج اسے زندگی میں پہلی دفعہ ٹانگوں میں شدید درد کا احساس ہوا..... حالانکہ وہ زیادہ چلی بھی نہیں تھی لیکن اسے لگ رہا تھا جیسے اب کبھی وہ زمین پر پیر نہیں رکھ سکے گی..... اور اگر وہ زمین پر پیر رکھے گی تو اس کے وجود کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

اور آج جب وہ اپنی الماری کھول کر کھڑی ہوئی تو وہ سارے کپڑے جو وہ بہت شوق اور سلیقے سے پہنتی تھی وہ سب اسے پرانے، بدرنگ لگے..... وہ کتنی ہی دیر الماری کے پٹ کھولے کھڑی رہی۔

☆☆☆

''آج جب نبیل اور شکیل کو میں اسکول چھوڑنے گئی تو وہاں دیبا سے ملاقات ہوگئی.....'' رات کے کھانے کے بعد تیمور کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

''دیبا تو شاید ملک سے باہر رہتی ہے ناں؟'' تیمور نے چائے کا کپ لے کر بیڈ پر کھسک کر رومی کے لیے جگہ بناتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں امریکا چلی گئی تھی شادی کے بعد کچھ عرصے پہلے ہی پاکستان واپس آئی ہے۔ مجھے ملی تھی..... بالکل بدل گئی ہے..... کتنی عام سی صورت شکل تھی لیکن نصیب دیکھو لمبی سی گاڑی جسے ڈرائیور چلا رہا تھا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیگمات کی طرح بیٹھی ہوئی تھی، میں پیدل جا رہی تھی مجھے دیکھ کر گاڑی روک لی تو مجھے بہت شرم آئی، میرا حلیہ اتنا خراب..... اور وہ.....''

''ارے یار..... دوستوں میں کیسا حلیہ، کیسی شرم تم دونوں بچپن کی سہیلیاں ہو، اب اس کا نصیب..... لیکن جانِ من دیبا کتنی ہی مالدار ہو..... تم سے زیادہ مالدار نہیں..... ارے تم تو تیمور کی بلکہ بادشاہ تیمور لنگ کی ملکہ ہو..... میری جان.....'' تیمور نے ہنستے ہوئے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

تب رومی نے ایک خاموش بے تاثر نگاہ اس کے ہنستے ہوئے چہرے پر ڈالی..... اور تیمور کو حیران اور ششدر چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ جانتی تھی جو مقدر میں ہو وہ ضرور ملتا ہے..... مگر وہ بے چین تھی..... کتنے ہی دن ہو گئے..... وہ تیمور کے ساتھ موٹر سائیکل پر باہر نہیں نکلی..... اسے لگتا کہیں سے دیبا نکل آئے گی..... اور اس کی لمبی سی سیاہ گاڑی کے پہیوں کے نیچے اس کی موٹر سائیکل اور اس کی انا کچل جائے گی۔ دیبا کئی دفعہ اس کے گھر آ چکی تھی..... وہ..... وہی دیبا تھی ہنستی مسکراتی..... پُرخلوص سی دیبا..... لیکن جب دیبا ہنستی تو اسے لگتا جیسے وہ اس پر ہنس رہی ہو..... دیبا کے ڈیزائنرز سوٹ، اس کا مہکتا پرفیوم، اس کا برانڈڈ ہینڈ بیگ اسے سانپ کی طرح ڈستے..... رومی ایسی نہیں تھی وہ صابر وشاکر قناعت پسند لڑکی تھی لیکن وہ بدل رہی تھی یا پھر وہ بدل گئی تھی۔

''تم بھی سوچتی ہوگی..... لڑکیاں ایک سے بڑھ کر ایک کپڑے، زیور بناتی ہیں، لمبی لمبی گاڑیوں میں گھومتی ہیں..... اور ایک میں ہوں تم کو ایک میٹھا پان یا ایک ٹھنڈی پیپسی ہی پلوا سکتا ہوں۔'' آج جب وہ دونوں ناشتا لینے کے لیے بیکری پر کھڑے کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو تیمور نے اس سے کہا۔

''نہیں جناب، میں اتنی سطحی سوچ رکھنے والی عورت نہیں ہوں..... میں اپنے حال پر خوش اور مستقبل سے پُرامید ہوں۔ دوسروں کی چیزوں کو حسرت سے دیکھنے والی عورتیں مجھے زہر لگتی ہیں، میرے سامنے اگر کسی کی دولت کا انبار بھی آ جائے تو میرے نزدیک تمہاری تنخواہ کا بالکل ہلکا سا لفافہ ہی اہمیت کا حامل ہے۔'' رومی نے پُراعتماد لہجے میں تیمور کو جواب دیا۔

''تم تو یہی کہتی تھیں رومی پر تم کو اب کیا ہوا۔'' تیمور جو..... دیبا سے ملاقات ہونے کے بعد رومی میں

ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھ رہا تھا...... جھنجلاتی ہوئی، روٹھی ہوئی، رومی کو دیکھ کر اپنے آپ سے گویا ہوا۔
وہ اپنی حتی المقدور کوشش کر رہا تھا کہ رومی کو اس فیز سے باہر نکال لائے لیکن رومی...... رومی بدل رہی تھی...... رومی کی سوچ بدل گئی تھی۔ اس کی ترجیحات ...... اس کی خواہشات بدل رہی تھیں اور تیمور جو اس سے بہت محبت کرتا تھا، وہ اس کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

''میرا دل چاہتا ہے میرے پاس بڑی سی گاڑی ہو...... خوب صورت سا گھر ہو...... گھر میں ہاتھ باندھے مؤدبانہ انداز میں گھومتے، کام کرتے ملازمین کی لمبی سی قطار ہو...... میں بیگمات کی طرح رہوں...... میرے کچن میں شیف ہو...... بڑی، بڑی بیگمات کی طرح بڑا سا ہینڈ بیگ لے کر بڑے، بڑے مالز میں جاؤں...... ڈیزائنرز کے بوتیک میں جب داخل ہوں تو لپک کر سیلز مین آگے بڑھے اور مؤدبانہ انداز میں پوچھے۔
Madam may I help you
اور میں ایک لمحے رک کر ترچھی نظر سے اس کی طرف دیکھوں اور آگے بڑھ جاؤں اور وہ میرے پیچھے، پیچھے چلتا رہے...... میں مہنگے ڈیزائنرز کپڑے گھر میں پہنوں، میں گرمیاں اٹلی میں اور سردیاں آسٹریلیا میں گزاروں...... یہ سب خواہشیں ایک طرف لیکن تیمور، تیمور کے بارے میں تو سوچو...... وہ کیا کرے......'' وہ جو خواہشوں کے جنگل میں بھٹک رہی تھی...... اس کے اندر سے کسی نے آواز بلند کر کے اسے ٹوکا۔
''میں نہیں جانتی...... مجھے نہیں پتا...... تیمور کچھ بھی کرے ایسی اچھی اور پُرتعیش زندگی پر میرا بھی تو حق ہے۔'' اس نے سختی سے اس اندر کی آواز کو کچلنا چاہا جو اس کی خواہشات کو لگام دینا چاہ رہی تھی۔
''میں نے تیمور کے لیے بہت کچھ کیا ہے لیکن بس اب میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔'' وہ اپنے آپ سے گویا ہوئی۔
''اور تیمور......؟'' اس کے اندر سے سوال اٹھا۔
''بھاڑ میں جائے۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور کہیں تقدیر کے صفحے پر ثبت ہو گیا۔
یقیناً وہ محبتوں میں وفادار ثابت نہیں ہو رہی تھی اور جو محبت میں وفا نہیں نبھاتے...... وہ کیسے ہوتے ہیں اور کیا کہلاتے ہیں......؟ وہ فی الفور اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

اور پھر رومی کے سوچنے کے انداز اور الفاظ نے رابعہ بیگم کو ساکت کر دیا۔
''میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی...... کہ رومی کی شخصیت اندر سے اتنی بدگمان اور مسخ ہو گئی۔'' رابعہ بیگم نے چند منٹوں میں کوئی پندرہ دفعہ اپنے آپ سے پوچھا۔
''رومی...... تمہیں اللہ نے کیا نہیں دیا، گھر بار، شریف محبت کرنے والا شوہر اور دو پیارے سے بیٹے...... تمہیں زندگی میں اور کیا چاہیے۔'' انہوں نے سرد لہجے میں اس سے پوچھا۔
''تم اللہ کی بہت ساری نعمتوں کو چند دنیاوی چیزوں کے لیے نظر انداز کر سکتی ہو...... تم تو اس اللہ سے بدگمان ہو رہی ہو جو بے مانگے نعمتیں عطا کرتا ہے...... جو اتنا مہربان و کریم ہے کہ ہماری بداعمالیوں کے سدھارنے کو قدم، قدم پر مواقع فراہم کرتا ہے جو تم مانگتی ہو وہ دیتا ہے اور جو تم سوچ رہی ہوتی ہو وہ سب جانتا ہے۔'' رابعہ بیگم اسے ایسے سمجھا رہی تھیں۔ جیسے وہ کوئی نوعمر لڑکی ہو۔
''اماں آپ میرے لیے دعا کیجیے۔'' رومی کے ہونٹ کپکپائے۔
''بیٹا! میں تو تمہارے کہے بغیر تمہارے لیے دعا کرتی ہوں۔ بس بیٹا تم اس کی رضا میں راضی ہو...... یہ اچانک ناشکری کے کلمات کیوں تمہاری زبان سے نکل گئے۔ مت ضد کرو بیٹا۔ اللہ سے ضد نہ کرو......''
''میں ضد نہیں کر رہی اماں...... میں تو مانگ رہی ہوں۔ اللہ کے اتنے خزانے ہیں...... وہ ہمارے لیے

ہی تو ہیں ناں...... وہ سب کو دیتا ہے، میں اگر مانگ رہی ہوں تو جرم تو نہیں کر رہی ہوں ناں......"

"تم کیا چاہتی ہو؟" اب اماں اس کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"میں چاہتی ہوں دنیا کا ہر عیش اور آرام میرے قدموں تلے ہو...... میں چاہتی ہوں دنیا میری مٹھی میں ہو۔" رومی کی بات پر رابعہ بیگم اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"بے وقوف...... عاقبت نا اندیش...... دنیا مانگتی ہے، ناشکری کہیں کی...... اتنا سب کچھ پا کر بھی اپنے آپ کو تہی دست سمجھتی ہے۔"

ماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مگر وہ بولتی چلی گئی کہ میں تو اپنے اللہ سے مانگ رہی ہوں اور اللہ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں......

☆☆☆

اور اللہ نے واقعی اس کی دعا قبول کر لی۔

تیمور نے تھوڑے سے سرمائے سے کاروبار شروع کیا اور پھر جلد ہی اسے ایک ایسا پارٹنر مل گیا جو سرمایہ لگا رہا تھا ففٹی ففٹی کی بنیاد پر یعنی سرمایہ اس کا اور محنت تیمور کی...... اور منافع ففٹی ففٹی......

کہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ رزق کشادہ کرنا چاہتا تو ان ذرائع سے بھی رزق دیتا ہے جنہیں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔

یہ لیدر کی جیکٹ ایکسپورٹ کرنے کا بزنس تھا۔ جلد ہی مارکیٹ میں تیمور کا ایک نام بن گیا۔ باہر کے ممالک میں اسے بڑے، بڑے آرڈرز ملنے لگے۔

بہت جلد اس کا چھوٹا سا کارخانہ ایک بڑی فیکٹری میں تبدیل ہو گیا۔ اور پھر ایک فیکٹری کئی فیکٹریوں میں تبدیل ہو گئی۔ bill bords تیمور کے نام سے جگمگانے لگے...... اس کی فیکٹری کی جیکٹس پہننا لوگوں کے لیے فخر کی بات ہونے لگی۔

اس کی کامیابیاں دیکھ کر چیمبر آف کامرس میں بننے والے اس کے دوست حیدر نے کپڑے کی مل میں اسے پارٹنر شپ دے دی۔

تیمور کی تقدیر عربی گھوڑے پر سوار سرپٹ دوڑنے لگی۔ اس کی ڈیزائن کردہ رومی لان بہت جلد خواتین میں مقبولیت حاصل کر گئی۔

رومی لان خریدنے کے لیے خواتین میں مقابلہ ہونے لگا۔ اس کی لان بازار میں آنے سے پہلے صرف کیٹلاگ کی بنیاد پر بڑے پیمانے پر بکنے لگی۔

اس کا بزنس سرپٹ دوڑنے لگا...... تیمور جس نے کبھی موٹر سائیکل کی پٹرول کی ٹنکی میں سو روپے سے زیادہ ایک وقت میں پٹرول نہیں ڈلوایا تھا اس کے گھر کے گیراج میں اب ہر سال نئی ماڈل کی گاڑی کھڑی رہتی۔

بہت جلد ایک چھوٹے مکان سے نکل کر بڑی سی کوٹھی تک کا سفر طے ہو گیا۔ اس کے گھر کا شمار علاقے کے خوب صورت ترین گھروں میں ہونے لگا۔

اس کے گھر کے لان میں اٹلی اور فرانس سے پودے منگوا کر لگوائے گئے اس کے بچے آسٹریلیا کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے اور...... رومی...... رومی کو ایسا لگتا جیسے اس کے اندر خواہشات کا ایک طوفان ہے جو روز موجیں مارتا ہے اس کی طغیانی روز بروز بڑھ رہی تھی۔

اس کا پرس نوٹوں اور مختلف کریڈٹ کارڈز اور ٹریولرز چیک سے بھرا رہتا...... اس کی الماری کپڑوں سے بھری رہتی۔

فارن ٹورز، فیشن شوز، برانڈڈ شوز اور ہینڈ بیگز ہر وہ چیز جس کی اسے خواہش تھی، اس کے قدموں میں تھی وہ خوب صورت تھی لیکن اب وہ حسین ترین لگتی۔

اب وہ جم بھی جاتی...... سوئمنگ کرتی...... اپنی فٹنس کا خیال رکھتی، ہفتے میں ایک دن پورا وقت وہ سیلون میں گزارتی...... اس کے ہاتھ پیر مینی کیور اور پیڈی کیور کی وجہ سے نرم و ملائم اور حسین رہنے لگے تھے۔

زندگی رنگین اور حسین ہو گئی لیکن زندگی کی رنگینیوں میں ڈوب کر وہ کسی کو بھول گئی اور کوئی اسے بھول گیا۔

☆☆☆

"تیمور آپ بھی چلتے ناں......" اس نے ہینڈ بیگ میں ٹکٹ اور پاسپورٹ رکھتے ہوئے لیپ ٹاپ پر مصروف تیمور سے کہا۔

"آئی ایم سوری...... میں بہت بزی ہوں اور ویسے بھی مائی ڈیر رومی اب آپ کا اتنا ایکسپوزر ہو چکا ہے کہ اس طرح کے ٹرپ میں کم از کم مجھے نہ گھسیٹا کریں۔" تیمور کا لہجہ اس کو کچھ جتاتا ہوا، کچھ طنزیہ سا لگا۔

ہر پندرہ دن کے بعد وہ اپنے بیٹوں سے ملنے آسٹریلیا ضرور جاتی تھی۔ لیکن چند ماہ سے تیمور اسے ہر ویک اینڈ پر آسٹریلیا بھیج رہا تھا۔ بعض اوقات اس کا دل نہیں ہوتا لیکن تیمور اس کے ہاتھ میں ٹکٹ تھما دیتا...... پورے ہفتے تیمور بے انتہا بزی رہتا...... میٹنگز، آفس ٹورز...... رومی چاہتی کہ ویک اینڈ پر تیمور اور وہ بہت سی باتیں کریں، لانگ ڈرائیو پر جائیں، کینڈل لائٹ ڈنر کریں...... کہ پورے ہفتے تو اکثر راتوں کو وہ اس کا انتظار کرتے، کرتے سو جاتی...... اور صبح تیمور اتنی جلدی میں ہوتا کہ بعض اوقات موبائل فون کی بیل اس کی بات کو جو منقطع کرتی تو وہ بات مکمل نہیں کر پاتی اور تیمور فون کان سے لگائے، لگائے گاڑی میں جا بیٹھتا۔

پھر سارا دن...... بہت ساری مصروفیات میں وہ گھر سی جاتی لیکن پھر بھی...... اندر بیٹھی سہمی ڈری عورت...... جائے نماز وں پر بیٹھ کر تیمور کو بھیک کی طرح مانگتی کچھ خالی، خالی سی رہتی...... بہت کچھ پانے کے بعد اسے لگتا وہ کہیں پر کچھ رکھ کر...... بھول گئی ہے۔ مگر کیا......؟ وہ اپنے آپ کو جواب نہیں دے پاتی لیکن کب تک...... تیمور اتنا کیوں بزی ہو گئے کہ انہیں میں، میں رومانہ تیمور علی نظر نہیں آتی، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

تیمور اٹھ کر جا چکا تھا اور وہ آئینے میں کھڑی اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔

☆☆☆

"oh my God you are looking awesome"

ندا جیسے ہی ڈریسنگ روم سے باہر نکلی تیمور کے منہ سے نکلا۔

"رئیلی......" ندا نے ایک ادائے دلبرانہ سے تیمور کے برابر میں کھڑے ہو کر آئینے میں نظر آتے عکس کو دیکھ کر سوال کیا۔

"مائی ڈارلنگ تم کتنی حسین ہو، یہ تم مجھ سے پوچھو......" تیمور نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے سے قریب کر لیا۔ تیمور اور ندا کی ملاقات جم خانہ کے ایک فنکشن میں ہوئی تھی...... اور بہت تیزی سے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے تھے...... یہ نہیں تھا کہ تیمور کی زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی تھی، تیمور کی جیب میں کئی لڑکیوں کے نمبر پڑے رہتے......وہ خوبرو تھا...... مالدار تھا......ویل میرڈ تھا......اس کے ارد گرد تتلیاں منڈلاتی تھیں......وہ بھی بھونرے کی سی خو بو رکھنے لگا تھا اور پھر بدلے میں وہ لڑکیوں کو دل بھر کے شاپنگ کراتا، اپنے ساتھ فارن ٹورز پر لے کر جاتا اور ہر لڑکی کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتا کہ وہ اس سے ضرور شادی کرے گا۔ دولت کی چکا چوند میں بننے والے اور چلنے والے دوستوں نے اسے یہ بات سمجھا دی تھی کہ دن بھر کی تھکن اور ٹینشن کو اتار پھینکنے کے لیے اس سے بہتر کوئی آپشن نہیں......اور وہ اس آپشن کو اچھی طرح استعمال کر رہا تھا۔

"تیمور تمہاری وائف ......وہ آج کل کہاں ہے؟" جب وہ ندا کو لے کر ائر پورٹ پہنچا تو اس نے سوال کیا......وہ ندا کو لے کر دو دن کے لیے بنکاک جا رہا تھا کہ وہاں آج کل بلا کا حسین موسم تھا اور وہ ایسی ہی لڑکی کا وہاں ساتھ چاہتا تھا۔

"ارے یار وہ بچوں کے پاس ہے......اور کہاں ہو گی...... بیوی کی جگہ تو وہی ہوتی ہے۔" تیمور کے لہجے میں بے پروائی تھی۔

"وہ برا نہیں مانتی......" یہ سوال کرنے والی صرف ندا نہیں تھی تقریباً ہر لڑکی پوچھتی تھی اور وہ اپنا

مخصوص جواب دیتا......

"ویسے تو اس کو پتا ہی نہیں ہے اور پتا بھی ہو تو اس کے برا ماننے کا کوئی حق نہیں ہے۔ دیکھو ناں اتنا خوب صورت گھر، فرمانبردار بیٹے...... اپنا نام...... شان و شوکت، نوکر چاکر...... ہر وہ چیز جس کی تمنا کوئی عورت کر سکتی ہے، وہ میں نے اس کے قدموں میں ڈال دی ہے۔ میری بھی کوئی زندگی ہے، میرے خیال سے اسے برا ماننے کا کوئی حق نہیں ہے۔" جہاز میں سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے تیمور نے صاف لہجے میں کہا۔

اور ندا نے مسکرا کر اس کے کاندھے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں کہ بند آنکھوں سے اسے بہت سارے خواب بننے تھے۔

☆☆☆

"یہ کیا؟ یہ تم نے کب سے لگانی شروع کر دی...... ارے بیٹا جب وضو ہی نہیں ہوگا تو تم نماز کیسے پڑھو گی۔" اس کے لمبے خوب صورت ترین ناخنوں پر سجی نیل پالش کو دیکھ کر راحت بیگم نے برہمی سے کہا۔ تب رومی نے ایک نظر اپنے سفید موی نیل پالش سے سجے ہاتھوں کو دیکھا...... وہ کہیں کھو سی گئی۔

☆☆☆

"یا اللہ تم کتنی لمبی، لمبی نمازیں پڑھتی ہو...... میں کب سے بیٹھا تمہاری نماز ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔" تیمور نے رومی کے سفید ململ کے ہالے میں دمکتے چہرے کو دیکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

"کہاں لمبی، لمبی نمازیں...... تیمور...... میرا تو دل چاہتا ہے کہ کبھی سجدے سے سر ہی نہیں اٹھاؤں۔ ہماری امی کہتی ہیں کہ اگر کبھی تم نماز نہ پڑھ سکو تو یہ نہیں کہنا کہ نماز قضا ہو گئی بلکہ یہ سوچنا کہ تم سے کیا خطا ہو گئی کہ اللہ نے تم کو یاد نہیں کیا۔ اللہ جن بندوں سے محبت کرتا ہے انہیں اپنی بندگی کی توفیق دیتا ہے۔" وہ جذب کے عالم میں کہتی۔

"واقعی کیسی خوش نصیبی ہے کہ بندہ زمین پر نماز پڑھتا ہے اور آسمان والا اسے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ جب میں جائے نماز پر کھڑی ہوتی ہوں تو ان لمحوں میں مجھے اپنے اوپر فخر محسوس ہوتا ہے کہ رب کائنات مجھے سن رہا ہے...... سنتا تو وہ سب کی ہے، دیکھتا تو وہ سب کو ہے لیکن اپنے در پر بلا کر سننا، دیکھنا یہ سعادت صرف خوش نصیبوں کو ملتی ہے۔" رومی نے ململ کا سفید دوپٹا سر سے اتار کر شانوں پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اللہ کی نیک اور پیاری بندی...... تم تو مجھے بہت ہی پیاری ہو۔" تیمور نے اس کے صبیح چہرے کو آنکھوں کے راستے دل میں اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں تیمور یاد آیا...... وہ خالہ نرگس ہیں ناں...... وہی خالہ نرگس جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں، وہ اپنے صوفے بیچ رہی ہیں بالکل نئے کے نئے ہیں...... تیمور وہ صوفے مجھے دلوا دیں...... میں اپنا ڈرائنگ روم سیٹ کرلوں گی۔"

رومی کو جائے دم پر رکھتے، رکھتے جیسے کچھ یاد آیا۔

"مائی ڈیئر وائف...... آپ اور آپ کے شوق، بیگم صاحبہ بندۂ ناچیز ایک معمولی تنخواہ دار آدمی ہے...... اور اس کی جیب اس وقت بالکل اجازت نہیں دیتی۔" تیمور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

اور وہ چپ سی ہو گئی۔

☆☆☆

"زندگی میں پیسہ آکسیجن کی طرح ہوتا ہے، بس مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے بہت ساری دولت چاہیے۔ اگر میرے پاس خوب صورت گھر، گاڑی، نوکر، چاکر ہوں تو پھر میری زندگی مکمل ہو جائے گی۔ اللہ میاں مجھے بہت ساری دولت دے دیجیے۔" اس نے جائے نماز پر بیٹھ کر اللہ سے مانگا اور کاتب تقدیر اس کی نامکمل دعا پر حیران رہ گیا۔

☆☆☆

"یہ بھی کوئی زندگی ہے...... ہر وقت جوڑ توڑ کرتے رہو...... حساب رکھتے، رکھتے میرے تو اعصاب ٹوٹ گئے۔ لعنت ہو اس زندگی پر...... جہاں ہم ایک ڈیزائنر کا سوٹ تک نہیں خرید سکتے...... کبھی کسی اچھے

ریسٹورنٹ میں کھانا نہیں کھا سکتے۔ بہت ہوا تو حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے برنس روڈ کے کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر نہاری کے شوربے میں روٹی ڈبو، ڈبو کر کھالی۔ بغیر پیسے کے زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔''

''لیکن تیرا دامن تو محبتوں کے پھولوں سے بھرا ہے۔'' کسی نے اس کے اندر سے اس کو ٹوکا۔

''ہونہہ خالی پیٹ کی محبت...... ایسی محبت بھاڑ میں جائے جو صرف لفظوں کے گرد گھومتی ہو، کیسا شاندار ہے دیبا کا گھر...... کیسا اعلیٰ رہن سہن ہے، ہر وقت گھومتی پھرتی ہے، اگر محبت نہ بھی ملے تو کیا ہے، دل بہلانے کو تو اس کے پاس دس چیزیں ہوتی ہیں۔''

''تو کس محبت کی بات کرتی ہے؟'' کوئی اس کے اندر سراپا سوال تھا۔

''ہر محبت۔ ہر قسم کی محبت۔'' اس نے اندر سے اٹھتی آواز کو سختی سے کچلا۔

''سب سے پہلے تم یہ بتاؤ محبت کیا ہوتی ہے؟'' اندر کی آواز خاموش رہنے پر تیار نہیں تھی۔

وہ خاموش رہی۔

''سب سے پہلے اسے ڈھونڈو جس کی محبت ہے تو سب کچھ ہے۔''

''چپ رہو پلیز...... مجھے کچھ نہیں سننا۔'' اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے......

☆☆☆

آج دیبا نے اسے اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا...... اس کی شان و شوکت اور طرزِ زندگی دیکھ کر وہ گنگ رہ گئی...... زندگی میں پہلی بار اس کو لگا جیسے اس کا دل اور دامن دونوں خالی ہیں اور پھر خواہشات کا بھرا کشکول اٹھائے وہ اپنے گھر چلی آئی...... زندگی میں پہلی مرتبہ اسے اپنا گھر، گھر نہیں لگا۔ دیواروں سے لپٹی بوگن ویلیا اس کو بری لگی...... موتیا کے مہکتے پھول تک برے لگے...... اور پھر بہت جلد اس کی سوچ نے دو کمروں اور بڑے سے صحن والے گھر کو مکان میں بدل دیا۔

☆☆☆

بعض اوقات ہم اللہ سے ضد باندھ لیتے ہیں اور اس سے وہ چیز مانگ بیٹھتے ہیں...... جو ہمارے حق میں اچھی نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جب بچہ شدید سردی میں آئس کریم مانگے تو ہم اسے نہیں دیتے...... بچہ نہیں جانتا...... کہ اس وقت یہ اس کے لیے کتنا تکلیف دہ ہو جائے گا...... حالانکہ وہ اسی کے لیے رکھی ہوتی ہے پر مناسب وقت کے لیے......

اسی طرح جب انسان، اللہ سے کسی چیز کو طلب کرتا ہے اور پھر اس کی طلب، ضد میں بدل جاتی ہے اور اللہ جو عالم الغیب ہے وہ اس کی خواہش کو اس لمحے پورا نہیں کرتا...... اس کی طلب کو کسی مناسب وقت کے لیے اٹھا کر رکھ دیتا ہے...... تو انسان مایوس ہو جاتا ہے، کفر بکنے لگتا ہے۔

انسان بہت ناشکرا اور جلد باز ہے۔

☆☆☆

''میں اب نماز نہیں پڑھوں گی، ساری زندگی سجدے کرتی رہی کیا ملا......؟ پتا نہیں کیوں...... وہ کفر بکتی چلی گئی۔

''ایک، ایک چیز کو ترستے رہو...... خواہشوں کو حسرتوں میں بدلتے، بدلتے بوڑھے ہو جاؤ...... ہمارے بچے گلی محلوں کے اسکولوں میں پڑھیں اور وہ جن کو شاید نماز کی رکعتیں بھی معلوم نہیں ہوں جن کو ایک سجدہ کرنے کی فرصت نہیں ہوتی...... ان کے بچے امریکا اور یورپ کے اسکولوں میں پڑھیں۔'' نماز کی نیت باندھتے، باندھتے اس نے ایک دم سفید ململ کا دوپٹا سر سے اتار دیا۔

مایوسی کفر ہے لیکن اس جلد باز انسان کو کون سمجھائے۔ واقعی انسان بہت ناشکرا اور جلد باز ہے۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے رومی......'' رابعہ بیگم کی تیز آواز اسے حقیقت کی دنیا میں واپس لے آئی۔

''امی فرصت نہیں ملتی......'' کہتے ہوئے اس کی آواز مدھم تھی۔ ''ویسے بھی میرے ہاتھوں پر لگی نیل پالش تیمور کو اچھی لگتی ہے...... وہ کہتے ہیں اس طرح

تمہارے ہاتھ بہت حسین لگتے ہیں...... تو ظاہر ہے امی پھر میں نیل پالش تو لگاؤں گی ناں......'' اب کے اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

''تمہارے میاں کو پسند ہے خوب...... بیٹا خوب...... اور اللہ کا کیا حکم ہے۔ بیٹا محبت، خوب صورتی، اچھائی یہ انسان کی آنکھ میں ہوتی ہے جس کو جس قدر خوش نما اور حسین دکھانا ہو...... اللہ دکھاتا ہے...... ہماری کیا اوقات...... دلوں میں پیار اور محبت ڈالنے والا اللہ ہے۔ میک اپ، کپڑے، زیور یہ کب سے خوب صورتی کے ٹھیکدار بن گئے۔'' رابعہ بیگم نے کہا اور اٹھ کر واپس چلی گئیں انہیں رومی کی سوچ پر حد درجہ تکلیف ہوئی۔

''ہونہہ میں خوب صورت ہوں۔ اس لیے تیمور کو اچھی لگتی ہوں اور اس لیے وہ مجھ سے پیار کرتے ہیں۔'' رومی نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے متکبرانہ انداز میں سوچا۔

لیکن اس لمحے وہ تکبر کرنے والے کا انجام بھول گئی تھی۔

☆☆☆

بعض اوقات ہمیں زندگی وہاں لا کھڑا کرتی ہے کہ ہم سمجھتے ہیں یہ ہمارا نقطۂ عروج ہے اور دراصل وہ ہمارا نقطۂ زوال ہوتا ہے۔

اور رومی بھی اپنے تئیں اسی نقطۂ عروج پر کھڑی تھی۔

''میں آج آپ کے آفس آؤں گی۔'' صبح ناشتے کی ٹیبل پر اس نے تیمور سے کہا۔

''کیوں......؟'' تیمور حیران ہوا۔

''بس سارا دن گھر میں بور ہوتی رہتی ہوں، سوچ رہی ہوں چند گھنٹے آپ کے ساتھ گزاروں۔'' رومی کا لہجہ خشک تھا۔

''اوکے آجانا...... میرے ساتھ چائے پینا...... پھر میں تمہیں گھر چھڑوادوں گا۔'' تیمور کا لہجہ سرسری تھا۔

''نہیں تیمور، میں اب روز آیا کروں گی...... پلیز آپ کوئی کمرا میرے لیے سیٹ کروادیں۔'' رومی کے لفظوں نے ایک لمحے کے لیے تیمور کو گونگا کردیا۔

جب سے رومی کو تیمور کے نت نئے افیئرز کا پتا چلا تھا وہ بہت ڈسٹرب ہوگئی تھی۔ اسے احساس ہوا خواہشات کے جنگل میں بھٹکتے، بھٹکتے کہیں پر تیمور نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا ہے اور اب وہ خلا میں قلابازیاں کھا رہی تھی۔ وہ کشش ثقل سے باہر نکل رہی تھی لہٰذا وہ زمین پر پاؤں جمانا چاہ رہی تھی۔

☆☆☆

''دیکھو رومی...... یہ ایلیٹ کلاس میں عام بات ہے اب تم مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے تیمور کی بیوی نہیں ہو...... تم ایک کامیاب بزنس مین تیمور علی خان کی مسز ہو...... اور یہاں سب چلتا ہے۔ خدا کے واسطے مجھے سانس لینے دو...... میرے گرد سے اپنا گھیرا توڑ دو...... ورنہ میں ہر تعلق توڑ دوں گا۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والی تقریباً زیادہ تر خواتین ان حالات سے گزرتی ہیں...... تم بھی اپنی آنکھیں بند کرلو...... خود بھی زندہ رہو اور مجھے بھی جینے دو......'' یہ تیمور آج کون سا سبق اسے پڑھا رہا تھا۔

''تم میری بیوی ہو...... میرے بچوں کی ماں ہو...... گھر میں آرام سے رہو...... کس چیز کی کمی ہے تمہیں...... عالیشان گھر، نوکر چاکر، عیش آرام ہماری کلاس سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر حضرات کی گھر سے باہر لائف ہے اور ان کی بیویاں سمجھوتا کرتی ہیں جو تمہیں بھی کرنا پڑے گا...... کچھ سمجھ آئی۔'' تیمور دہاڑا۔

صبح جب رومی نے تیمور سے اس لڑکی کے بارے میں سوال کیا جو کل رات اس کے گھر آئی تھی تو تیمور کے جواب نے اسے پارہ، پارہ کردیا۔

اسے اپنی روح وجود کے چنگل سے باہر پھڑپھڑاتی نظر آئی۔

''تم نہیں دیکھتیں تو پھر بھی تم کو بتادیتا...... پلیز مجھے خوش رہنے دو...... اور......'' تیمور مسلسل بول رہا تھا لیکن وہ شاید قوتِ سماعت کھو چکی تھی۔

☆☆☆

اسے چپ سی لگ گئی تھی۔ بے انتہا آرام وہ

زندگی اس کو بے آرام کر رہی تھی...... اس نے پہلے سے زیادہ اپنا خیال رکھنا شروع کر دیا وہ تیمور کو دیوانوں کی طرح چاہتی، اس کے اردگرد گھومتی...... اس کی قربت کے مواقع ڈھونڈتی وہ جتنا تیمور کے قریب جاتی وہ اتنا ہی اس سے دور بھاگتا...... وہ بجتی سنورتی...... تیمور نظر اٹھا کر نہیں دیتا۔ وہ ہنستی، کھلکھلاتی، مسکراتی، تیمور اس کو نہیں دیکھتا۔ وہ روتی، تڑپتی، بلبلاتی تیمور ذرا پروا نہیں کرتا...... وہ تیمور جو اس کا دیوانہ تھا جو اسے پاگلوں کی طرح چاہتا تھا وہی تیمور اس سے بیزار رہنے لگا تھا۔

''میں نے آفس میں تمہارے لیے کمرا تیار کروا دیا ہے۔ پلیز وہاں آ کر مجھے ڈسٹرب مت کرنا...... یہ نہیں کہ میرے کمرے میں چکر لگاتی رہو...... وہاں آؤ، بیٹھو...... جو دل چاہے کرو......

but please dont distrub me''

تیمور نے تنبیہی انداز میں رومی سے کہا اور پھر بریف کیس سیٹ کرنے لگا۔

گو کہ رومی کو اس کا انداز بہت برا لگا لیکن وہ خاموش رہی...... کچھ دنوں سے وہ بہت خاموش رہنے لگی تھی۔

وہ روز چند گھنٹوں کے لیے آفس جانے لگی...... آفس میں اس پر کئی اسرار کھلے...... زیادہ اسٹاف نوجوان اور خوب صورت لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ لڑکیاں تیمور کے آس پاس منڈلاتیں...... تیمور اُن کے درمیان راجہ اندر بنا رہتا...... اور وہ خاموش رہتی۔

☆☆☆

گرے ٹراؤزر پر ریڈ کلر کی گہرے گلے کی ٹاپ، خوب صورت تراشیدہ ہائی لائٹ کٹے ہوئے بال...... خوب صورت مومی، مخروطی انگلیوں کے نیل پالش سے سجے ناخن، گلے میں جھولتی نازک سی چین...... فیشل ٹریٹمنٹ سے دمکتا چہرہ...... خوب صورت پیروں میں سرخ سینڈل، اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے خوب صورت وجود کا جائزہ لیا۔

''کہیں کوئی کمی......؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا؟

''نہیں......'' اس کے اندر سے کسی نے اس کو تسلی دی۔

جب سے اس نے تیمور کے آفس جانا شروع کیا تھا وہاں پر تیمور کے اردگرد گھومتی الٹرا ماڈرن لڑکیوں کے سامنے اسے اپنا آپ کچھ دقیانوسی سا لگا...... سو تیمور کے لیے اس نے سارے ایسٹرن اسٹائل کے کپڑے صندوقوں میں بند کر دیے...... لمبے بالوں کو کٹوا دیا اور اس وقت وہ ویسٹرن اسٹائل کے کپڑوں میں، خوب صورت میک اپ اور جدید ہیر اسٹائل کے ساتھ عمر سے کم از کم دس سال چھوٹی لگ رہی تھی۔

''اب تیمور تم کہاں بھاگو گے...... میرا خوب صورت وجود تمہیں پاگل کر دینے کے لیے کافی ہے۔'' وہ نظر آتے آئینے میں عکس کو دیکھ کر اپنے آپ سے گویا ہوئی۔

☆☆☆

''یا اللہ تم اتنی پیاری ہو جیسے ڈول...... تم کو کیا ضرورت تھی اتنی ٹیپ ٹاپ کی ہائیں۔'' اس کی نئی بننے والی دوست صنوبر نے محبت سے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''بس میں چاہتی ہوں تیمور کو میرے علاوہ کچھ نظر نہ آئے تو مائی ڈیئر صنوبر ڈارلنگ اس کے لیے کچھ تو کرنا پڑے گا ناں......'' اس نے مسکرا کر اپنی گھنی پلکوں پر لگاتے ہوئے تفاخرانہ لہجے میں کہا۔

صنوبر خاموش سی ہو گئی۔

صنوبر اور رومی کی ملاقات ایک فنکشن میں ہوئی تھی۔ اور پھر ان کی ملاقات بہت جلد دوستی میں بدل گئی۔ صنوبر فطرتاً محبت کرنے والی اور سادہ سی لڑکی تھی جو رومی سے بہت مخلص تھی۔

اور اس مخلص صنوبر کا دل اس کے لہجے کے غرور پر کانپ سا گیا تھا۔

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آتا صنوبر کیا ہو گیا ہے، وہ تیمور جو میرا دیوانہ تھا، جس کی محبتوں کی شدتوں نے مجھے مغرور کر دیا تھا...... جس کی چاہت، اعتبار اور

دیوانگی مجھے آسمانوں کی بلندیوں پر لے جاتی تھی۔ وہ تیمور..... اسی تیمور کو میں نظر ہی نہیں آتی۔ وہ میری قربت سے کتراتا ہے، وہ مجھ سے بیزار رہنے لگا ہے۔ اللہ صنوبر اگر تیمور بدل گیا تو پھر میری زندگی میں کچھ نہیں بچے گا..... میرا دل اور میرا دامن دونوں خالی رہ جائیں گے۔ اگر تیمور کی محبت نہ رہی تو پھر زندگی کس کام کی۔'' وہ صنوبر کے سامنے کہتے، کہتے بلک پڑی۔

''کیا... ہوا کیا میری جان، میری بہن مجھے بتاؤ تو سہی.....'' صنوبر نے محبت سے اس کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے پوچھا۔

☆☆☆

''تیمور آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ نہ مجھ سے بات کرتے ہیں اور نہ ہی میری طرف دیکھتے ہیں، میں سو رہی ہوتی ہوں تو آپ خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں..... رات گئے جب میں انتظار کرتے، کرتے تھک جاتی ہوں تب آپ گھر آتے ہیں..... ایسا کیا ہو گیا ہے تیمور..... کہ گھر سے، مجھ سے سب سے آپ کی دلچسپی ختم ہو گئی ہے..... میں وہی رومی ہوں جسے آپ بے انتہا چاہتے ہیں۔''

''چاہتا تھا۔''

رومی کو بات کرتے، کرتے اچانک تیمور نے ٹوکا۔

رومی کو ایسا لگا جیسے..... اس کے پاس الفاظ ختم ہو گئے ہوں..... وہ گونگی ہو گئی ہو..... اس وقت کاش وہ بہری ہو جاتی کاش.....

''کیا مطلب.....؟'' رومی کے منہ سے پھنسا، پھنسا سا نکلا۔

''ہاں تھا رومی..... تم جتنا بنتی سنورتی ہو..... مجھے اتنی ہی بری لگتی ہو تم جتنا میرے قریب آنے کی کوشش کرتی ہو..... مجھے تم سے..... تمہارے وجود سے اتنی ہی کوفت ہوتی ہے..... بیزاری محسوس ہوتی ہے۔ تمہاری ہر بات، ہر انداز..... ہر ادا مجھے کوفت میں مبتلا کرتی ہے۔ جب تک تم مجھ سے دور رہتی ہو..... مجھے نظر نہیں آتی ہو..... میں خوش اور مطمئن رہتا ہوں..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میرا پیچھا چھوڑ دو..... مجھ سے دور چلی جاؤ..... مجھے نظر نہ آؤ.....'' تیمور بولے چلا جا رہا تھا اور وہ..... اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس کا وجود ریزہ، ریزہ ہو کر بکھر رہا تھا..... وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس خالی کرسی کو دیکھ رہی تھی جہاں پر کچھ دیر پہلے تیمور بیٹھا سنگ باری کر رہا تھا۔ وہ جا چکا تھا۔ وہ ساکت تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی..... پہلے وہ کرسی کے نزدیک آئی..... اس امید پر کہ شاید وہ اندھی ہو گئی ہے اس نے کرسی کو ٹٹول کر تیمور کے وجود کو کھوجنا چاہا..... لیکن..... اس کے ہاتھ ہوا میں معلق ہو گئے۔ وہ بے یقینی سے سارے کمرے میں ایک، ایک جگہ اس کے وجود کو..... اس کی خوشبو کو کھوجتی رہی..... لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔

وہ جا چکا تھا..... گھر سے بھی اور شاید اس کی زندگی سے بھی.....

اس نے دھندلی ہوتی آنکھوں سے اس کی گاڑی کو گیٹ سے باہر نکلتے دیکھا..... اور پھر ایک تیز چیخ اس کے منہ سے نکل کر سارے گھر میں گونجنے لگی۔

☆☆☆

اس نے آنکھ کھول کر چاروں طرف دیکھا، بڑی نامانوس سی جگہ تھی۔ وہ خالی، خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ بھاری ہوتے سر اور دھندلی ہوتی آنکھوں سے اس نے جگہ اور کمرے کو سمجھنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہی..... اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن اسے ایسا لگا جیسے وہ اپنی قوتِ گویائی کھو چکی ہے۔ سوکھی زبان اور کانٹے پڑتے حلق نے اس کو احساس دلایا کہ وہ شدید پیاسی ہے۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو سیدھے ہاتھ کی پشت میں اس کو شدید چبھن کا احساس ہوا۔

''اللہ کا شکر ہے رومی کو ہوش آ گیا۔'' کسی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خوشی سے لرزتی ہوئی

آواز میں کہا۔

''تو کیا میں بے ہوش تھی...... یا مر گئی تھی۔'' اس نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اپنے آپ سے سوال کیا اور پھر اس کا دل و دماغ اندھیرے میں ڈوبتے چلے گئے۔

☆☆☆

اسے ایک لمحے کے لیے ایسا لگا کہ اس کی روح کھینچ لی گئی۔ ہو...... تیمور...... تیمور اس کی زندگی تھا اور اس کا بھی تو دعویٰ تھا کہ میں اس کے لیے آکسیجن کی طرح ہوں پھر ایسا کیا ہوا؟ اس نے منت سماجت سے، محبت سے، خدمتوں سے، دیوانہ پن سے...... اپنی انا اور عزتِ نفس کو پسِ پشت ڈال کر ہر طرح سے تیمور کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا...... لیکن تیمور اس سے بیزار ہی رہا...... ناراض ہی رہا...... وہ جتنا اس کو مناتی وہ اتنا ہی روٹھتا...... وہ جتنا اس کے قریب جاتی...... وہ اتنا ہی اس سے دور بھاگتا۔

وہ جتنا محبت کا اظہار کرتی...... وہ اتنی ہی نفرت کرتا اور پھر اس دن وہ سگنل پر روز کھڑی اس کی گاڑی کا شیشہ ہینڈ وائپر سے صاف کرتی، چار بچوں کی پختہ عمر ماں سے نکاح کر کے گھر لے آیا...... اس کے گھر لے آیا...... اس سے پہلے کہ وہ شور کرتی...... اس کا گریبان پکڑتی، واویلا مچاتی۔ اس معمولی صورت کی پختہ عمر کی اپنی نئی نویلی دلہن کے کہنے پر اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ روتی رہی...... چیختی رہی...... اپنی محبتوں کے واسطے دیتی رہی، اس کی محبتیں یاد دلاتی رہی۔ لیکن اس عورت کی پہلی خواہش وہ رد نہیں کر سکتا تھا۔ گھر کے ملازمین تاسف سے اسے دیکھتے رہے۔ اور وہ گھسیٹتا ہوا اسے باہر نکال کر گیٹ بند کر چکا تھا۔ کتنی ہی دیر...... اونچے، اونچے ستونوں والے پھولوں سے ڈھکے اس گھر کو وہ خالی، خالی نظروں سے دیکھتی رہی جسے بہت محبت سے اس نے سجایا تھا۔ جس کی پیشانی پر لکھا محبت کدہ رومی رو رہا تھا۔

پھر وہ بند گیٹ کو دیکھتی رہی...... جو اس کے لیے بڑے احترام سے کھلتا تھا لیکن آج اسی گیٹ سے اس کو دھکے مار، مار کر نکالا گیا تھا...... وہ بہت دیر تک کھلنے کی آس میں بند دروازے سے لپٹی کھڑی رہی لیکن پھر جیسے اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور امید دم توڑ گئی۔

پھر اس نے آہستہ، آہستہ چلنا شروع کیا چند قدم چل کر اس امید پر وہ ضرور پیچھے مڑ کر دیکھتی کہ شاید...... شاید دروازہ کھل گیا ہو...... لیکن دروازہ بند رہا......

اسے پیر میں چبھن کا احساس ہوا تو اسے پتا چلا کہ وہ ننگے پیر ہے...... بکھرے بال، رو رو کر سوجی آنکھیں، اس نے دوپٹا اپنے چاروں طرف لپیٹا...... اور پھر سڑک کے کنارے بیٹھ کر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی...... نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی...... پھر وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر چیخ، چیخ کر رونے لگی۔ اللہ کو پکارنے لگی۔ کس سے شکایت کر رہی...... کس کو پکار رہی ہے۔

اور پھر اس کا چکراتا ہوا سر اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

''بیٹا اب کیسی طبیعت ہے؟'' رابعہ بیگم نے محبت سے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہی......

''میں تمہارے گھر گئی تھی...... پتا چلا تیمور بھائی دو دن پہلے امریکا گئے ہیں۔ وہ اکیلے کیوں گئے ہیں؟ تم ساتھ کیوں نہیں گئیں۔'' جب دوپہر تک اس کی طبیعت سنبھلی تو چچہ، چچہ سوپ پلاتے ہوئے محبت اور فکرمندی سے ملے جلے تاثرات اور لہجے کے ساتھ صنوبر نے پوچھا۔

''مجھے کیا ہوا تھا؟'' اس کی آنکھوں نے صنوبر سے پوچھا لیکن لب خاموش ہی رہے۔ صنوبر بھی خاموش رہی...... بہت سے سوالوں کا جواب نہیں ہوتا...... اور صنوبر بھی اس کو کیسے بتاتی کہ سڑک کے کنارے بے ہوش پڑی رومی کو صنوبر کے شوہر نے دیکھ لیا تھا اور پھر انہوں نے ہی سب کو اطلاع دی تھی۔

''بتاؤ......'' رومی کی نم آنکھوں نے پھر پوچھا۔

''تم شاید میرے گھر آ رہی تھیں لیکن راستے

میں تمہیں شاید چکر آ گئے تم گر گئیں۔ اظہر (صنوبر کے شوہر) نماز پڑھ کر آ رہے تھے...... انہوں نے تمہیں دیکھ لیا...... پھر میں اور وہ تم کو لے کر اسپتال چلے آئے...... پھر آنٹی بھی آ گئیں۔" صنوبر نے بات کو تھوڑا بدلتے ہوئے بتایا شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ رومی کو تکلیف ہو۔

"اوہ اچھا......" کچھ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رومی کے منہ سے نکلا۔

"میں مسلسل کوشش میں ہوں کہ تیمور بھائی سے رابطہ ہو جائے لیکن ان کا نمبر ہی نہیں مل رہا......" صنوبر نے اسے تسلی دینا چاہی۔

"رہنے دو......" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اور صنوبر چونک اٹھی۔

اور پھر رومی نے کروٹ بدل لی۔ صنوبر چند لمحوں تک اس کی پشت کو تکتی رہی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی لیکن صنوبر کو نہیں معلوم تھا کہ رومی کی زندگی سے کیا نکل گیا...... اور کیوں......؟ یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

"یہ کیسے ہو سکتا ہے تیمور بھائی نے شادی کر لی اور تم......" کہتے، کہتے صنوبر نے ہونٹ چبائے۔

"اور میں نکال دی گئی۔" رومی سوچ کر رہ گئی...... لیکن اب وہ خاموش رہتی تھی...... بہت کم باتیں کرتی تھی۔

کتنے دن، ہفتے، گزر گئے...... وہ گہری اداسیوں میں ڈوبی رہنے لگی۔ اللہ سے شکوے...... شکایتوں میں بدل گئے۔ وہ سارا سارا دن منہ لپیٹے پڑی رہتی۔ اس کا دماغ ایسا لگتا سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو گیا ہو...... دیبا اور صنوبر اسے زندگی کی طرف لانے کی کوشش کرتیں۔ دیبا واپس امریکا جا چکی تھی۔ گو کہ صنوبر اس کی نئی، نئی دوست تھی لیکن بے حد مخلص اور محبت کرنے والی۔

"دیبا کا فون آیا تھا۔ اس نے تیمور سے بات کی تھی۔ تیمور نے تمہارے گھر کی چابیاں بھیج دی ہیں۔ وہ اپنی بیوی اور اس کے بچوں کو لے کر دبئی شفٹ ہو گیا ہے۔ کاروبار بھی وہیں سیٹ کر لیا ہے اس نے وعدہ کیا ہے کہ ایک معقول رقم ہر ماہ تمہارے اکاؤنٹ میں آ جایا کرے گی۔"

وہ خاموش رہی......

"اور میرے بچے...... میرے بیٹے۔" اس کا دل رویا۔

"دونوں بیٹے، باپ ہی کے پاس ہیں۔" رابعہ بیگم ماں تھیں بن کہے اس کے دل کی بات جان گئیں۔

"میں ٹھیک ہوں، امی میں کیا کروں گی اس گھر میں جا کر......" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تمہاری مرضی ہے۔" رابعہ بیگم نے اصرار نہیں کیا۔

"اٹھو نماز پڑھو...... اللہ سے دعا کرو...... وہ تمہارے دل کو سکون دے، خوشی دے۔" رابعہ بیگم نے اس کو سمجھایا۔

"میں کیوں اللہ سے دعا کروں؟ اللہ نے میرے ساتھ کیا کیا...... زندگی بھر اللہ کی مرضی اور ناراضی کا خیال رکھتی رہی اور اس اللہ نے مجھ سے تیمور کو چھین لیا...... میرے بیٹوں کا دل مجھ سے خراب کر دیا۔ ایک معمولی صورت شکل کی عورت کو میرے اوپر مسلط کر دیا...... میری سوکن بنا دیا۔ مجھے میرے ہی گھر سے دھکے مار کر نکلوا دیا اور میں، میں...... نہیں کچھ نہیں کروں گی...... نہ نماز پڑھوں گی نہ روزہ رکھوں گی، نہ دعا کروں گی۔ کون سی میری زندگی میں کوئی خوشی ہے، مجھے کچھ ملا ہے جو میں کچھ مانگوں۔" اس کے لب خاموش تھے لیکن اس کا دل کفر کی حد تک بے ایمانی اور بدگمانی کر رہا تھا۔ وہ بہت سارے شکووں کے ساتھ یہ بھول رہی تھی کہ اللہ اپنے جن بندوں سے پیار کرتا ہے کبھی کبھی اس کو دکھ کی سوئی چبھوتا ہے اور اس چبھن میں ایسی طاقت ہوتی ہے کہ اس کا بندہ رجوع کرتا ہے...... ہدایت مانگتا ہے اور ہدایت خوش نصیبوں کو ملتی ہے...... اور رومی کتنی نصیبوں والی تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا...... لیکن وہ جانتا تھا جو سب کچھ جانتا ہے۔

☆☆☆

''میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔'' اس نے رابعہ بیگم سے کہا اور پھر اُن کا جواب سنے بغیر باہر نکل گئی۔

کئی لمحوں تک وہ محبت کدہ رومی کو دھندلی ہوتی آنکھوں سے دیکھتی رہی...... اور پھر خاموشی سے گھر کے اندر داخل ہو گئی...... ملازمین اسے دیکھ کر ادب سے سلام کرنے لگے...... وہ خاموش رہی...... اسے ملازمین کے سامنے ایک عجیب سی خفت کا احساس ہوا۔ ان کے سامنے...... ہاں ان کے سامنے وہ ہاتھ پکڑ کر اس گھر سے نکالی گئی تھی۔ لیکن نہ جانے وہ کون سی قوت تھی جن کے زیر اثر وہ دوبارہ وہاں موجود تھی۔

تیمور کیسا تھا، کس حال میں تھا، اسے کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ گھنٹوں، گھنٹوں میں سر دیے تیمور کے لیے روتی...... بار، بار اس کو کال کرتی...... وہ اس کا فون ریسیو نہیں کرتا...... وہ اس کو whatsapp پر میسج کرتی اس نے whatsapp آف کر دیا۔ وہ اس کو فیس بک پر تلاش کرتی اس نے اس کو بلاک کر دیا۔ ایک جنون تھا جو اس پر سوار رہتا۔ وہ سارا، سارا دن گھر میں اس کی خوشبو محسوس کرتی پھرتی...... اس کو ڈھونڈتی اور پھر وہ نہ ملتا تو بہت روتی۔

ملازمین اس کی حالت دیکھتے لیکن حدِ ادب میں رہتے ہوئے خاموش رہتے۔

اس کی حالت دیکھتے ہوئے رابعہ بیگم اسے سمجھاتیں۔

''بیٹا اللہ کے آگے جھکو، نماز پڑھو، اس کی مدد مانگو۔'' تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتی۔

''میں اللہ کے آگے کیوں جھکوں اس نے میرا سب کچھ چھین لیا اس نے مجھے بے سائبان کر دیا۔'' اس کے کفر بکنے پر رابعہ بیگم توبہ، توبہ کرتی رہ جاتیں وہ اللہ سے پناہ مانگتی رہتیں۔ اس کے لیے نیک ہدایت کی دعائیں کرتیں...... اور سب جانتے ہیں ماں، باپ کی دعا کتنی جلدی عرشِ الٰہی کا دروازہ کھلواتی ہے۔

☆☆☆

وہ کتنی ہی دیر...... فون کے ریسیور کو دیکھتی رہی اسے یقین نہیں آ رہا تھا...... ان کے سنے گئے الفاظ پر۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم، میرا پیچھا کیوں کرتی ہو...... اللہ کے واسطے میرا پیچھا کرنا، مجھے کھوجنا چھوڑ دو...... میں بہت خوش ہوں، تمہاری شکل سے، تمہاری آواز سے مجھے کوفت ہوتی ہے اگر تم مجھے اس طرح تنگ کرتی رہیں تو ان تین لفظوں کو کہنے میں دیر نہیں لگے گی...... جو تمہارا اور میرا راستہ الگ، الگ کر دیں گے...... ویسے بھی نبیلہ (تیمور کی دوسری بیوی) نہیں چاہتی کہ تم میرے نام کے ساتھ جڑی رہو اور نبیلہ کی ہر خواہش میرے لیے قابلِ احترام ہے...... میں اس سے محبت کرتا ہوں ایسی محبت جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں...... اگر چند لمحے وہ مجھے نظر نہیں آئے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے...... سمجھیں تم......'' وہ دہاڑا۔

''اور اس فون کو میرا آخری فون سمجھنا اگر آج کے بعد تم نے مجھے کال کرنے کی کوشش کی...... تو میرا کیا فیصلہ ہوگا...... میرے خیال سے تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا۔''

وہ فون رکھ چکا تھا اور رومی نہ جانے کتنی ہی دیر تک ایک بے یقینی کی سی کیفیت میں ریسیور پکڑے بیٹھی رہی تھی لیکن آج وہ روئی نہیں...... آج اس نے کوئی واویلا نہیں مچایا۔ ایک عجیب سا احساس تھا...... ایک ایسا احساس جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی...... جس کے وہ زیر اثر تھی...... اس نے آہستگی سے فون کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

اسے...... اپنی ماں کی دعائیں اور نصیحتیں یاد آ گئیں۔

''تو اللہ سے کیوں نہیں مانگتی بیٹی۔ ارے جو سب کا ہوتا ہے تو اس کی کیوں نہیں ہو جاتی جس طرح تو ان دنیاوی چیزوں کے لیے بے قرار رہتی ہے، کبھی اللہ کے لیے ہوئی...... نہیں بالکل نہیں...... تو ہو بھی نہیں سکتی...... اللہ کو وہ ڈھونڈتے ہیں جن کو اللہ چاہتا ہے۔ اپنی مرضی مت چلا...... اللہ کی مرضی پر چل...... تجھے وہ سب ملے گا جو تو چاہتی ہے۔ جیسی محبت تو نے دنیا سے دنیاوی چیزوں سے کی ہے اگر اللہ سے کرتی تو دربدر نہ

بھٹکتی...... اس کی ہو جا جس کا سب کچھ ہے۔ ایک مرد کے لیے تو اب روتی ہے، کبھی اللہ کے لیے روئی...... نہیں اگر اللہ کے لیے روتی تو وہ تجھے روتا نہیں چھوڑتا۔ تیرے آنسو پونچھتا...... لیکن تو...... تو مخلوق کی محبت میں خالق کی محبت بھلا بیٹھی۔ تو نے زندگی کے سترہ سال اس مرد کو خوش کرنے میں برباد کر دیے پھر بھی تو وہ تجھ سے خوش نہ ہوا...... اگر تو صرف سترہ دن اتنے ہی خلوص سے اپنے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرتی تو وہ راضی نہ ہوتا کیا؟ تو ناشکری ہے، جو مل گیا اس پر شکر نہیں کرتی جو کھو گیا اس پر صبر کیوں نہیں کرتی۔ ہر کام میں...... ہر معاملے میں محبت اور خلوص بہت ضروری ہے...... یہ ایسے ہی ہے جیسے جسم کے لیے روح......''

''اماں میں تو تیمور کی محبت تھی اور میری محبت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔

''بیٹا محبت میں تقسیم نہیں ہوتی، محبت میں ضرب ہوتی ہے، جمع ہوتی ہے، محبت میں تفریق نہیں ہوتی، محبت بلا تفریق ہوتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ اچھائی کر، خود غرضی کا لبادہ اتار کر پھینک...... بس نیکی کر...... خود سے مطمئن رہ...... تیرے دل کو یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ تو نے کسی کے ساتھ برا نہیں کیا...... ہم انسان ہیں، ہمارے اختیار میں جتنا ہے اتنا ہی کر سکتے...... باقی اللہ پر چھوڑ دے...... اللہ بڑا نکتہ نواز ہے۔'' پھر واپسی کا سفر بہت پُرسکون تھا وہ آنکھیں بند کیے اپنی اماں کی باتیں سوچ رہی تھی۔

زندگی میں پہلی دفعہ اسے احساس ہوا...... واقعی وہ بہت ناشکری ہے، واقعی زندگی میں وہ خالی ہاتھ ہے، اس رب نے جسے اس نے یاد کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس رب نے...... اس کی ہر خواہش، ہر آرزو پوری کی...... اور وہ...... وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

کہتے ہیں جب دل بدلتا ہے تو چند لمحے ہی لگتے ہیں اور روی کو بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔ جیسے کسی نے اس کا دل چٹکی سے پکڑ کر پلٹ دیا ہو۔

بارشیں

بارشوں کے موسم میں
تم کو یاد کرنے کی
عادتیں پرانی ہیں
اب کی بار سوچا ہے
عادتیں بدل ڈالیں
پھر خیال آتا ہے
عادتیں بدلنے سے
بارشیں نہیں رکتیں

انتخاب: یاسمین اقبال، لاہور

سوال

ایک لڑکی نے اپنے والد صاحب سے پوچھا۔''بابا میں اپنے جسم کے کس، کس حصے کا پردہ کیا کروں؟'' تو والد صاحب نے جواب دیا۔

''جس، جس حصے کو جہنم سے بچانا چاہتی ہو۔''

از: سنبل ملک اعوان

زندگی میں پہلی مرتبہ وہ صدقِ دل سے روئی...... کسی خواہش کے لیے نہیں...... اپنی کم نصیبی...... اپنی بدنصیبی پر...... اپنی رائیگاں گئی زندگی پر، اپنے جذبوں کی ناقدری پر......

وہ اللہ سے آج زندگی میں پہلی مرتبہ چیزیں نہیں مانگ رہی تھی...... وہ اللہ سے اللہ کی محبت مانگ رہی تھی...... آج زندگی میں پہلی بار اسے لگا کہ سب کچھ ہارنے کے باوجود بھی وہ تہی دامن نہیں ہے...... اللہ اس کے ساتھ ہے بس اسے اپنے رب کو راضی کرنا ہے۔

اللہ اپنے بندوں سے کتنی محبت کرتا ہے لیکن ہم...... ہم سمجھ ہی نہیں پاتے۔

میں کم ظرف ہر نعمت کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی رہی۔ وہ مجھے جیسے، جیسے نوازتا رہا...... میں ویسے، ویسے اسے بھولتی رہی...... وہ اب میری زندگی سے نکلتا گیا۔

ماں کے گھر سے واپسی پر اس نے تیمور کے اس پُرتعیش گھر کو چھوڑ دیا اور واپس اپنے دو کمروں اور بڑے سے صحن والے گھر میں چلی آئی جو برسوں سے بند پڑا ہوا تھا۔ گھر اس کی زندگی کی طرح ہی گرد آلود تھا۔

رابعہ بیگم اور صنوبر نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن اب وہ صرف اللہ کو کھوجتی تھی۔

”جب میں اللہ کو بھول بیٹھی تو آپ کو ایسا ملال کیوں نہیں ہوا...... اور آج جب میرا بے چین دل میرے اللہ کے لیے تڑپ رہا ہے تو آپ لوگ مجھ پر ترس کھا رہے ہیں۔“ وہ کہتی۔

اس نے سارے رنگین کپڑے خیرات کردیے، وہ صرف سفید لباس پہنتی...... تیمور کہاں ہے؟ کیا کررہا ہے اب اسے پروا نہیں تھی۔ اس کے بیٹے جو آسٹریلیا کے ایک بڑے اسکول میں پڑھ رہے تھے جن کی زندگیوں میں ماں، باپ کی حیثیت ثانوی تھی کہ نیکیاں، نیک اولاد، فرمانبردار اولاد کی صورت میں ہی ملتی ہیں...... اس نے کون سی ایسی نیکی کی تھی کہ اس کی اولاد اس کی ہوتی۔ اس کے بیٹوں کو نہ اس بات کی پروا تھی کہ ان کا باپ کیا کرتا پھرتا رہا ہے اور نہ ہی انہیں اس بات کا ملال تھا کہ ان کی ماں کا کیا حال ہے۔ وہ اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ وہ اپنا مستقبل بنانے میں مصروف تھے...... وہ ہفتوں اس کو فون نہیں کرتے...... اور وہ شکایت بھی نہیں کرتی تھی۔

”پتا ہے صنوبر میں بچوں کے رویے کی شکایت کیوں نہیں کرتی...... ان کی لاتعلقی کا دکھ مجھے اللہ کے اور قریب کرتا ہے...... میں سوچتی ہوں میں نے تو صرف جنم دیا ہے اس پر ان کی بے پروائی مجھے اس قدر تکلیف دیتی ہے، مجھے بھی تو میرے اللہ نے تخلیق کیا ہے، میرے اعضا بنائے، میری تقدیر لکھی...... میرے دنیا میں آنے سے پہلے اس نے میرا رزق اتار دیا۔ مجھے ایمان دیا، شریف خاندان دیا...... ہر خواہش پوری کی...... مجھے حسن دیا...... جب میں نے اسے بھلادیا تو اگر میرے بچے مجھے بھلادیں تو شکایت کیسی...... یہ تو مکافاتِ عمل ہے ناں......“

اس کی زندگی یکسر بدل گئی تھی۔

وہ سفید کپڑوں میں ملبوس رہتی...... محلے کے بچوں کو قرآن پڑھاتی، کوئی بیمار پڑتا تو تیمارداری میں لگ جاتی، کوئی ضرورت مند ملتا تو اس کی ضرورت کو حتی الامکان پورا کرنے کی کوشش کرتی...... کھانا پکاتی...... اور پھر کسی بھی رفاحی ادارے میں لے جاکر ان مظلوم لوگوں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتی...... جنہیں اللہ کے سوا کوئی پوچھنے والا نہیں جب رابعہ بیگم اس کی تکلیفوں پر پریشان ہوتیں...... تو وہ مسکرا کر کہتی۔

”امی اللہ انہیں آزماتا ہے جنہیں وہ اپنے قریب لانا چاہتا ہے۔ مجھے جو ملتا ہے اس پر میں اللہ کی شکرگزار ہوں اور جو نہیں ملتا اس پر بھی اللہ کی شکرگزار ہوں کہ وہ مجھے وہی دے گا جو میرے حق میں بہتر ہے۔“

”تمہیں کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا چاہیے......“

دیبا کو جب صنوبر کے ذریعے رومی کے حال کا پتا چلا تو اس نے فون پر اسے تاکید کی۔

”کیوں......؟ کیوں دکھاؤں سائیکاٹرسٹ کو؟ صرف اس لیے کہ میں اپنے رب کے حکم کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے اور اس کے حکم پر چلنے کی کوشش کررہی ہوں۔ اس لیے کہ دکھ کی سوئی چبھو کر میرے اللہ نے مجھے غفلت کی زندگی سے جگایا ہے۔ ہاں مجھے ہی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا چاہیے تھا جب...... جب میں حقیقی خدا کو بھول کر مجازی خدا کو پوج رہی تھی جب میں آخرت کو بھول کر دنیا میں ڈوب رہی تھی۔ اللہ لے کر بھی آزماتا ہے اور دے کر بھی...... جب اس کی دی ہوئی دولت، اس کی آزمائش پر میں پوری نہیں اتری، آج جب میں تابعداری، بندگی اور شکر کی سیڑھی پر قدم رکھنے کی کوشش کررہی ہوں تو تم سب کو میں سائیکی لگ رہی ہوں، تم سب مجھے پاگل سمجھ رہے ہو۔“ اس نے کھردرے اور تلخ لہجے میں دیبا سے کہا۔

اور دیبا کو ایسا لگا جیسے اس کا پورا وجود ٹھنڈے پانی میں ڈوب گیا ہو...... اس کے پاس کہنے کے لیے ایک لفظ نہ بچا اور اس نے خاموشی سے فون بند کردیا۔

☆☆☆

اس نے درس قرآن کی کلاسز لینی شروع کردیں اور اس پر آگہی کے دروازے کھلنے لگے...... لیکن اب

بھی اکثر وہ سوتے، سوتے گھبرا کر اٹھ بیٹھتی...... اس کے دل کی بے چینی ختم نہیں ہوتی۔ وہ ایک عاجز بندی کی طرح لوگوں سے پیش آتی۔ کوئی اس کو کچھ کہتا وہ کبھی برا نہیں مانتی...... وہ سارا، سارا دن جائے نماز پر سر جھکائے بیٹھی رہتی...... ساری، ساری رات اس کی سجدوں میں گزرتی۔ گھر میں قرآن پڑھنے والی بچیوں کو اچھی، اچھی چیزیں پکا کر کھلاتی اور خود روٹی کے بچے ہوئے ٹکروں سے پتیلی کا پیندا پونچھتی۔

''بیٹا کیا ہو گیا ہے؟ تیمور کے لیے تم نے اپنی کیا حالت بنالی۔'' آج رابعہ بیگم نے جب اس کو دیکھا تو دل گرفتگی سے کہنے لگیں۔

''کیا ہو گیا امی...... یہ سب آپ نے ہی تو مجھے سمجھایا تھا۔ دراصل میری چپل کا تلوا گھس گیا ہے پیر زمین کو چھوتا ہے اس لیے ایڑی میں شیشہ چبھ گیا۔ اور امی دل میں اتنے گھاؤ ہیں اس ایڑھی کے گھاؤ کا کیا رونا...... اور تیمور؟ کس نے کہہ دیا...... میں نے تیمور کے لیے جوگ لیا ہے، تیمور کہاں ہے، کس کے ساتھ ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ مجھے تو خیال تک نہیں آتا...... میرے لیے تو میرا اللہ ہی کافی ہے...... مجھے بس اللہ چاہیے...... جو مجھے اٹھاتا ہے، جو مجھے سلاتا ہے، جو مجھے کھلاتا ہے...... جس کی محبت ہر غرض سے پاک ہے...... میں اپنے اللہ کی دیوانی ہوں...... میں اس کے عشق میں مبتلا ہوں...... آپ کو پتا ہے امی عشق کیا ہوتا ہے، عشق اور محبت دراصل دو الگ، الگ جذبے ہیں...... محبت یہ ہے کہ تو چاہے تو میں بھی چاہوں اور عشق...... عشق ہر ایک کے نصیب میں کہاں؟ عشق یہ ہے کہ تو چاہے نہ چاہے' میں تجھے چاہوں گی...... ہاں میں اپنے اللہ سے عشق کرتی ہوں۔ مجھے تو زندگی کے اس دوراہے پر آ کر پتا چلا ہے کہ ان تمام جذبوں کو جنھیں زندگی بھر میں محبت کا نام دیتی رہی...... وہ سب تو محبت اور عشق کی الف، ب سے بھی واقف نہیں تھے۔ محبت کیا ہوتی ہے؟ محبوب کیسا ہوتا ہے؟ عشق کی کتنی منزلیں ہیں؟ یہ مجھے اب پتا چلا ہے......

جب انسان کو عشق ہو جاتا ہے تو وہ ملنگ ہو جاتا ہے۔ ہوش و خرد سے بیگانہ...... محبوب کے دیدار کا دیوانہ...... محبوب کا حصول...... محبوب کی پسند اور ناپسند...... اس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ اور مجھے اپنے اللہ سے عشق ہے، جس نے مجھ پر انسانوں کے روپ کھولے...... جس نے دکھ کی سوئی چبھو کر مجھے اپنے ہونے کا احساس دلا دیا ہے۔ سب کچھ نہ کچھ مانگتے رہتے ہیں، کوئی دنیا مانگتا ہے، کوئی محبوب مانگتا ہے' ہر شخص بھکاری ہے، ہر بادشاہ، ہر فقیر اسی کے در کا بھکاری ہے...... میں بھی اس کے در سے بھیک مانگ رہی ہوں...... میں اپنے اللہ سے اس کی محبت مانگ رہی ہوں۔ وہ ناراض نہیں ہوتا...... وہ رحمٰن ہے وہ رحیم ہے...... لیکن ہر ایک کے نصیب میں کہاں اس کے در کا بھکاری ہونا...... امی اس سے بھیک مانگنا بہت اچھا لگتا ہے...... آپ کو پتا ہے جب ساری دنیا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو وہ اللہ ہے جو اس وقت بھی ہاتھ تھام لیتا ہے...... جو ہمارے وجود کو کشش ثقل سے باہر نہیں نکلنے دیتا...... ورنہ ہم، ہم تو وہ لوگ ہیں اس کی نعمتوں کے ملنے کے بعد اس کے دائرہ ثقل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں...... امی آپ تو ماں ہیں ناں...... ماں، باپ کی دعا تو سیدھی عرش پر جاتی ہے آپ میرے لیے دعا کریں ناں...... آپ میرے لیے دعا کریں...... مجھے میرا اللہ مل جائے، میرا کشکول اس کی محبت سے بھر جائے......'' وہ رابعہ بیگم کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے رو رہی تھی اور رابعہ بیگم خاموشی سے صرف اسے دیکھ رہی تھیں...... یہ ان کی موم سے نازک شہد سے گندھی بیٹی تھی جو آج زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔

☆☆☆

دو سال سے زائد عرصہ ہو گیا تھا۔ ان دو سالوں میں نہ اس کے بچے اس سے ملنے آئے اور نہ ہی تیمور کی کوئی خبر اس تک پہنچی۔

لیکن وہ ایمان کی اس سیڑھی پر جا کھڑی ہوئی تھی جہاں بندہ اللہ کی رضا میں راضی رہتا ہے۔ وہ جانتی تھی

اس کا ایمان تھا، اللہ انہیں آزماتا ہے جنہیں وہ اپنے قریب لانا چاہتا ہے۔ وہ اللہ کے لیے اللہ کے بندوں میں خیر بانٹتی تھی...... اکثر لوگ اس خاموش لڑکی کو جو سارا، سارا دن نم آنکھوں سے قرآن پاک پڑھتی رہتی جوارد گرد بسنے والوں کی تکلیف پر تڑپ اٹھتی لوگ بڑی عزت سے اور کبھی حیرت سے اسے دیکھتے تھے۔

"تم تیمور بھائی کو کیسے یاد نہیں کرتیں، تم کو تو ان سے بہت محبت تھی ناں......" دیبا نے ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا۔

"محبت...... تمہیں پتا ہے محبت کیا ہوتی ہے؟" اس نے اپنے سوکھے لبوں کو زبان پھیر کر تر کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں پتا......" وہ عجیب یاسیت سے مسکرائی۔

"جب انسان بہت گہری نیند میں ہو اور اس کے کانوں میں اذان کی آواز آئے اور وہ اپنی نیند کو چھوڑ کر اللہ کے لیے نماز پڑھنے اٹھ کھڑا ہوئے یہ سچی محبت ہے۔ عام محبت اور سچی محبت میں فرق ہوتا ہے۔" اس نے کہا اور حیران سی دیبا کو چھوڑ کر وضو کرنے چل دی۔

☆☆☆

"بعض اوقات مسلمان ہونے کے باوجود ہم ساری زندگی یہ یقین نہیں کر پاتے ہمارا اللہ کون ہے؟ جب کوئی ہم سے پوچھتا ہے تم مسلمان ہو تو ہم کہتے ہیں الحمدللہ...... تمہارا رب کون ہے، ہم کہتے اللہ واحد...... لیکن جب ہم پر کوئی وقت پڑتا ہے، جب ہم کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تو کیا ہم اللہ سے رجوع کرتے ہیں...... نہیں ہماری ہر مشکل ہر پریشانی میں ہم کو سب سے پہلے جس کا خیال آتا ہے دراصل وہی ہمارا اللہ بن جاتا ہے۔ ہم کسی مصیبت میں آتے ہیں تو ہم کہتے ہیں میرا بھائی ایس پی ہے، اس کو فون کرتا ہوں...... اور ہم اللہ سے مدد مانگنے کے بجائے اس پولیس والے کے دروازے پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم بیمار ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ارے فلاں ڈاکٹر کو دکھاؤ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ اس لمحے ہم بھول جاتے ہیں اللہ شافی، اللہ کافی اور وہ ڈاکٹر ہمارا اللہ بن جاتا ہے۔ ہم سفر پر جاتے ہیں تو کہتے ہیں سارا انتظام ہے، میرے پرس میں پیسے ہیں کوئی فکر کی بات نہیں...... اس لمحے پیسہ اللہ بن جاتا ہے۔ ہم کسی بھی دکھ پریشانی، بیماری یا کسی بھی مسئلے میں یہ صرف یہ کیوں نہیں کہتے، حسبنا اللہ ونعم الوکیل

ہمیں حکم ملا کہ دکھ اور پریشانی میں صبر اور نماز کا سہارا لو۔ ہماری خوشی میں، ہماری پریشانی میں...... سب سے پہلے جو چیز ہم بھولتے ہیں وہ نماز ہی تو ہے، حیرت ہے دنیا کے سارے کاموں کے دوران ہمارے پاس نماز کے لیے وقت ہی نہیں بچتا...... ہم کسی کی اللہ کے دیے ہوئے مال میں ہی سے مدد کریں تو چاہتے ہیں کہ وہ بندہ ہمارا شکر یہ ادا کرے بلکہ ہر آن ہمارا شکر گزار ہو...... پر اللہ کی بے پناہ نعمتوں کا ہم شکر ادا نہیں کرتے، ہم اللہ کی تخلیق کی ہوئی ہر نعمت استعمال کرتے ہیں اور بدلے میں ہمارا اللہ ہم سے پیسہ نہیں مانگ رہا، صرف بندگی چاہتا ہے...... اپنے اپنے گریبانوں میں جھانک کر ہمیں سوچنا چاہیے کہ کیا ہم اللہ کے حقیقی بندے ہیں جیسا کہ ہونا چاہیے۔ ہم چوبیس گھنٹوں میں لاتعداد نافرمانیاں کرتے ہیں...... اور اگر ایک بات ہماری مرضی کے خلاف ہو جائے تو ہم کفر بولنے لگتے ہیں۔ بے شک اللہ کے ہر کام میں حکمت اور مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے...... ہمیں یقین ہونا چاہیے وہ جو ہمارا رب ہے دراصل وہی ہمارا سب ہے...... بے شک وہی ہمارا سب ہے۔" اس کے لب کپکپائے۔ آئمہ ہانی نے چونک کر ذرا فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے رومی کو دیکھا۔

وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے ان کے درس میں آرہی تھی...... وہ آتی خاموشی سے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی ان کا درس سنتی اور پھر بغیر بات کیے اٹھ کر چلی جاتی۔ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا وہ بولی تھی۔ آئمہ ہانی مسکرائیں...... وہ جانتی تھیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اللہ تعالیٰ کبھی نہ کبھی اصلیت دکھا دیتا ہے ہر رشتے کی...... ہر محبت کی...... پھر وہ سب کچھ دکھا کر آدمی سے کہتا ہے کہ اب بتا تیرا میرے سوا کون ہے؟

جب ساری دنیا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو وہ اللہ ہی ہے جو ہمارا ہاتھ تھامے رکھتا ہے...... اللہ کی دہلیز پر سجدے کرتے رہو...... کوئی ایک سجدہ تو قبولیت کے دریچے پر پہنچے گا۔ کوئی ایک سجدہ......

''میرے مالک میرے سجدوں کو قبول فرما......''

اس کے دل نے فریاد کی اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اس کے کندھے کسی ان جانے بوجھ سے دکھ رہے تھے...... اس کا دل بے حد گھبرا رہا تھا۔ رائگاں زندگی کا ملال۔

وقت کا زیاں...... اس کو رُلا رہا تھا۔

''ایک بادشاہ سے اس کی ساری بیویاں محبت کا دعویٰ کرتی تھیں۔ ایک دن بادشاہ نے ان کی محبت کو جانچنا چاہا...... تو اس نے دربار میں ہیرے جواہرات کا ڈھیر لگا دیا اور سب بیویوں سے کہا کہ اس دربار میں موجود ہر چیز کو تم جو چاہو جتنا چاہو لے سکتی ہو۔

بادشاہ کا اشارہ ملتے ہی ساری بیویاں جلدی، جلدی اپنے، اپنے تھیلے بھرنے لگیں۔ لیکن ایک بیوی آگے بڑھی اور اس نے بادشاہ سے پوچھا کہ کیا ہم دربار میں موجود کوئی بھی چیز لے سکتے ہیں۔ بادشاہ نے اقرار کیا تو اس نے آگے بڑھ کر بادشاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا مجھے آپ چاہئیں...... کیونکہ اگر آپ ساتھ ہیں تو سارا خزانہ خود بخود میرا ہو جائے گا......

رومی کو صبح کو پڑھی ہوئی حکایت یاد آگئی تو اس کے آنسو اور تواتر سے بہنے لگے...... واقعی ساری زندگی میں بھی تھیلے میں پتھر بھرتی رہی میں نے بادشاہ کا نہ سوچا۔

اور میرا بادشاہ، میرا مالک، میرا شہنشاہ تو دن میں پانچ مرتبہ مجھ کو پکار کر کہتا ہے، آؤ بھلائی کی طرف، آؤ بھلائی کی طرف...... میں نے مخلوق کی محبت میں خالق کو بھلا دیا...... کبھی مخلوق بھی کسی کی ہوئی ہے۔

میں مٹی سے بنی اور مٹی ہی میرا انجام...... یہ جانتے ہوئے بھی تکبر کیا۔

ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں جو ملا وہ اس کی عنایت ہے اس کی مہربانی ہے، ہم تو پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق سے نیچے نہیں اتار سکتے۔''

''باجی یہ مجھے دے دو۔'' وہ جو اپنی سوچوں میں گم تپتی سڑک پر چلی جارہی تھی اس بچے کی آواز پر چونک اٹھی...... اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کی بوتل تھی...... وہ پانی جب اس کو بھوک لگتی تو وہ گھونٹ بھر لیتی...... اس نے اپنی خالی مٹھی دیکھی اور پھر سر اٹھا کر سر پر جلتے سورج کی طرف دیکھنے کی کوشش کی......

اور پھر وہ پانی کی بوتل سوالیہ بنے اس بچے کو تھما دی جو اس جلتی سڑک پر ننگے پیر بھاگ، بھاگ کر گاڑیوں کے شیشے صاف کر رہا تھا۔

''رکو......'' اس نے جلدی، جلدی پانی پیتے اس بچے کو روکا۔ ''یہ چپل پہن لو۔'' اس نے اپنے سفید دودھیا پیر تارکول سے تپتی سیاہ سڑک پر رکھ دیے۔

''باجی یہ تو آپ کی ہیں اور میرے پیروں میں بڑی بھی ہیں۔'' بچے نے چپل کو ضرورت مند نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں تم پہن لو، کم از کم تمہارے پیر تو نہیں جلیں گے ناں۔'' اس نے شفقت سے اس بچے کے سر کو تھپتھپایا اور اس بچے کو حیران چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

سارے کمرے میں سفید دودھیا روشنی بکھری ہوئی تھی...... ہر چیز پر ایک عجیب سا سکون طاری تھا...... برسوں بعد اس کا دل خوش تھا مطمئن تھا...... اس نے طمانیت سے مسکراتے ہوئے دیوار پر لگی کلاک کو دیکھا۔ جو رب کو ڈھونڈتا ہے، کھوجتا ہے...... رب اس کو ضرور ملتا ہے...... وہ تو یہ قبول کرتا ہے، وہ بندوں کی توبہ سے خوش ہوتا ہے اور جب وہ خوش ہوتا ہے تو بندہ نصیبوں کی بلندی پر جا کھڑا ہوتا ہے تجھ کو تیرا محبوب مبارک۔'' خواب میں کی گئی سرگوشی پھر اس کے کانوں میں گونجی...... وہ بستر سے کھڑی ہوگئی کہ اس کو شکرانے کے نفل پڑھنے تھے اس کی یاسیت اس کی افسردگی ختم

ہوگئی اور پھر وہ سجدے میں جا کر خوشی سے روتی رہی...... روتی رہی......

☆☆☆

اس نے چائے کا کپ منہ سے لگاتے ہوئے تیمور اور اپنے بیٹوں کو دیکھا، کتنے برسوں کے بعد وہ سب ایک ساتھ اپنے گھر میں چائے پی رہے تھے...... اس نے تیمور کی آنکھوں سے چھلکتی والہانہ محبت کو دیکھا......

"رومی بہت، بہت مبارک ہو تیمور بھائی نے اپنی دوسری بیوی کو طلاق دے دی ہے وہ بہت شرمندہ ہیں، بہت معافی مانگ رہے ہیں وہ اور تمہارے دونوں بیٹے تم سے ملنے کو بے قرار ہیں، وہ تمہیں لینے آرہے ہیں......" وہ جو خوشی الحانی سے قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ ایک لمحے کو خاموش ہوئی۔

"اے ابنِ آدم ایک میری چاہت ہے اور ایک تیری چاہت ہے...... پر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔"

اس کے ذہن میں گونجا۔

"میں جانتی تھی۔" اس کے لبوں سے سرسراتے ہوئے نکلا۔

"تمہیں...... تم، تمہیں کیسے پتا......" صنوبر حیران ہوئی۔

وہ خاموش رہی......

"میں نے اسی دن اپنی بات کو سمجھانا یا وضاحت دینا چھوڑ دیا تھا...... جس دن یہ جان لیا تھا کہ لوگ آپ کی بات کو اپنی سمجھ تک ہی سمجھ سکتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے قرآن پاک بند کیا اور کھڑی ہوگئی۔

☆☆☆

"تم نے مجھ سے کوئی شکایت یا گلہ نہیں کیا...... میں تو سمجھ رہا تھا تم بہت ناراض ہوگی۔" بچے اٹھ کر جا چکے تھے۔ تیمور نے خاموشی سے چائے پیتی سر کو اسکارف سے ڈھانپے، فل آستین کی ڈھیلی ڈھالی قمیص میں اپنے آپ کو چھپائے اس رومی سے کہا جو اتنی مقدس اور پاکیزہ لگ رہی تھی، جس کے چہرے پر اتنا تقدس اور پاکیزگی تھی کہ باوجود شوہر ہونے کے وہ نظر اٹھا کر دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

"کچھ گلے کہنے کے نہیں ہوتے محسوس کرنے کے ہوتے ہیں...... ان کہے لفظوں کی چیخیں ہر کسی کو سنائی بھی تو نہیں دیتیں......" وہ سوچ کر رہ گئی۔

"کیونکہ میں سمجھ چکی ہوں ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا...... اور میں نے اپنے اللہ کی رضا میں راضی رہنا سیکھ لیا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

تیمور خاموش ہوگیا...... وہ سمجھ رہا تھا کہ آہستہ، آہستہ رومی اس فیز سے باہر آجائے گی...... لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ رومی کا محبوب بدل گیا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ عشقِ حقیقی کی اس سیڑھی پر جا کھڑی ہوئی ہے جہاں عشقِ مجازی، محبوبِ حقیقی کے حکم کی تعمیل تھا۔

☆☆☆

لان میں کرکٹ کھیلتے دونوں بیٹے، محبت کی...... بے قراریاں چھلکاتا اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا تیمور...... اس نے ایک مطمئن نگاہ محبتوں، خوشیوں اور اطمینان سے جگمگاتے محبت کدہ روی کو دیکھا اور پھر آسمان کی طرف کہ...... "میرا رب وہ ہے، جو مشرق والوں کو دیکھتا ہے تو مغرب والوں کو نہیں بھولتا ہے جو آسمانوں کا نظام چلاتے ہوئے سمندروں کا نظام نہیں بھولتا جو رات کے اندھیروں میں سجدہ کرنے والوں کو دیکھتا تو برائی کی محفلوں سے غافل نہیں ہوتا...... جو ایسا معاف کرنے والا ہے کہ سو سال کے گناہوں کو ایک پل میں معاف کر دیتا ہے اور پلٹ کر یہ بھی نہیں پوچھتا کہ پھر تو نہیں کرو گے......"

اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا اور آنکھ میں آیا آنسو بڑی مہارت سے چھلکنے نہیں دیا...... اور منتظر کھڑے تیمور کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا شروع کر دیا کہ یہ اس کے رب کا حکم تھا...... اور زندگی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ بے شک ہر شے پر اللہ قادر ہے۔



بھروسا

سحرش فاطمہ

”ارے تم نے سنا، وہ عائشہ نے کرن کو تھپڑ مارا؟“

”ارے چھوڑو، یہ صرف نام کی دوستیاں ہیں پیٹھ پیچھے تو ایک دوسرے کی برائیاں کرتی ہیں۔“

”سچ ہے ویسے یہ امبر بھی کم نہیں، مجھ سے کہتی ہے علیزہ کا کسی سے چکر ہے۔“ یہ نزہت تھی جو اپنی دوست ربیعہ سے فون پہ بات کر رہی تھی۔

”ہاں شک تو مجھے بھی تھا، تمہیں کس نے بتایا؟“ ربیعہ نے پوچھا۔

"ارے عائشہ نے بتایا اسے اپنے بہن علیزہ پسند نہیں...... جلتی ہے بتا رہی تھی کہ روز فون پہ بات کرتی ہے۔" نزہت نے اور چسکے لے، لے کے بتایا۔

"توبہ، توبہ اور ہمیں لیکچر دیتی ہے یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، اچھا چھوڑو وہ تھپڑ والی بات تو سنو۔" ربیعہ اب بھی اسی میں اٹکی تھی۔

"یار سینئر جی آ گئے ہیں، میں بعد میں بات کرتی ہوں۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے بائے۔" دونوں نے فون رکھ دیا لیکن نزہت نے فون کہیں اور گھمایا۔

"ہاں یار علیزہ کیسی ہو؟"

"ہاں، میں ٹھیک تم بتاؤ۔"

"میں بھی ٹھیک ہوں۔"

"اور کیا ہو رہا تھا؟"

"ارے بس یہ امبر کا فون آیا تھا تمہاری باتیں کر رہی تھی۔" نزہت بھی کم نہ تھی اس کام میں۔

"کیا میری باتیں کیوں کیا کہہ دیا ایسا؟" علیزہ پوچھنے لگی۔

"کہہ رہی تھی خود افیئر چلاتی ہے اور ہمیں روک ٹوک کرتی ہے اور کہہ رہی تھی پوری رات جاگ، جاگ کے باتیں کرتی ہے اور ہمیں کہتی ہے پڑھائی کرتی ہوں، لو سنو اس کی باتیں۔" نزہت نے اپنی طرف سے باتیں بنا کر سنا دیں۔

"کیا، اس نے ایسا کہا؟ خود اس کے کون سے کام صحیح ہیں بس رہنے دو اور یہ افیئر میرا کب سے ہو گیا؟"

"دفع کرو تم کیا بتا رہی تھیں ربیعہ کا؟" اسے تو دوسری کہانی مل رہی تھی وہ کیوں چھوڑ دیتی۔

"چھوڑو یار ہم کیوں کسی اور کی باتیں کریں اِدھر اُدھر ویسے بھی تمہارے لیے بھی بہت کچھ کہتی ہے۔" علیزہ نے بھی اپنی طرف سے کہہ دیا جس پہ نزہت غصے میں آ گئی۔

"اچھا، آئی بڑی معصوم چالاک کہیں کی، اِدھر مجھ سے اچھی دوستی رکھ کر تم سے میری برائیاں کرتی ہے۔ اسے تو میں چھوڑوں گی نہیں، چلو تم سے میں بعد میں بات کرتی ہوں۔ پہلے اسے دیکھ لوں۔"

"چلو ٹھیک ہے اللہ حافظ!"

"ہاں اللہ حافظ۔" دونوں نے فون رکھ دیا۔

"کیا ہوا عالی مسکرا رہی ہو؟" عائشہ نے پوچھا۔

"قسم سے یہ لڑکیاں بھی ناں اِدھر اُدھر کا سن کر باتیں اِدھر اُدھر کر دیتی ہیں اور کیا پکا نشانہ لگاتی ہیں اور سامنے والے بات اگل بھی دیتے ہیں۔" علیزہ نے افسوس کا مظاہرہ کیا۔

"ہاں اور کیا، مجھ سے ہی تمہاری دوستیں اوٹ پٹانگ سوال کرتی ہیں اور پھر میرا تیرا نام لے کے ان لوگوں کو بتا دیتی ہیں، تم نے ایسی لڑکیوں سے دوستی رکھی ہی کیوں ہے؟" عائشہ نے پوچھا۔

"اوہو ہم سب تو کالج کی دوستیں ہیں اب کچھ شادی کر چکی ہیں کچھ پڑھ رہی ہیں آگے تو بس سلام دعا اب بھی ہے۔"

"خیر میں تو کہوں گی ان سب سے بچ کے رہو۔" عائشہ نے تنبیہ کی۔

"اچھا بابا، اب چلو اٹھو بابا آتے ہوں گے کچن میں چلتے ہیں۔" دونوں ہنستے بات کرتے کچن میں آ گئیں۔

"اچھا اور کیا باتیں ہو رہی تھیں فون پہ بتاؤ مجھے بھی۔"

"لو میں بھی اِدھر کی اُدھر کر دوں۔" عائشہ کی بات پہ علیزہ نے کہا۔

"ہاں تو میں تو بہن ہوں ناں، میں نے کون سا ان لڑکیوں کو بتانا ہے۔" عائشہ نے منہ بسورتے کہا۔

"اچھا بابا بتا دوں گی ابھی تو کوکنگ...... پہ توجہ دو۔" علیزہ کی بات پہ عائشہ مسکرا دی۔

☆☆☆

"ہیلو کیسی ہو؟ کافی دن ہو گئے ہم سب ملے نہیں، ملتے ہیں۔" ربیعہ نے علیزہ کو فون کیا۔

"نہیں یار، میں پڑھائی میں اتنا مصروف رہتی ہوں

کہ ملنے ملانے کا وقت نہیں ہوتا۔" علیزہ نے وجہ بتائی۔
"بس، بس رہنے دو تم تو...... حالانکہ نزہت سے تو کہا تھا تم نے ملنے کا، میں نے کہا تو فوراً پڑھائی کا بہانہ...... اچھے سے جانتی ہوں جتنی سیدھی بنتی ہو اتنی ہو نہیں۔"
"ربیعہ دیکھو یہ بدتمیزی ہے، میں تم سے آرام سے بات کر رہی ہوں اور تم اپنا لہجہ دیکھو۔" علیزہ کو رنج ہوا تھا ربیعہ کی بات سن کر۔
"ہاں سب سے بیٹھ کے چغلیاں کرتی ہو اور خود معصوم بھی بن جاتی ہوں، جانتی ہوں تمہاری چالاکی وہ تو اچھا ہوا نزہت نے بتا دیا ورنہ تمہارا بہانہ میں سمجھ ہی نہ پاتی۔"
"کون سی بات بتادی نزہت نے۔" علیزہ کو شدید حیرت نے آگھیرا۔
"بس کردو بی بی، جاؤ اپنا کام کرو پڑھائی کرو بس خدا حافظ!" ربیعہ نے فون کھٹ سے بند کر دیا۔
"یہ ان دونوں کا مسئلہ ہے کیا اب تو واقعی کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

☆☆☆

کافی دن گزر گئے کسی نے آپس میں بات نہیں کی نزہت اور ربیعہ اپنے ہی گھریلو جھمیلوں میں گرفتار تھیں تو علیزہ اور امبر اپنی پڑھائی میں عائشہ ان کی دوست تو نہ تھی پر علیزہ کی بہن ہونے کے ناتے جانتی سب کو تھی، سلام دعا بھی تھی۔
"کیا سوچ رہی ہو عالی؟" علیزہ کتاب کھولے بیٹھی ہوئی تھی نظریں اس کی کہیں اور تھیں یقیناً اس کا دھیان پڑھائی کے بجائے کہیں اور تھا۔
"اے عالی کہاں گم ہو؟" عائشہ نے چٹکی بجائی۔
"ہاں کیا کچھ کہا؟" علیزہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔
"کیا بات ہے؟" عائشہ نے اس کی کتاب اس کے ہاتھ سے لے کے بند کی۔ علیزہ نے گہری سانس لی۔
"عاشو کیا میرا کسی سے افیئر ہے؟"

عائشہ کا تو منہ ہی کھل گیا۔
"کس نے کہا اور سچ بتاؤ واقعی ہے کیا؟"
"پگلی! میں خود تم سے پوچھ رہی ہوں۔" علیزہ نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔
"نہیں، ایسا تم سوچ بھی نہیں سکتیں نہ ایسا میں ہونے دوں گی۔" عائشہ نے بھویں اچکا کے حکمیہ انداز میں کہا علیزہ کو ہنسی آگئی۔
"بس، بس ڈرامی کہیں کی...... اچھا کسی دن نزہت، ربیعہ اور امبر کو نہ بلالیں؟"
"کیوں خیر ہے ناں... گھر پہ بلا رہی ہو؟" عائشہ کو حیرت ہوئی۔
"ان سب کی عقل ٹھکانے لگانی ہے اور کیا بس!" عائشہ نے زوردار قہقہہ لگایا علیزہ کی بات پر۔
"عالی ان کے پاس عقل بھی ہے کیا؟" اس نے عائشہ سے سوال کیا جس پہ علیزہ ہنس پڑی۔
"ہاں ہے اور تمہیں میرا ساتھ دینا ہے ایک کام میں۔"
علیزہ نے اسے اپنا ایک پلان بتایا۔
"جو حکم عالی جاہ۔" عائشہ مان گئی تھی۔

☆☆☆

"السلام علیکم ربیعہ کیسی ہیں آپ؟"
"جی وعلیکم السلام میں ٹھیک، آپ کون؟ میں نے پہچانا نہیں۔"
"ارے عائشہ بات کر رہی ہوں علیزہ کی بہن، کیا حال ہیں؟"
"اوہ ہاں، اچھا میں ٹھیک تم بتاؤ۔"
"بس کیا بتاؤں وہ اصل میں...... علیزہ میری بہن ہو کے بھی بہت عجیب ہے آپ اس کی دوست ہیں، آپ سمجھاتی کیوں نہیں؟"
"کیوں کیا ہوا؟"
"دیکھیں ناں اس نے گھر میں لنچ رکھا ہے اور امبر اور نزہت کو بلایا پر آپ کو نہیں، میں نے کہا بھی تھا کہ انہیں بھی بلاؤ تو ڈانٹ دیا۔"
"کیا اس نے سب کو بلایا ہے اور مجھے نہیں؟ اچھا

ٹھیک ہے میری بلا سے جس کو بلانا ہے بلائے میں تو نہیں آؤں گی۔''

''ارے کیوں نہیں آئیں گی آپ کو...... میں بلا رہی ہوں ناں آپ کو آنا ہوگا تاکہ میں علیزہ کو بتا سکوں کہ آپ میری دوست ہیں!''

''چلو ٹھیک ہے، تم کہہ رہی ہو تو آجاتی ہوں۔''

''ہاں اور عالی کو مت بتانا ٹھیک ہے، میں فون رکھتی ہوں اب۔''

''ٹھیک ہے اللہ حافظ۔''

فون رکھنے کے بعد دونوں بہنوں نے تالی ماری اور ہنس پڑیں۔

''چلو ایک کو تو کہہ دیا اب میں امبر کو فون کرتی ہوں دیکھتے ہیں ان کا کیا حال ہے۔'' علیزہ نے عائشہ کو کہا اور فون ملانے لگی۔

''ہیلو ہاں امبر کیسی ہو؟ میں علیزہ بول رہی ہوں۔''

''ارے تم کیسی ہو؟ امتحان کی تیاری ہوگئی؟''

''ہاں ہوگئی ہے، سنو آخری پیپر کے اگلے دن میرے ہاں لنچ پہ آنا ہے تمہیں ٹھیک ہے ناں؟'' علیزہ نے اسے یاد دلایا۔

''اچھا واہ بھئی، اور کون، کون آرہا ہے؟ وہ چھپکلی نزہت اور موٹی ربیعہ کو بھی بلایا ہے یا صرف مجھے۔'' امبر کو خار تھی ان دونوں سے۔

''توبہ ایسے تو نہ کہو۔'' علیزہ کو ہنسی آگئی۔

''کیوں نہ کہوں، تمہیں کیا پتا یہ دونوں کتنی بڑی فسادن ہیں ہم نے ان سے دوستی رکھ کے غلطی کردی ہے۔''

''اوہو چھوڑو تم بس آجانا۔''

''اچھا آجاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے اب پڑھائی کرو، میں فون رکھتی ہوں اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' علیزہ نے فون رکھ دیا۔

''عالی، اب نزہت کی باری۔'' عائشہ نے اب فون لے لیا۔

''نہیں، اسے میں نہیں بلاؤں گی وہ خود آئے گی۔'' علیزہ مسکرائی۔

''ہیں وہ کیسے؟'' عائشہ نے پوچھا۔

''وہ کام تم ربیعہ پہ چھوڑ دو۔'' علیزہ نے آنکھ ماری عائشہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

علیزہ... اور امبر پڑھائی میں لگ گئیں۔ ایک ہفتے بعد آزاد ہوجانا تھا...... اس بیچ امبر اکثر فون کرتی اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگ جاتی جس میں نزہت اور ربیعہ وغیرہ کی بھی باتیں ہوتیں اور علیزہ منع کرتی کہ نہ کرو......

''شکر اللہ کا آج آخری پرچہ تھا۔'' علیزہ، امبر کے ساتھ کینٹین میں بیٹھ کر چائے پی رہی تھی۔

''ہاں یار شکر اب دو ہفتے کی چھٹیاں۔'' امبر نے دونوں ہاتھ اٹھا کے جوش سے کہا۔

''بس، بس زیادہ خوش نہ ہو۔'' علیزہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم آخری دفعہ کب خوش ہوئی تھیں؟'' امبر نے اسے ٹوکا۔

''تمہیں کیوں بتاؤں؟'' علیزہ نے منہ چڑایا۔

''ہاں نزہت وغیرہ کو ہی بتانا۔'' امبر نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ کل کا کنفرم ہے ناں۔'' چائے پیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں کل کا پکا ہے آجانا تم۔'' علیزہ نے کہا اور اپنا بیگ اٹھایا۔

''کہاں جارہی ہو؟'' امبر نے اس سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے عائشہ کو ساتھ لے کے جانا ہے اس لیے جلدی جارہی ہوں۔'' علیزہ نے وجہ بتائی۔

''ویسے برا نہ ماننا عائشہ تمہاری بہن ہے لیکن نزہت لوگ عائشہ کے نام سے ہی ساری باتیں منسوب کرکے بتاتے ہیں، ایک دوسرے کو اور مجھے بھی۔'' امبر نے اپنی لٹوں کو یار، بار کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''چھوڑو تم یہ سب بس کل آجانا...... چلو اللہ

حافظ۔" علیزہ چلی گئی۔

☆☆☆

اگلے دن علیزہ کے ہاں سب کا لنچ تھا اس نے کافی تیاری کر لی تھی عائشہ نے بھی تھوڑی بہت مدد کردی تھی...... گھنٹی بجی علیزہ نے دروازہ کھولا سامنے نزہت تھی۔

"ارے نزہت تم؟" علیزہ کو مصنوعی حیرانی ہوئی۔

"کیوں، تم دعوت نہیں دو گی تو میں نہیں آؤں گی...... میں ربیعہ کے ساتھ آئی ہوں۔ تم نے تو اسے بھی نہیں بلایا تھا ناں بھلا ہو عائشہ کہ اس نے یاد رکھ لیا تم تو بہت بے مروت نکلیں۔" نزہت کے پیچھے ربیعہ آ کھڑی ہوئی۔

"چھوڑو نزہت، اندر چل کے بات کرتے ہیں عائشہ ہے ناں ہمارے لیے۔" ربیعہ نے اندر چلنے کا کہا اور علیزہ نے ان کو اندر جانے کا رستہ دیا۔

عائشہ بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ علیزہ کچن میں تھی...... نزہت اور ربیعہ مسلسل اِدھر اُدھر کی بات کر کے علیزہ کو بُرا بھلا بھی کہے جا رہی تھیں عائشہ کو کوفت ہونے لگی۔

وہ ان سے معذرت کر کے کچن میں آ گئی۔

"عالی انہیں بلانے کا یہ منصوبہ تمہارا تھا اور ان کی باتیں سن لو اُف ہر ایک کی برائی کسی نے وہ کام شاید کیا بھی نہ ہوگا تب بھی یہ لوگ یقین کے ساتھ بولیں گی...... توبہ۔" عائشہ کان پکڑ کے بولی۔

"صبر کر جاؤ امبر کو آنے دو، پتا نہیں کہاں رہ گئی ہے۔ ان سب کو میں نے کچھ کہنے سمجھانے ہی بلایا ہے۔" علیزہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"گھنٹی بجی ہے۔ دیکھتی ہوں امبر آئی ہوگی۔" عائشہ گھنٹی کی آواز پر دیکھنے گئی۔

"شکر ہے آپ آ گئیں کب سے عالی آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" عائشہ نے امبر کو گلے لگا کے کہا اور اندر لے آئی۔

"یہ دیکھو کون آیا ہے۔" عائشہ، امبر کو نزہت لوگوں کے پاس لے گئی نزہت اور ربیعہ دونوں کے منہ کا زاویہ بگڑ گیا۔

"آؤ، آؤ امبر بیٹھو ہمارے ساتھ۔" نزہت نے مسکراتے ہوئے بلایا۔

تینوں باتیں کرنے لگیں، عائشہ علیزہ کے پاس گئی۔

کام کرتے ہوئے اچانک انہیں لڑنے کی آوازیں آئیں دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچیں تو دیکھا وہ تینوں آپس میں الزام تراشیاں کر رہی تھیں۔

"بس، بس! کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو، خود غلط ہو کے بھی ایک دوسرے کو غلط کہہ رہے ہو۔" علیزہ کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"تم ہمیں کیوں کہہ رہی ہو اپنا حال دیکھو ہماری برائیاں کرتی ہو تو ہم نے کر لیں اس میں برا کون ہوا؟" ربیعہ نے کہا۔

"کس نے کہا میں نے تمہاری یا کسی کی برائی کی ہے نام لو اس کا؟" علیزہ نے پوچھا۔

"نزہت نے کہا تھا مجھے۔" ربیعہ نے نزہت کا نام لیا وہ چونک گئی۔

"نہیں، یہ جھوٹ بول رہی ہے، یہ خود تمہاری برائیاں کرتی ہے پوچھ لو عائشہ سے۔" نزہت نے عائشہ کا نام لے لیا۔

"نہیں عالی یہ دونوں اپنی طرف سے بات کرتی ہیں اور نام میرا لگاتی ہیں۔" علیزہ نے چپ کھڑی عائشہ کو دیکھا۔

"ہاں اور میں گواہ ہوں مجھ سے بھی نزہت زیادہ تر عائشہ کا نام لے کر ہی باتیں کرتی ہے۔" امبر بھی بول پڑی۔

"ہاں نزہت اکثر عائشہ کا نام لیتی ہے۔" ربیعہ بھی کیسے پیچھے رہتی۔

"چپ کرو سب لوگ۔" علیزہ زور سے بولی۔ "تم دونوں کو شرم آنی چاہیے پہلے دونوں نے مل کر میرے لیے کہا کہ میں برائیاں کرتی ہوں اور میرا کسی سے چکر ہے اور بنا جانے اس بات کی تصدیق بھی ایک دوسرے سے کر دی وہ بھی کس کا نام لے کر میری ہی بہن کا؟ نزہت اس دن تم نے مجھے فون کیا تھا اور

امبر کے نام سے یہ باتیں کہیں جبکہ تم نے تو عائشہ کے نام سے یہ باتیں ربیعہ سے کی تھیں۔"

سب ایک دم خاموش ہو گئے تھے

"مجھے عائشہ نے بہت دفعہ کہا کہ یہ دونوں برائیاں کرتی ہیں حتیٰ کہ امبر نے بھی، میں نے انہیں کچھ نہ کہا بلکہ تم لوگوں کو بھی نہیں۔"

علیزہ صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

"دوستی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جو دل چاہے کسی کے نام کوئی بات کردی جائے ہاں اگر کوئی بات غلط ہو تو اس بندے کے منہ پہ کہو... نہ کہ اس کے پیٹھ پیچھے برائی کرو۔"

علیزہ... کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی۔

"بھروسا انسان کا ایک دفعہ ٹوٹتا ہے تو اس انسان پہ پھر دوبارہ نہیں ہو پاتا پر ہم لوگ ایک دوسرے کو موقع دیتے ہیں کہ چلو معاف کیا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ پھر ایک دوسرے کی برائی کی جائے اور ایک دوسرے کے نام سے غلط باتیں کی جائیں۔"

"ہم...... لوگ پڑھے لکھے ہیں، عقل شعور رکھتے ہیں اللہ نے بدگمانیوں سے بچنے کو کہا ہے اور غیبت و برائی کا کیا انجام ہے سوچ کے بھی دل دہل جاتا ہے...... اللہ فرماتا ہے کسی کی غیبت نہ کرو غیبت کرنے والے کے لیے کہا جاتا ہے کہ کیا وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ تو سوچو ہم...... لوگ ہر وقت کسی نہ کسی کی برائی میں لگے رہتے ہیں اور بدگمان رہتے ہیں کہ فلاں نے یہ کردیا جبکہ اس بیچارے نے کیا بھی نہیں ہوتا......"

سب خاموش بیٹھے نظریں جھکائے ہوئے تھے۔

"میں تم سب کا اپنا دوست سمجھتی تھی لیکن نزہت اور ربیعہ نے میرا بھروسا ختم کیا ہے میں نے اول تو کبھی کوئی راز کی بات بتائی نہیں جبکہ تم لوگ اپنے ہی دل کی باتیں دوسروں کے نام سے لگا کر آگے کردیتے ہو بندہ کس لحاظ سے تم لوگوں پہ بھروسا کرے؟" علیزہ افسوس کررہی تھی۔

"میں نے یہاں تم سب کو اسی لیے بلوایا تھا ایک منصوبے کے مطابق جس میں عائشہ نے میرا ساتھ دیا۔"

سب علیزہ کی بات سن رہے تھے کوئی کچھ نہ بولا وہ دونوں غلط تھے ان کی چپ سے اندازہ ہو گیا تھا۔

"میرے خیال سے اب ہم...... لوگ دوست نہ رہیں تو اچھا ہے جب دوست بن کر تم لوگ ایسے کررہے ہو تو جب دوستی ہی نہیں رہے گی تو افسوس بھی نہیں ہوگا۔"

"ہمیں معاف کردو علیزہ، ہم واقعی غلط تھے ایک دوسرے کی ٹوہ میں ہی لگے رہتے تھے۔" نزہت علیزہ کے پاس آ کر بولی۔

"ہاں علیزہ واقعی ہم نے بے شک ہر بات میں مرچ مسالا لگا کر اپنی طرف سے آگے بڑھایا...... ہمیں بے شک سزا دو لیکن دوستی تو نہ ختم کرو۔" ربیعہ نے بھی ہمت کی بولنے کی۔

"میں کیا سزا دوں سوائے اس کے کہ تم لوگوں کو معاف کیا باقی دوستی کی بات ہے، اب صرف رسمی سلام دعا ہی رہ سکتی ہے ہمارے بیچ۔"

علیزہ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ امبر اس کے پیچھے گئی۔

"میرے خیال سے ہمیں چلنا چاہیے۔" نزہت بولی تو عائشہ ان کے پاس آئی۔

"تم بھی ہمیں معاف کردینا، ہم نے تمہارے نام سے بہت کچھ کہا۔" نزہت بولی۔

"معاف کیا۔" عائشہ نے گہری سانس لے کے کہا۔

وہ لوگ جانے ہی لگی تھیں کہ علیزہ واپس آئی اور انہیں ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔

"دیکھو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب جبکہ تم لوگوں نے اپنی غلطی مان لی ہے تو ہم بھی تمہیں معاف کرتے ہیں۔ اور دوبارہ سے دوستی کے رشتے استوار کرتے ہیں۔ اور میں نے لنچ تیار کیا ہوا ہے چلو آؤ سب مل کر میز لگائیں اور اکٹھے کھانا کھائیں۔"

نزہت اور ربیعہ نم آنکھوں سے اس کے ساتھ کچن کی جانب بڑھ گئیں۔



شمعِ ہدایت

اختر شجاعت

نفس...... عرفانِ الٰہی

تمام تعریف تمام حمد وثنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے کہ اس نے اپنی ذات کو پہچنوانے کے لیے ہم پر علم ذاطلاع کے دروازے کھول دیے۔ ایسی حمد جس کے ذریعے ہم اس کی مخلوقات میں سے حمد گزاروں میں زندگی بسر کریں۔ ایسی حمد جس کی بدولت ہمارے لیے برزخ کی تاریکیاں چھٹ جائیں۔

بارالٰہا! جب ہم ایسے دو کاموں کا ارادہ کریں کہ ان میں سے ایک تیری خوشنودی کا اور دوسرا تیری ناراضی کا باعث ہو تو ہمیں اس کام کی طرف مائل کرنا جو تجھے خوش کرنے والا ہو۔ اور اس کام سے ہمیں.... بے دست وپا کردینا جو تجھے ناراض کرنے والا ہو...... اور اس مرحلے پر ہمیں اختیار دے کر آزاد نہ چھوڑ دے...... کیونکہ نفس تو باطل ہی کو اختیار کرنے والا ہے۔ مگر جہاں تیری توفیق شاملِ حال ہو اور برائی کا حکم دینے والا ہے مگر جہاں تیرا رحم کارفرما ہو۔

بارالٰہا! تو نے ہمیں کمزور اور سست بنیاد پیدا کیا ہے...... اور پانی کے ایک حقیر قطرہ (نطفہ) سے خلق فرمایا ہے۔ اگر ہمیں کچھ قوت وتصرف حاصل ہے تو تیری قوت کی بدولت اور اختیار ہے تو تیری مدد کے سہارے سے...... لہٰذا اپنی توفیق سے ہماری دستگیری فرما اور اپنی رہنمائی سے استحکام وقوت بخش اور ہمارے دیدہ ودل کو ان باتوں سے جو تیری محبت کے خلاف ہیں نابینا کردے اور ہمارے اعضا کے کسی حصے میں معصیت کے سرایت کرنے کی گنجائش نہ پیدا کر......

بارالٰہا! رحمت نازل فرما محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور ان کی آل پر...... اور اپنی رحمت کے صدقے میں مجھے اور تمام مومنین ومومنات کو ان سب برائیوں سے پناہ دے۔ اے تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے...... نفس کے لغوی معنی ہیں وجود، شے، ہستی یا اس کی حقیقت...... خواہش نفسانی بھی نفس برائی کا سرچشمہ اور شرارت کا منبع ہے۔ تمام برے اخلاق اور افعال کا باعث ہمارا نفس ہے۔ علامہ ثنا اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں نفس سے مراد ایک جسم لطیف ہے، جو جسمِ کثیف کے اندر سمایا ہوا ہے، یہ روح اور جسم کے درمیان ایک پل کا کام دیتا ہے، یہ ایک روح حیوانی ہے اور اس کا طبعی میلان حیوانی خواہشات اور اخلاقِ رذیلہ کی جانب ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ "بے شک نفس تو ضرور برائی کا حکم دیتا ہے۔" رسول اللہؐ نے اس سلسلے میں صحابہ کرامؓ سے فرمایا۔ "ایسے رفیق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ جس کا حال یہ ہو کہ اگر تم اس کا اعزاز واکرام کرو، کھانا کھلاؤ، کپڑے پہناؤ تو وہ تمہیں بلا ومصیبت میں ڈال دے اور اگر تم اس کی توہین کرو، بھوکا ننگا رکھو تو تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے؟"

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس سے زیادہ برا ساتھی تو دنیا میں ہو ہی نہیں سکتا۔" آپؐ نے فرمایا۔ "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے تمہارا نفس جو تمہارے پہلو میں ہے وہ ایسا ہی ساتھی ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارا نفس ہے جو تمہیں برے کاموں میں مبتلا کرکے ذلیل وخوار بھی کرتا ہے اور طرح، طرح کی

مصیبتوں میں گرفتار کردیتا ہے۔

☆☆☆

ارشادِ خداوندی ہے کہ ”اور نفس کو خواہش سے روکا تو بے شک جنت میں ٹھکانا ہے۔“ روایات میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کے پاس وحی بھیجی۔

”اے داؤد! اپنے نفس کو دشمن سمجھو، میری دوستی اس کی دشمنی میں ہے۔“

حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے۔ ”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اپنے نفس کے عیوب پر آگہی بخش دیتا ہے۔“ ایک اور جگہ آپؐ کا فرمان ہے کہ ”جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ یعنی جس نے اپنے نفس کے فنا کی حقیقت سمجھ لی وہ اپنے رب کی بقا کے راز کو پا گیا جس نے اپنے نفس کو ذلیل جانا اس نے اپنے رب کی حقیقی عظمت کو سمجھا اور جس نے اپنے نفس کی بندگی کو جان لیا وہ اپنے رب کی ربوبیت کو سمجھ گیا۔“

حقیقت میں نفس تو ایک ہی ہے مگر صفات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور عام طور پر جو بیان کی جاتی ہیں ان کی اقسام تین ہیں۔

1۔ نفسِ امارہ۔ تمام برے افعال، تمام شیطانی حرکات، تمام منفی افعال اسی نفس کی بدولت سرزد ہوتے ہیں۔ یہ گناہ، نافرمانی اور فسق و فجور کی طرف آمادہ کرتا ہے۔ یعنی یہ نفس ہمیں برائی کا حکم دیتا ہے۔

2۔ نفسِ لوامہ۔ جب انسان کو اپنی خطاؤں کا اپنی کوتاہیوں کا اور اپنے گناہوں کا احساس ہوتا ہے تو احساسِ شرمندگی اس پر غالب ہوتا ہے۔ اس لمحے وہ نیکی کی طرف راغب ہوتا ہے تب وہ اطمینان و سکون کی تلاش میں سرگرداں ہوتا ہے۔

3 ۔ نفسِ مطمئنہ۔ مسلسل مجاہدہ ، عبادت، ریاضت، یادِ الٰہی اور تقویٰ کی بدولت جب نفس کے تقاضے پورے نہیں ہوتے پھر قلب کو مکمل سکون حاصل ہوتا ہے اور اس سکون سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو قلب، روح کے مقام پر سفر کرتا ہے اور یہاں جب نفس، قلب کے مقام پر پہنچتا ہے تو اس کو سکون و طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ”جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرتے اور نفسانی خواہشوں سے بچتے ہیں یقیناً ان ہی کے لیے جنت میں ٹھکانا ہے۔“

حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ ”مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ خوف خواہشات کی پیروی اور امیدوں کی درازی سے ہے۔“

حضرت سلیمانؑ کا قول ہے کہ۔ ”جو شخص اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے وہ اس شخص سے زیادہ طاقتور ہے جو تنہا کسی شہر کو فتح کر لیتا ہے۔“

مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ ”میں اپنے نفس کے ساتھ بکریوں کے گلے پر ایک چرواہے کی طرح ہوں جو ایک طرف انہیں اکٹھا کرتا تو وہ دوسری طرف نکل جاتی ہیں۔“

☆☆☆

حضرت ابراہیم خواصؒ بیان کرتے ہیں ”ایک مرتبہ میں نے سنا کہ روم میں ایک راہب ہے جو ستر سال سے زہد و رہبانیت میں مشغول ہے۔ میں نے تعجب سے کہا کہ رہبانیت کی شرط تو چالیس سال ہوتی ہے یہ آدم زاد کس مذہب پر ستر سال سے بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ میں اس سے ملنے گیا۔ اس نے کھڑکی کھول کر مجھ سے بات چیت کی اور کہا۔ ”اے ابراہیم! میں جانتا ہوں کہ تم کس لیے آئے ہو......؟ میں یہاں رہبانیت کی غرض سے ستر سال سے نہیں بیٹھا ہوں بلکہ میرے پاس ایک کتا ہے جو خواہش میں سرکش ہے۔ میں اس کتے کی رکھوالی کر رہا ہوں تاکہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔“ میں نے جب راہب کی یہ بات سنی تو خدا سے مناجات کی کہ اے رب تو بڑا قادر ہے، کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے شخص کو بھی صحیح راستہ دکھاتا ہے پھر راہب نے مجھ سے کہا...... ”اے ابراہیم! تم کب تک لوگوں کی طلب میں رہو گے؟ جاؤ پہلے اپنے آپ کو طلب کرو...... جب تم اپنے آپ کو پا جاؤ تو اس

کی نگہبانی کرو کیونکہ ہر روز یہ ہوا یعنی نفسانی خواہش تین سو ساٹھ قسم کی الوہیت کا لباس پہن کر گمراہی کی طرف بلاتی ہے۔ شیطان کا بندے کے دل اور باطن پر اس وقت تک قبضہ نہیں ہو سکتا جب تک معصیت (گناہ، قصور) اور نافرمانی کا جذبہ اور خواہش اس کے اندر نہ ابھر آئے...... جس وقت بندے کے اندر خواہش نے سر اٹھایا اسی وقت شیطان کا اس پر قبضہ ہو جاتا ہے، وہ دل میں آرام کرتا ہے اور اس کے باطن میں جم کر بیٹھ جاتا ہے۔ جو شخص اپنے نفس کو فنا کر دیتا ہے اسے رحمت کے کفن میں لپیٹ کر کرامت کی زمین میں دفن کیا جاتا ہے جو ضمیر کو ختم کر کے بے ضمیر ہو جاتا ہے اسے لعنت کے کفن میں لپیٹ کر عذاب کی زمین میں دفن کیا جاتا ہے۔"

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ "دنیا میں نفس سے زیادہ بری چیز اور کوئی نہیں......" حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ نے فرمایا...... "اپنے نفس کا مقابلہ اپنے اللہ کی عبادت و اطاعت کر کے کرو...... ریاضت، شب بیداری، کم بولنا، کم کھانا اور کم سونا لوگوں کی تکالیف برداشت کرنا، ان سے خیالات پاکیزہ ہوتے ہیں۔ کم بولنے سے انسان آفتوں سے دور رہتا ہے۔ تکالیف برداشت کرنے سے درجات بلند ہوتے ہیں...... اور کم کھانے سے شہوت نفسانی ختم ہو جاتی ہے۔ زیادہ کھانا دل کی سیاہی اور اسے ظلمت میں گرفتار کرتا ہے۔ بھوک حکمت کا نور ہے۔ زیادہ سیر شکم ہونا اللہ تعالیٰ سے دور کرتا ہے، اس ضمن میں فرمان رسولؐ ہے کہ "اپنے دلوں کو بھوک سے منور کرو...... اپنے نفس کا بھوک اور پیاس سے مقابلہ کرو...... ہمیشہ بھوک کے وسیلے سے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہو...... بھوکے رہنے والے کو مجاہد فی سبیل اللہ کے ثواب کے برابر اجر ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھوکے، پیاسے رہنے سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے۔ آسمان کے فرشتے اس انسان کے قریب نہیں پھٹکتے جس نے اپنا پیٹ بھر کر عبادت کا مزہ کھو دیا ہو۔"

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول ہے کہ "جب سے میں ایمان لایا ہوں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اس لیے کہ میں اپنے رب کی عبادت کا مزہ لے سکوں۔ نیز اپنے رب کے شوق و دیدار کی وجہ سے کبھی سیر ہو کر پانی نہیں پیا...... اس لیے کہ بہت کھانے سے عبادت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ جب انسان خوب سیر ہو کر کھا لیتا ہے تو اس کا جسم گراں اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتی ہیں پھر وہ سونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا وہ اس مردار کے مانند ہو جاتا ہے جو کسی راہ گزر پر پڑا ہو۔"

حکیم لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "کھانا اور سونا کم کرو کیونکہ جو شخص زیادہ کھاتا ہے وہ زیادہ سوتا ہے وہ روزِ حشر اعمالِ صالح سے خالی ہاتھ ہوگا۔" آقائے دو جہاں حضرت محمدؐ نے فرمایا۔ "اپنے دلوں کو زیادہ کھانے پینے سے ہلاک نہیں کرو، جس طرح زیادہ پانی سے کھیتی تباہ ہو جاتی ہے اسی طرح زیادہ کھانے پینے سے دل ہلاک ہو جاتا ہے۔"

حضور کریمؐ کا ارشاد ہے۔ "سب سے افضل جہاد نفس کے ساتھ ہے۔" جب صحابہ کرامؓ جہاد سے واپس لوٹتے تو فرمایا کرتے تھے...... ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ آئے ہیں...... صحابہ کرامؓ نے نفس کے ساتھ جہاد کو اس لیے افضل قرار دیا کیونکہ یہ جہاد مسلسل ہوتا ہے۔ کفار کے ساتھ جہاد کبھی کبھار ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نمازی اپنے دشمن کو سامنے دیکھتا ہے لیکن اس جہاد میں شیطان نظر نہیں آتا، چھپے ہوئے دشمن سے لڑائی نظر آنے والے دشمن کی نسبت مشکل ہوتی ہے۔ کافر کے ساتھ جہاد میں قطعاً ہمدردی نہیں ہوتی لیکن شیطان سے جہاد میں نفس اور خواہشات، شیطان کی حامی ہوتی ہیں لہٰذا یہ مقابلہ سخت ہوتا ہے۔

ایک دانا کا قول ہے جس انسان پر اس کا نفس غالب آ جاتا ہے وہ شہوت (حصولِ لذت کا شوق) کا غلام بن جاتا ہے۔ وہ بے ہودگی کا تابع بن جاتا ہے اس کا دل تمام فوائد سے محروم ہو جاتا ہے۔ جس نے اپنے جسم کی زمین کو شہوت سے سیراب کیا اس نے

اپنے دل میں ندامت کاشت کی...... اللہ نے مخلوق کو تین قسموں میں پیدا کیا۔

1۔فرشتوں کو پیدا کیا انہیں عقل عطا کی مگر شہوت سے محفوظ رکھا۔

2۔جانوروں کو پیدا کیا ان کو عقل سے عاری رکھا مگر شہوت عطا کی۔

3۔انسانوں کی تخلیق کی اس کو عقل اور شہوت دونوں عطا کیں۔

جب انسان کی عقل پر شہوت غالب آجاتی ہے تو وہ جانوروں سے بدترین مخلوق بن جاتا ہے......اور جب اس کی شہوت پر عقل غالب ہو تو یہ فرشتوں سے بہتر ہوتا ہے۔

☆☆☆

حضرت مالک بن دینار قریب المرگ تھے آپؒ کے دل میں گرم روٹی کا ثرید جس میں شہد اور دودھ شامل ہو، کھانے کی خواہش پیدا ہوئی آپؒ نے اپنے خادم کو حکم دیا۔ وہ کھانا تیار کر کے لے آیا تو آپؒ نے کھانا دیکھ کر فرمایا۔"اے نفس! تو نے تیس سال صبر کیا اب زندگی کے آخری لمحات میں صبر نہیں کر سکتا۔" تب آپؒ کھانا کھائے بغیر وصال پا گئے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کو اپنے نفس سے اس قدر مخالفت ہو گئی تھی کہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اگلے جہان میں فرمائے کہ کوئی آرزو ہے تو بیان کرو تو میں عرض کروں گا۔"اے پالنے والے......! مجھے اجازت دیجیے تاکہ میں دوزخ میں جاؤں اور اس نفس کو آگ میں ایک غوطہ دے آؤں کیونکہ اسی کی وجہ سے مجھے دنیا میں بہت سی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔"

وہ نفوسِ قدسیہ جو مسلسل ریاضت، ذکر اور یادِ الٰہی سے نفسانی آلائشوں اور دنیا کے رذائل سے پاک ہو جاتے ہیں اور ارتقائی منازل طے کر کے نفسِ کاملہ اور مطمئنہ پر فائز ہو جاتے ہیں ان کا نفس کامل طور پر مطیعِ فرمانِ الٰہی ہو جاتا ہے۔

نفس کو سکون اس وقت میسر آتا ہے جب وہ یقین، معرفت اور شہود کی اعلیٰ منازل پر فائز ہو جائے اور یہ مقام ذکرِ الٰہی کی کثرت سے حاصل ہوتا ہے۔

ایسے کام جو صریح طور پر گناہ ہیں ان میں اگر کوئی شخص نفس کی مخالفت کی کوشش کرے جیسے چوری، ڈاکا، زنا، شراب خوری، بددیانتی، چغلی، گالی وغیرہ تو ممکن ہے وہ کامیاب ہو جائے لیکن کچھ ایسے ہیں جن میں ہوائے (خواہش) نفس عبادات میں شامل ہو جاتی ہے۔ نفس نیکیوں کی شکل میں انسان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اس کے اعمال ضائع کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اور سخاوت میں دکھاوے اور ریاکاری کا دخل ہوتا ہے۔ صدقات وخیرات میں کسی پر احسان کی نیت اور خودنمائی اور برتری کا احساس، اپنی عبادت میں نیکیوں پر غرور اور فخر وغیرہ ایسے گناہ ہیں جو نظر نہیں آتے......اور یہی وہ ہوائے نفس ہے جس کی مخالفت سب سے پہلے ضروری ہے......اگر آپ کے پاس کوئی ایسا شیخ کامل موجود ہے جو نفس کی مکاریوں کو سمجھ کر آپ کو اس کا علاج بتائے اور مشورہ دے تو بہترین بات ہے اور اگر ایسا شخص آپ کو میسر نہیں تو پھر آپ کثرت سے استغفار کریں۔

لوگوں نے حضرت اویس قرنیؓ سے عرض کیا کہ ایک شخص تیس سال سے قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے اور کفن گلے میں ڈالے ہوئے مسلسل روتا رہتا ہے۔

حضرت اویس قرنیؓ نے فرمایا......ہمیں وہاں لے چلو......چنانچہ سب وہاں پہنچے اور اس شخص کی کیفیت جب آپؓ نے دیکھی تو فرمایا......"اے بندۂ خدا تیس برس سے تجھے اس قبر اور کفن نے اللہ تعالیٰ سے پھیر کر تجھے اپنی جانب مشغول کر لیا ہے...... یہ دونوں تیری راہ کے بت اور تیرے اور خدا کے درمیان حجاب بنے ہوئے ہیں۔ وہ شخص آپؓ کی اس بات کی تہ تک پہنچ گیا اس نے ایک نعرہ لگایا اور جان دے دی اور قبر میں گر پڑا۔ انسان لاشعوری طور پر خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔

سورۂ جاثیہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ۔ ”کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا ہے اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا...... اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اب کون ہے جو اسے ہدایت دے کیا تم لوگ غور نہیں کرتے؟“ یہ آیت مبارکہ غور و فکر کی دعوت دیتی ہے کہ انسان کی اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے کی وجہ سے رب کریم کی ہدایت سے محروم کردیا جائے۔ دلوں سے عرفانِ صداقت ختم ہوجائے اور نورِ حق دیکھنے والی بینائی ختم کردی جائے۔ حضرت ابو امامہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا کہ زیرِ آسمان دنیا میں جتنے معبودوں کی عبادت کی گئی ہے ان میں سب سے زیادہ مبغوض (قابلِ نفرت) اللہ کے نزدیک، ہوا و ہوس ہے یعنی خواہش نفس......

حضرت سہل بن عبد اللہ تستریؒ فرماتے ہیں کہ تمہاری بیماری نفسانی خواہشات ہیں اگر تم ان کی مخالفت کرو تو یہ بیماری میں تمہاری دوا بھی ہے۔

ایک دفعہ آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے دریافت کیا...... ”تم پہلوان کسے کہتے ہو؟“ انہوں نے جواب دیا...... ”جسے لوگ پچھاڑ نہ سکیں۔“ آپؐ نے فرمایا۔ ”نہیں پہلوان وہ ہے جو غصے میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔“

حضرت بایزید بسطامیؒ کے مجاہدہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا...... کہ ”میں ایک معمولی سا مجاہدہ بیان کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ایک رات آدھی رات کو میرے دل میں خیال آیا کہ باقی رات یادِ الٰہی میں گزاروں گا...... میرے نفس نے مخالفت کی اس پر میں نے قسم کھائی کہ اے نفس تو نے مجھے دھوکا دیا اور عبادت میں میرا ساتھی نہیں بنا تیری سزا یہ ہے کہ تجھے ایک سال تک پانی نہ دوں گا...... چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور سال بھر پانی نہیں پیا۔“

☆☆☆

حضرت رابعہ بصریؒ علیل ہوئیں اور پھر ان کا انتقال کا وقت قریب آیا تب حضرت مالک بن دینارؒ آپ کی عیادت کو آئے اور دریافت کیا کہ اس دنیا میں تم کو کس چیز نے تکلیف دی؟ حضرت رابعہ بصریؒ نے کہا کہ ”معصیت نے۔“ تب حضرت مالک بن دینارؒ نے پھر پوچھا کہ کیا کسی چیز کو بھی تمہارا دل چاہتا ہے...... آپ نے جواب دیا کہ ”ہاں...... مغفرت کو۔“ تب حضرت مالک بن دینارؒ نے سوال کیا کہ کیا دنیا کی بھی کسی چیز کی خواہش ہے؟

آپ بولیں ”تیس برس سے تازہ کھجور نہیں کھائی اس کو دل چاہ رہا ہے......“ یہ سن کر حضرت مالک بن دینارؒ اپنے دل میں سوچنے لگے کہ اب تو یہ چند گھڑیوں کی مہمان معلوم ہوتی ہیں اتنی جلدی تازہ کھجور کہاں سے لائی جاسکتی ہے...... یہ خیال آیا ہی تھا کہ ایک پرندہ آیا اور تازہ کھجور ان کے قریب ڈال گیا حضرت مالک بن دینارؒ فوراً یہ کھجور لے کر حضرت رابعہ بصریؒ کے قریب گئے اور کہا کہ تازہ کھجور حاضر ہے۔

حضرت رابعہ بصری نے دریافت کیا کہ یہ کہاں سے آئی؟ تب حضرت مالکؒ نے پورا واقعہ سنا دیا...... تب وہ یہ واقعہ سن کر بولیں۔ ”معلوم نہیں کہ یہ پرندہ یہ کھجور کس کے باغ سے لے آیا ہے۔ ایسی حالت میں اس کھجور کا کھانا مناسب نہیں ہے۔ اب تو میں اپنے اللہ کے پاس پہنچ کر ہی کھجور کھاؤں گی۔ اس لیے آپ نے فوراً اپنے نفس کی خواہش کو کچل دیا۔ پھر فرمایا۔ اب مجھے اکیلے مکان میں اللہ واحد کے ساتھ چھوڑ دو......“ چنانچہ وہاں موجود لوگ مغموم ہوئے مگر آپ کی ہدایت پر تنہا چھوڑ کر باہر نکل گئے اور دروازہ بند ہوگیا۔ مگر رحمتِ الٰہی کا دروازہ کھل گیا۔ کچھ دیر بعد اس مکان کی طرف سے آواز آئی۔ ”اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کے جوارِ رحمت کی طرف چل اور اس طرح کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔“ یہ آواز سن کر لوگوں نے مکان کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ حضرت رابعہ بصریؒ اپنے رب کو پیاری ہوگئیں...... اللہ، اللہ تیس

برس کی دلی خواہش شبہ کی وجہ سے پوری نہیں کی...... اس طرح حفاظت کرتے ہیں اپنے نفس کی۔

☆☆☆

حضور اکرمؐ نے فرمایا۔ ”اپنے حواس کو اپنے قابو میں رکھ...... یہی محاسبۂ نفس ہے۔“

حضور اکرمؐ نے فرمایا۔ ”میں اللہ تعالیٰ سے دن میں سو بار توبہ و استغفار کرتا ہوں۔“ توبہ یہ ہے کہ انسان غلطی کر کے ندامت کے ساتھ اس کو دیکھے اور توبہ کرے۔

حضرت عمر فاروقؓ جب رات کی تاریکی پھیل جاتی تو اپنے پاؤں کو اپنے درے سے ٹھوکر دے کر خود سے سوال کرتے بتا تو نے آج کیا عمل کیا؟“ گویا آپ نفس کشی فرماتے۔

حضرت معروف کرخیؒ اپنے آپ کو کبھی کبھار کوڑے مارا کرتے تھے اور کہا کرتے...... ”اے نفس تو اخلاص اختیار کرتا کہ تو خلاصی پا سکے۔“

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر یہ چاہیں کہ عبادت‘ مناجات و دعا میں اثر ہو تو یہ ناممکن ہے۔

حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد ہے کہ مومن اپنے نفس کا حکمران ہے وہ اس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے تاکہ قیامت کو اس کو حساب آسان رہے جو دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرتے قیامت کو ان کا محاسبہ سخت ہوگا۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ مومن سے جب کوئی خطا ہو جاتی ہے تو وہ اپنے نفس کا تعاقب کرتا ہے کہ تیرا اس بات سے کیا ارادہ تھا؟ تیرا اس کھانے سے کیا مقصد تھا؟ اور اس پہننے سے کیا مطلب تھا۔ لیکن تو بدکار ہے کہ ہر کام کرتا چلا جاتا ہے اور اپنے آپ کو عتاب نہیں کرتا۔

حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس طرح کے بندے پر رحم فرمائے گا جو خود کو کہے کہ کیا تو ایسا تو نہیں؟ کیا تو ویسا تو نہیں......؟ اس طرح کی باتوں سے خود اپنی مذمت کرے اور اپنے نفس کو لگام دے کر کتاب اللہ کا پابند بنائے تو فائدہ ہو۔

جناب احمد بن قیسؒ کے ایک ساتھی کی روایت ہے کہ وہ چراغ کے قریب آ کر اس کی لو پر ہاتھ رکھ کر اس کی تپش محسوس کر کے خود سے مخاطب ہوتے اور کہتے اے موحد مسلمان یعنی حیف تو نے آج یہ کام کیا؟ اور فلاں دن فلاں کام کیوں کیا تھا؟ اللہ کے لیے اپنے نفس سے جہاد کرنا مجاہدہ ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں...... غور و فکر عبادت کی کنجی ہے اور درست کام کرنے کی نشانی یہ ہے کہ نفس اور خواہشات کی مخالفت کرے اور ان دونوں کی مخالفت ان کی خواہشات کو ترک کر دینے سے ہوتی ہے۔

بعض نفسانی صفات کا تعلق انسانی پیدائش کے وقت سے ہوتا ہے۔ مثلاً انسان خاک سے پیدا ہوا اس لیے آدمی میں جو ضعف و کمزوری پائی جاتی ہے وہ خاک کی بدولت ہے۔ اس میں بخل کا مادہ گیلی مٹی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور شہوت پرستی جلی ہوئی چکنی مٹی سے پیدا ہوئی جہالت کا وجود کھنکھناتی مٹی کی وجہ سے ہے۔ قرآن پاک میں بھی یہ آیا ہے کہ ”وہ مٹی ٹھیکرے کی طرح ہو گئی تھی۔“ اس لیے اس میں شیطنت بھی آ گئی ہے کیونکہ ٹھیکرا آگ سے بنتا ہے لہٰذا اس شیطنت کی بدولت اس میں مکر و فریب اور حسد کا مادہ موجود ہے۔

جو شخص نفس کی فطرت اور اصل سے واقف ہو اسے اس بات کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ وہ خالق کائنات کی امداد کے بغیر ضبطِ نفس نہیں کر سکتا۔

دن رات میں محاسبۂ نفس کے دو وقت مقرر کر لو......

1۔ نمازِ چاشت کے بعد گزشتہ رات کا محاسبہ کرو کہ کیا حالت رہی...... اگر نعمت دیکھو تو شکر ادا کرو‘ اگر کوئی آفت دیکھو تو استغفار کرو...... اللہ تعالیٰ سے ڈرو، توبہ کرو اور اس سے معافی چاہو۔

2۔ سونے سے پہلے دوسرا محاسبہ کرو...... کہ تمہارا دن کس قدر غفلت اور برائی میں گزرا اس میں تم نے

کیا، کیا اور کس کے لیے اعمال کیے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ بندے اور اللہ کے درمیان گناہوں کی ایک محدود حد ہوتی ہے جب بندہ اس حد تک پہنچتا ہے تو اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے اور اب اسے کبھی نیکی کی توفیق نہیں ہوئی۔

اس لیے ان حد کو پہنچنے والے توبہ و رجوع میں جلدی کر ایسا نہ ہو کہ تو حد تک جا پہنچے اور سخت مشقت وشقاوت کا سامنا کرے اگر غفلت مزید بڑھ جائے تو مہر آگے قفل میں بدل جاتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”کیا پس وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہیں۔“

یہ بات یاد رہے کہ طویل غفلت سے سختی پیدا ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ڈرایا ہے اور فرمایا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”چنانچہ جن کے دل اللہ کے ذکر سے سختی میں ہیں ان کے لیے ہلاکت ہے۔“

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ ”کفر کی بنیاد تیرا اپنے نفس کی خواہش پر قائم رہنا ہے۔“

نفس امانت میں خیانت کرنے والا اور طلب رضائے الٰہی سے روکنے والا ہے اور سب سے بہتر عمل نفس کی خلاف ورزی ہے۔

حضرت محمد بن فضل بلخیؒ فرماتے ہیں کہ میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو نفسانی خواہشوں کو لے کر خانہ کعبہ جاتا اور اس کی زیارت کرتا ہے، وہ کیوں ہوائے نفس پر پاؤں نہیں رکھتا تاکہ وہ حق تعالیٰ تک پہنچے اور اس کا دیدار پائے...... لیکن نفس کی سب سے بڑھ کر ظاہر صفت شہوت ہے اور شہوت کے معنی آدمی کے تمام اعضا پراگندہ اور تمام حواس اس کے کاموں میں مصروف ہیں اور ہر ایک کے افعال کی بابت بندے سے سوال ہوگا...... لہٰذا لازم ہے کہ آنکھ کا شہوت دیکھنا...... کان کا سننا، ناک کا سونگھنا...... زبان کا چکھنا، جسم کا چھونا اور پسند کا سوچنا ہے...... طالب اپنے وجود کا حاکم اور نگہبان ہے اور دن رات اس کی حفاظت کرے اور اللہ سے دعا کرے کہ اس کے باطن سے ہر

دعا

دعا مومن کا ہتھیار ہے...... دعا پر اعتقاد ہی نیکی ہے اب ہم اللہ کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہیں تو ہمیں یقین کامل ہوتا ہے کہ اللہ ہماری دعائیں سنتا ہے اور جب ہماری دعا میں خلوص ہو اور یہ دل کی گہرائیوں سے مانگی گئی ہو تو یہ ہماری آنکھوں کو نم کردیتی ہے اور یہی آنسو دعا کی صورت میں منظوری کی دلیل ہیں۔ دعا مومن کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ دعا ناممکنات کو ممکن بنا دیتی ہے۔ دعا زمانے بدل دیتی ہے، دعا آنے والی بلاؤں کو ٹال دیتی ہے۔ دعا میں، بڑی قوت ہوتی ہے جب تک سینے میں ایمان ہے دعا پر یقین رہتا ہے۔ جس کا دعا پر ایمان نہیں اس کے سینے میں ایمان نہیں ہم سب کو اللہ کی بارگاہ میں یہ دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں دعاؤں کی افادیت سے مایوس نہ ہونے دے اور ہمیں دعاؤں پر کامل یقین حاصل ہو۔

از: ماہ رخ، حیدرآباد

خواہش دور ہو جائے۔

حضرت بشر حافیؒ فرماتے ہیں کہ ساٹھ شیطان اتنا فساد برپا نہیں کرتے جتنا کہ ایک برا دوست ایک لمحے میں کرتا ہے اور ساٹھ برے دوست اتنا فساد برپا نہیں کرتے جتنا نفس ایک لمحے میں کرتا ہے۔

تمام مذاہب کا اس میں اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا نفس کے مکروہات میں سے ہے۔

حضرت سفیان بن عینیہؒ فرماتے ہیں کہ ”بندے کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ اللہ کے نزدیک سب سے افضل ہو اور اپنی نظر میں سب سے برا۔“

حضرت فضیل بن عیاضؒ اکثر فرمایا کرتے جو شخص کسی ریاکار کو دیکھنا چاہے وہ مجھے دیکھ لے...... پھر اپنی داڑھی کو پکڑ کر روتے اور کہتے اے فضیل! تو اپنی جوانی میں فاسق تھا پھر ریاکار ہو گیا...... واللہ فسق

ریا سے بدر جہا بہتر ہے...... ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت مالک بن دینار کو ریا کار کہہ کر پکارا تو آپؒ نے اس کو مخاطب کر کے فرمایا...... اے دوست تو نے میرا لقب معلوم کر لیا جس کو اہلِ بصرہ بھول گئے تھے۔

حضرت وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں کہ شیطان ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے روبرو آیا آپؑ نے اس سے سوال کیا کہ جب تو امتِ محمدیؐ دیکھے گا تو ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ شیطان نے جواب دیا۔ میں ان کی نظر میں دنیا کو اس قدر مزین کر دوں گا کہ وہ درہم و دینار کو کلمۂ توحید سے بھی زیادہ عزیز جانیں گے۔

تو جو شخص شہوت پر غالب ہے وہ فرشتوں پر غالب ہے اور جس پر شہوت غالب آجائے وہ جانوروں سے بھی برا ہے۔

حضرت یزید رقاشیؒ کبھی ٹھنڈا پانی نہیں پیتے تھے اور فرماتے تھے کہ ڈرتا ہوں اگر آج میں ٹھنڈا پانی پی لوں تو کل آخرت میں اس سے محروم نہ رہوں۔

جب کوئی بندہ طلب آخرت کی وجہ سے اپنی گزشتہ زندگی پر غور کرتا ہے تو یہ فکر اس کے لیے غسل کا کام دیتی ہے فرمان نبویؐ ہے کہ ”ایک گھڑی کا تفکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔“

اس لیے ہر عقلمند کو لازم ہے کہ اپنے زندگی کے معاملات پر غور کرے، اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرے...... جن چیزوں کا اقرار کرتا ہے ان میں تفکر کرے اور توشۂ آخرت تیار کرے...... امیدوں کو کم کر کے توبہ میں جلدی کرے، اللہ کا ذکر کرتا رہے...... حرام چیزوں سے پرہیز کرتے ہوئے نفس کو صبر پر آمادہ کرے۔ نفسانی خواہشات کی پیروی نہ کرے...... نفس ایک بت ہے جو نفس کی پیروی کرتا ہے وہ بت پرستی کرتا ہے جو اخلاص سے اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ اپنے نفس پر جبر کر کے ہی کرتا ہے...... اور ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ رب العزت نے آخرت میں انعامات رکھے ہیں...... جنت ان کا ٹھکانا ہے۔

افسوس ...... آج ہم کس قدر اپنے نفس کے ہاتھوں کھلونا بن چکے ہیں...... خواہشات کی بھر مار ہے اور ہر جائز و ناجائز خواہش کی تکمیل میں مصروف ہیں...... احساسِ برتری کے زعم میں مبتلا ہیں...... بہترین لذیذ کھانوں کی خواہش...... بہترین مہنگے ترین ملبوسات اپنے جسم پر سجانے کا شوق...... بہترین گھروں اور گاڑیوں کی خواہش...... غرضیکہ ہر طرف خواہشات کی یلغار ہے...... ہم اس قدر اپنے نفس کے آگے بے بس ہو چکے ہیں...... حضرت یحییٰ بن زکریاؑ نے شیطان کو بہت سے پھندے اٹھاتے ہوئے دیکھا پوچھا ”یہ کیا ہے؟“ شیطان بولا...... ”یہ شہوات ہیں ان سے ابنِ آدمؑ کو قید کرتا ہوں۔“ آپؑ نے دریافت کیا کہ ”کیا میرے لیے بھی کوئی ہے؟“ شیطان نے کہا کہ ”ایک رات آپ نے پیٹ بھر کر کھا لیا جس سے نماز میں سستی پیدا ہوئی۔“ آپؑ نے فرمایا...... ”آئندہ میں بھی پیٹ بھر کر نہیں کھاؤں گا......“ یہ اس ہستی کا حال ہے جس نے زندگی میں صرف ایک رات پیٹ بھر کر کھا لیا...... تو پھر اس شخص کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو عمر بھر کبھی بھوکا نہیں رہتا اور پیٹ بھر کر کھاتا ہے اس پر اس کی عبادت گزار بننے کی خواہش ہے۔

مقامِ غور و فکر ہے؟

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نفس کے شر سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

حرفِ آخر! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرتی ہوں کہ اس مضمون کو تحریر کرتے ہوئے کہیں کوئی غلطی کوئی کوتاہی کوئی کمی رہ گئی ہو تو اللہ رب العزت مجھے معاف فرما دے کہ وہ بہت مہربان اور معاف کرنے والا رب ہے...... آمین۔

میں نے جن بے حد قابلِ احترام ہستیوں کی کتب سے یہ مضامین منتخب کیے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کے درجات بلند فرمائے...... (آمین) اور اس کو ہمارے لیے توشۂ آخرت بنا دے، آمین۔

عورت! آپ ہی قاتل آپ ہی مسیحا

شائستہ زریں

قارئین کرام!
السلام علیکم
مرد عورت کا استحصال کرے تو المیہ...... اور عورت دوسری عورت کا استحصال کرے تو سانحہ ہے ......لیکن ایسی واردات کی نوبت آتی ہی کیوں ہے؟ وہ کون سے عوامل ہیں جو صنفِ نازک کو اس درجہ قوی بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنی ہی صنف کی حقیقی خوشیاں اس سے چھین لیتی ہے۔ بظاہر یہ ایک ناقابلِ یقین حقیقت معلوم ہوتی ہے لیکن یہ وہ کڑوا سچ ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اگر ایک طرف ایسے منفی فکر و عمل کی حامل خواتین ہمارے معاشرے کا حصہ ہیں تو دوسری جانب ایسی خواتین کی بھی کمی نہیں جو مثبت اور صحت مند سوچ کے تحت اپنی جیسی خواتین کی فلاح و ترقی میں فعال کردار ادا کرتی ہیں۔

اپنی ہم صنف کے لیے خواتین کے ان منفی و مثبت جذبات اور رویوں کے پیش نظر ہم نے ایک سروے رپورٹ کے ذریعے معلوم کیا کہ

سوال: 1 ایک عورت دوسری عورت کا استحصال کیوں کرتی ہے؟

سوال: 2 خواتین اپنی ہم صنف کے لیے کیسے معاون اور مددگار ثابت ہو سکتی ہیں؟

عارفہ شمسہ

(سماجی کارکن، صداکارہ، آرٹسٹ)

1: جب عورت کا کوئی مضبوط سماجی و معاشی پس منظر نہ ہو، وہ معاشی طور پر کمزور ہو، اس کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو تو دوسری عورت اسے کمزور سمجھ کر اس کا استحصال کرتی ہے۔

2: بغیر کسی منافقت کے اپنے جذبات، خیالات اور حالات ایک دوسرے کو صحیح طور پر بتا کر ایک دوسرے سے صلاح کریں، دل سے ایک دوسرے کی



عارفہ شمسہ

بات سن کر فیصلہ کریں اور اس وقت جب آپ کا دل اس فیصلے کو تسلیم کر رہا ہو۔

ماہ پارہ صفدر

(پروڈیوسر بی بی سی اردو سروس، صحافی، نیوز کاسٹر)

1: عورت ہی عورت کا استحصال کرتی ہے بہت سے معاملات میں لیکن کیوں؟ متعدد نفسیاتی، سماجی اور معاشی وجوہات ہیں اور کسی ایک وجہ ہی کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ عورت کا عورت کے ہاتھوں استحصال کی سب سے بڑی مثال عورت کا شادی شدہ مرد سے دوسری شادی ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دو تین



ماہ پارہ صفدر

بچوں کی ماں کو چھوڑ کر اس سے شادی کر رہا ہے تو وہ کیوں رضامند ہوتی ہے جبکہ وہ جانتی ہے کہ ایسا کر کے وہ ایک دوسری عورت کی حق تلفی کر رہی ہے۔ ایسے تجربے میں یہ بھی دیکھا ہے کہ عورت اگر کسی انتظامی منصب پر فائز ہو جائے تو اکثر معاملات میں عورت کے لیے یہ بہت ہی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ متعدد شعبوں کی ایسی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ جہاں عورت ہی عورت کا استحصال کرتی ہے اور بہت سے معاملات میں وہ مرد کی آلۂ کار بھی بنتی ہے۔

۲: میرے خیال میں خواتین کو بلاشبہ اپنی ہم جنس کا مددگار ہونا چاہیے لیکن معیار کی قیمت پر نہیں، ہاں اگر کہیں فرق انیس ساڑھے انیس کا ہے تو مردوں کے اس معاشرے میں باوجود اس کے کہ عورت نے بہت ترقی کی ہے لیکن مرد اب بھی عورت کے زیادہ علم، اس کی بہت اچھی انتظامی صلاحیت اور کام کی بہتر استعداد کو تسلیم نہیں کرتا ہے گو کہ ایسے شوہروں کی تعداد بہت کم ہے جو اپنے سے زیادہ پڑھی لکھی بیوی کو ہر وقت نیچا دکھانے کی فکر میں رہتے ہیں...... ایسے میں خواتین کو ہی خواتین کی ذہنی تربیت کرنی ہے اور ان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہے۔ میں نے خود دفتری ماحول میں نئی آنے والی لڑکیوں کی تربیت کی ہے، جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔

ربیعہ اکرم

(پروگرام منیجر ایف ایم ۱۰۱ کراچی)

1: عورت عورت کا استحصال اس وقت کرتی ہے جب وہ خود عدم تحفظ کا شکار ہوتی ہے۔ جب وہ یہ محسوس کرتی ہے کہ یہ تو اس کی بقا اور انا کا سوال ہے، جب وہ خود احساسِ کمتری میں مبتلا ہوتی ہے تو پھر اسے خود کوئی چارہ نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ وہ اپنی ذات کو محفوظ کرنے کے لیے دوسری عورت کا استحصال کرے۔

۲: خواتین اپنی ہم صنف کے لیے کئی معاملوں میں معاون اور مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ایک عورت ہی عورت کی نفسیات و مسائل کو بخوبی سمجھ سکتی



ربیعہ اکرم

ہے۔ اس کا ادراک رکھتی ہے اور مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، کسی بھی گھر میں ماں اپنی بیٹی یا بہو کے لیے، نند، بھابی اور بھابی، نند کے لیے اور بہن، بہن کے لیے تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لا کر مددگار اور معاون ہو سکتی ہے۔ شرط اخلاص و محبت ہے اور اسی طرح کسی ادارے کی خاتون سربراہ اپنی ماتحت خواتین کے مسائل کو سمجھ کر انہیں حل کرنے میں زیادہ بہتر انداز سے معاون ثابت ہو سکتی ہے بلاشبہ....

قوموں کی عزت ہم سے ہے

راحیلہ فردوس

(نعت خواں، سابق نیوز کاسٹر پی ٹی وی)

۱: عورت کو ہمارے معاشرے میں اب تک وہ اعتبار، اعتماد نہیں ملا، جو اس کا حق ہے۔ اس وجہ سے وہ خود کو محفوظ نہیں سمجھتی، ایسی صورت میں وہ خوفزدہ ہوجاتی ہے۔ اس میں خوداعتمادی کی کمی ہونے لگتی ہے تو وہ دوسری عورت کا استحصال کرنے لگتی ہے۔

۲: اگر خواتین اپنی ہم صنف کے لیے اپنے دل میں تھوڑی سی گنجائش نکال لیں، خود پر بھروسا کریں تو وہ دوسری خواتین کی مدد کرسکتی ہیں، اس سے معاشرے میں بھی بہتری آئے گی۔ اور خواتین میں صحت مند



راحیلہ فردوس

مقابلے کا رجحان پروان چڑھے گا ساتھ ہی متعلقہ شعبوں میں خواتین کی کارکردگی بھی بہتر ہوگی۔

ہما احمد تاجدار

(گھریلو خاتون)

۱: کوئی بھی عورت جب بخوشی اپنا استحصال نہیں کرواسکتی تو پھر وہ دوسری عورت کا استحصال کیوں کرتی ہے؟ جبکہ وہ محبت کا سرچشمہ بھی ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا کرتی ہے تو اس کے اہم اسباب اسلامی تعلیمات سے

ناواقفیت، بنیادی اخلاقی اقدار سے دوری اور جہالت ہے۔ اور یہی وہ ناسمجھی ہے جو اسے غیر محفوظ ہونے کا یقین دلاتی ہے۔

۲: خواتین ایک دوسرے کا خیال رکھیں، ایک دوسرے کا ساتھ دیں، ان کو آگے بڑھنے کی ترغیب



ہما احمد تاجدار

دیں، محبت کو شعار بنائیں نہ کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کریں۔ یوں باہمی محبت سے تکلیف بھی کم ہوگی اور معاشرہ بھی ترقی کرے گا۔ خواتین ایک دوسرے کے لیے الگ، الگ معیار قائم کرنے کے بجائے ایک ہی سطح پر کھڑی ہوکر ایک دوسرے کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرکے اپنی ہم صنف کے لیے مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

نورین خان

(پروفیسر شعبۂ انگریزی۔ ضیاالدین یونیورسٹی)

۱: عورت ہی عورت کو بہتر طور پر سمجھ سکتی ہے اور عورت میں حسد کا عنصر ہونے کی وجہ سے وہی دوسری عورت کی دشمن بھی ہوتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ آج کی عورت کو کس طرح توڑا جاسکتا ہے۔ ناقص تعلیمی معیار کی وجہ سے عورت کی اس حس کو ابھی تک سکون

نہیں ملا، جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں عورت ہی عورت کا استحصال کرتی ہے۔

۲: تعلیم نسواں عام ہونے سے یہ ضرور ہوا کہ عورت کو اس کے جائز حقوق کا علم ہو گیا لیکن جو خواتین ابھی تک ان سے ناواقف ہیں، باشعور خواتین انہیں حقوقِ نسواں کا شعور اور آگہی دے کر ان کے لیے



نورین خان

مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ مردوں کے اس معاشرے میں خواتین پر اگر ظلم ہو رہا ہے تو اس کو روکیں اور کسی بھی وجہ سے شکار ہونے والی عورت کو اس کا حق دلوائیں۔

آصفہ زہرا

(نیوز اینکر اب تک ٹی وی)

۱: ہمارے معاشرے کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ایک بچی اپنے بچپن ہی سے محبت بھرے رشتوں میں یعنی دادی سے ماں کی، ماں سے دادی کی، نند سے بھابی کی، بھابی سے نند کی باہمی کڑواہٹ دیکھتی چلی آتی ہے۔ پھر یہ کہ خالہ سے محبت کا معیار الگ ہے اور پھوپی سے الگ اور اسی غلط سوچ کی وجہ ہی سے عورت، عورت کی مخالفت پر آمادہ ہوتی ہے۔ جو بڑھتے، بڑھتے ہر حد پار کر جاتی ہے، جو بچی کمسنی سے یہ سب دیکھتی چلی آتی ہے تو اس کے ذہن میں منفی سوچ ہی پروان چڑھتی ہے۔ ساس، بہو، نند بھاوج کے منفی خاکے اس کے ذہن میں بنتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی ہی جیسی عورت کی دشمنی میں بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر یہ رویے دفتر اور دیگر مقامات پر بھی دیکھتے ہیں جس سے دوستی کی ہر حد پار کی، اسی کے لیے کسی دوسری عورت کی دشمن بھی بن گئی۔ اور پھر جب خود اس سے تعلقات خراب ہوئے تو پھر کسی اور کا سہارا لے کر



آصفہ زہرا

اس کا استحصال کرتی ہے۔

۲: ہم کو on read ground سب ٹھیک کرنا ہوگا گھر سے اپنی تربیت کو ٹھیک کرنا ہوگا اور اس کے لیے نوعمری ہی سے لڑکی کی تربیت کرنی ہوگی اس سے معاشرے میں عورت کا رخ ہی بدل جائے گا پھر دیکھیں کہ وہ کیسے اپنی ہی ہم صنف کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

حنا الطاف

(ٹی وی آرٹسٹ)

۱: صرف اس لیے کہ دوسری عورت آگے نہ بڑھ سکے۔ اس کے حصے میں آنے والی کامیابی وہ خود حاصل کر لے اور ایسا وہ اپنی چھوٹی ذہنیت اور تنگ نظری کی وجہ سے کرتی ہے۔

۲: اگر ہم اپنی جیسی لڑکیوں کو آگے بڑھنے کا

متعلقہ رشتوں سے جُڑی خواتین کے مابین نااتفاقی، رنجش، نفرت اور دشمنی کے منفی جذبات پروان چڑھتے ہیں جو دوسری عورت کے استحصال کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ آصفہ زہرا کی یہ سوچ بھی بجا ہے کہ ناپختہ ذہن میں محبت بھرے رشتوں کے لیے نفرت کی کڑواہٹ سے بچپن ہی سے ان رشتوں کے حوالے سے منفی جذبات جنم لیتے ہیں جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہو کر اپنی ہم صنف کے استحصال کا سبب بنتے ہیں سو اس کے خاتمے کے لیے بیٹی کی عمدہ ذہنی واخلاقی تربیت



تحریم منیبہ

بے حد ضروری ہے۔جب خواتین کسی بھی صورتِ حال میں مثبت طرزِ عمل اختیار کرتی ہیں تو دراصل وہ اپنی ہم صنف کی راہ کے تمام کانٹے چن لیتی ہیں۔ گویا جب خواتین دیگر خواتین کے حق میں منصف اور مخلص ہوں گی تو ایک دوسرے کے حقوق کو تحفظ دینے کا ظرف اور احساس بھی ان کے اندر جنم لے گا تب وہ خود سے کمزور تر عورت کی طاقت بن کر انہیں ان کا اصل مقام دلاتے کی عملی کاوش ضرور کریں گی اور اپنی ہم صنف کے لیے خواتین کا یہ رویہ ہی ان کے ساتھ بہت بڑا اور اہم تعاون ہے۔



حنا الطاف

حوصلہ دیں گے تو ہماری زبان سے نکلنے والے الفاظ اور محبت بھرا لہجہ بھی ان کے ساتھ بہت بڑا تعاون ہے۔ جس طرح بھی ممکن ہو اپنی ہم صنف کا حوصلہ بڑھائیں تاکہ وہ آگے بڑھ سکیں۔

تحریم منیبہ
(نعت خواں)

ا: جب مقاصد ایک جیسے ہوں، ذاتی مفادات کے لیے، سبقت حاصل کرنے کے لیے تب عورت دوسری عورت کا استحصال کرتی ہے۔

۲: ایثار کا مظاہرہ کر کے، لالچ اور انا سے گریز کر کے خواتین اپنی ہم صنف کے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

☆☆☆

عزیز قارئینِ کرام: سروے کے شرکا کی آرا سے جو مجموعی صورتِ حال سامنے آئی ہے وہ یہی ہے کہ جب ایک عورت دوسری عورت کے مقابلے میں خود کو کمزور محسوس کرتی ہے تو نفسیاتی طور پر خوفزدہ ہو جاتی ہے تب اپنے دفاع کے لیے وہ مخفی طاقت استعمال کرتی ہے۔لیکن یہ بھی بجا کہ اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ مضبوط ہاتھ مرد کی کمزوری کا بھی ہے کیونکہ جہاں مرد کسی بھی قسم کے دباؤ میں آ کر رشتوں میں امتیاز برتتا ہے وہیں سے

وہ آئے بزم میں......

نزہت اصغر





معروف مصنفہ اور ماہرِ تعلیم
محترمہ افسر سلطانہ
سے معلومات افزا اور دل پذیر گفتگو

اپنے بہت پیارے اور سمجھدار قارئین کی خدمت میں سلام عرض ہے...... جی ہاں سمجھدار اس لیے کہ آپ لوگوں کی تعریف، تنقید، رائے اور فرمائشیں ہماری اس بزم کو بہتر سے بہتر بنا رہی ہیں تو یہ آپ لوگوں کی سمجھداری ہی تو ہے۔ اسی لیے آج ہم پاکیزہ کی ایک اور دیرینہ، پُرخلوص اور قابلِ قدر ساتھی محترمہ افسر سلطانہ کی آمد سے اپنی بزم کو سجا رہے ہیں۔ ہم نے ان سے بہت سارے سوالات کیے اور ان سب کے ہی افسر سلطانہ نے اتنے جامع، مدلل اور

بھرپور جوابات دیے کہ حقیقی معنوں میں لطف آ گیا کہ ایک پڑھے لکھے باشعور ذہن کی حامل شخصیت کی گفتگو ایسی ہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ افسر سلطانہ کو صحت و سلامتی عطا کرے، آمین...... تو آئیں ہم اس مربی، معلمہ اور باعمل استاد سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آج کی اس بزم میں آپ کو خوش آمدید...... آپ کو آنا کیسا لگ رہا ہے؟

افسر سلطانہ ✧...... شکریہ، پاکیزہ کی محفل ہو یا کوئی تقریب...... خود کو کبھی اجنبی محسوس نہیں کیا...... اب یہاں آنا اور تمہارے ساتھ، ساتھ قارئین سے مخاطب ہونا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ میرے لیے ایک بہت بڑا اعزاز...... جس کے لیے عذرا رسول، انجم انصار، نزہت تمہاری اور پاکیزہ کے تمام اسٹاف کی مشکور ہوں۔ (بہت نوازش آپ کی بھی)

پاکیزہ ✧...... ایک زمانے میں آپ افسانے تحریر کیا کرتی تھیں اب کیوں اس سے کنارہ کشی کر لی؟

افسر سلطانہ ✧...... نزہت، لکھنا خالص خدا داد صلاحیت ہے اس سے کنارہ کشی ہو ہی نہیں سکتی...... یقیناً پچھلے پانچ سال میں کہیں بھی چھپ نہیں سکی لیکن ذہنی طور پر تخلیق کا عمل جاری رہا...... وجہ تعلیمی سلسلہ تھا...... ایم فل کے بعد پی ایچ ڈی کی دوڑ میں شامل ہوں۔ سب سے دعاؤں کی درخواست ہے...... یہ سلسلہ اس سال بخیر و خوبی اپنے انجام کو پہنچے۔ (انشاء اللہ)

پاکیزہ ✧...... اپنی تحریری صلاحیت کا احساس آپ کو کب ہوا؟

افسر سلطانہ ✧...... لکھنے کا سلسلہ پانچویں جماعت سے شروع ہوا۔ اس وقت ادراک کیا ہوتا تھا۔ اردو کی ٹیچر پہچان گئیں...... آٹھویں جماعت میں انہی کی ہمت افزائی سے اخبار میں مضامین چھپنا شروع ہو گئے اور بس اخباروں سے رسائل کا سفر طے ہونے لگا۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... آپ نے تقریباً کتنی کہانیاں لکھیں، کیا کتابی شکل میں چھپوائیں؟

افسر سلطانہ ✧...... تقریباً ڈھائی سو افسانے، بیس پچیس ناولٹ اور ایک ناول قسط وار چھپ چکا ہے۔ کتابی شکل میں کچھ بھی نہیں چھپوا سکی۔ کچھ فرصت کی کمی، کچھ ازلی کاہلی۔ لاہور کے پبلشرز نے چند سالوں پہلے رابطہ کیا تھا۔ وہ بھی تھک کر بیٹھ گئے اور اِدھر سے بھی جنبش نہیں ہوئی۔ (افسر اب آپ پی ایچ ڈی کے بعد پھر کوشش کریں)

پاکیزہ ✧...... ہمارے علم میں ہے کہ آپ انگریزی ادب کی استاد ہیں بلکہ اپنی یونیورسٹی کی ڈیپارٹمنٹ ڈین پھر اردو نثر نگاری میں دلچسپی......؟ کچھ حقیقت بتائیں؟

افسر سلطانہ ✧...... میں صرف انگریزی ہی نہیں، کمیونی کیشن اسکلز 1. communication skills اور ٹیکنیکل رپورٹ رائٹنگ 2.techincal report writing بھی پڑھاتی ہوں۔ یہ سب کچھ میری ملازمت کا حصہ ہے۔ لکھنے کی صلاحیت دراصل اللہ کی طرف سے عطیہ ہے بس اسی لیے لکھتی ہوں۔ اور یہ وضاحت کر دوں میں ڈیپارٹمنٹ ڈین نہیں بلکہ چیئر پرسن ہوں...... (جی بہتر)

پاکیزہ ✧...... آپ کو درس و تدریس سے شروع سے دلچسپی تھی یا حادثاتی طور پر اس جانب آ گئیں؟

افسر سلطانہ ✧...... نہیں بالکل بھی دلچسپی نہیں تھی کچھ نام ہی کا اثر تھا۔ کسٹم افسر، پولیس افسر اور پھر آخر میں بینک افسر بننے کی خواہش کا اظہار کیا...... مرحوم والدِ محترم کو یہ ملازمتیں پسند نہیں تھیں۔ لہٰذا معلمی کا پیشہ اختیار کیا اور اب اس پر پچھتاوا بھی نہیں۔ (ہاں بھئی یہ شعبہ تو عبادت کے ضمن میں آتا ہے)

پاکیزہ ✧...... حادثاتی طور پر اس وجہ سے کہا کہ اکثر ہر فرد کچھ اور بننے کا ہوتا ہے مگر بن کچھ اور جاتے ہیں؟ کیوں ٹھیک کہا ہے ناں؟

افسر سلطانہ ✧...... بالکل ٹھیک کہا...... اور وجہ تو آپ کو بتا ہی دی۔

پاکیزہ ✧...... انگریزی ادب کی تدریس کے ساتھ، ساتھ آپ افسانے کس طرح تحریر کرتی رہیں؟ کوئی

مشکل تو پیش نہیں آئی۔

افسر سلطانہ ❖ ...... میں ہمیشہ سادہ اور آسان الفاظ پر مشتمل افسانے لکھتی ہوں۔ مشکل وقت کی کمی سے پیش آتی ہے۔

پاکیزہ ✧ ...... اردو ادب اور انگریزی ادب دو مختلف جہانوں کے ادب ہیں، قدرِ مشترک کیا ہوسکتی ہے؟

افسر سلطانہ ❖ ...... انسانی فطرت ہی قدرِ مشترک ہے...... ویسے ادب آفاقی ہوتا ہے۔ (جی بالکل)

پاکیزہ ✧ ...... آپ نے پہلے پہل کن موضوعات پر قلم اٹھایا؟

افسر سلطانہ ❖ ...... بچپن والدہ کی بیماری کی وجہ سے ننھیال کے زیرِ سایہ گزرا...... بزرگوں کے ساتھ بچے رہیں تو کچھ اثر آہی جاتا ہے...... بڑے سنجیدہ موضوعات چنے۔ سب سے پہلے معاشرے میں پھیلی فضول رسومات پر لکھا...... بڑی نصیحتیں بھی کیں...... چھوٹا منہ اور بڑی بات شاید اسی کو کہتے ہیں۔

پاکیزہ ✧ ...... آج کل کی تحریروں کے بارے میں کیا کہیں گی؟ کیا موضوعات کے اعتبار سے فرق محسوس کرتی ہیں؟

افسر سلطانہ ❖ ...... موضوعات کے اعتبار سے تو فرق محسوس نہیں ہوتا...... البتہ معیار پر اکثر ڈنڈی ماردی جاتی ہے۔ (یہ تو ہے جہاں ہر شعبے میں معیار متاثر ہورہا ہے تو یہ شعبہ کیسے بچا رہتا)

پاکیزہ ✧ ...... پچیس تیس سال پہلے کے لکھنے والے تقریباً تمام ہی لکھاری یہ بات کہتے ہیں کہ ہم اپنے شوق، جذبے، لگن اور مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتے تھے مگر آج کل یہ لکھنا لکھانا معاشی ضرورت کے تحت ہورہا ہے ایسے میں طویل تحریر تو سامنے آرہی ہے مگر یادگار اور باوزن تحریر نہیں آرہی۔ آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

افسر سلطانہ ❖ ...... بالکل صحیح تجزیہ ہے آپ کا...... یہ مسلمہ حقیقت ہے، بہت سی نئی رائٹرز 'معذرت کے ساتھ' غیر ضروری طوالت کا شکار ہوجاتی ہیں۔ گاڑی کو زبردستی کھینچنے سے نہ مقصد رہتا ہے نہ جذبہ...... کہانی میں وزن اس کے جائز اختتام کا متقاضی ہوتا ہے۔ (جی نئی بچیوں کو ایسی ہی رہبری کی ضرورت ہے)

پاکیزہ ✧ ...... اچھا یہ بتائیں پاکیزہ سے کب اور کس طرح ناتا جڑا اور آپ کو پاکیزہ کا حصہ بننا کیسا لگا؟

افسر سلطانہ ❖ ...... پاکیزہ سے رشتہ بہت پرانا ہے، میں ان دنوں تین بڑے رسائل میں لکھ رہی تھی۔ نیا نوکر جیسے تو ہرن مار دے...... بس وہی حال یہاں بھی تھا...... تینوں رسالوں میں ایک، ایک افسانہ اور ایک بچی کہانی جس میں مسالا بھی ڈالنا پڑتا تھا۔ شیرٹن ہوٹل میں پاکیزہ کا ایک فنکشن تھا۔ ساتھ انجم انصار آبیٹھیں۔ 'میری خوش قسمتی' بس وہی ایک پیار بھرا جملہ...... ایک مخلص کی پیشکش...... "ہمارے پاکیزہ میں کیوں نہیں لکھتیں......" جس نے رشتہ قائم کردیا...... اس کے بعد کئی سالوں تک پاکیزہ ہی میں لکھا...... ایک آدھ اور رسالہ بھی ہے لیکن اس میں تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں...... بزم جہاں اتنا پیار ملے کہ سالوں بعد بھی فون کروں اور انجم نام بنام گھر والوں کو پوچھنا شروع کردیں۔ اس طرح کی شخصیات اور ادارے کہیں دستیاب ہوتے ہیں۔ (بالکل درست کہا آپ نے)

پاکیزہ ✧ ...... پاکیزہ کے بارے میں کیا کہیں گی؟ مزید کیا بہتری یا تنوع ہوسکتا ہے؟

افسر سلطانہ ❖ ...... پاکیزہ کا معیار ہمیشہ سے قائم و دائم ہے۔ افسانے ہوں یا ناولٹ معیار کی بنیاد پر چھاپے جاتے ہیں...... بھرتی کے مال سے گریز کیا جاتا ہے۔ بڑے، بڑے نام اس رسالے کا حصہ ہیں۔ مختلف انعامی سلسلے قاری بہنوں کی آمد کا مستقل ذریعہ...... جلترنگ پہلے بھی شاید کسی خط میں لکھا تھا کہ میری تھکن میں میرے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ثابت ہوتا ہے۔ تمام چھوٹے سلسلے پسندیدہ، البتہ بہتری کی گنجائش تو ہمیشہ رہتی ہے۔ پرانے ادب سے کوئی انتخاب بھی شامل ہوجائے تو نئے رائٹرز مزید استفادہ کرسکتے ہیں بلکہ میں چاہوں گی...... انگریزی ادب سے بھی ترجمہ کرکے کچھ چھاپ دیا جائے تو ایک

آدھ چھپا چور ضرور سامنے آجائے گا۔ ویسے میری قاری بہنیں مجھ سے زیادہ اچھے مشورے دیتی رہتی ہیں اور ان پر اکثر عمل بھی ہوتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو جاری رہنا چاہیے۔ (ہاں کلاسیکی ادب سے انتخاب کی تو کافی فرمائشیں آرہی ہیں)

پاکیزہ ✧...... اچھا یہ سوال مجھے سب سے پہلے کرنا چاہیے تھا چلیں اب بتادیں' افسر نام آپ کا کس نے رکھا تھا اور کیا سوچ کر رکھا ویسے آپ نے تو ماشاءاللہ نام کی خوب لاج رکھی؟

افسر سلطانہ ✧...... نزہت، ابو اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی شادی سے پہلے ہی ان کے والدین داغِ مفارقت دے گئے تو ہمیں ددھیالی کوئی بھی رشتہ نہیں ملا...... امی بتاتی تھیں جس اسپتال میں میری آمد ہوئی وہاں کوئی ڈاکٹر میری ہم نام تھیں...... بے حد اخلاق والی، بزرگوں کو عزت دینے والی...... سو نانا جان ان کے اخلاق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فیصلہ صادر ہوگیا...... ویسے مجھے اپنے نام کا پہلا حصہ بالکل پسند نہیں۔ نانا جان سے معذرت محلے اور یونیورسٹی میں مجھے صرف سلطانہ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ویسے بتاؤں تو پتا چلے ناں......(اچھاجی)

پاکیزہ ✧...... ہاں لاج تو رکھی مگر ایک بہت منکسر المزاج اور حلیم الطبع افسر کے طور پر ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟

افسر سلطانہ ✧...... اس سوال کا جواب خالص اسٹاف سے پوچھنے کا تھا۔ حقیقت وہی بتائیں گے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب آپ کوئی ذمے داریاں سنبھالے بیٹھے ہوں تو مزاج کے خلاف بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ اصولوں پر سمجھوتا نہیں ہوسکتا...... ہر سمسٹر میرا ڈیپارٹمنٹ تقریباً 2000 (دو ہزار) طلبا و طالبات کے مستقبل کو سنوارنے کا کام انجام دیتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ رول ماڈل بھی بننا ہو اور ٹیچرز کلاس نہ لیں...... جائیں بھی تو دس منٹ لیٹ ہوں اور پانچ منٹ جلدی باہر نکلیں...... قربانیاں تو دینا پڑتی ہیں...... بس یہی کوشش ہوتی ہے کہ کوتاہی نہ میری طرف سے ہو نہ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے۔ تاہم میرا اسٹاف بہت محنتی اور وقت کا پابند ہے۔ (جب اتنی اچھی معلم اور ساتھی ہوں تو کیوں نہیں)

پاکیزہ ✧...... آپ کی پہلی تحریر پر گھر والوں کے اور قریبی لوگوں کے کیا تاثرات واحساسات تھے؟

افسر سلطانہ ✧...... اپنی ذات کے حوالے سے کچھ کہنا نہ مجھے آج پسند ہے نہ بچپن میں تھا' انٹرویو دینے سے اسی لیے کترا رہی تھی' پہلی تحریر کے بارے میں ڈرتے، ڈرتے صرف مرحومہ والدہ کو بتایا تھا جب انہوں نے ابو کو بتایا تو انہیں بہت دنوں تک یقین نہیں آیا۔ قریبی لوگوں کو تو سالوں تک پتا نہیں چلا...... انکشاف اس وقت ہوا جب دوسرے رسالے اور پاکیزہ میں بیک وقت انجم انصار اور دوسری مدیرہ میدان میں اتر آئیں تصاویر کیسی چغلیاں کھاتی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... ذاتی طور پر آپ کو کیسے موضوعات پسند ہیں، لکھنے اور پڑھنے کے بھی حساب سے؟

افسر سلطانہ ✧...... میں معاشرے میں پھیلے لاتعداد، بے شمار موضوعات چننے کی عادی ہوں۔ ایسے موضوعات اور افسانے اور بھی اچھے لگتے ہیں۔ جن میں مسائل کے ساتھ حل بھی موجود ہوں۔

پاکیزہ ✧...... یونیورسٹی لائف یعنی تدریس کے حوالے سے کیسی گزر رہی ہے کیا دیگر سوشل سرگرمیوں کے لیے وقت ملتا ہے؟

افسر سلطانہ ✧...... الحمدللہ بہت اچھی...... بہت سی مصروفیات کے باوجود کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ اسٹاف ممبرز کی برتھ ڈے منائی جاتی ہے۔ ساتھ اپریل میں شیکسپیئر کو بھی بھولا نہیں جاتا...... اسٹاف بھی مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے تو اس کا حصہ بننا بھی میری ذمے داری ہے۔ (اسی سے تو ذہنی ہم آہنگی بڑھتی ہے)

پاکیزہ ✧...... کچھ اپنی فیملی کا بھی مختصر تعارف کروائیں پھر ذرا ہلکے پھلکے سوالات کی طرف آؤں گی؟

افسر سلطانہ ✧...... الحمدللہ بہن' بھائی، بھابی، بہنوئی اور ان کے بچے جو میری زندگی کا سرمایۂ حیات

ہیں میں ان سب کی زندگی، صحت اور اچھی تقدیر کی بہت بہت دعائیں مانگتی ہوں۔ آپ سب بھی ان سب اور بچوں کو خاص طور پر اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھیں۔ (انشاءاللہ ضرور)

پاکیزہ ✧...... آج کی نوجوان نسل کے بارے میں کیا کہیں گی مطلب ان کی سوچ اور نقطۂ نظر کس جانب ہے؟

افسر سلطانہ ❖...... ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی...... آج کی نوجوان نسل بہت باصلاحیت، باشعور ہونے کے ساتھ، ساتھ محنتی بھی ہے۔ جو بچے بے راہ روی پر چل پڑیں وہاں کی تربیت کی ہوتی ہے۔ والدین کمانے کی فکر میں بچوں کو ماسیوں کے سپرد کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم نہ ہونے کا سب سے بڑا نقصان آج کل اکثر وہ والدین رہے ہی نہیں جو ہمارے نصیب کا حصہ تھے۔ نسل کو مورد الزام ٹھہرانا کسی طرح بھی مناسب تو نہیں لگتا۔ (جی ہاں)

پاکیزہ ✧...... آپ نے اپنا طالب علمی کا زمانہ کیسا گزارا۔ کیا غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی آگے، آگے تھیں؟

افسر سلطانہ۔ تمام عمر میری والدہ شدید بیمار رہیں تو طالب علمی کا زمانہ نہایت کٹھن گزرا...... خانساماں کے پاس چھٹی کرنے کے ایک سے ایک بہانے تھے۔ کم از کم ناشتا تو ہمیشہ سے ہی میری ذمے داری ہوتا۔ چولھے کے پاس نوٹس رکھ کر پڑھے...... چلتے پھرتے یاد کیا پر وہ کہتے ہیں ناں کہ شوق ہر مشکل پر غالب آجاتا ہے تو غیر نصابی سرگرمیوں میں خوب، خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا...... مباحثوں میں شرکت کی۔ جہاں، جہاں پڑھا جی بھر کر کمپیئرنگ کی...... ملازمت کے دوران بھی کمپیئرنگ میری ہی ذمے داری رہی۔ اب دو سال سے جان بخشی ہے۔ (اچھا، آئندہ اپنی تقریبات میں ہم آپ کو یہ زحمت ضرور دیں گے......)

پاکیزہ ✧...... آج کی لڑکیاں، بچیاں پہلے سے زیادہ سمجھدار اور باصلاحیت ہیں یا نہیں؟

افسر سلطانہ ❖...... آج کل کی لڑکیاں باصلاحیت ہونے کے علاوہ سمجھدار بھی ہیں۔ تربیت کی کمی بعض اوقات اقدار سے پرے ہٹا دیتی ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ عقل سے پیدل ہو جائیں۔

پاکیزہ ✧...... کیا حصولِ علم کے مدارج طے کرنے کے ساتھ، ساتھ لڑکیاں گھریلو امور میں بھی ماہر ہو سکتی ہیں؟

افسر سلطانہ ❖...... حصولِ علم کے ساتھ لڑکیاں گھریلو کاموں میں ماہر ہو سکتی ہیں اور ہو بھی رہی ہیں۔ میں اپنی طالبات کی مثال دے سکتی ہوں...... پڑھتی ہیں اور وہ بھی انجینئرنگ کی تعلیم کہ وہ آسان نہیں ہوتی پھر بھی وہ کھانا پکاتی ہیں...... پینٹنگ بھی کرتی ہیں، سچ بتاؤں جاہل پھوہڑ نہیں دیکھی کبھی...... (زبردست)

پاکیزہ ✧...... لڑکیوں کے لیے گھریلو امور میں طاق ہونا کس حد تک ضروری ہے کیونکہ آج کل تو لڑکیاں کیریئر بنانے کی زیادہ فکر کرتی ہیں؟

افسر سلطانہ ❖...... طاق ہونے کا ارمان تو خواتین میں خال، خال نظر آتا ہے...... چاہیں وہ کیریئر بنانے والی ہوں یا گھر میں رہنے والی...... لیکن گھر سے مکمل غافل کوئی بھی لڑکی رہ نہیں سکتی...... سب کو پتا ہے چولھا بھی کسی موقع پر جھونکنا ہے...... امائیں بھی تو پیچھے لگی رہتی ہیں۔ (اور یہ بھی تو بتایا جاتا ہے کہ شوہر کے دل میں جانے کا راستہ ذائقے کا سفر ہے)

پاکیزہ ✧...... آپ کے خیال میں ایک لڑکی کی شادی سے پہلے کیا ترجیحات ہونی چاہئیں اور شادی کے بعد ایک عورت کی حیثیت سے بھی فرمائیے؟

افسر سلطانہ ❖...... اصولاً تو کردار، تعلیم اور خاندان ہی ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے پر مادیت کے اس دور میں سب کو گھر، بنگلا، گاڑی، باہر کی ملازمت ہو تو کیا کہنے۔ پاکستان میں ہو تو صرف اور صرف سرکاری ملازمت یا ملٹی نیشنل کمپنی کی ملازمت چاہیے...... شادی کے بعد میں، میرے بچے اور میرا شوہر...... ایک غلط سوچ جو تمام پرانے رشتے چکنا چور کر دیتی ہے...... اگر آپ باقی تمام رشتے توڑ چکیں تو آپ عورت نہیں بکی دہشت گرد

ہیں...... گھریلو دہشت گردی...... ہمارے معاشرے کی ننانوے فیصد خواتین یہ کام بخوبی انجام دے لیتی ہیں۔ (ارے، بہت خوب اصطلاح بنائی، واہ مزہ آ گیا)

پاکیزہ ✧...... لفظ زندگی کی تعریف تین جملوں میں کریں...... یعنی آپ کے نزدیک زندگی کیا ہے؟ کیسے بسر ہو اور کس لیے بسر ہو؟

افسر سلطانہ ❖...... زندگی جہدِ مسلسل ہے...... اصل زندگی وہ ہے جو دوسروں کے لیے ہو...... اپنے اور صرف اپنے لیے جینا فضولیات کی اعلیٰ قسم ہے۔

پاکیزہ ✧...... زندگی میں محبت کے جذبے کی کیا قدر و اہمیت ہے؟

افسر سلطانہ ❖...... ربِ کائنات نے تمام کے تمام رشتے محبت کی زنجیر میں جکڑ کر اتارے۔ اس جذبے کی قدر و قیمت یہ ہے کہ اگر محبت کو زندگی سے جدا کر دیا جائے تو بے حسی، بدگمانی، خودغرضی اور نفرت کو فروغ ملتا ہے اور اس انتہا تک کہ ظالم، معصوم بچوں اور اساتذہ کو شہید کرنے کے ساتھ ساتھ جلا بھی ڈالتے ہیں۔ (اللہ ایسے ظلم سے بچائے)

پاکیزہ ✧...... کس قسم کے لوگوں سے ملنے کو دل بےتاب رہتا ہے؟

افسر سلطانہ ❖...... پہلے نمبر پر وہ لوگ جو قومی ہیرو ہوں...... دوسروں کے لیے جیتے ہوں مثلاً ڈاکٹر قدیر، ڈاکٹر ادیب رضوی...... ایدھی...... وغیرہ، وغیرہ اور دوسرے نمبر پر ادبی اذہان رکھنے والے۔ (بےشک)

پاکیزہ ✧...... کس مزاج کے لوگوں کو دیکھتے ہی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے؟

افسر سلطانہ ❖...... کیا سوال پوچھ لیا...... چھچھورے، مطلبی اور جھوٹے لوگ کیا اب ملنا چھوڑ دیں گے۔ (ہاں مجبوری بھی تو ہوتی ہے)

پاکیزہ ✧...... کیا تلخ بات کا جواب اسی تلخی سے دیتی ہیں یا برداشت، تحمل کا رویہ بہتر ہوتا ہے؟

افسر سلطانہ ❖...... برداشت اور تحمل ہی رشتے قائم رکھتے ہیں، تمام عمر یہی کیا ہے۔ (آج کی نوجوان نسل کو بھی اس کی شدید ضرورت ہے)

پاکیزہ ✧...... رائٹرز میں آپ اپنے ہم عصروں میں سے یا آج کل کی بھی مصنفات میں سے کن، کن سے متاثر ہیں؟

افسر سلطانہ ❖...... سینئر، میری ہم عصر اور جونیئرز میں بہت سے پسندیدہ نام ہیں ایک دو نام لینے سے ناراضی کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ (ہوں...... محتاط انداز)

پاکیزہ ✧...... اچھا مرد رائٹرز اور خواتین رائٹرز کی تحریروں میں کوئی فرق ہوتا ہے اگر ہاں تو کیا؟

افسر سلطانہ ❖...... مرد رائٹرز کا قلم ہمیشہ سے بےباک رہا ہے...... وہ خوب صورت رنگ برنگے لباس اور جیولری سے بھی عام طور پر پرہیز کرتے ہیں۔ خواتین اس میں ہاتھ ہلکا ہی رکھتی ہیں...... پر بناوٹ دسنگار میں خواتین ہی قلابے ملاتی دیکھی گئی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... ٹی وی بینی کا کس حد تک شوق ہے؟ اور کیا دیکھتی ہیں؟

افسر سلطانہ ❖...... بچپن سے لے کر آج تک الحمدللہ بے حد معروف زندگی گزار رہی ہوں...... لہٰذا شوق تو ادھر اُدھر ہی ہو گیا...... چلتے پھرتے نظر پڑ جائے تو اور بات ہے عام طور پر کھانا کھاتے وقت ٹی وی کھولتی ہوں...... زیادہ تر خبرنامہ یا پھر کوئی ڈراما۔ (صرف اس وقت تک جب تک کھانا کھا رہی ہوں)

پاکیزہ ✧...... ٹی وی ڈرامے لکھنے کا خیال کبھی آیا؟

افسر سلطانہ ❖...... ایک آدھ بار ہی خیال آیا ہوگا...... خیالات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے نہ پاسپورٹ کی پابندی نہ ویزے کا حصول۔ (ہاں یہ تو ہے)

پاکیزہ ✧...... شاعری سے کس حد تک شغف ہے؟ کبھی نثر نگاری کرتے ہوئے شاعری کی طرف دھیان نہیں گیا؟

افسر سلطانہ ❖...... اب تو شاعری پڑھنے کی حد تک...... انٹر میں اچھی خاصی غزلیں لکھیں۔ ایک مرتبہ کالج کے مشاعرے میں حصہ لے کر داد بھی پائی...... پھر

ایک دن اچانک اپنی شاعری اچھی نہیں لگی...... تمام غزلیں پھاڑ دیں...... اب ایک شعر بھی نہیں بن پاتا ' نعمتوں کی قدر نہ کرو تو نعمتیں چھن جاتی ہیں '۔ (اوہو...... آپ نے ایک شاعرہ کو رُلا دیا)

پاکیزہ ✧...... کوئی پسندیدہ شاعر، شعر اور ہاں گیت بھی بتائیں؟

افسر سلطانہ ❖...... پسندیدہ شاعر علامہ اقبال اور ان کا ہی ایک شعر بہت پسند ہے۔

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تیری ہمت کی کوتاہی تیری قسمت کی پستی ہے

پاکیزہ ✧...... انگریزی، انڈین، پاکستانی کون سی فلمیں دیکھتی ہیں؟ کوئی پسندیدہ اداکار، اداکارہ؟

افسر سلطانہ ❖...... حقیقتاً فلمیں دیکھنے کا شوق نہیں ہے۔ کبھی فیملی ممبرز کے ساتھ دیکھی بھی تو نام پر دھیان نہیں دیا، کبھی شکل پر غور نہیں کیا...... شکر گزار ہوں ان محترمہ کی جنہوں نے مجھ سے اعتماد ہو کر بتایا کہ سب کی رائے میں اُن کی شکل مادھوری ڈکشٹ سے ملتی ہے...... تذکرہ نکلا تو یونہی کہہ دیا مادھوری ڈکشٹ کی فلم آئے تو بتا دینا...... دو تین دن بعد ہی شور مچا فلاں چینل پر تری دیو فلم آرہی ہے...... مادھوری بھی ہے دیکھ لیں...... چینل سرچ کیا...... بے خبری پر رونا آنا چاہیے تھا...... یہ فلم سالوں پہلے قسطوں میں گھر میں دیکھی تھی وی سی آر پر...... چند سین ہی گزر رہے تھے کہ مہمانوں کی آمد نے مجھ کو دوڑا دیا تھا لیکن اہم بات یہ بتانا تھی کہ اگر مادھوری ان خاتون سے مل لیتی تو پھوٹ، پھوٹ کر رو دیتی...... فلمیں میں دیکھتی نہیں لہٰذا اگلے سوال کا جواب دے دیتی ہوں۔ (کیا کرتی ہیں افسر...... اچھا خاصا ہنسا دیا...... اللہ آپ کو خوش رکھے)

پاکیزہ ✧...... اپنی پسند و ناپسند کے حوالے سے بھی کچھ ضرور بتائیں کہ پسندیدہ رنگ، موسم، خوشبو، ذائقہ، ڈش، تفریحی مقام، کوئی جملہ جو آج بھی یاد ہو؟

افسر سلطانہ ❖...... پسندیدہ رنگ سفید، گلابی اور زعفرانی...... موسم، موسمِ بہار پسند ہے۔ موسم بہار کی صبح کی ہوا کا مزہ ہی کچھ اور ہے...... پھولوں سے مجھے عشق کی حد تک پیار ہے...... بہار پسند کرنے کا دوسرا سبب یہ بھی ہے...... خوشبو موتیا کی، خوشبو گلاب کی بھی اچھی لگتی ہے۔ میٹھا، کھٹا اور نمکین تینوں ہی ذائقے پسند ہیں۔ پلاؤ شوق سے کھاتی اور اچھا پکاتی ہوں پر بچے بریانی پسند کرتے ہیں۔ تفریح ساحلِ سمندر کی پسند تو ہے لیکن سارا وقت بچوں کو پانی سے دور رہنے کی تلقین کرتے، کرتے حلق سوکھ جاتا ہے اور وہ یقیناً چڑتے بھی ہوں گے کہ جب لاتی ہیں تو چیختی کیوں ہیں۔ (ارے ہم بھی پہلے اپنے بڑوں سے یہی کہتے تھے، اب خود چیختے رہتے ہیں)

پاکیزہ ✧...... کوئی ناقابلِ فراموش مگر خوشگوار واقعہ کہ جس کو سوچ کر آج بھی مسکرا اٹھتی ہوں؟

افسر سلطانہ ❖...... کوئی خاص واقعہ یاد نہیں آ رہا...... البتہ دو بھائیوں اور امی کی جلد، جلد اور اچانک دائمی جدائی نے زندگی میں بے تحاشا افراتفری پھیلا دی تھی۔ مثلاً صبح خود بھی پڑھنے جانا ہے، ناشتے کے ساتھ ٹفن بھی تیار کرنا ہے تو ٹوتھ پیسٹ کے بجائے ابو کی شیونگ کریم کو برش کی مدد سے منہ میں رکھ لیا۔ محلے میں کسی خاتون کو بیماری کے سبب آکسیجن سلنڈر کی ضرورت پڑ گئی اور ہم نے وین میں سوار ہوتے ہوتے یہ دیکھنے کے بجائے کہ اپنے اسکن کلر کے دو مختلف ڈیزائن کے موزوں پر نظر ڈال لیں گیٹ پر کھڑی آنٹی ' بچوں کو خدا حافظ کہنے کے لیے عام طور پر مائیں موجود ہوتی ہیں ' کو بتایا کہ فلاں کو سوئی گیس لگ گئی ہے شام کو دیکھنے جانا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے یہ یاد رکھا چولہا چیک کر کے استری کا پلگ بھی دیکھنا ہے۔ دروازے چیک کرنا ہیں۔ کچرے کا ڈبا باہر رکھنا ہے ' ماسی کے لیے کپڑے نکالنا ہیں، اب یہ سب کام تو خوش اسلوبی سے انجام دے لیے اور اسائنمنٹ گھر پر ہی رہ گیا...... اب سوچو اس ڈانٹ کا جو اس دن کھائی...... اب تم مسکراؤ نہ مسکراؤ...... ہم تو مسکرا ہی دیتے ہیں۔ (ارے آدھے پیرے میں آپ نے پوری

داستانِ حیات سنادی، ہے ناں بڑی رائٹر!)

پاکیزہ ✧...... آخر میں پاکیزہ قارئین کو اپنے گرانقدر خیالات اور دعاؤں سے بھی نوازیے۔

افسر سلطانہ ❖...... قارئین، رائٹرز کے لیے یقیناً گرانقدر سرمایہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے بے لاگ تبصرے ہماری تحریر کے معیاری اور غیر معیاری ہونے کا احساس دلاتے ہیں...... تعریف کے ساتھ تنقید بری چیز نہیں لیکن بس دل م دکھانے والی نہ ہو...... دعائیں تو بہت سی ہیں، ڈھیر سی ہیں...... میں اپنے لیے بھی اور سب کے لیے ایمان والی صحت مند زندگی، خوش حالی اور اچھی تقدیر کی دعائیں کرتی ہوں اور بہت شدت سے کرتی ہوں اور یہ سب دعائیں آپ سب کے لیے، اپنی رائٹرز بہنوں کے لیے، قاری بہنوں کے لیے بھی ہیں جہاں بھی رہیں خوش رہیں...... نیکیاں پھیلائیں، بدگمانی سے دور رہیں...... رشتے قائم رکھیں اور رکھنے میں مدد دیں۔ (الٰہی آمین، اللہ آپ جیسے بہی خواہوں کو اچھی صحت کے ساتھ سلامت رکھے)

پاکیزہ ✧...... آج کی نئی افسانہ نگاروں سے کوئی بات کہنا چاہیں کوئی نکتہ، کوئی تجویز جو اُن کی مزید رہنمائی کرسکے؟

افسر سلطانہ ❖...... ہماری نئی افسانہ نگار اچھا اور بہت اچھا لکھ رہی ہیں، ایک چھوٹا سا مشورہ ہے کہ قلم کی حرمت ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ اصلاحی پہلو نظر انداز نہ ہو...... طوالت سے گریز کریں...... کوشش کریں انگریزی جملوں کی بھرمار نہ ہو اور اگر دل چاہتا ہے تو صحیح تو کریں؟ مرکزی خیالات اپنے معاشرے میں پھیلے مسائل سے چن لیں...... غور کریں بہت کچھ مل جائے گا...... (نئی لکھاری بہنیں ان چند سطروں کو بار، بار پڑھیں)

پاکیزہ ✧...... آج کی اس نشست کے بارے میں بھی ضرور تبصرہ کیجیے؟

افسر سلطانہ ❖...... بہت ہی اچھی نشست رہی...... میرا خیال تھا کہ آپ مجھ سے پہلے مزید اور رائٹرز کا انٹرویو لے لیتیں...... بہر حال عزت افزائی کا شکریہ...... بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ بہت اچھا لگا...... بڑے جم کے سوال کیے...... اور تواتر سے کیے...... نزہت سچ بات تو یہ ہے کہ اگر تمہاری پیار بھری مسکراہٹ ساتھ نہ ہوتی تو مجھے اور میری زبان کو لڑکھڑا جانا تھا۔ (یقین کریں افسر مجھے بھی بے حد لطف آیا آپ کا بہت شکریہ!)

پاکیزہ ✧...... کیا اس گفتگو کے بعد کچھ تحریک پیدا ہوئی کہ پاکیزہ کے لیے اپنی کوئی تازہ ترین تحریر دیں...... ویسے ہمیں تو انتظار رہے گا۔

افسر سلطانہ ❖...... ہاں بالکل انشاء اللہ جلد ہی کوئی افسانہ ارسال کروں گی۔ بہت ہی طویل عرصہ ہوگیا...... انٹرویو دیکھ کر شاید میں سب کو یاد آجاؤں...... ورنہ جہاں تک میرا خیال ہے میں شاید ہی کسی حافظے میں موجود ہوں...... حد ہوگئی...... خط بھیج دیتی ہوں تو دو صفحہ کا افسانہ کیوں نہیں بھیج سکتی۔ (جی ضرور لکھیں)

☆☆☆

آخر میں ایک دفعہ پھر ہم اپنی معزز قلم کار افسر سلطانہ کا بے حد شکریہ ادا کرتے ہیں کہ کتنے مصروف روزنامچے سے انہوں نے وقت نکالا ہے۔ یقین کریں ہمیں اس گفتگو سے اتنا مزہ آیا، اتنا اچھا لگا اور اتنا کچھ قابلِ غور ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اللہ افسر سلطانہ کی قلمی و فکری صلاحیتوں کو قائم و دائم رکھے اور ان کی تحریریں ہمارے صفحات کی زینت بنتی رہیں۔

قارئین یقیناً آپ بھی بے حد لطف اندوز ہوئے ہوں گے بلکہ بہت کچھ سیکھا بھی ہوگا...... وہی چھوٹی سی پیاری دعا کے ساتھ اجازت کہ خوش رہیے، خوشیاں بانٹیے اور دوسروں کو خوش رکھنے میں معاون بنیے۔ اللہ ہم سب کا معاون و مددگار ہو۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

باتیں بہار و خزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

عزیز بہنو! ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضر خدمت ہے تاکہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھوتا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضر خدمت ہیں۔

☆ نور آمنہ درانی...... لاہور

1۔ اللہ نے انسان اور جن اپنی عبادت کے لیے پیدا کیے ہیں اور اس کائنات میں کچھ بھی بے فائدہ، فضول نہیں پیدا کیا۔ عورت کا درجہ ماں ہونے پر بہت بلند ہے اور وہ اپنی نسل کو جیسا چاہے بنا سکتی ہے، اپنی نیک تربیت اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے اور ہر ایک یہ یاد رکھے کہ ایک دن ہر ایک عمل، ہر لفظ کا حساب دینا ہے۔ ایک عورت اپنی شخصیت کو بہت پُرکشش بنا سکتی ہے۔ وہ قدرتی طور پر بھی نرم و نازک و لطیف ہے۔ شکل صورت اللہ کی دی ہوئی ہوتی ہے مگر کردار، اخلاق ذاتی کوشش سے بہتر ہو سکتا ہے۔ اندر کا سکون چہرے پر جھلکتا ہے اگر دل سے حسد، کینہ، بغض، غصہ و نفرت نکال لیں، جو کچھ اپنے اختیار میں ہے اچھا کریں اور سب کچھ اللہ اور رسولؐ پر چھوڑ دیں لوگوں سے توقع، امید نہ رکھیں۔ چرب زبانی، طنزیہ گفتگو اور جاہلانہ حاضر جوابی، بلند آہنگ لہجہ اور دوسروں کی کمزوریوں کا مذاق اڑانا...... یہ کبھی کسی کے لیے بھی پسندیدہ نہیں ہو سکتا، دوسروں کی بات توجہ سے سنیں اچھی بات کی تعریف کریں مگر خوشامدانہ نہیں، صفائی نصف ایمان ہے خود بھی پاک صاف اور گھر بھی بلکہ جہاں بھی آپ ہوں خیال رکھیں۔ مختصر بات کریں، زبانیں صرف رس، شہد نہیں انڈیلتیں زہر بھی انڈیلتی ہیں۔ احتیاط سے زبان چلانے میں بڑی عافیت ہے آخری آسان بات کہ اتباع کیجیے، پیروی کیجیے.... اُمہات المومنین اپنی اصل ماؤں کی اور خاتون جنت بی بی فاطمہ زہرہؓ کی۔ کیونکہ ان کی مکمل زندگی اللہ تعالیٰ و قرآن کے مطابق ہے۔

2 دلچسپ واقعہ...... میری شادی ہے کہ میرے فکر و خیال، میری مکمل زندگی بدل گئی۔ میں سائیکالوجسٹ ہوں اور ایک ایسے ادارے میں کام کرتی ہوں جہاں چھ سو سے زیادہ اسپیشل بچے ہیں۔ بڑے بھی ہیں مگر وہ بھی ذہنی طور پر بچے ہیں۔ یہ سب وہ ہیں جو جنت میں جائیں گے جن کا کچھ بھی حساب کتاب نہیں ہوگا کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ کچھ بول نہیں سکتے، کچھ سن نہیں سکتے، معذور ہیں، پیدائشی ایسے ہی ہیں...... یہ ان کے والدین کی آزمائش ہے۔ ان سے نفرت، کراہت نہیں بلکہ ان کو پوری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ خود اپنا ذرا بھی خیال نہیں رکھ سکتے کچھ عام کھانے کی کوئی چیز نہیں کھا سکتے۔ چھوٹے بچوں کی طرح لیکویڈ دودھ، بسکٹ نرم خوراک، بھوک پیاس لگے تو بھی نہیں بتا سکتے۔ یہ اتنے معصوم و مظلوم ہیں کہ کسی بات، سلوک کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ میں ان کی زندگی میں کچھ آسانیاں لانے کی خدمت و جدوجہد کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے جو کچھ ہمارے دلوں میں ہے۔ میں یہ تھوڑے سے پیسوں کے لیے نہیں بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے کرتی ہوں (سبحان اللہ) جب میں اپلائیڈ سائیکالوجی ایم ایس سی میں پڑھ رہی تھی تو ایک دن یہاں آئی تھی اور پھر کتنے دن روتی رہی تھی حتیٰ کہ

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُر اثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے......

2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں...... کوئی دل کی بات؟

5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

بیمار ہوگئی۔ میری ماں نے مجھے سمجھایا کہ شکر ہے کہ ہم ایسے نہیں اور ہم شکر گزار بنیں...... اللہ نے کتنی نعمتوں سے نوازا ہے اگر بہت آسائشیں نہیں ہیں تو یہ جو آنکھیں، ہاتھ، پاؤں، ذہن، سوچ آگہی یہ کتنی بڑی نعمت ہیں جو کچھ اپنے پاس ہے اسے بہت سمجھیں دوسروں پر نظر نہ رکھیں بلکہ اپنے سے کم کو دیکھیں۔ آپ بھی اگر ان بچوں کو دیکھیں تو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر کریں۔

3۔ سب سے زیادہ جلترنگ، مجھے کچھ کہنا ہے...... بہت بہت زیادہ پسند ہیں۔ پھر دین کی باتیں، بہنوں کی محفل، روحانی مشورے، ہومیوکلینک، پاکیزہ ڈائری، میں اکثر گنگناتی ہوں پسند ہیں۔ میں چاہتی ہوں آپ کچھ نئے سلسلے بھی شروع کریں۔ جیسے ایک شعر ایک کہانی...... آپ کوئی شعر منتخب کریں اور قارئین بہنیں اس پر کوئی چھوٹا سا افسانہ لکھیں جو آپ کو پسند آئے شائع کریں اور کچھ انعام بھی رکھیں۔ (تجویز اچھی ہے)

4۔ بہت ساری رائٹرز مجھے بہت پسند ہیں، میں کوئی بہت ذہین عقلمند نہیں ہوں۔ آپ ایسا لکھیں کہ خود مطمئن ہوں کہ آپ نے اپنی تخلیق کردہ کہانی سے دوسروں کو صراطِ مستقیم دکھائی ہے۔ ساس، نند، بھابی وغیرہ کی سازشیں یا عورت کو کچھ زیادہ ہی گھٹیا نہ دکھائیں۔ مثبت پہلو بھی ہو۔

5۔ ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

آدمی آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ آدمی کو اپنے آنے کا تو نہیں جانے کا ضرور پتا ہوتا ہے یعنی ایک نہ ایک دن تو اسے کوچ کر جانا ہے۔ تو آدمی، آدمی کیوں نہیں رہتا...... جانور کیوں بن جاتا ہے۔

☆ رابعہ عمران چوہدری...... رحیم یار خان

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں اگر ہمارا اخلاق اچھا ہوگا تو ہماری شخصیت خود بخود پُر اثر اور خوب صورت نظر آئے گی۔ منفی سوچ، تنگ مزاجی، تکبر ہماری شخصیت کو تہس نہس کر دیتا ہے اس لیے اچھا لباس، اچھی گفتگو اور اچھے خیالات ہمیں پُرکشش بناتے ہیں۔



2۔ ویسے تو زندگی میں اتنے واقعات، بہت سے خوب صورت لمحات بھی آئے مگر کوئی ایسا لمحہ جس نے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا ہو جب ایک صبح پارلر کا دروازہ زور، زور سے بجنے لگا۔ میں سوئی ہوئی تھی اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک بارہ، تیرہ سال کی ایک بچی مجھ سے روٹی کے لیے پیسوں کا تقاضا کرنے لگی۔ میں نے اسے اندر بلایا اور دس روپے دیے۔ جسامت میں قدرے بھرا بھرا جسم، گوری رنگت، بالوں کو شاید عرصے سے کنگھا نہیں کیا تھا۔ پھٹا ہوا لباس پہنے چپل کو گھسیٹتے ہوئے جب وہ باہر نکلی

تو میں نے اسے پھر آواز لگائی۔ سنو گڑیا بات سنو...... وہ واپس آ گئی۔ میں نے اسے کہا کہ تم یوں اکیلی گلیوں میں گھومتی ہو تمہارے والدین، بہن بھائی سب کہاں ہیں کیا کرتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کے امی، ابو اور بھائی کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور اب وہ سات بہنیں ہیں۔ تین کی شادی ہو گئی ہے اور چار بہنیں ہم ساتھ رہتی ہیں۔ بڑی بہن ہمارے ساتھ رہتی ہے کیونکہ شادی کے بعد اسے کافی بیماریاں چمٹ گئیں تو اس کا شوہر اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ میرا ذہن ایک دم ماؤف سا ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا اور اس اندھیرے میں مجھے اپنی تین بیٹیوں کا سایہ نظر آنے لگا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ تم یوں مانگا مت کرو...... تو وہ کہنے لگی کہ ہم کھانا کیسے کھائیں گے، بڑی بہن چل نہیں سکتی باقی دو بہنیں اس سے چھوٹی ہیں، رشتے دار خود بہت غریب ہیں، محلے والے پوچھتے نہیں میرے سر پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا کیونکہ جس جگہ وہ رہتی تھی وہاں بہت بڑے، بڑے لوگوں کے گھر تھے۔ بن ماں، باپ کے یہ بچیاں کیسے گزارہ کرتی ہوں گی۔ کیا محلے کے لوگوں کو اس کا احساس نہ تھا۔ بہر کیف میں نے اس بچی کو کہا تم مانگا مت کرو...... تم پڑھنا چاہتی ہو تو میں تم کو پڑھاؤں گی اسکول میں ایڈمیشن دلاؤں گی مگر اس کا جواب نہ میں تھا۔ میں نے کہا پھر تم محنت کر کے کمالیا کرو...... مانگو مت...... تم میرے پاس آیا کرو، میرے پارلر کا کام، گھر کا کام کر لو اس کی میں اجرت دوں گی اور پارلر کا کام، سلائی کا کام بھی سکھاؤں گی۔ وہ مان گئی اور اگلے دن مطلوبہ ٹائم پر پہنچ بھی گئی۔ پھر میں نے اس کے گھر کا ایڈریس لیا اور اسے چھوڑنے چلی گئی۔ تاکہ مجھے پتا ہو کہ یہ کہاں سے آتی ہے اور اس کے گھر کے حالات کیسے ہیں، تو میں نے کچھ راشن، آٹا اور گھر کی ضرورت کی کچھ اشیا اور ہوٹل سے کھانا پیک کروایا اور اس کے گھر چلی گئی میرے شوہر بھی میرے ساتھ تھے۔ اس کے گھر جا کر اس کی بہن کی حالت دیکھ کر تو میں کئی دن روتی رہی۔ وہ حد سے زیادہ موٹی اور پوری الرجی جیسی گندی بیماری میں مبتلا ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ خدایا رحم فرما۔ جوان ہوتی بچیاں صبح سے نکلتی شام کو واپس آتی ہیں، میں نے ان سے کہا۔

"باجی آپ پلیز ان کو باہر نہ بھیجا کریں۔" کہنے لگی کھانا کہاں سے کھائیں، روٹی ہی مانگ کے لے آتی ہیں، کسی نے ٹھنڈی دی، باسی دی جیسی بھی دے دی۔ میں حیران ہوئی ان کے ارد گرد بڑے بڑے گھر؟ یا خدا ان بڑے، بڑے گھروں میں رہنے والوں کے دل اتنے چھوٹے کیوں ہوتے ہیں۔ کھانا ضائع ہو جاتا ہے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ میرے اللہ ان کا کوئی کمانے والا بھی نہیں۔ ان کی مدد فرما۔ مجھے واپسی کا راستہ اتنا کٹھن لگا کہ متواتر میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یا اللہ ہم تو تین وقت کی روٹی کھا کر تیرا شکر ادا نہیں کرتے۔ بلکہ پھر شکوہ کرتے ہیں سب کچھ ہے مگر پھر بھی روتے ہیں، اللہ پاک یہ کیسا نظارہ دکھا دیا مجھے کہ میرا دکھ سے اور شرمندگی سے سر جھک گیا۔ اس واقعے نے میری سوچ بدل دی۔ فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔ خدارا آپ بھی اپنے ارد گرد دیکھیے۔ کہیں کسی کا بچہ بھوک سے نہ بلکتا ہو۔ اپنی سوچ اور فکر و خیال کا دائرہ اتنا وسیع کیجیے کہ قطرہ، قطرہ مل کر سمندر بنتا ہے تو جب ہم سب مل کر سوچیں گے کام کریں گے تو کوئی "حنا" گلیوں میں سڑکوں پر روٹی کی تلاش میں نہیں نکلے گی۔ اللہ پاک سب کی بچیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

3۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے بہت اچھے ہیں، روحانی مشورے، پاکیزہ کا بہت عمدہ سلسلہ ہے۔ بہنوں کی محفل کی تو کیا ہی بات ہے۔ جلترنگ تو پاکیزہ کی جان ہے۔ شاعری کے سلسلے اور خوش ذائقہ میں مزے، مزے کی ترکیبیں، زبردست لگتی ہیں...... ہومیو کلینک اور تمام سلسلے لاجواب ہیں۔

4۔ پاکیزہ مصنفات سے یہ کہنا کہ آپ تو اتنا لاجواب لکھتی ہیں حقیقت سے قریب تر اپنے لفظوں کے سحر میں ہمیں جکڑ لیتی ہیں۔ ماشاء اللہ! اللہ پاک آپ کو مزید کامیابیاں، ترقیاں اور خوشیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

5- ہم سادہ طبیعت لوگوں کو
یہ سادہ طبیعت لے ڈوبی

بیادِ رفتگاں

نزہت اصغر

دنیائے ادب کے چند اور جگمگاتے ستارے......
اس ماہ غروب ہوگئے۔ یہ وہ ستارے تھے جن کی کمی کوئی پوری نہیں کرسکتا۔ اپنی تحریروں کے حوالے سے وہ آج بھی زندہ ہیں اور کل بھی زندہ رہیں گے......!

ممتاز ادیب محی الدین نواب

''جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز'' کے ایک اہم ستون اور ممتاز ادیب محترم محی الدین نواب برضائے ربی انتقال کرگئے۔'' انتقال کی ایسی خبریں اگرچہ آئے روز ہی آتی ہیں مگر اپنے' اپنے شعبوں میں ممتاز و معروف شخصیات کے انتقال کی خبر ایک لمحے کو سناٹے میں لے جاتی ہے۔

محی الدین نواب کے انتقال کی اس خبر نے کیا کیا نہ یاد دلایا۔ سب سے بڑھ کر ان کی لکھی گئی داستان ''دیوتا'' جو 1977ء سے لے کر چند سال پیشتر تک انتہائی دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی رہی۔ بھارت کے ایک رسالے میں ان کا انٹرویو دیکھ کر لوگوں کو ان کی مقبولیت کا مزید اندازہ ہوا۔ دنیا بھر میں جہاں' جہاں اردو لکھی، پڑھی، سمجھی اور بولی جاتی ہے وہاں مطالعے کے شوقین نواب صاحب کی تحریروں کے بے حد مداح ہیں۔ جب انٹرنیٹ کا دور نہیں تھا۔ وہ اس وقت بھی مقبول و معروف لکھاری جانے گئے آج تو خیر اس وسیلے کی بدولت کافی لوگ مشہور ہو ہی گئے ہیں۔ پر نواب صاحب جیسا ناقابلِ فراموش کردار تخلیق کرنے والا مصنف اس وسیلے کا محتاج نہیں تھا۔

خود نواب صاحب کے الفاظ ہیں کہ ''میری پہلی کہانی نے ماہنامہ رومان کراچی میں انعامی مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا اور پچاس روپے ملے۔ یہ پچاس روپے آج کے لاکھوں روپوں پر بھاری ہیں۔ اس چھوٹی سی رقم نے میری ہر کہانی کو سکہ رائج الوقت بنا دیا۔ اچھا ادیب یا فنکار داد سمیٹنے نہیں جاتا بلکہ واہ واہ کی صدائیں خود ہی اس کے گھر تک آتی ہیں۔

کوئی بھی مصنف، ادیب، تحریر نگار، شاعر یا مصور جو بہترین تخلیقات کرتا ہے اس کے افکار،



خیالات اور الفاظ کتابی شکل یا تصویر کی صورت امر ہو جاتے ہیں پھر وہ جسمانی طور پر مر کر بھی مرا نہیں کرتا۔

یہاں ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ جاسوسی ڈائجسٹ کے پانچویں پرچے ماہنامہ دلکش میں بھی انہوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور معروف سیریز پی جن ٹاور لکھی جو آج بھی قابلِ ذکر ہے۔ ماہنامہ دلکش کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں نواب صاحب نے کہا۔

''میں نے تمام ہی کلاسیکی ادیبوں کی نگارشات کا مطالعہ کیا ہے میں ان سب میں کرشن چندر اور جیلانی بانو کی تحریروں سے متاثر تھا۔ ابتدا میں، میں نے ان

کے ہی اسلوبِ نگارش کو اپنایا پھر رفتہ رفتہ میرا اپنا ایک منفرد اسٹائل بنتا چلا گیا۔"

نواب صاحب نے یہاں اعتراف بھی کیا اور اپنا اسٹائل بھی بتایا۔ آج کے قلمکار کسی سے متاثر ہونے کے سوال پر بپھر جاتے ہیں کہ "ہمارا تو اپنا ہی انداز ہے۔" نواب صاحب کے مطالعے میں ہر طبقے کے ادیب اور تحریر نگار شامل تھے۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے نگرانِ اعلیٰ اور روحِ رواں جناب معراج رسول صاحب کے بارے میں نواب صاحب کا کہنا تھا کہ "ہم سب معراج صاحب کو ٹیلنٹ ہنٹر کہتے ہیں۔ انہوں نے کتنے ہی قلمی صلاحیتوں کے حامل افراد کو تلاش کیا۔ اپنی کامیابی کے سلسلے میں معراج رسول کے بارے میں کہوں گا۔

وہی ہے میرا نام میرے قلم کی معراج
یہ پیش منظر اسی پس منظر سے ابھرا ہے"

ڈائجسٹوں میں چھپنے والے ادب کے بارے میں نواب صاحب کا کہنا تھا...... "ڈائجسٹوں میں چھپنے والا ادب عوامی ہے۔ عوام کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ادبی رسالے بک اسٹالز پر پڑے پڑے گرد آلود ہوتے رہتے ہیں۔ اخبارات صبح کو تازہ اور شام کو باسی ہو جاتے ہیں۔ ایک ہمارے ڈائجسٹ ایسے ہیں جو کئی ماہ تک پڑھتے رہنے کے بعد بھی کتابوں اور رسالوں کے لنڈا بازار میں پہنچ کر تروتازہ اور قابلِ فروخت رہتے ہیں۔"

غرض یہ کہ محی الدین نواب جیسی نابغۂ روزگار شخصیت اور فن پر لکھنے کو بے حساب مواد ہے۔

نواب صاحب، جناب معراج رسول کی نظر میں

"محی الدین نواب ایک نام ہے ایک پہچان ہے۔ اچھی کہانیوں کی پہچان...... بلند پایہ تحریروں کی شناخت...... نواب کے بارے میں یہ بات بالکل ٹھیک کہی گئی ہے کہ ان کی کہانیاں آنکھوں سے نہیں دل کی گہرائیوں سے پڑھی جاتی ہیں۔ نواب کا قلم بلاشبہ معاشرے کے جسم پر ایک تیز نشتر کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنے عملِ جراحی سے انہیں کھولتا چلا جاتا ہے پھر ایک وجود پر کئی چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ نواب کو اگر معاشرے کا صحیح ترجمان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کا مشاہدہ وسیع ہے اور ان کے قلم میں بے پناہ سچائی ہے۔ معاشرے کا کوئی پہلو ان کی آنکھ سے اوجھل نہیں وہ ایک عام سی کہانی میں بھی بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔" (پروردگار عالم انہیں اعلیٰ مقام عطا فرمائے)

معروف ادیب و کالم نگار انتظار حسین

آج ایک اور درخشاں ستارہ اردو ادب و صحافت کے آکاش سے بظاہر معدوم ہو گیا مگر وہ اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت کتابی صورت میں نسل در نسل جگمگاتا رہے گا۔ ابھی گزشتہ برس ہی اردو ادب کے مداحین کو عبداللہ حسین، اشتیاق احمد اور جمیل الدین عالی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا کہ ان کی خبریں آگئیں، سچ ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

انتظار حسین جیسے مصنف، ادیب اور بہترین



انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بے شمار تراجم، مقالے، افسانے، ناول، کالمز اور "پاکستانی افسانے کے پچاس سال" جیسی نادر کتابیں...... ان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ان کے ناول اور دیگر کہانیاں ان کے عصری حالات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ انتظار حسین نے بلاشبہ قابلِ رشک کامیابیوں کو سمیٹتے ہوئے ایک

قابلِ تقلید زندگی گزاری۔

آج ان پر چند سطریں لکھنے کی ہمت اور خواہش اس وجہ سے بھی ہوئی ہے کہ ہم نے ان کو مختلف ادبی تقریبات میں کافی قریب سے دیکھا اور ان کے مقالے ان کی زبانی بھی سنے۔ خطۂ پوٹھوہار ادبی لحاظ سے کافی زرخیز ہے اور میرے والد صاحب ڈاکٹر سید سبطِ حسن رضوی مرحوم ایسی نشستوں کا اہتمام اکثر کیا کرتے تھے۔ دبستانِ انیس کے بینر تلے شعروادب کی کافی نابغۂ روزگار شخصیات کو دیکھا اور سنا۔

کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جب ہم کسی بھی نامور ہستی کو بہت ہی قریب سے دیکھتے ہیں، سنتے ہیں تو ایک فخر سا محسوس ہوتا ہے یہی کیفیت ہماری بھی ہے۔ ہر حساس لکھاری کی طرح انہیں بھی شاندار ماضی کی اقدار اور روایات بکھرنے کا دکھ تھا مگر علامتی افسانہ نگار ہونے کے ناتے وہ خوش آئند پہلوؤں کو بھی ڈھکا چھپا اور کبھی عیاں ضرور رکھتے تھے تاکہ یاسیت کی لہریں کہیں ذہنوں کو پراگندہ نہ کر دیں۔

انتظار حسین کے ادبی کارنامے سدا ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ اب ان کے ہفتہ وار کالموں کا صرف انتظار ہی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

فاطمہ ثریا بجیا

(معروف ڈراما نگار، بہترین ناول نگار، اپنی تہذیب کی دلدادہ)

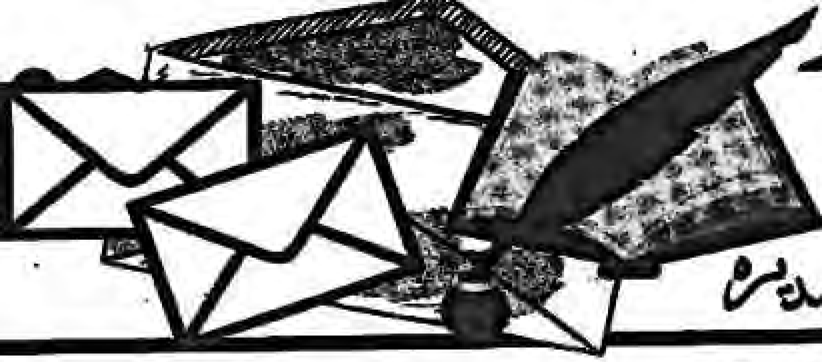
بجیا کی موت پر کچھ بھی لکھنا بہت مشکل ہے کہ ابھی تک عالمِ بے یقینی ہے۔ فاطمہ ثریا بجیا...... ایک پورا عہد ہیں...... کہانیوں کا عہد...... داستانوں کا عہد...... ڈراموں کا عہد...... سماجی کارہائے نمایاں انجام دینے کا عہد...... اگرچہ فاطمہ ثریا بجیا کا پورا گھرانا ہی فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں میں خدمات انجام دے رہا ہے مگر بجیا کی ذات تو گویا ایک مرکزِ نگاہ...... جیسے ماں خاندان کا مرکز ہوتی ہے۔ ان کے لکھے گئے



ڈرامے اور مختلف ناولوں کی ڈرامائی تشکیل بلامبالغہ ان کے فن کا اوجِ کمال ہے۔ آج بھی ان کے لکھے ڈرامے دیکھیں تو جدید اور قدیم تہذیب کا امتزاج...... خاندانی و معاشرتی مسائل و مشکلات اور ان کا حل...... بہت ہی پُراثر، پُرلطف اور قابلِ غور ہے۔ زبان و بیاں اس قدر سہل مگر موثر کہ سر دُھننے کو جی چاہے۔ بجیا اگرچہ کافی عرصے سے بسترِ علالت پر تھیں مگر اپنی سماجی ذمّے داریوں سے ہرگز غافل نہیں تھیں۔ اگر کسی کو لکھنے لکھانے کے سلسلے میں رہنمائی چاہیے تو بجیا حاضر...... کسی بھی قسم کے مسائل میں دو چار اردگرد بسنے والوں سے باخبر اور ان کے لیے چھاؤں کے مانند...... ان سے وابستہ رشتے تو ان کا دم بھرتے ہی تھے مگر جو اُن کے حلقۂ احباب میں بھی داخل ہوا تو بجیا کی شخصیت وفن کے سحر سے نکل نہیں سکا۔

بلاشبہ ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور صدیوں یاد رہتے ہیں۔ بجیا کی ان خدمات کے سلسلے میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے انہیں تمغۂ حسنِ کارکردگی اور لائف ٹائم اچیومنٹ کے ایوارڈز بھی ملے۔

فاطمہ ثریا بجیا ہمیشہ سب کے دلوں پر راج کرتی رہیں گی، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، (الٰہی آمین)۔



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ......!

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا...... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو...... یاالٰہی دونوں جہاں میں ہم سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے...... آمین ثم آمین۔

پیاری بہنو! الحمدللہ میں خیر و عافیت کے ساتھ آسٹریلیا سے آچکی ہوں۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل بہت اچھا وقت گزرا...... خوب گھومی پھری، بہت سارے لوگوں سے ملی اور ڈیڑھ ماہ ہوا کی طرح گزر گیا...... میرے بیٹے عمیر اور میرے بھائی سلیم نے زیادہ سے زیادہ مقامات مجھے دکھائے...... بے شک آسٹریلیا ایک خوب صورت ترین ملک ہے مگر اس کی خوب صورتی کی حفاظت کرنے والے وہاں کے حکمران اور ان کی قابلِ فخر انتظامیہ ہے...... جہاں قانون سب کے لیے برابر ہے کہ قانون توڑنے پر اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کو بھی جرمانے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ جہاں محنت کی عظمت ہے کہ میں نے وہاں کئی وکیل لڑکیوں کی سیکورٹی گارڈز کے ساتھ شادیاں ہوتے دیکھی ہیں اور ایسے پرانے جوڑوں کو خوش و خرم زندگی گزارتے بھی دیکھا ہے...... (ہمارے ہاں کسی ڈاکٹر لڑکی کی کسی سیکورٹی گارڈ کے ساتھ شادی ہوتے دیکھی ہے؟ وہ سیکورٹی گارڈز سے شادی کرنے کا سوچ سکتی ہے......؟ نہیں ناں......) ایک ایسا ملک جہاں معذوروں کا ہر گام پر خیال کیا جاتا ہے...... جن کی وجہ سے بس کی سیڑھی خودکار نظام کے تحت زمین سے لگ جاتی ہے۔ وہاں کوئی یہ سوچ نہیں سکتا کہ نابیناؤں پر لاٹھی چارج کیا جائے...... استغفراللہ...... جہاں ووٹ دینا لازمی ہے...... اور اگر آپ کو امیدوار پسند نہیں ہیں تو جو کم ناپسند ہیں تو ان کو ووٹ دینا لازمی ہے۔ جہاں کوئی غریب یا گداگر نظر نہیں آتا...... اور وہاں کی انتظامیہ ہمہ وقت اپنے ملک کے شہریوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہے تو وہاں اطمینان اور سکون کا تو راج ہوگا۔ مسلمانوں کے اوصاف جب دوسرے لوگ اپنالیں تو وہ یقیناً زندگی میں آگے بڑھیں گے...... وہاں کی باتیں پھر بھی تفصیل سے ہوں گی مگر میں ان لوگوں کا ضرور...... ذکر کروں گی جو پاکیزہ اور ہم سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ سعدیہ سلیم، رابعہ، ناظمہ رحمان، مسز اسد...... مسز شجاع، مسز عمیر نور خان، مسز قاسم، نویدہ تبسم، فاطمہ باجی، مس مالی (سری لنکن) نفیسہ، مسز لودھی، مسز سجاد، نوما جاوید، میری بہو ثمینہ اور چھوٹی بھاوج اور میری سمدھن نے جتنا میرا خیال رکھا...... اس کے لیے لفظ شکریہ ان کی محبتوں کا ترجمان نہیں ہو سکتا...... وہاں پر بنی ہماری ایک سری لنکن دوست مالی کے ساتھ بھی بہت اچھا وقت گزرا...... جو وہاں ایک چیریٹی کے ادارے میں کام کرتی ہیں اور بہت عزت دینے والی خاتون ہیں۔

☆ اور اب آیئے پہلے ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے...... ابھی پڑھ لیں...... اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں اور اب ایک نظر نئی اور تر و تازہ سرگرمیوں پر بھی ڈال لیجیے......

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

✖ گزشتہ دنوں مصنفہ عظمیٰ آفاق سعید کی کتاب ذرا سا گھوم لوں میں کی تعارفی تقریب ان کی رہائش گاہ واقع ڈیفنس کراچی میں منعقد ہوئی۔ جس کی مہمان خصوصی محترمہ عذرا رسول تھیں۔ تقریب کا آغاز حمد باری تعالیٰ اور درود پاک کے ساتھ ہوا۔ اس تقریب میں ہماری ان مصنفات اور تبصرہ نگار بہنوں نے شرکت کی۔ جن کے نام یہ ہیں۔ رفعت سراج، عطیہ عمر، اختر شجاعت، رضوانہ پرنس، شگفتہ شفیق، نزہت اصغر، عقیلہ حق، سیما رضا، تسنیم ماپارہ، ڈاکٹر ممتاز ضیا، یاسمین رشید، کرن شاہد، صدف جاوید، امبر مسرت، بسمہ آصف اور دیگر...... اس تقریب کی کوریج ریڈیو پاکستان کراچی کے لائیو پروگرام میں ہوئی اور محترمہ عذرا رسول اور تمام مصنفات نے کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات ریکارڈ کروائے۔ (ماشاءاللہ)

✖ کشمیر ڈے کے موقع پر فریئر ہال کراچی میں محمد ریحان خان کی تصویروں کی نمائش ہوئی جس میں آزاد کشمیر کے خوب

صورت مناظر پر مبنی ان کی 124 تصاویر رکھی گئی تھیں۔ یہ ریحان خان کی تصاویر کی پانچویں نمائش تھی جو کئی روز جاری رہی۔ ہماری ملاقات ریحان صاحب کی اہلیہ سیما خان سے ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ پاکیزہ کی فین ہیں۔ (ماشاء اللہ)

* پاکیزہ کی مصنفہ نوشین ساجد، سرگودھا ان دنوں عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب گئی ہوئی ہیں۔ (مبارک باد)
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار نورافشاں شیخ، شکارپور کے بھائی تاج محمد شیخ عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب روانہ ہوگئے ہیں۔ (مبارک باد)
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار رفیعہ ابدالی، کراچی عمرے کی سعادت حاصل کرکے واپس آگئی ہیں۔ (مبارک باد)
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسز نزہت اشفاق، کراچی کے پوتے کی عقیقے کی تقریب مقامی ہال میں ہوئی۔ جس میں ہم نے بھی شرکت کی۔ (مبارک باد)
* پاکیزہ کی مستقل قاری فرحین ناز، سندھ کا نکاح اپنے کزن امجد علی کے ساتھ سادگی سے ہوگیا ہے۔ (مبارک باد)
* مصنفہ سلمیٰ غزل کی ڈاکٹر بیٹی نے FCPS کا امتحان پاس کرلیا اور وہ اب لیاقت نیشنل اسپتال میں شعبۂ ریڈیالوجی میں ریزیڈنسی کررہی ہے (بے حد مبارک باد)
* گزشتہ دنوں عذرا رسول صاحبہ کی دوست اور پاکیزہ کی مستقل قاری و تبصرہ نگار شائستہ اعجاز کی پیاری بیٹی جویریہ اعجاز کی شادی بخیر وخوبی انجام پائی۔ (مبارک باد)
* گزشتہ ماہ مصنفہ سکینہ فرح کی پیاری بیٹی کی شادی ہوئی۔ (بے حد مبارک باد...... اگر میں کراچی میں ہوتی تو ضرور شرکت کرتی)
* اس ماہ فوقیہ عمران، ملتان کی سالگرہ ہے۔ (مبارک باد)
* پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا کی ذہین و فطین بیٹی حورعین تعلیمی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کررہی ہے۔ (ماشاء اللہ)
* مصنفہ ہما بیگ، کراچی نے اپنی خرابیٔ صحت کی بنا پر اپنا ریسٹورنٹ بند کردیا ہے۔ جس کی وہ اپنے شوہر کے ساتھ مکمل نگرانی کیا کرتی تھیں (اللہ آپ کو کلی صحت عطا فرمائے۔ آمین)
* پچھلے دنوں مصنفہ عطیہ عمر نے اپنی صحت یابی کی خوشی میں پاکیزہ مصنفات کو سروسز کلب میں ہائی ٹی پر مدعو کیا جس میں محترمہ عذرا رسول آپ کی باجی انجم انصار، عظمیٰ آفاق، رفعت سراج، نزہت اصغر، آمنہ حماد، یاسمین رشید، تسنیم ماپارہ نے شرکت کی۔ (عطیہ اللہ آپ کو صحت سے رکھے)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

* مصنفہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی کی طبیعت ناساز ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ذکیہ ایوب، کراچی ان دنوں علیل ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں ظفر، کراچی ہنوز بیمار ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی کے پیروں کی تکلیف بہت زیادہ بڑھ گئی ہوگئی ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا خالد، کراچی کے پاؤں میں ہلکا سا فریکچر ہوگیا ہے۔
* ہم سب کی لاڈلی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی کو ابھی آپ کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ کے شوہر شدید بیمار ہیں۔
* پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار، ثمینہ وحید، پنجاب بستر علالت پر ہیں۔

انتقالِ پُرملال

* معروف ادیب محی الدین نواب انتقال کرگئے۔
* معروف کالم نگار و ادیب انتظار حسین چل بسے۔

* مایہ ناز ڈراما نگار فاطمہ ثریا بجیا انتقال کر گئیں۔
* پاکیزہ کی مستقل قاری سبین فیصل کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔
* پاکیزہ کی مصنفہ سلمٰی غزل کے بڑے بھائی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔

تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

☆☆☆

ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”ذکیہ آپا کو اللہ صحت والی زندگی عطا کرے ان کی تحریر پڑھ کر بے حد لطف آرہا ہے۔ اس مرتبہ افسانے مختصر مگر پُراثر رہے...... اُمِ ایمان کا نفیس تو بہت ہی کم ظرف نکلا اتنے بڑے گھر میں دروازے کھلے رکھ کر اپنی نفاست پسندی کا ثبوت دے رہا تھا۔ شیریں حیدر کے انکشاف نے تو بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ فرحین عثمان کی اک نئی روشنی اور صائمہ قریشی کی کہانی میں نئی شادی شدہ لڑکیوں کے لیے اچھی نصیحت تھی ۔ ہماری نئی مصنفات اپنی کہانیوں کے ساتھ اچھی گائڈ لائنز تو بہت دے رہی ہیں مگر لڑکیوں کے پاس پڑھنے کا وقت ہے ہی نہیں۔ ناہید سلطانہ کا مکافات بہت اچھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جو بویا وہی کاٹا...... نایاب جیلانی کے ناول کی دوسری قسط بھی اچھی تھی۔ رفاقت جاوید کے انٹرویو کا دوسرا حصہ بھی اچھا لگا اور سچی کہانی بھی...... اور تمہارے ناول گم شدہ محبت کی پہلی قسط بہت دلچسپ لگی کیونکہ اس میں ٹی وی اور اخبارات کے اندر کی کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی...... جلترنگ میں سرخرو اور محتاط دونوں ہی دلچسپ تھے اور جب میں کہتی ہوں اپنے گھر میں کہ یہ بہت مزے کی ہے تو میری پوتی کہتی ہے کہ آپ نے جلترنگ پڑھا تھا یا کھایا تھا۔“ (آج کے بچوں کے سوالات ایسے ہی ہوا کرتے ہیں)

سائرہ رضا، کراچی سے۔ ”میرے لیے یہ بات نہایت فخر کا باعث ہے کہ میری پہلی کتاب اب کر میری رفو گری...... جس میں میرے دو ناول شامل ہیں۔ القریش پبلی کیشنز نے شائع کی ہے اور اس کا بہت اچھا رسپانس ملا ہے۔ میرے لیے یہ بات اس لیے قابلِ فخر و مسرت ہے کہ میں نے اس کی چند کاپیاں اپنے کالج گورنمنٹ سرسید ڈگری کالج ناظم آباد کی لائبریری کو بطور تحفہ دی ہیں۔ وہ قابلِ قدر مادرِ علمی کہ جس سے میں نے تو پڑھا ہی مگر اسی درس گاہ سے پروین شاکر، ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، قمر جہاں خلیل، رضوانہ پرنس و دیگر کے علاوہ محترمہ عذرا رسول جیسی ہستیوں نے بھی تعلیمی مدارج طے کیے ہیں۔ آج میں اپنے آپ کو بہت قابلِ عزت پاتی ہوں کہ میرا تعلق اس درسگاہ سے ہے وہ جہاں سے میں نے کچھ سیکھا اسی کی بدولت آج میں اس قابل ہوئی۔ میں چاہتی ہوں کہ آج کی نوجوان لڑکیاں اسے ضرور پڑھیں بلکہ تمام مصنفات کی تحریریں پڑھا کریں کہ سب میں کوئی نہ کوئی سبق ضرور ہوتا ہے۔ یہ چند سطریں میں اپنے پاکیزہ کے توسط سے سب تک پہنچانا چاہتی ہوں، شکریہ۔“ (پیاری سائرہ، تم ماشاء اللہ اتنا اچھا لکھتی ہو کہ ہم سب تمہارے فین ہیں، تمہاری کتب یقیناً پڑھی جائیں گی)

نور افشاں شیخ، شکار پور سے۔ ”آپ کا بے حد شکریہ کہ شکار پور کے بارے میں میری تحریر شائع کی اور میں نے اپنے سب احباب کو دکھائی اور وہ سب بے حد خوش بھی ہوئے...... انجم باجی آپ کے ناول گم شدہ محبت کا انتظار کئی ماہ سے کر رہی تھی...... اور اس کی پہلی قسط پڑھ کر ہی مزہ آگیا...... صبا اچھی لڑکی ہے اور میں تو پورے ماہ اسی کے بارے میں سوچتی رہی...... کہ اب اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے...... میں آئندہ ماہ آپ کو بھرپور تبصرہ لکھ کر بھیجوں گی مگر میری اردو زیادہ اچھی نہیں ہے۔“ (گڑیا تم ٹوٹی پھوٹی اردو میں بھی تبصرہ لکھ کر بھیجو...گی تو وہ شائع ہوگا...... کہ ہم جانتے ہیں کہ تم سندھی زبان کی رائٹر ہو...... مگر ہمارے لیے یہ بے حد خوشی کی بات ہے کہ تم اردو میں بھی لکھتی ہو)

ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ ”تم نے خوب کہا غصہ پر قابو اور اپنی ذات پر یقین و عزم سے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اعتبارِ وفا میں کردار اتنے زیادہ ہیں کہ کہانی پر اچھا اثر نہیں ڈال رہے ہر وقت ذرا ذرا سے ماضی میں جانا بدمزہ کر دیتا ہے، کھل کر کردار سامنے آئیں تو کہانی یقیناً بہت اچھی لگے گی۔ قیصرہ حیات نے بہت اچھا لکھا مگر اس کا اختتام اچھا نہیں لگا آمنہ اور عبدالرحمٰن کو پاکستان میں ہی رہنا چاہیے تھا۔ نفیس لوگ، ایک تلخ حقیقت اور اُمِ ایمان کی اچھی کاوش۔ شیریں حیدر حسبِ معمول مختصر مگر دلچسپ تحریر کے ساتھ آئیں۔ کھوئے کھوئے لمحے میں کہانی واضح اور دلچسپ ہوتی جا رہی ہے، اک نئی روشنی اور بہشتی اچھی تحریریں ہیں...... اب باری ہے گم شدہ محبت کی، انجم آئیں اور خوب آئیں۔ پہلی قسط سے اندازہ ہو رہا ہے کہ ناول خوب ہوگا دیکھیں...... بیچاری صبا کی گم شدہ محبت کا کیا ہوتا ہے۔ صائمہ قریشی کی تحریر کا آئیڈیا اچھا نہیں لگا اس طرح اگر

آزمانے لگیں تو وہ گویا خود ہی بھٹکنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مکافات اچھی اثر انگیز تحریر ہے، مرہم سے آگ لگ جائے تو گوارا تھی۔ ایک وعدہ ایک پیغام سے تو ہمیں بہت ہی افسوس ہوا، کیا پیغام دیا ہے انہوں نے کہ ایک بزرگ پر، بے شک وہ ظالم تھیں، ایسا بھیانک الزام لگا کر اولاد اور زمانے بھر میں ذلیل کر دو...... پہلے اتنی نیک پروین بننے کی کیا ضرورت تھی اپنے حق کے لیے جو قدم بعد میں اٹھایا پہلے اٹھالیا ہوتا۔ اے عشق ترے ہیں کھیل عجب، اپنے عجب عجب کھیلوں کے ساتھ توجہ حاصل کر رہی ہے۔ برا آپا، اصل زندگی اور دل جوئی مختصر گوارا تحریریں ہیں۔ رفاقت جاوید نے دل کو چھو لینے والی تحریر لکھی...... انٹرویو تو ان کا مکمل ہوا مگر یہ خلش رہ گئی کہ کاش وہ اپنے کچھ الفاظ کی وضاحت یا معذرت کرتیں۔ نایاب جیلانی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ سمجھوتا ایک تلخ حقیقت پر مختصر اچھی تحریر ہے۔ شیف گلزار اور ان کی بیگم سے ملاقات اچھی لگی اور سیما یاسمین مجتبیٰ سے بھی مل کر خوشی ہوئی۔ اختر شجاعت نے نماز پر بہت ایمان افروز مضمون لکھا، اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے، آمین۔ دیگر سلسلے بھی اچھے ہیں، شہلا نواز نے شادی شدہ بہنوں کو جو مشورہ دیا وہ بہنوں کو توجہ سے پڑھنا اور عمل کرنا چاہیے بہت ضروری ہے یہ سب کرنا۔ بہنوں کی محفل کے ذریعہ سب بہنوں سے ملاقات ہوگئی عذرا کو پکارتے پکارتے بہنوں کے گلے بیٹھ گئے (میرا تو بیٹھ گیا) جلترنگ حسب معمول خوشیوں اور مسکراہٹوں کے رنگ بکھیر رہا ہے۔'' (تفصیلی تبصرے کا شکریہ...... آپ خوش ہو جائیں آپ کی اور دیگر بہنوں کی فرمائش کی وجہ سے محترمہ عذرا رسول کا انٹرویو جلد شائع ہوگا)

☜ تسنیم ماپارہ، کراچی سے۔ ''سرورق کی موہنی سی صورت بڑی پیاری لگی۔ فکر انگیز اداریہ کے بعد ذکیہ صاحبہ کی یادوں کی مالا کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی ہے۔ اللہ انہیں صحت و تندرستی عطا کرے، آمین۔ نگہت سیما کا اعتبار وفا طویل ہوتا جا رہا ہے۔ تھوڑی سی کہانی اب آگے بڑھنی چاہیے۔ شیریں حیدر کے انکشاف نے ہمارے ڈینٹسٹ کے پھیروں کی یاد جگادی۔ بہت خوب صورت تحریر...... اک نئی روشنی، جستجو، بے بسی، مکافات، ایک وعدہ ایک پیغام، سمجھوتا سب ہی افسانے دلچسپ تھے۔ رفاقت جاوید کی جگمگا تا ستارہ نے رُلا رُلا دیا۔ تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں، گم شدہ محبت کی پہلی ہی قسط جاندار رہی۔ تبصرہ کچھ عرصے بعد...... جلترنگ کے محتاط انداز سے لطف اندوز ہوئے۔ اپنی محفل کی تو بات ہی کیا...... اختر شجاعت، شمع ہدایت، ہماری زندگیوں میں روشنی بھری رکھے۔'' (مختصر تبصرے کا شکریہ)

☜ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''امید ہے کہ آسٹریلیا میں بیٹے بہو اور پوتیوں کے ساتھ خوب انجوائے کر رہی ہوں گی۔ (الحمدللہ خیر و عافیت سے واپس آ چکی ہوں) ٹائٹل پر ماڈل کی اسٹائل دل لے گئی اداریہ زندگی کا قرینہ سکھا گیا۔ یادوں کی مالا، ذکیہ بلگرامی کی بہت ہی روح پرور اور ایمان افروز تحریر ہے۔ اس مالا کے تمام موتی اس قدر خوب صورت اور پُرنور ہیں کہ نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ سلسلے وار ناول اعتبار وفا سپرہٹ جا رہا ہے تمام منظر کھل کر واضح ہو گئے ہیں۔ اس شمارے کا سب سے بڑا سرپرائز پیاری انجم باجی کا ناول جس کا بڑی مدت سے انتظار تھا۔ گم شدہ محبت کی پہلی قسط ہی کافی فکر دار رہی...... اے عشق ترے ہیں کھیل عجب میں سارہ کی عاقبت نا اندیشی نے دل کو بہت خراب کیا۔ منی ناول دیار صبح کے اجالوں میں بڑی الجھنیں ہیں سلجھیں گی تو ہی سمجھ میں آئے گا کہ ہادی مظلوم کے ساتھ آخر ہوا کیا اور یہ اسمارا اور اسما کا کیا چکر ہے۔ رفاقت جاوید کی تحریر جگمگا تا ستارہ زخموں پر سے کھرنڈ اتار گئی، دل خون کے آنسو رو کر بھی مضطرب رہا۔ مکافات، ناہید سلطانہ اختر کا بہت ہی زبردست شاہکار رہا۔ اتنا اچھا آدمی بہک کیسے گیا۔ یہ الجھن دماغ میں شور مچاتی رہی۔ دیگر تحریروں میں کھلتے گلاب پھیکے رنگ، ایک وعدہ ایک پیغام اور برا آپا بہت ہی پُراثر اور خاصے کی تحریریں ہیں۔ شمع ہدایت نماز کے بارے میں تفصیل سے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے فوراً دعا کی یا اللہ ہمیں سب کو جیسا کہ حق ہے ویسی نمازیں ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔ (آمین) پاکیزہ کے مہمان میں شیف گلزار اور ان کی فیملی سے مل کر بے حد مزہ آیا۔ ویسے انہیں اپنی کوئی خاص ترکیب قارئین سے شیئر کرنی چاہیے تھی۔'' (ہاں یہ تو ہے)

☜ مسز نزہت، اشفاق، کراچی سے۔ ''پہلے میں امریکا گئی ہوئی تھی۔ میں واپس آئی تو باہر سے بچے بھی آ گئے...... اس مصروفیت میں پاکیزہ تاخیر سے پڑھ پائی مگر جب پڑھا تو دلی طمانیت سی حاصل ہوئی۔ سیما یاسمین کا انٹرویو پسند آیا۔ اور مجھے تمام رائٹرز کے انٹرویو پڑھنے میں ایک الگ ہی مزہ آتا ہے کہ ان کی باتیں دیگر خواتین سے مختلف لگا کرتی ہیں۔ (ہاں، یہ بات تو ہے) انجم آپ کا ناول دیکھ کر اور پڑھ کر بہت اچھا لگا...... طرز تحریر سادہ ضرور ہے مگر اپنے اندر جو کہانیاں سمیٹے ہوئے ہے اس کا بھی اندازہ ہو رہا ہے۔ آپ نے اخبار اور پروڈکشن ہاؤس کے ماحول کی بڑی دلچسپ عکاسی کی ہے۔ یہ سب باتیں تو

عام لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہیں...... فروری کے شمارے کی دوسری بڑی خوب صورتی ناہید سلطانہ اختر کی تحریر تھی جو کہ بے حد پسند آئی۔ شیف گلزار کی باتیں بھی پسند آئیں اگر وہ ترکیب بھی بتا دیتے تو اس انٹرویو میں مزید چار چاند لگ جاتے۔ اب آتی ہوں ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کی طرف...... میں سچ کہتی ہوں اتنی اچھی اور اتنی خوب صورت یادوں کی مالا میں نے اس سے قبل نہیں پڑھی۔ دیگر افسانوں میں صائمہ قریشی، اُمِ ایمان، شیریں حیدر، ہاجرہ ریحان، فاخرہ رابعہ اور ثریا انجم کی تحریریں بہت پسند آئیں۔" (تبصرے کا شکریہ، ہماری تمام مصنفات شکریہ کہتی ہیں)

✉ نویدہ تبسم، آسٹریلیا سے۔ "انجم باجی مجھے آپ کا آسٹریلیا آنا بہت اچھا لگا۔ اور آپ سے گلہ ہے یہ گلہ ہے فون پر بات ہو جاتی تھی۔ ان دنوں میں سفر نہیں کر سکتی تھی ورنہ سڈنی ضرور آتی (چلو آئندہ سہی انشاء اللہ) باجی مجھے پاکیزہ نیٹ سے پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے آپ مجھے بتا دیں کہ پاکیزہ آسٹریلیا میں کہاں سے ملے گا...... تو میں وہیں سے رابطہ کرلوں گی۔" (نویدہ آپ کو سڈنی میں اور ین میں مل جائے گا...... وہاں پاکستانی اور انڈین کی بہت بڑی تعداد رہتی ہے اور جہاں اردو رسائل مل رہے ہیں وہاں پاکیزہ بھی موجود ہے۔ ویسے آپ سالانہ خریدار بھی بن سکتی ہیں۔ وہ اس طرح کہ پاکستانی 90000 روپے پر امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ اور باقی ممالک کے لیے 8000 روپے جبکہ پاکستان کے شہروں کے لیے 800 روپے...... سالانہ ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں اور اس کے لیے مزید معلومات حاصل کرنی ہوں تو ثمر عباس 03012454188 سے رابطہ کریں۔ اس سلسلے میں رسالے پر صفحہ نمبر 175 پر اشتہار میں مکمل معلومات بھی ہیں۔ شکریہ)

✉ تابندہ جبیں، کورنگی، کراچی سے۔ "بہت برسوں بعد رابطہ کر رہی ہوں۔ پتا نہیں بہنوں کو میں یاد بھی ہوں یا نہیں...... (جب مجھے یاد ہو تو یقیناً دیگر بہنوں کو بھی یاد ہوگی) آپ کی تحریریں اتنی شوق سے پڑھتی ہوں کہ ان دنوں بھی آپ کا پرانا ناول محبت ہم سفر میری شروع کر رکھا ہے۔ فروری کے شمارے کی سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس میں آپ کے نئے ناول گم شدہ محبت کا شروع ہونا ہے۔ پہلی قسط پسند آئی اور آگے اس کی تہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ (جی انشاء اللہ) ذکیہ بلگرامی میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان تک میری مبارک باد پہنچا دیں۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✉ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ "آج کل میں اپنے شوہر کی بیماری کی وجہ سے بے حد پریشان ہوں مگر پاکیزہ اپنے ذہنی سکون کے لیے ضرور پڑھتی ہوں۔ فروری کے شمارے میں گم شدہ محبت پاکیزہ کی جان تھا۔ دل کو چھو لینے والا انداز تحریر ہے آپ کا...... سچ کہہ رہی ہوں یار، بار صبا کے بارے میں صفحات پڑھتی رہی۔ پھر کارزرد، پاکیزہ ڈائری اور جلترنگ پڑھنے کے بعد ناہید سلطانہ اختر اور شیریں حیدر کو پڑھا اور بہت اچھا لگا......" (آپ فروری کا پورا شمارہ پڑھیں ہماری سب تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں، یقیناً آپ کو بے حد لطف آئے گا)

✉ رعنا جبیں، ورجینیا امریکا۔ تمہارے طویل خط کا ایک، ایک لفظ پڑھا۔ تم نے اور تمہارے بچوں کا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ اب تمہیں پرانی باتیں سوچ کر بھی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ورجینیا امریکا میں میرے، بہت زیادہ رشتے دار موجود ہیں اور شکاگو میں میرا اپیٹار رہتا ہے۔ جب بھی اللہ کا حکم ہوا اور میں امریکا آئی تو انشاء اللہ تم سے ضرور ملاقات ہوگی۔

✉ نازیہ جمال، واہوا۔ تمہارا طویل خط پڑھا...... کتنی پرانی، پرانی باتیں تمہیں یاد ہیں کہ میں کب ٹی وی پر آئی تھی اور کیا کہا تھا کہ خط پڑھ کر چند لمحے کے لیے تو میں سوچ میں پڑ گئی کہ اتنی اچھی یادداشت حیرت ہے تمہارا افسانہ جب قابل اشاعت کی سند حاصل کر گیا ہے تو ضرور لگے گا۔ آپ دیگر باتوں کے لیے کسی بھی دن دو بجے کے بعد آفس فون کر کے معلومات حاصل کر سکتی ہیں۔ 02135895313Ext.118,107

✉ نگہت اعظمی، کراچی سے۔ "امید ہے آپ اہلِ خانہ کے ہمراہ خیریت سے ہوں گی۔ دیگر احوال یہ ہیں کہ میں پچھلے دنوں اسلام آباد گئی ہوئی تھی۔ پندرہ دن رہ کر آئی ہوں۔ بہت عرصے بعد گئی تھی اور ٹرین سے گئی تھی۔ بہت انجوائے کیا شدید سردی تھی لیکن بیس سال بعد سردی کا مزہ لیا۔ پنڈی میں بہت تبدیلیاں آگئیں بہت خوب صورت ہو گیا ہے۔ صدر میں بے حد صفائی نظر آئی۔ میرا وہاں گھر ہے۔ اس کی مرمت کروائی بہت مصروف دن گزرے لیکن بہت اچھا لگا۔ پاکیزہ پنڈی جانے سے پہلے پڑھ لیا تھا۔ ابھی کچھ یاد نہیں سوائے ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کہ میں انہیں بہت زیادہ پسند کرتی ہوں اور حیران ہوتی ہوں اور رشک کرتی ہوں کہ انہوں نے ماشاء اللہ کتنے بہت سارے کام کیے ہیں آج کل کی لڑکیوں کو ان سے سبق

حاصل کرنا چاہیے کہ ایک عورت بیک وقت کتنے کام کرسکتی ہے۔‘‘ (بے شک)

٭ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ’’فروری کا شمارہ پاکیزہ اپنے دلفریب ٹائٹل کے ساتھ ملا اس مرتبہ بھی اس کے افسانے اور ناولٹ بے حد اچھے لگے پاکیزہ میں شائع ہونے والے سب افسانے میعاری اور مزیدار ہوتے ہیں۔ آپ کا آسٹریلیا کا سفر بے حد اچھا گزرا ہوگا اور پھر اپنوں سے ملنے کا تو اپنا ہی مزہ ہے (وہاں تو مجھے غیر بھی اپنوں کی طرح ہی ملے) اداریہ پڑھا بے حد اچھا لگا، یادوں کی مالا ذکیہ بلگرامی کی تحریر دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے خوش رہو ذکیہ جی...... انکشاف، شیریں حیدر کی تحریر نے کمال کر دیا...... اک نئی روشنی، بہشتی، گم شدہ محبت پڑھ کر مزہ آگیا اتنا اچھا ناول مدتوں کے بعد پڑھنے کو ملا ہے...... کھلتے گلاب پھیکے رنگ اور اپنی پیاری فرینڈ فرح طاہر قریشی کی کہانی بے بسی پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ ناولٹ مکافات، ناہید اختر سلطانہ نے خوب لکھا مجھے ان کے افسانے بے حد اچھے لگتے ہیں۔ مرہم سے آگ لگ جائے واہ واہ...... ایک وعدہ ایک پیغام...... اصل زندگی، سمجھوتا تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک لگیں۔ مجھے تو ویسے بھی شیف گلزار کے کھانے بے حد پسند ہیں۔ آج اپنے پسندیدہ شیف کے متعلق پڑھ کر اچھا لگا۔ پاکیزہ ڈائری میں سب نے اچھا لکھا۔‘‘ (پسندیدگی کا شکریہ)

٭ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ’’نور افشاں آپ نے اپنے شہر کی بہت اچھی سیر کروائی ہے پڑھ کر آگاہی ہوئی۔ اس مرتبہ مجھے پاکیزہ کا شمارہ اس وجہ سے بھی زیادہ اچھا لگا کہ اس میں میری باجی انجم کا ناول شروع ہوا ہے۔ پہلی قسط ہی بھرپور ہے اور انشاء اللہ یہ بھی محبت ہم سفر میری کی طرح مقبولیت حاصل کرے گا۔ ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کی تحریریں دل کو سکون دیا کرتی ہیں۔ اس مرتبہ سب ہی افسانے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ شیریں حیدر، اُمّ ایمان، ماجرہ ریحان، رفاقت جاوید، نایاب جیلانی کس، کس کا نام لوں...... ماشاء اللہ سب نے بہت اچھا لکھا۔ ان دنوں میری پیاری بہن نوشین ساجد عمرے کے لیے گئی ہوئی ہے...... اللہ پاک اسے خیریت سے واپس بلائے...... اور وہ سب بہنیں جو میری صحت یابی کے لیے دعا کو رہتی ہیں۔ ان کے لیے جزاک اللہ......‘‘ (مختصر تبصرے کا شکریہ...... اللہ تم کو کلی صحت عطا فرمائے، آمین)

٭ ام ایمان قاضی، کوٹ چٹھہ سے۔ ’’اداریہ ہمیشہ کی طرح زبردست، یادوں کی مالا سے دل کو منور کیا۔ درخشن کی کہانی اچھی لگ رہی ہے۔ انجم باجی آپ کے ناول کی پہلی قسط جاندار رہی۔ ناولٹ فرحین اظفر کا زیادہ متاثر کر گیا۔ مکافات کے اختتام میں بہت جلدی کی گئی۔ بزم پاکیزہ میں نئی مصنفات بھی حصہ لیں تاکہ مزے، مزے کے سوال زیادہ آئیں گے۔ پاکیزہ ڈائری اور رائٹرز کے انٹرویوز بھی ایک اچھا سلسلہ ہے۔‘‘ (تبصرے کا شکریہ بزم پاکیزہ کے لیے تم بھی ڈھیر سارے سوالات ایک ساتھ بھیج سکتی ہو)

٭ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ’’جنوری کے پاکیزہ میں اپنا خط اور بہار و خزاں پر اپنا مراسلہ نہ پا کر بڑی مایوسی ہوئی لیکن پھر یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی۔ پھر فروری کا پاکیزہ ہاتھ میں آتے ہی دل خوشی سے باغ، باغ ہو گیا صحیح کہا ہے کسی نے کہ بدگمانی محبت کی قینچی ہے (محاورہ بدل دیا) آپ کی آسٹریلیا روانگی کی اطلاع بھی پاکیزہ سے ہی ملی اگر آپ پہلے بتا دیتیں تو ہم بھی وہاں سے کچھ کینگرو منگا لیتے۔ افسانے چند ہی پڑھ پائی جس میں اُمّ ایمان کا نفیس لوگ زبردست رہا۔ شیریں حیدر بہت اچھی رائٹر ہیں مگر اس مرتبہ انکشاف نے مزہ نہیں دیا اور آپ کی دھماکے دار انٹری تو عنوان سے ہی اچھی لگ رہی ہے۔ گم شدہ محبت سادہ کہانی ابھی تو ابتدا ہے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا...... اس کو کہتے ہیں سادگی میں پُرکاری (شکریہ)

٭ نیر شفقت، پنجاب سے۔ ’’کافی عرصے بعد حاضر ہو رہی ہوں۔ شاید اس عرصے میں آپ مجھے بھول گئی ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ نے مجھے یاد رکھا ہوگا۔ اپنی لکھاری بہنوں کو آپ بھلا کیسے بھول سکتی ہیں (تم مجھے یاد ہو) عذرا رسول آپی کا کیا حال ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوب صورت شخصیت کی مالک ہیں۔ اللہ پاک انہیں اور ان کے گھر والوں کو صحت اور تندرستی سے آباد رکھے۔‘‘ (آمین) (عذرا ماشاء اللہ خیریت سے ہیں اور آپ کو دعا کہہ رہی ہیں)

٭ بنت گاٹا، گاؤں ہلو وال پنجاب سے۔ ’’اس شمارے کی تعریف کی میں کوئی بھی تعریف نہیں کروں گی کیونکہ ہم سب (پڑھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ یہ ہمارے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے۔ تعریف تو اس کی کی جاتی ہے جس کے بارے میں ہر کوئی انجان ہو یا کوئی کسی کو جانتا نہ ہو۔ جاننے والوں کے بارے میں بار، بار کہہ کے الفاظ کے تاثر ختم کرنے والا حساب ہے۔

شمارے کے بارے میں اتنا کہنا چاہوں گی کہ گھنے جنگل میں رات کی تاریکی میں چنگھاڑتے ہوئے خوف میں درختوں کے پتوں سے چھن کے آتی روشنی ہے یہ شمارہ......" (بے حد نوازش، ہاں ابھی آپ کی کہانی پڑھی نہیں ہے)

☜ عالیہ حرا، کراچی سے۔ "آپ کے ایک اداریے نے مجھے جلدی، جلدی لکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ (چلو کسی بہانے سے ہی سہی تمہاری کاہلی تو ٹوٹی) انشاء اللہ اب دیر نہیں ہوا کرے گی۔ (اچھی بات ہے) فون پر آپ سے رابطہ نہیں ہو پایا۔ یا انگیج ہوتا ہے یا آپ موجود نہیں ہوتیں۔ (آپ فون کیجیے، میں گھر پر ہوں اور فون بھی ٹھیک ہے) پاکیزہ کی تحریروں میں نکھار آتا جا رہا ہے۔ جن قارئین اور رائٹرز کو دکھ ملے ہیں اللہ انہیں صبر عطا فرمائے اور جنہیں رب تعالیٰ نے خوشیوں اور کامیابیوں سے نوازا ہے انہیں بے حد مبارک باد۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

☜ نازیہ نزی، نوشہرہ کینٹ سے۔ "سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا میں آپ کی مثبت سوچ نے آگہی کا در وا کیا جو درست بات ہے۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی تحریر روح کے اندر جا لگتی ہے۔ تقدیر، ناہید سلطانہ اختر کی تحریر میں نکات جو اٹھائے گئے ہیں وہ جامد ہیں۔ جیو تو ایسے، نظیر فاطمہ کی تحریر جو تقریباً ہر تیسرے گھر کی کہانی ہے پر قلم اٹھایا۔ بات چھوٹی سی تھی مگر حقیقت میں بہت خاص ہے۔ ندا حسنین کی میں زیر بار تیرا ابھی بالکل عمومی نوعیت کا ٹاپک تھا۔ مگر آخر میں اچھائی کا پہلو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر کے کہانی کا حق ادا کیا۔ ہاجرہ ریحان کی تحریر بدلہ سب سے الگ اور منفرد کہانی تھی۔ بوجھ، سعدیہ عزیز کی بہترین تحریر تھی پڑھ کر رونا آیا۔ سعدیہ آپ کا طرز تحریر بہت اچھا لگا مجھے۔ خاص کر آپ جیسے لوگوں کی تحریریں بہت دھیان اور توجہ سے پڑھنے کی ہوتی ہیں۔ ورنہ مجھ کچھ نہیں آتا پھر نیا سورج، نزہت جبیں ضیا کی ہلکی پھلکی اصلاحی تحریر بھی اچھی لگی۔ جسٹ فار انجوائے منٹ اور جگر ہو جائے گا چھلنی بھی ہمارے ہی معاشرے کا عکاس تھیں اور لڑکیوں کی اصلاح کے لیے بہت اہم تھیں اور ہم لوگ، گھر تو آخر اپنا ہے نے رویہ بہتر کرنے کی ترویج کی۔ ام ثمامہ کی بانجھ کبھار ن بھی اعتبار و نا اعتباری کا المیہ بیان کرنے والی تحریر تھی۔ ناہید فاطمہ حسنین کی ناکردہ بھی مثبت تحریر نہ ہوتے ہوئے بھی مثبت ثابت ہوئی۔ منجدھار بھی تمپل گی تمام سلسلے پسند آئے۔" (پسندیدگی کا شکریہ، ہماری مصنفات شکریہ کہتی ہیں)

☜ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ "سرورق، ڈرامے میں حتمی کردار والی یہاں سادہ سے تاثرات لیے دل کو بھا گئی۔ مجھے کہنا ہے جی ہم نے دل اور کان لگا کر سن لیا۔ جو غصہ کرتا ہے اسی کا بلڈ پریشر بڑھتا ہے۔ الحمدللہ ہم اس مرض سے کوسوں دور ہیں اور دوسروں کو بھی دور کرتے رہتے ہیں۔ دعاؤں اور ہداؤں کے ذریعے......آپ کی دی ہوئی ربیع الاول کی مبارک باد سر آنکھوں پر اور جی ہاں ہم دادی اماں بن گئے ہیں، میرے بڑے بیٹے ثمر کے ہاں پہلا بیٹا آیا ہے۔ اور نام رکھنے کی سعادت ملی ہمیں۔ (مبارکاں) یادوں کی مالا باریک بینی اور دل تھام کے پڑھتے ہیں اور دل و نگاہ کو روشنیوں سے بھرتے ہیں۔ اختر شجاعت کے پُرنور قلم سے بھی نور نظر نصیب ہوتا ہے اور پڑھتے وقت اللہ قریب ہوتا ہے۔ حمد و نعت تو پاکیزہ کا روشن آسمان ہے۔ سیما یاسمین مجتبیٰ، بڑی خوب صورت خوب سیرت اور منفرد لگیں اور یہ بات بھی ہماری والی بات بھی گئی کہ آپ ذرا جواب خط سیر حاصل دیا کریں۔ (ہماری سیما تو ہیں ہی ہر فن مولا......کہ اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں) باقی جلترنگ والی بات بھی دل کو لگی......کاش آپ کا جلترنگ ٹی وی پر آئے......پھر تو میرے بچے ضرور دیکھیں گے۔ اور مجھے بھی وہاں زیادہ مزہ آئے گا۔ رسالے میں شاعری زیادہ ہو جائے تو دل کی کلی کھل کر پھول بن جائے۔ فریدہ خانم اور نازیہ نزی والی غزلیں اچھی لگیں۔" (شکریہ......)

☜ مسز فرح امجد، لاہور سے۔ "میری تمام بہنوں کو نیا سال مبارک ہو......اور یہ سال سب کے لیے موسم بہار کی طرح رہے۔ آپی میں 2015ء میں بہت بڑے سانحے سے گزری ہوں۔ 23 نومبر 2015ء کو میرے پیارے شوہر امجد حسین اس دنیائے فانی سے پردہ کر گئے۔ آپی میں ابھی تک شاک میں ہوں اور میں اپنے دکھ کا اظہار نہیں کر پا رہی ہوں پلیز آپ اور میری سب بہنیں میرے شوہر کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس نصیب کرے اور ان کے درجات بلند کرے (آمین) مجھے امید ہے کہ اس دکھ کی گھڑی میں آپ سب بہنیں میرا ساتھ دیں گی۔" (پیاری فرح......تم باقاعدگی سے پاکیزہ کے تمام سلسلوں میں حصہ لو تاکہ تمہاری توجہ بٹے......اور اپنا خیال رکھو کہ بچوں کے لیے اب تم ماں بھی ہو اور باپ بھی)

☜ سحرش فاطمہ، پنجاب سے۔ "انجم آپی کیسی ہیں آپ سے دو تین دفعہ فون پر بات ہوئی، تب سے ہی میں آپ کی فین ہو گئی ہوں۔ (اور ہم آپ کے) سب سے پہلے تو میں رب العزت کی شکر گزار ہوں جس کی بدولت میں پاکیزہ میں لکھ رہی ہوں،

مجھے میرے اب تک کے لکھے ہوئے افسانوں کے جواب میں صائمہ بخش آپی نے یاد رکھا۔ بہت شکریہ پسند کرنے کا۔ میں پہلی دفعہ خط کے ذریعے سب سے مخاطب ہو رہی ہوں، پاکیزہ رائٹرز کا تو کیا ہی کہنا اور اس سے بڑھ کر ہماری وہ بہنیں جو خط لکھتی ہیں میں انہیں پڑھتی ہوں مزہ آتا ہے۔ مدیحہ شاہد تمہیں میں ڈائجسٹ رائٹر کی وجہ سے ہی جانی۔ اس کا پارٹ تو بھی بناؤ۔ صائمہ قریشی پہلے افسانہ پھر اب ناولٹ ماشاء اللہ اب لگتا ہے سیدھا ناول پر آؤ گی، مبارک ہو، مجھے پتا ہے تم بہت اچھا لکھتی ہو۔ شبینہ گل کی ایک ایسی تحریر جو تلخ تھی لیکن بہت اداس بھی۔ تمہیں بھی پاکیزہ میں خوش آمدید...... ندا حسنین نے جب، جب لکھا خوب سے خوب تر لکھا۔ فرح طاہر میری پیاری سی رائٹر دوست تمہیں پڑھ کر ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔" (پیاری سحرش تمہاری آرا پہنچائی جا رہی ہے)

✿ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ "سرورق کی حسینہ کی معصوم مسکراہٹ دل کو بھا گئی۔ سلسلے وار ناولز تو زبردست جا ہی رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آسٹریلیا سے باخیریت واپس لائے۔ (جی میں آ گئی ہوں) دیار صبح کے اجالوں میں، مکافات، کھلتے گلاب، پھیکے رنگ، رفاقت جاوید کی جگمگاتا ستارہ بھی پسند آئی۔ یادوں کی مالا مضمون پڑھ کر دل خوش اور روح منور ہو جاتی ہے۔" (شکریہ)

✿ طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے میں جو کچھ آپ نے کہا ہمیں لگا ہم نے بھی یہی کہنا تھا۔ دین کی باتیں ہر بار کی طرح ایمان کی تازگی کا سبب بن گئیں۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ کو ڈھیروں دعائیں خوب صورت سفر میں ہمیں شامل کرنے پر...... اعتبار وفا پہلے سے زیادہ دلچسپ ہو گئی ہے اور مجھے تو اس کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی ہے۔ ویل ڈن نگہت سیما جی...... ناہید سلطانہ اختر جی نے بھی تقدیر کے وار کو خوب واضح کیا۔ جیو تو ایسے بھی ٹھیک تھا۔ آتے ہیں قیصرہ حیات جی آپ کی طرف...... جی جناب یہ کیا یوں لگا کہ آپ آخری امید کو آپ نے اس امید پر تمام کر دیا گویا اس کا دوسرا حصہ پھر کبھی لکھنے کا ارادہ ہو۔ نیا سورج، جسٹ فار انجوائے منٹ سبق آموز تحاریر تھیں۔ جگر ہو جائے گا چھلنی کی عفت میں مجھے اپنی ابتدائی ازدواجی زندگی کا تھوڑا عکس نظر آیا۔ ہم لوگ واقعی ہم لوگوں جیسی تحریر تھی۔ سمیرا یونس ویل ڈن باقی تمام تحاریر بھی دل پر نقش ہیں۔ عظمیٰ آپ کی بیٹی ہے وہ ہر دم یہ ثابت کر رہی ہے۔ اختر شجاعت جی آپ کے ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے اتنا کچھ اتنے خوب صورت اور سادہ انداز میں کہ کیا کہنے...... جزاک اللہ...... باتیں بہار و خزاں کی ایک دلچسپ سلسلہ ہمیں سب کے بارے میں معلومات دے رہا ہے۔ تسنیم منیر علوی نے بہت خوب صورت انداز میں بیان کیا بہار و خزاں کو...... شائستہ زریں آپ کا سلسلہ بھی اچھا ہے اور شیریں حیدر کو سلام ہے کیا ناپ تول کے کہانی کو ترتیب دیتی ہیں مبارک باد، بہنوں کی محفل کی کیا بات ہے۔ جلترنگ کے لیے مجھے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ماشاء اللہ آپی آپ ہر بار نئے موضوعات یہ اتنا سارا مزاح کیسے تخلیق کرتی ہیں۔ (یہ سب آقا کا کرم ہے) حسن نکھاریے، کارنر کے سلسلے، پاکیزہ ڈائری سب انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ روحانی مشورے تو بہت ضروری ہوتے ہیں۔ ورنہ پاکیزہ ادھورا لگے۔" (تبصرے کا شکریہ)

✿ نازنین آفریدی، پشاور سے۔ "امید ہے کہ آپ آسٹریلیا سے بخیریت واپس آ چکی ہوں گی بلکہ وہاں بہت، بہت انجوائے بھی کر چکی ہوں گی۔ ہے ناں، ظاہر ہے اپنے بچوں کے پاس کون جا کر خوش نہیں ہوتا۔ (یہ تو ہے) آپ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ بہت خوشی ہوئی بہت اچھا لگا تھا۔ آنٹی دل کی باتیں تو انہی سے کی جاتی ہیں ناں جو دل کے بے حد قریب ہوتے ہیں سو میں بھی اکثر آپ سے اپنی کتھائیں شیئر کرتی رہتی ہوں کیونکہ آپ بھی میرے دل کے بے حد قریب ہیں۔ آنٹی آپ سے ریکوئسٹ ہے اپنی خصوصی دعاؤں میں مجھے ضرور یاد رکھا کریں۔ (جی ضرور) دوسرا آنٹی ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اللہ کی وہ برگزیدہ بندی ہیں جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ پلیز آنٹی میری خاطر ان سے اسپیشلی کہیں کہ وہ میرے لیے بھی دعا کیا کریں۔ (جی بالکل، وہ کہے بغیر سب بہنوں کے لیے دعا کرتی ہیں) ہمیشہ کی طرح اسٹارٹ بہنوں کی محفل سے لیا۔ آپ نے کہا کہ پاکیزہ میں شوخ و چنچل تحریریں لکھنے والی ایک مصنفہ کو ایک چینل سے صبح کی نشریات کی میزبانی کی پیش کش ہوئی ہے۔ میرے خیال میں تو یہ عظمیٰ آفاق ہیں کیونکہ شوخ و چنچل وہ خود بھی ہیں اور ان کی تحریریں بھی...... شمع ہدایت سے میں ہمیشہ ہدایت لینے کی کوشش کرتی ہوں۔" (آپ نے بالکل صحیح پہچانا ہے۔ مگر ابھی انہوں نے کچھ نہیں کہا ہے۔ تبصرے کا شکریہ۔ اللہ آپ کی پریشانیاں دور کرے، آمین)

✿ فصیحہ آصف خان ملتان سے۔ "سخت سردی کا عالم ہے۔ اس عالم میں پاکیزہ کا ساتھ گرما گرم کش کے ساتھ، ساتھ خشک میوے جیسا لطف فراہم کرتا ہے۔ نئے سال کی مبارک ہو آپ سب قارئین کو بھی اگرچہ دیر ہو گئی۔ خیر ابھی تو فروری کا ماہ ہے۔ نئے سال کا پہلا شمارہ سردی کا تاثر لیے ملا۔ ماڈل کے پس منظر کا منظر دلفریب لگا، دکھ، سکھ اور زندگی کے نشیب و فراز کے

ثمن میں آپ کی پُرحکمت باتیں واقعی اثر پذیر لگیں۔ میں نے تو اب یہی مشاہدہ کیا ہے کہ ہم سب میں (مجھ سمیت) برداشت، صبر وحوصلے کی بتدریج کمی ہوتی جارہی ہے۔ جو واقعی نہ صرف ہمارے لیے بلکہ ہم سے وابستہ رشتوں کے لیے بھی بہت خطرناک ثابت ہورہی ہے۔ سو میری بھی سب بہنوں سے عرض ہے کہ اپنے اندر برداشت کا مادہ رکھیں۔ محترمہ اختر شجاعت ..... کے شمع ہدایت کا تذکرہ کروں گی پورا مضمون بے حد آرام سے پڑھا۔ ایک، ایک لفظ پر غور کیا۔ تو خود پر ملامت کی اور ندامت محسوس ہوئی ہمارے اندر تو ایک بھی ..... ایسی بات نہیں کہ عاشقِ رسول کہلا سکیں۔ ایسے مضامین ہمارے احتساب کے لیے از حد کارآمد ہیں۔ تاکہ ہم اپنے آپ کو دین وسنت کی صحیح راہ کے راہی بنا سکیں۔ محترمہ قابلِ احترام ذکیہ بلگرامی کے کیا کہنے یادوں کی مالا پڑھ کر دل کو بے حد سکون محسوس ہوتا ہے۔ اللہ ذکیہ صاحبہ کو صحت والی لمبی عمرِ عزیز عطا فرمائے، آمین۔ میرے لیے بھی خاص دعا کیجیے گا۔ قیصرہ حیات کی آخری امید کی آخری قسط جاندار رہی۔ آخری قسط میں انہوں نے بہت قابلِ عمل باتیں تحریر کیں۔ ثمن بلال اپنے دلکش انداز میں اے عشق ترے ہیں کھیل عجیب پیش کر رہی ہیں مگر جی مجھے ان کی کچھ باتوں سے اختلاف ہے۔ بے شک وہ بے حد ماڈرن گھرانے کی کہانی دکھا رہی ہیں۔ مگر ذرا ہاتھ ہولا رکھیں (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)۔ ثمن بہن آپ کچھ مثبت دکھائیں۔ بے شک آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں پر اسلامی تہذیب وثقافت کو فروغ دیں شکریہ۔ اڑنے کا ہنر جانتی ہوں۔ شائستہ کے سروے بے مثال وباکمال ہوتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ ذہانت سے پُر خواتین میں دلچسپی رہی ہے۔ سو سب کے لیے دعائیں کہ وہ کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں۔ باتیں خزاں وبہار کی واقعی حریدار رہیں۔ فریدہ افتخار صاحبہ آپ تو بہت ''پہنچی'' ہوئی ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ ارے واہ سیما یاسمین مجتبیٰ سے باتیں کھری کھری لگیں۔ گو وہ کچھ باتیں حذف کر گئیں مگر جواب سے بھی آشنا کر گئیں۔ وہ واقعی ایک سچی مصنفہ ہیں۔ اللہ ان کو بہت خوشیاں دے، آمین۔ شادی مبارک کی دلہن سعدیہ بے حد کیوٹ لگی۔ بہنوں کی محفل میں جس شوخ وچنچل مصنفہ کا ذکر آپ نے مارننگ شو کے حوالے سے کیا میرا خیال ہے وہ صائمہ اکرم ہیں۔ کیوں میں نے ٹھیک پہچانا ناں؟ (بالکل نہیں) اللہ آپ کو خیریت سے آسٹریلیا سے پاکستان لائے، آمین (واپس آچکی ہوں)۔ امینہ عندلیب کے لیے بہت ساری دعائیں۔ سعدیہ ہما شیخ مبارکاں ویسے تم کہاں چھپی ہوئی ہو کال بھی نہیں سنتی ہو؟'' (تبصرے کا شکریہ)

☜ شائستہ زریں، کراچی سے۔'' انجم باجی! کیسی ہیں آپ؟ عمیر کی بیٹی کی سالگرہ اور اس میں دادا دادی کی شرکت بہت مبارک ہو۔ مثل مشہور ہے کہ ''سفر وسیلۂ ظفر'' سو آپ بھی اپنے اس سفر کو کامیاب بنائیں اور آسٹریلیا کی تہذیب وثقافت اور رہن سہن کی روداد نذرِ قارئین کریں۔ غصے کی گرمی اور زبان کی تیزی کے منفی اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے امن وآشتی کا پیغام دیتا اداریہ بہت عمدہ تھا۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کی ایمان فروز تحریریں روحانی مسرت کا باعث بنتی ہیں۔ جزاک اللہ۔ افسانے یوں تو سب ہی اچھے تھے لیکن ناہید سلطانہ اختر کے ہنر کی کیا بات ہے، رفاقت جاوید کے افسانے کے ساتھ ہی اُن سے پوچھے جانے والے بقیہ سوالوں کے جواب بہت اچھے لگے۔ نگہت سیما اور ثمن بلال دونوں کے ناول دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ گم شدہ محبت کی اٹھان بہت اچھی ہے پر معلوم نہیں کہ بازیاب ہوگی بھی کہ نہیں؟ موضوع عمدہ اور وقت کی اہم ضرورت ہے۔ دفتری ریشہ دوانیوں اور دفتری ماحول میں کام کرنے والی لڑکیوں کے مسائل کی عکاسی خوب کی ہے۔ بعض فقرے حقیقت پر مبنی اور دل کو چھونے والے تھے۔ نزہت اصغر! ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کو اپنی بزم میں کب خوش آمدید کہ رہی ہیں؟ باتیں بہار وخزاں کی بہت اچھا سلسلہ ہے سوالوں کا معیار عمدہ ہے تو جواب بھی خوب ہیں۔ جلترنگ کے ساز بجتے ہی فضا میں خوشی کے رنگ بکھیر دیتے ہیں۔ عظمیٰ کو صاحبِ کتاب بننا مبارک ہو۔ اُن تمام قارئین اور تبصرہ نگاروں کا بہت شکریہ جو میرے لیے گئے انٹرویوز اور سروے رپورٹس کو سراہتے ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

☜ یاسمین کنول، پسرور سے۔'' پاکیزہ کا سرورق واقعی جنوری کی شدید سردی کا عکاس نظر آتا ہے۔ پہاڑوں پر برف اور ماڈل کی جرسی۔ اداریہ بہت اچھا لگا۔ واقعی زندگی رنگ بدلتی ہے اور بدلتے رنگوں کے ساتھ ہمیں جینے کا قرینہ آنا چاہیے۔ جلترنگ میں منگنی والا جلترنگ زیادہ اچھا لگا۔ آخری امید کی آخری قسط قیصرہ حیات کی بہترین تحریروں میں سے ہے ماشاء اللہ۔ سیما یاسمین مجتبیٰ سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا یادوں کی مالا کا سفر بہت دلچسپ اور روحانیت کو اجاگر کرتا سفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کی ہر نعمت عطا فرمائی اور استاد دلچسپ دلکش انداز تحریر بخشا کہ انسان ان کی تحریر پڑھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ صحت وتندرستی عطا فرمائے تاکہ وہ ہمیں مزید روحانیت کی باتیں بتا سکیں' اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے وہ اپنے ذکر کرنے والوں کو بہت نوازتا ہے

انہوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ کلام الٰہی کو لکھنے میں صرف کیا۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی اور وہ دنیا کے کاموں میں بھی آگے، آگے رہیں۔ باقی مستقل سلسلے پسند آئے بزمِ پاکیزہ دوبارہ شروع کرنے پر مبارک باد قبول فرمائیں۔" (شکریہ)

✿ نگہت غفار، کراچی سے۔ "اس ماہ دسمبر کا رسالہ دیکھا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ انجم کی تحریر ہمیشہ کی طرح دل کو بھا گئی اختر شجاعت جی کے لیے دل کی تمام تر گہرائیوں سے دعائیں نکلیں۔ بہنوں کی محفل میں جن بہنوں اور بیٹیوں کو خوشی و مسرت نصیب ہوئی ہے وہ خدا کرے ہمیشہ خوشیوں کے حصار میں رہیں جو بیمار ہیں ان سب کو ربِ کائنات مکمل صحت اور لمبی عمر عطا فرمائے، آمین۔ جو اب ہم میں نہیں ہیں مالک دو جہاں ان تمام کو اپنے دربار میں اعلیٰ منصب پر فائز فرمائے، آمین۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح پُرمزاح تحریر دکھی اور پریشان لوگوں کے چہروں پر خوشی اور مسرت لے آتی ہے کسی کو اپنی ذات سے خوشی دینا بہت بڑی نیکی ہے۔" (شکریہ)

✿ دیا آفرین شاہدرہ، لاہور سے۔ "جنوری کا پاکیزہ جلدی مل گیا وہ بھی برف پوش پہاڑوں کے ساتھ زبردست۔ اداریہ سے ہوتے ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا تک پہنچے۔ خوب صورت روداد ہم تک پہنچانے کا بے حد شکریہ۔ ورِ ثمن بلال کا ناول اے عشق ترے ہیں کھیل عجب اچھا ہے۔ اس بار مناب اور اقصم کی اسٹوری کم تھی رائٹر سے کہیں ناں زیادہ لکھا کریں ان پر اور سارہ اور اسجد تو فضول کردار ہیں پڑھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ نایاب جیلانی منی ناول کے ساتھ آئیں، اچھا لگا۔" (شکریہ)

✿ خولہ عرفان، کراچی سے۔ "جنوری کا پاکیزہ اپنے خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ میرے ہاتھ کو مہکا گیا۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا بار، بار پڑھی ہے بہت خوب صورت اندازِ گفتگو اور اندازِ تحریر جیسے سُبک، سبک ہوا چل رہی ہو۔ ناہید سلطانہ اختر کا تقدیر، بہت دھیما لہجہ لیے تقدیر کے رنگ صفحوں پر چھوڑ گیا۔ ان کے انداز بیان کی کیا بات ہے۔ نظیر فاطمہ کا جیو تو ایسے خوب صورت عکاسی کررہا تھا۔ ندا حسنین کا میں زیرِ بار تیرا دھوکے کا خوب صورتی سے جواب دیا ہے جو جیسا کرتا ہے اس کا انجام اصفہان لودھی جیسے لوگوں کا سا ہوتا ہے۔ تابندہ نعیم کا کھوئے کھوئے لمحے تاریخ کے جھروکوں سے بہت خوب صورتی کے ساتھ واقعات کی عرق ریزی کرکے اسے لفظوں میں ڈھال رہا ہے... بہت اچھے۔ ہاجرہ ریحان کا بدلہ بھی بہت اچھا لگا۔ ویسے ہاجرہ بہت ڈھونڈ کر موضوع لاتی ہیں۔ سعدیہ عزیز آفریدی کا بوجھ محبتوں کا حسین انداز لگ رہا تھا اور ہر رنگ محبت لفظوں میں سمویا ہوا تھا۔ نزہت جبیں ضیا صاحبہ کا نیا سورج کے کیا کہنے خوب صورتی کے ساتھ تنقید کرتی ہیں۔ جسٹ فار انجوائے منٹ نورعین صاحبہ کا بہت عمدہ، ثمیرا یونس ہارون کا ہم لوگ افسانہ بھی بہت شاندار تھا۔ نایاب جیلانی کا دیا صبح کے اجالوں میں بہت خوب صورت اندازِ بیان ہے اور کہانی کا انداز بھی دلکش ہے۔ گھر تو آخر اپنا ہے، ہما بیگ کی تحریر بہت جاندار تھی اور اُمِ ثمامہ کا بانجھ کمہارن تو بازی لے گیا مزہ آگیا۔ ناہید فاطمہ حسنین کا ناکردہ اور منجدھار، سیما بنت عاصم کا دونوں بہت خوب صورت افسانے تھے اندازِ تحریر بہت عمدہ اور کہانی بھی مختلف موضوع لیے تھی۔ وہ آئے بزم میں سیما یاسمین مجتبیٰ کے ساتھ ایک خوب صورت نشست ثابت ہوئی جتنے اچھے انداز میں نزہت اصغر نے تحریر کیا ہے لگتا ہے کہ ہم خود ان سے محوِ گفتگو ہیں۔ ثمیرا حمید فاروق نے اپنی بیٹی کی شادی کا احوال رقم کیا ان کی خوشیوں کا رنگ ہر لفظ سے جھلک رہا ہے۔" (شکریہ)

✿ رابعہ عمران چودھری، رحیم یار خان سے۔ "سالِ نو کا پاکیزہ نمبر ہمارے ہاتھوں میں جگمگا رہا ہے۔ یادوں کی مالا اٹنے کا ہنر جانتی ہوں۔ باتیں بہار و خزاں کی میں سب نے زبردست لکھا۔ سیما یاسمین مجتبیٰ سے ملاقات خوب رہی اور اتفاق سے وہ مجھے فیس بک پر بھی مل گئیں ان سے بات کرکے بے حد خوشی ہوئی جلترنگ ہمیشہ کی طرح لاجواب رہا۔ سب سے پہلے نزہت جبیں ضیا کی تحریر بہت سبق آموز تھی اور میرے خیال میں لکھاری دراصل چنگاری ہوتا ہے یعنی رائٹر ایک لائٹر ہوتا ہے۔ یہ تو اس کی اپنی مرضی ہے کہ ہر جگہ آگ لگائے یا پھر صرف روشنی پھیلائے۔ (بہت خوب بھئی) بالکل اسی طرح نورعین کی تحریر جسٹ فار انجوائے منٹ بھی آج کل کی جنریشن کے لیے ایک سبق کی طرح تھی۔ ثمیرا یونس ہارون نے تو پاکستانیوں کا خوب نقشہ کھینچا۔ بہت خوب ثمیرا جی۔ ناہید سلطانہ کی تحریر تقدیر بہت اچھی معلوم ہوئی۔ سعدیہ عزیز آفریدی نے اچھا لکھا۔ بانجھ کمہارن، اُمِ ثمامہ کی بہترین اور یادگار تحریر رہے گی۔ عورت کا ظرف ہوتا کہ وہ اگر ماں نہ بن سکے تو وہ شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دے دیتی ہے اگر مرد باپ نہ بن سکے تو وہ ساری زندگی اسی کے ساتھ گزار دیتی مگر مرد اپنی اس کمزوری کو چھپانا چاہتا ہے اگر عورت بانجھ ہے تو اس کے نصیب میں طعنے رہ جاتے ہیں۔ اُف...... بہت تکلیف دہ بات ہے۔ نیا سلسلہ بہت پسند آیا قارئین سے سروے والا یوں سب ایک دوسرے کے بارے میں پڑھ سکیں گے اور دیکھ بھی سکیں گے۔" (تبصرے کا شکریہ آپ کا سلام

سب تک پہنچا دیا ہے۔نزہت اصغر بھی جواب و سلام دے رہی ہیں)

✉ تمثیلہ لطیف پسرور، پاکیزہ میں آپ کا کلام شائع ہوا ہے۔آپ مکمل پرچہ پڑھا کریں۔پاکیزہ ڈائری میں نہیں تو کارنرز میں آپ لوگوں کے مراسلات ضرور شامل ہوتے ہیں۔خط بھیجنے کا شکریہ۔

✉ حافظہ ست البنات، تونسہ شریف سے۔''باجی چار سال سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔آپ کے محبت بھرے جواب جو آپ بہنوں کو دیتی ہیں انہی سے لکھنے کا حوصلہ ملا ہے۔باجی ایک کہانی لکھی ہے آپ کی خدمت میں بھیج رہی ہوں اگر قابلِ اشاعت ہو تو کہانی کا عنوان آپ خود ہی لکھیے گا یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا۔باجی میں نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے اور ترجمہ بھی پڑھا ہوا ہے۔''(ماشاء اللہ! ابھی آپ مطالعے پر زیادہ زور دیں)

✉ عائشہ جنجوعہ، تونسہ شریف آپ کا مختصر ترین خط ملا۔آئندہ مکمل تبصرہ بھیجیے گا۔نیا نام مبارک ہو۔

✉ فرخندہ جعفری، گجرات سے۔''ماہ دسمبر کا پاکیزہ پڑھا۔پڑھ کر بہت خوشی ہوئی آپ نے میرے سوال کو پہلا انعام یافتہ سوال قرار دیا ہے۔اس کے لیے میں آپ سب کی تہ دل سے شکر گزار ہوں۔باتیں بہار و خزاں کی میں بھی میری تحریر لگائی ہے اس کے لیے بھی بہت بہت شکریہ۔ماہ دسمبر کے پاکیزہ کی تمام رائٹر مصنفۂ ادیبہ خاص کر ہمیں کبھی نہ بھولنے والی مدیرہ انجم انصار صاحبہ نے اپنی بھرپور کوشش سے پاکیزہ کو چار چاند لگائے ہیں تمام کہانیاں بہت اچھی اور سبق آموز تھیں۔اختر شجاعت نے صبر، رضائے الٰہی پر بہت ہی اچھا لکھا۔جلترنگ کی دونوں کہانیاں بالکل سچائی پر مبنی تھیں بالکل اسی طرح ہو رہا ہے۔جنوری میں آپ سڈنی (آسٹریلیا) چلی جائیں گی تو ہماری لکھنے کی حوصلہ افزائی کون کرے گا۔''(مختصر خط کا شکریہ۔میں وہاں بیٹھ کر بھی آپ لوگوں کے ساتھ تھی۔میری روحانی مشورے کی کتاب اور عظمیٰ کا سفر نامہ منگوانے کے لیے آپ القریش پبلی کیشنز لاہور سے رابطہ کر سکتی ہیں۔فون نمبر 042.37652546.37668958)

✉ شہزادی کائنات یونس، کراچی۔نانی اماں کے انتقال پر تعزیت قبول کریں۔آپ کہانیاں پڑھتی ہیں لکھنے کا بھی ان شاء اللہ تجربہ ہوتا جائے گا۔آپ کی شاعری نزدیکی اشاعت میں شامل ہو جائے گی۔

✉ عزیز دانی سلیم، پشاور سے۔''آپ کو علم نہیں ہوگا مگر ایک بہت پرانی قاری ہوں اس وقت سے جب پروفیسر وحیدہ نسیم (مرحومہ) پاکیزہ کے لیے لکھا کرتی تھیں۔انہوں نے ایک بار ربیع الاول کے مبارک مہینے میں ایک سلام لکھا تھا اگر آپ یہ سلام ''لائی مجھے مدینہ میری شکستہ پائی'' شائع کر دیں تو مہربانی ہوگی۔''(کوشش کریں گے وعدہ نہیں)

پیاری بہنو! پاکیزہ کے اپریل اور مئی کے شمارے سالگرہ نمبرز ہوں گے ان کے لیے اپنے مراسلات، اپنے انٹرویوز، تصویر کے ساتھ یا بغیر تصویر کے اپنے شہر کے نام کے ساتھ جلد از جلد ہمیں ارسال کر دیں تاکہ وہ ان خصوصی نمبرز میں جگہ پا سکیں۔

اور اب آیئے پہلے درود پاک پڑھتے ہیں اور پھر دعا مانگتے ہیں یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم یا کریم! میرے جسم کو شفا اور دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما......اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔یا رب العالمین مجھ سے میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز و اقارب سے ہمیشہ ہمیشہ راضی رہنا......اور ہر گناہ ہر غلطی......اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا۔اپنی نظر میں چھوٹا مگر دوسروں کی نظروں میں بڑا بنا دینا اور دونوں جہان میں مجھے خیر عطا کرنا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے......اور تیری ثنا......سب سے بڑی اور تیری پناہ عزت والی ہے......اس لیے صرف اپنا محتاج رکھنا......اور ہمیشہ، ہمیشہ اپنی شان کے حساب سے ہم سب پر اپنا رحم کرم اور فضل کرنا اور ازل سے ابد تک ہم سب کو معاف کرنا کہ......بے شک میرا رب ہر شے پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

دعاگو............

آپ کی اپنی باجی............انجم انصار

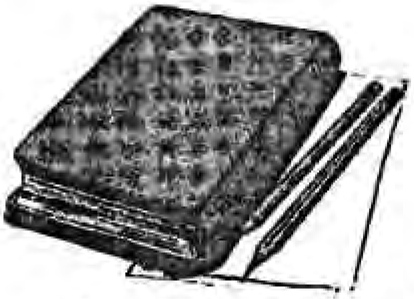
پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔63.c فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس۔مین کورنگی روڈ۔کراچی۔پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

کیسے ہو تیری حمد بیاں اے میرے خدا
انسان کے بس میں ہے کہاں اے میرے خدا
گوہر بنایا آب میں تیسانِ آب کو
حیراں ہوں کیوں نہ اہلِ جہاں اے میرے خدا
شہہ رگ سے بھی قریب، تخیل سے دور ہے
چشمِ بشر سے کیوں ہے نہاں، اے میرے خدا
ہر شئے ہے تیرے حسن کا پرتو لیے ہوئے
دریا...... پہاڑ، کون و مکاں اے میرے خدا
ہر چیز پر گمان ہے تیرے وجود کا
پھر بھی ملا نہ تیرا نشاں اے میرے خدا
تیری عطا کا شکر کرے کیسے ارتضیٰ
یہ کہہ کے چپ ہے میری زباں اے میرے خدا

شاعر: ارتضیٰ جونپوری

مرسلہ: شازیہ محبوب...... کراچی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

روحِ تحقیق نے سچ فرمایا
ہر نبی آپؐ کی خوشبو لایا
ہمہ تائید خدا کی تمہید
آپؐ کا سایہ خدا کا سایہ
آپؐ کے اسم کی تسمیہ جلی
جہاں قرآن کا ورق الٹایا
للہ الحمد محامد کا بیاں
بخدا اسم مسمّٰی پایا
حق کے اس طور قریب و اقرب
آپؐ کو ہادیٔ حق ٹھہرایا
مدحِ ممدوحِ خدا کی منزل

آج ایمان کہاں لے آیا

کلام: گوہر ہوشیار پوری

مرسلہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

رشک

دو آدمیوں کے سوا کسی پر رشک کرنا درست نہیں۔ ایک وہ شخص جسے خداوندِ کریم نے قرآن پاک کا علم عطا کیا ہو اور وہ رات کو اور دن کو اسے پڑھتا ہو...... دوسرا وہ شخص جسے خداوندِ کریم نے مال و دولت عطا کیا ہو اور وہ رات کو اور دن کو راہِ خدا میں خرچ کرتا ہو۔ (مسلم)

شہ پارے

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا جس نے دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ و بحمدہ کہا تو اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں خواہ وہ دریا کے جھاگ کے برابر ہوں۔

(بخاری و مسلم)

مرسلہ: رفعت مبین رفی، یو ایس اے

اقوال حضرت علی کرم اللہ وجہہ

☆مخلوق کی خوشنودی کے لیے اللہ کو ناراض مت کرو...... اگر اللہ سے رشتہ کٹ گیا تو کوئی اللہ کی جگہ تمہارے کام نہیں آ سکتا۔

☆مخلص دوستوں کی تلاش ایسے کرو جیسے مریض شفا کی تلاش کرتا ہے۔

مرسلہ: تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد

عورت اسلام کی نظر میں

حدیثِ مبارکہ کی رو سے

1۔ عورت کے لیے یہ بہت ہی مبارک ہے کہ

اس کی پہلی اولاد لڑکی ہو۔

2۔جس شخص کو کچھ بیٹیاں ملیں اور وہ ان کے ساتھ نیک سلوک کرے یہاں تک کہ کفو میں ان کی شادی کردے تو وہ بیٹیاں اس کے لیے جہنم سے آڑ بن جائیں گی۔

3۔جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے لڑکی! تو زمین پر اتر...... میں تیرے باپ کی مدد کروں گا۔

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

اولاد کے لیے پیغام والدین

جس دن تم ہمیں بوڑھا دیکھو تو صبر کرنا اور ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنا...... جب ہم کوئی بات بھول جائیں تو ہم پر غصہ نہ کرنا اور اپنا بچپن یاد کرنا...... جب ہم بوڑھے ہو کر چل نہ پائیں تو ہمارا سہارا بننا.....اور پہلا قدم یاد کرنا۔

جب ہم بیمار ہو جائیں تو وہ دن یاد کرنا اور یہ سوچ کر ہم پر خرچ کرنا...... جب ہم تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی خواہش قربان کرتے تھے۔

مرسلہ: ساجدہ ظفر، کمالیہ

پھول

بیٹیاں تو پھول ہیں
نہ کہ
پاؤں کی دھول ہیں
کیوں پھر
انہیں جلایا جاتا ہے
ونی کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے
رسم و رواج کے نام پر قربان کیا جاتا ہے
یہ انصاف مانگتی ہیں
ادھورا نہیں پورا

از: صائمہ سید، کراچی

بہارِ زندگی

آپ نے مسکراتے ہوئے تو بہت لوگوں کو دیکھا ہوگا مگر کبھی غور کیا۔ کافی لوگ تو صرف اخلاقی طور پر مسکراتے ہیں تاکہ لوگ انہیں بداخلاق نہ سمجھیں۔ کچھ لوگ زبردستی مسکراتے ہیں، دل ہی دل میں گالیوں سے نواز رہے ہوتے ہیں کہ کس مصیبت سے واسطہ پڑ گیا۔ کوئی مسکراہٹ کے پردے میں دانت پیس رہا ہوتا ہے، اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مسکراہٹ کیسی ہونی چاہیے تو جناب...... مسکراہٹ وہی خوب صورت اور پُرکشش ہوتی ہے جو دل سے نکلے اور ہونٹوں پر پھیل جائے ایسی مسکراہٹ جس سے لگے کہ وہ کہہ رہی ہے کہ مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ سچی مسکراہٹ میں بناوٹ نہیں ہوتی ایسی مسکراہٹ ہو جس سے غیر بھی اپنے بن جائیں۔ گھر ہو یا دفتر...... ہر جگہ لوگ ایسی مسکراہٹ والے انسان کی عزت کریں گے، خوشگوار مسکراہٹ سے ماحول میں اپنائیت رچ بس جاتی ہے۔ مسکراتے رہیے کہ یہی زندگی کا حسن ہے۔

از: رابعہ عمران چوہدری، رحیم یار خان

نظم

تیرے انتظار میں
میں کتنا بدل گئی ہوں
بہار سے نکل کر
خزاں میں ڈھل رہی ہوں

مرسلہ: فردوس شاہی...... لاڑکانہ

غزل

سرِ محفل یہ اشارہ کیسا
سرِ مژگاں یہ ستارہ کیسا
آنسوؤں کا ہی منافع ہوگا
دل کے سودے میں خسارہ کیسا
قصۂ غم تو ہے ہم دونوں کا
اب تمہارا یا ہمارا کیسا
کٹ گیا ہجر کا موسم لیکن

تم نے یہ وقت گزارا کیسا
چاند تاروں سے ہی پوچھا ہوتا
شبِ فرقت کا ہے مارا کیسا
روزنِ ہجر سے آکر جھانکو
ہے شبِ غم کا نظارہ کیسا
ڈوب کر تم بھی ذرا دیکھو تو
میں نے پایا ہے کنارہ کیسا
آنکھ میں اپنی ڈبو کر فرح
لب پہ اِک شعر اتارا کیسا

شاعرہ: فریدہ لاکھانی فرح، سڈنی، آسٹریلیا

ماں

باپ کے انتقال کے بعد بیٹے نے ماں کو اولڈ ہاؤس میں داخل کروادیا...... سال میں صرف ایک بار خیریت دریافت کرنے چلا جاتا...... ایک دن اولڈ ہاؤس سے فون آیا کہ اس کی ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو ماں عالمِ نزع میں تھی۔ اس نے روتے ہوئے ماں سے پوچھا کہ۔ ”ماں! تیرے لیے کیا کرسکتا ہوں۔“

ماں بولی۔ ”بیٹا اس اولڈ ہاؤس میں پنکھے لگوادو کہ یہ اکثر خراب رہتے ہیں۔“ بیٹا حیران ہو کر بولا۔ ”ماں مگر تم تو یہاں کافی عرصہ رہیں...... اب آخری وقت میں یہ فرمائش کیوں کررہی ہو؟“

ماں بولی۔ ”بیٹا میں نے تو جیسے تیسے وقت گزارلیا لیکن ڈرتی ہوں کہ کل جب تیرے بچے تجھے یہاں چھوڑ کر جائیں گے تو، تو اتنی گرمی کیسے برداشت کر پائے گا۔“

از: پروین افضل شاہین بہاول نگر

پانسہ

زندگی میں ایک وقت ایسا بھی ہے، جب آپ اپنی ساری طاقت، سارا دماغ، ساری ترکیبیں اور ساری صلاحیتیں صرف کرچکے ہوتے ہیں، اس وقت بھی سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہی ہوتا ہے اور آپ کچھ نہیں کرسکتے۔

از: عائشہ منظور، سیالکوٹ

بہار

یاد تو خاص نہ تھی بس اتنا
تم جو آئے بہار کے دن تھے
ساری شامیں حسین لگتی تھیں
وہ سارے موسم گلاب موسم تھے
تم جو رکتے تو ہم ٹھہر جاتے
سارے احساس تم سے باہم تھے
تم جو آئے بہار کے دن تھے

شاعرہ: صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ

دوست

اچھے دوست ہاتھ اور آنکھ کے مانند ہوتے ہیں جب ہاتھ کو تکلیف ہوتی ہے تو آنکھ روتی ہے اور جب آنکھ روتی ہے تو ہاتھ آنسو پونچھتے ہیں۔

از: مسز فرح امجد، ٹاؤن شپ لاہور

غزل

میری آنکھوں کے صحرا میں سمندر رقص کرتا ہے
کسی کے ہاتھ میں جیسے مقدر رقص کرتا ہے
سہانی شام میں تم نے ہمارا ہاتھ پکڑا تھا
ابھی تک شام کا دیکھو وہ منظر رقص کرتا ہے
تمہارے وصل کی یادیں ابھی تک میں نہیں بھولی
تمہاری یاد کا موسم دسمبر رقص کرتا ہے
ابھی پچھلی رُتوں کے سرد موسم سے نہیں نکلے
ابھی پچھلے دسمبر کا کیلنڈر رقص کرتا ہے
مزاروں پر فقیروں کی قطاریں بنا کرتی ہیں
میری سوچوں کے اندر بھی قلندر رقص کرتا ہے
تمہارے پیار کے زخموں کی سوغاتیں سلامت ہیں
تمہاری یاد کا دل میں بھی نشتر رقص کرتا ہے
میرے باہر کا ہر موسم تمہیں اچھا لگے شاید
گماں بھی کوئی تمثیلہ کے اندر رقص کرتا ہے

شاعرہ: تمثیلہ لطیف، پسرور

جلترنگ

انجم انصار

خوب صورت مقولہ

شگفتہ کی اپنی تیز وطرار نند سے لڑائی ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کی شکایت کس سے کرے تا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرسکے۔

اپنے میکے فون کر کے اماں سے مشورہ لیا تو انہوں نے غصے میں کہا۔ ”اس خبیث عورت کو اسی وقت جھونٹے پکڑ کر دو چار ہاتھ لگاتی تا کہ آئندہ اس کی ہمت نہ ہوتی تجھ سے بات کرنے کی۔“

”اماں! وہ میری بڑی نند ہیں، میرے میاں بھی انہیں باجی کہتے ہیں۔ میں ان کو کیسے ہاتھ مار سکتی ہوں۔“ شگفتہ نے گھبرا کر کہا۔

”چل! اگر تیرا ہاتھ نہیں اٹھ رہا تو بچے کی کوئی ہاکی اس کی کمر پر مارتی یا منہ پر ریکٹ ایسا مارتی کہ جبڑا ٹوٹ جاتا۔“

”اماں! بچے میرے ہیں نہیں، میاں تاش کھیلنے کے سوا کوئی گیم نہیں جانتے۔ یہ بیٹ، یہ ریکٹ میرے گھر میں کہاں ہیں جن کو میں اپنے اوزار بھی بنا کر رکھوں۔“

”اری پگلو! تو پھر چیخ، چیخ کر دھواں دھار گالیاں ہی سنا دیتی تا کہ پاس پڑوس کے لوگوں کو کچھ تو پتا چلتا کہ تیرے ساتھ کیا کچھ نہیں ہو رہا۔“

”اماں! میں یہ سب ضرور کرتی مگر اسکولوں کی تعطیلات ہونے کے باعث میرے فلور کے چاروں فلیٹ خالی ہو چکے ہیں۔ سب کے سب اپنے میکے گئے ہیں۔ مجھے تو چیخنے کا بھی سواد نہ آتا۔“

اماں کی باتوں سے بور ہو کر شگفتہ نے سوچا کہ میاں جانی سے شکایت کرنی چاہیے۔ جس لڑاکا بہن کو وہ باجی، باجی کہہ کر پکارتے ہیں وہ اصل میں کتنی بدتمیز ہے کہ اسے بات کرنے کا کوئی ڈھنگ ہی نہیں آتا ہے۔ تب جتنے مرچ مسالے وہ باتوں میں بھر سکتی تھی بھرے...... جتنی آگ کی ضرورت تھی وہ بھی لگائی مگر میاں جی تو ایک دم ٹس نکلے...... مجال ہے کہ اپنی بہن کی کسی بات کا برا مانا ہو۔

”میری باجی دل کی بہت اچھی ہیں۔“

”زبان سے تو زہر اگلتی ہیں۔ دل کا مجھے کیا کرنا ہے۔“ شگفتہ نے تنگ کر کہا۔

”میری بہن کے بارے میں آئندہ کوئی بات کرنے کی ہمت نہ کرنا...... تمہیں معلوم ہے کہ مجھے اپنی بہن سے کتنی محبت ہے۔“

”سنبھالیں اپنی بہن کو اگر آئندہ کوئی فضول بات کی تو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دوں گی۔“

”یہ گھر تم اپنے جہیز میں تو نہیں لائی ہو۔“ وہ غصے سے بولے۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کا گھر میرا گھر ہی تو ہے۔“

”نہیں! شوہر کا گھر صرف اس کا گھر ہوتا ہے۔ بیوی حق ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔“

اللہ میاں جانی کے خیالات کتنے گھٹیا ہیں۔ ابھی تو نند کی زبان کا شکوہ تھا۔ اب میاں کی باتیں بھی سنگ باری کرنے لگی تھیں۔ شگفتہ جو دل میں یہ پروگرام بنائے بیٹھی تھی کہ نند صاحبہ کی سسرال میں فون کر کے یہ کہے گی کہ اپنی بدتمیز بہو کو سنبھالیں۔ آپ لوگوں نے بہت ڈھیل دے رکھی ہے، اس پروگرام پر بھی عمل نہیں کر سکی...... میاں جانی کی باتیں تڑ، تڑ اس کو لہولہان کر رہی تھیں۔ پورے ہفتے وہ منہ پھلائے پھلائے رہی اور جب بات چیت شروع ہوئی تو ناراضی دکھاتے ہوئے کہا۔

”آپ بعض دفعہ ایسی، ایسی باتیں کر جاتے ہیں

کہ میرا دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔"

"ہونہہ...... ! تم تو پاگل ہو...... میاں کی باتیں بھی کوئی دل سے لگایا کرتا ہے۔ رات گئی، بات گئی کہ مقولے پر یقین رکھا کرو...... کبھی پریشان نہیں ہو گی۔"

تب وہ زبردستی کی ہنسی ہنس دی، کھی کھی کھی۔

☆☆☆

ڈر اور خوف

چوکی کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہم لوگ رہتے تھے۔ بڑے شہر میں آتے ہوئے ویسے ڈر سا لگ رہا تھا مگر جب پنڈی کئی بار اپنے عزیزوں کے ہاں آئے تو سارا خوف مٹ سا گیا۔ اپنا پنڈی بھی کتنا اچھا ہے، یہاں کے لوگ پنڈ جیسے ہی تو ہیں ناں (پنڈی میرا ہارٹ فیورٹ شہر ہے نہ) اور چند سالوں میں ہی ہم لوگ ایسے ہی ہو گئے جیسے شہروں کے لوگ ہوتے ہیں، کھانے کے وقت کوئی بھی آجائے روٹی کے بجائے چائے، شربت دینے لگے، رہنے کے لیے کوئی آئے تو اپنے گھر کو مزید چھوٹا سا ظاہر کرنے لگے مگر جب میاں جی نے بتایا سطوت آنٹی باہر سے آئی ہیں، ہوٹل میں ٹھہری ہیں صرف تھوڑی سی دیر کے لیے ملنے کے لیے آئیں گی تو واقعی میں تو ڈر ہی گئی۔ بعض مہمانوں سے مجھے خواہ مخواہ ہی ڈر سا لگتا ہے، میں نے میاں جی سے کہا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے...... باحیثیت لوگوں سے دنیا کے لوگ ڈرتے ہیں۔"

"کیا کبھی ہم سے بھی کوئی ڈرے گا؟" میں نے یونہی ہنس کر پوچھا۔

"میرے خیال سے تو آئندہ دس سالوں میں بھی کوئی ایسی خاص بات ہمارے ساتھ نہیں ہونے والی کوئی ہم سے ڈرے یا خوف زدہ ہو۔" بعض دفعہ کی بات چند منٹوں میں بھی پوری ہو جاتی ہے اس کا کسی کو علم نہیں ہوتا اب کبھی سوچتی ہوں تو ہنسی ہی آجاتی ہے۔ سطوت آنٹی کے آنے سے پہلے ہی میں نے ان کی خاطر داری کا سامان ٹرالی پر سجا دیا تھا اور بچوں کو خاص کر دی تھی کہ مہمان جب آئیں وہ سب تمیز سے آکر سلام کریں۔ ان کے پوچھ لیے جاتے والے سوالات کے جوابات بھی رٹوا دیے تھے کہ کس کلاس میں پڑھتے ہیں، گھر میں کون پڑھاتا ہے کلاس میں کیا رینک آتا ہے آپ کی پسند کی کیا کیا چیزیں ہیں وغیرہ وغیرہ......!

بچوں کو سختی سے تنبیہہ کر دی تھی کہ اپنی گفتگو کے دوران ٹرالی پر رکھی ہوئی کسی چیز کی جانب نظر تک نہیں ڈالنی اگر مہمان ازخود کھانے کو بھی کہے تب بھی کچھ نہیں کھاتا۔ وی آئی پی مہمان کا قیام مختصر ترین ہوا کرتا ہے وہ جلد چلے جائیں گے تو بے شک ٹرالی پر رکھی ہر چیز چٹ کر جانا کہ وہ سب چیزیں صرف تم ہی لوگوں کے لیے منگائی ہیں۔ مہمان درجۂ اول بھی کوئی چیز نیت بھر کے نہیں کھاتے صرف سونگھنے والے ہوتے ہیں۔

سطوت آنٹی کے آنے کے بعد ہر چیز ہمارے ہوم ورک کے حساب سے ہو رہی تھی، ہمارے آدھے درجن بدتمیز بچے تہذیب یافتہ بچوں کا لیبل چڑھائے ڈرائنگ روم سے سرخرو ہو کر گئے تھے، ہاں چھوٹی نند سمجھانے کے باوجود اپنے دوپٹے کے پلو سے چھپا کر لے آئی تھیں اور ان کے کمرے سے فاتح سے قہقہے ڈرائنگ روم تک بھی آرہے تھے۔ مہمان آنٹی نے کوئی چیز بھی رغبت سے نہیں کھائی تھی بس سونگھ کر ہی تعریف کے پل باندھ دیے تھے، پانی تک انہوں نے اپنے بیگ سے نکال کر پیا تھا۔ پتا نہیں وہ باہر سے آتے ہوئے اپنے ساتھ پانی کے کتنے ٹینکر لائی تھیں اور جب وہ پچ پچ کر کے الوداعی بوسے لے کر گئیں تو میری جان میں جان آئی۔ آج کے اس امتحان سے تو میں بہ آسانی نکل آئی تھی۔

"آجاؤ بچو......" میں نے سرشاری سے آواز نکالی۔

"اٹیک......" چھوٹی نند نے نعرہ لگایا اور وہیں بیٹھ کر سب بچوں نے اور میں نے بھی اس

ٹرالی پر ہلہ بول دیا۔ کوئی انگلی سے کھیر چاٹ رہا تھا تو کوئی چٹنی، میں تو چھولے چٹخارے لے کر کھا رہی تھی، میرا دیور دوپہر کی روٹی سے حلیم کھانے بیٹھ گیا۔ بچے کچھ گرا رہے تھے کچھ کھا رہے تھے۔ نند نے ایک دفعہ ڈانٹا بھی تو میں نے اشارے سے منع کر دیا۔

''آخر بچے ہیں، کھانے دو بعد میں صفائی ہو جائے گی۔'' پپو کی گڈو سے لڑائی ہوئی تو اس نے کیک اس کے منہ پر لگا دیا، گڈو کو غصہ آیا تو اس نے کیک کا پیس اس پر پھینکا، پپو نیچے بیٹھ گیا اور کیک کی ساری رنگ برنگی کریم میرے چہرے پر لگ گئی۔

اب بچے میری شکل دیکھ کر ہنس رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے، نند نے مارے خوشی کے دودھ کا ڈبا بجا کر ڈانس شروع کر دیا تھا۔

''ڈھم، ڈھم ڈھول باجے۔'' اور پھر واقعی سب کا ڈھول بج گیا۔

سطوت آنٹی نے دروازے کی گھنٹی بھی بجائی تھی مگر دروازہ کھلا دیکھ کر وہ اندر آ گئی تھیں اور ہم سب کو دیکھ کر خوف زدہ سی کھڑی تھیں۔ مارے تھکی کے کوئی لفظ ان کے منہ سے نہیں نکل رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جو میں نے کہا تھا کہ ہم کب کسی کو ڈرائیں گے آج سطوت آنٹی میرے ڈرائنگ روم میں خوفزدہ سی کھڑی تھیں۔ پاس پڑے کشن سے میں نے اپنا چہرہ پونچھ کر ان سے کہا۔

''آپ...... آپ تو چلی گئی تھیں......؟'' جیسے یقین نہیں تھا کہ وہ دوبارہ کیسے آ گئیں۔

''میرا چشمہ یہاں رہ گیا تھا، نظر کا چشمہ ہے ناں تو......'' انہوں نے کونے میں رکھی ہوئی ٹیبل سے اپنا چشمہ اٹھایا اور سرپٹ بھاگ گئیں۔ بچے جو یوں اچانک افتاد آنے پر ساکت ہو گئے تھے ان میں دوبارہ چابی بھر گئی۔

''اٹیک......'' گڈو نے چلا کر کہا اور میں نے وہی بڑے کا ڈونگا اٹھایا کہ دوبارہ مہمانوں کے آنے کا خطرہ نہیں تھا اور مجھے اپنے بچوں کے ساتھ ان ہی کے انداز میں کھا پی کر زیادہ مزہ آتا تھا۔

☆☆☆

میرا پلان

جب بھی میں یاسمین کا فون ریسیور کرتی ہوں، بے حد پریشان ہو جاتی ہوں۔ یاسمین کے پاس ہمیشہ وقت کی فراوانی ہوتی ہے اور وہ اس قدر طویل گفتگو کرتی ہے کہ میں بور ہو جاتی ہوں۔ کیا کھایا، کیا پکایا سے لے کر آج کتنی بار بجلی گئی اور آئی؟ کام والی ماسی نے کیا نئے بہانے بنائے اور اسٹار پلس کے ڈراموں میں منفی کردار کیسے ناچ نچا رہے ہیں۔ یاسمین سے بات کرتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ فون کا سلسلہ کس طرح ختم کروں مگر وہ اپنی باتوں کے شکنجے میں اس طرح کستی ہے کہ میں سوائے اس کی باتوں کے جواب میں ہوں، ہاں کرنے کے کچھ بولنے کی سکت نہیں پاتی حالانکہ میری عادت ایسی نہیں ہے۔ میں ناپسندیدہ لوگوں کو منہ تک نہیں لگاتی ہوں، ان کی جانب دیکھنا تک پسند نہیں کرتی ہوں مگر یاسمین کی ہر بات میں بظاہر بڑے شوق سے سنتی ہوں اس کی کسی بات سے اختلاف تک نہیں کرتی ہوں۔ اس کے بور سے جوک پر قہقہہ لگا کر اپنی شگفتہ مزاجی کا اظہار کرتی ہوں۔ جس کی صرف یہ وجہ ہے کہ یاسمین میری ہونے والی نند کا نام ہے۔ جو اسد کی منہ چڑھی بہن ہے۔

یاسمین میری ایسی نند ہے جو آفت کی پرکالہ ہے جس نے اپنی تمام بھابیوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ جس کے بارے میں میرا پلان یہ ہے کہ شادی کے بعد میں اسے اپنے گھر میں گھسنے بھی نہیں دوں گی۔

اس نے محبت سے اگر قدم بڑھایا بھی تو میں نفرت سے وہیں روک دوں گی...... آخر ہماری محبت کی شادی ہو رہی ہے اب اسد کو میری آنکھوں سے دنیا کو دیکھنا چاہیے، کیا خیال ہے......؟

☆☆☆



☆ کرن کمال، فیصل آباد

ہر ابتدا سے پہلے ہے ہر انتہا کے بعد
ذاتِ نبیؐ بلند ہے ذاتِ خدا کے بعد
دنیا میں احترام کے لائق ہیں جتنے لوگ
میں سب کو مانتا ہوں مگر مصطفیؐ کے بعد

☆ سیما گل...... ملتان

کوئی یزداں ہے یہاں کوئی فرشتہ ہے یہاں
کیا برائی تھی اگر آدمی انساں ہوتا

☆ اریب ناز...... سمہ سٹہ

ہوس کاروں نے جب سے بزمِ الفت میں قدم رکھا
وفا پہ حرف آیا آدمیت کو زوال آیا

☆ رفعت مبین رفی...... یو ایس اے

سفر میں عین ممکن ہے میں خود کو چھوڑ دوں لیکن
دعائیں کرنے والوں کا سہارا ساتھ رہتا ہے

☆ ناعمہ تحریم...... کراچی

یا اللہ میری ارضِ پاک کا قریہ قریہ
ہو سکون کا محور ہو امن کا گہوارہ
اس کے ہر خطے میں کریں خوشیاں راج
نہ ہو کوئی سانحہ پشاور جیسا دوبارہ

☆ رانی بانو...... ٹھٹھہ

مجھے اس طرح اپنی محبت میں مصروف کردے میرے اللہ
مجھے سانس تک نہ آئے تیرے ذکر کے بغیر

☆ ماہ رخ چوہدری...... حیدرآباد

مجھے کر عطا اے میرے خدا تو بہت بندہ نواز ہے
میری ہر صبح محتاج ہے تیری رحمتوں کے نزول کی

☆ شہزادی کائنات یونس...... کراچی

کبھی اٹکھیلیاں کرتا ہوا سے
کبھی تتلی کی خواہش میں مچلنا
ہمیں بھی راس آتا جارہا ہے
تمہارے غم کی بانہوں میں سنبھلنا

☆ ایمن رانی...... کمالیہ

بند ہوتی کتابوں میں اڑتی تتلیاں ڈال دیں
کس نے رسموں کی آگ میں لڑکیاں ڈال دیں

☆ قندیل رانی...... کمالیہ

راہ تاریک سہی پھر بھی ملے گی منزل
صرف ایک عزم کی قندیل جلادی جائے

☆ رابعہ عمران چوہدری...... رحیم یار خان

اور کچھ روز یہ چہرہ ہے یہ آنکھیں ہیں یہ خواب
اور کچھ روز رہے گا یہ تماشا ہم سے

☆ حمنیٰ قندیل...... کمالیہ

دل کے سب نقش تھے ہاتھوں کی لکیروں جیسے
نقشِ پا ہوتے تو مٹائے جاتے
شہرِ بے مہر کبھی ہم کو بھی مہلت دیتا
اِک دیا ہم بھی کسی رخ سے جلائے جاتے

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

ہماری پیاس بھی جیسے کوئی سمندر تھی
کہ پانی مانگنے دریاؤں تک نہیں آئے

☆ نازیہ نزی...... نوشہرہ کینٹ

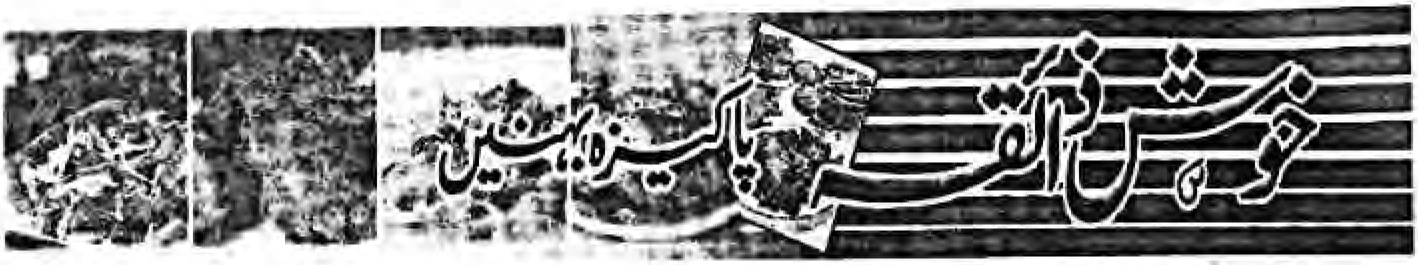
تمہیں معلوم نہیں تم نے کسے کھویا ہے
جب کبھی یاد کرو گے تو تڑپ جاؤ گے
منزلِ زیست ہر کسی کو کہاں ملتی ہے
اس کے اسرار میں ڈوبو تو سمجھ جاؤ گے

☆ ریحانہ حسن...... کراچی

کبھی جو دل میں رہتا تھا ہمارے
پرائی آنکھ میں اب بس گیا ہے

نہ اس سے تم کوئی امید رکھو
سحرؔ دنیا بڑی ہی بے وفا ہے
☆صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ
کچھ تو ہے جو کھٹک گیا ہے ہمیں
آپ کو جو ہمارا نہیں ہونے دیتا
☆نگینہ ضیا......کیماڑی کراچی
ستارے، پھول، جگنو، رنگ ہر اک شے ہے بے معنی
تمہارے ہجر کی شب، میں رخ مہتاب کیا دیکھوں
سحرؔ معلوم ہے مجھ کو نتیجہ دل لگانے کا
محبت کے صحیفے میں وفا کے باب کیا لکھوں
☆کوثر خالد......جڑانوالہ
اِک شمع ہدایت ہو اِک جذبہ شجاعت ہو
اِک فکرِ نیابت ہو اِک شوقِ شہادت ہو
ہوں امن کی کلیاں بھی ہوں پھولوں سی کلیاں بھی
ہر سو یہ کرامت ہو ہر کوئی سلامت ہو
☆یاسمین اسرار......کمالیہ
رکھ دے گا بدل کے وہ میرے روپ کی صورت
میں برف کا انسان ہوں تو وہ دھوپ کی صورت
☆فرحت احمد، کراچی
میری تنہائی کو میرا شوق نہ سمجھنا
بہت پیار سے دیا ہے یہ تحفہ کسی نے
☆رعنا امان اللہ......سرگودھا
اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا
یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھر نہ آئے گا
☆حمیرا نوشین......منڈی بہاؤالدین
ہماری سوچ کی پرواز کو روکے نہیں کوئی
نئے افلاک پر پہرے بٹھا کر کچھ نہیں ملتا
یہ اچھا ہے کہ آپس کے بھرم نہ ٹوٹنے پائیں
کبھی بھی دوستوں کو آزما کر کچھ نہیں ملتا

☆جبین نیاز......ملتان
سڑکیں زہر آلود نگر ویران ہوئے
ایسا پھیلا خوف کہ دل سنسان ہوئے
آدم خور درندے فارغ بیٹھ گئے
جب سے وحشت پر مائل انساں ہوئے
☆یاسمین کنول، پسرور
ڈھلنے لگی تھی رات کے تم یاد آگئے
پھر اس کے بعد رات بہت دیر تک رہی
☆مریم کاشف......حیدرآباد
میں حق پہ ہوں مگر میری گواہی کون دیتا ہے
کہ دنیا کی عدالت میں صداقت ہار دیتی ہے
☆ثمینہ کوکب......جہلم
مجھے جو بھی دشمنِ جاں ملا وہی پختہ کارِ جفا ملا
نہ کسی کی ضرب غلط پڑی نہ کسی کا تیر خطا ہوا
جو نظر بچا کے گزر گئے میرے سامنے سے ابھی ابھی
یہ میرے ہی شہر کے لوگ ہیں میرے گھر سے گھر ہے ملا ہوا
☆فریدہ افتخار......اسلام آباد
گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا
☆شازیہ افتخار......اسلام آباد
کوچۂ دوست سے آگے ہے بہت دستِ قبول
عشق والوں نے ابھی خاک کہاں چھانی ہے
☆فلک بنت ندیم......لطیف آباد
جھک کے ملنا عذاب ہے یارو
لوگ بزدل سمجھنے لگتے ہیں
☆معصومہ علی......منڈی بہاؤالدین
دلوں کو چیر دیتا ہے وہ عابدؔ
جو آنسو آنکھ سے گرتا نہیں ہے
☆مریم......لطیف آباد
کس نے پاک وطن کی خاطر اپنا آپ گنوایا ہے
کس نے گھر برباد کیا اور کتنا مال گنوایا ہے
ڈھلتا سورج ڈوب رہا ہے آؤ بیٹھ کے سوچیں تو
جانے والے سال میں ہم نے کیا کھویا کیا پایا ہے



خوش ذائقہ اور مزیدار ترین کھانے پسند کرنے والی پیاری بہنوں کی خدمت میں ڈھیروں سلام، دعائیں و پیار...... ان صفحات کے لیے آپ کے تعاون اور پسندیدگی کا شکریہ۔ سردیوں کے حوالے سے آپ کو مختلف تراکیب اور معلومات پسند آئیں یہی وجہ ہے کہ ہم ایک دفعہ پھر مچھلی، جو قدرت کا بہترین عطیہ ہے۔ اس کی معلومات اور تراکیب پیش کر رہے ہیں۔ موسم سرما کے پھل، سبزیاں، میوہ جات اور سمندری و آبی حلال مخلوق تو آج کل اپنی، اپنی حیثیت و استطاعت کے لحاظ سے دستر خوان کی زینت بن رہی ہے مگر آج ہم آپ کو یہ بھی بتائیں گے چونکہ ڈاکٹرز (ریڈ میٹ) گائے، بھینس، بکرے کے گوشت کے حوالے سے تحفظات پیش کرتے رہتے ہیں اس لیے اپنی غذاؤں میں اناج، سبزی اور انڈے، مرغی، مچھلی کو بھی حصہ بنانے کا کہتے ہیں۔ ان غذاؤں میں اعلیٰ معیار کی پروٹین ہوتی ہے جس طرح مرغی پالنے کا رواج عام ہے اس طرح بطخ، مرغابی و دیگر حلال پرندے پال کر ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ مچھلی کا گوشت عام طور پر کاربو ہائیڈریٹ سے محروم ہوتا ہے لیکن کچھرے دار مچھلی اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ ان میں کاربو ہائیڈریٹ گلائی کوجن ..... کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح مچھلی میں نمکیات (آئیوڈین) زیادہ پائے جاتے ہیں۔

مچھلی چاول

اشیا: مچھلی ثابت آدھا کلو۔ پامفرٹ یا چھوٹی مچھلیاں بھی لے سکتی ہیں) باسمتی چاول، آدھا کلو (ابال لیں۔ چاول پھریرے ہونے چاہئیں) لہسن، ادرک کا پیسٹ، آدھا، آدھا چائے کا چمچ۔ نمک، سرخ مرچ، کالی مرچ پسی ہوئی، حسب ذائقہ۔ اجوائن، ایک چٹکی بھر پسی ہوئی۔ پیاز، کٹی ہوئی دو کھانے کے چمچ۔ تیل، دو کھانے کے چمچ۔ ہری مرچ، پیاز سجانے کے لیے باریک کٹی ہوئی۔

ترکیب: مچھلی کا پیٹ اچھی طرح صاف کرلیں۔ لہسن، ادرک، نمک، مرچ اور اجوائن کو ایک پیالے میں ڈال کر مکس کرلیں پھر یہ آمیزہ مچھلی کے اندر باہر اچھی طرح لگادیں اور تقریباً بارہ گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ مچھلی کے اگلے مرحلے سے پہلے چاول ابال لیں۔ اب ایک کھلے منہ کے برتن میں پیاز گولڈن براؤن کرلیں اور اس میں مچھلی ڈال دیں۔ پانی کا ہلکا سا چھینٹا ڈال کر آنچ ہلکی رکھیں۔ پانی خشک ہوجائے اور ایک جانب سے مچھلی پک جائے تو نہایت احتیاط سے پلٹ دیں اور دوسری طرف سے بھی پکالیں۔ اب ایک ڈش میں گرم، گرم چاول نکال کر اس پر مچھلی رکھ دیں اور ہری مرچ اور پیاز سے سجالیں۔ دم پخت مچھلی چاول تیار ہے۔ اسے مختلف چٹنیوں کے ساتھ پیش کرسکتی ہیں۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

جھینگے اور بندگوبھی کے سینڈوچ

اشیا: بند گوبھی (کرم کلہ) ایک پیالی، جھینگے، آدھی پیالی ابال لیں۔ انڈے، چھ عدد۔ نمک، کالی مرچ، حسب ذائقہ۔ ہرا دھنیا، ہری مرچ باریک کٹی ہوئی۔ میٹھا سوڈا، چٹکی بھر۔ مکھن، درمیانے سائز کی ایک ٹکیا۔ ڈبل روٹی کے سلائس، حسب ضرورت۔ مایونیز ..... ساس، سلائس پر لگانے کے لیے۔

ترکیب: انڈوں میں سوڈا، کالی مرچ، نمک، ہرا دھنیا اور ہری مرچ ڈال کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں پھر کٹا ہوا کرم کلہ اور ابلے ہوئے جھینگے بھی ڈال لیں اور مکس کریں۔ اب فرائی پین میں مکھن گرم کر کے اس آمیزے کو تل لیں۔ یہ آملیٹ کی صورت ہوگا۔

گھریلو ٹوٹکے

☆ چاولوں کے کنستر کے پیندے میں نیم کی سوکھی پتیاں رکھ دیں تو کنستر میں کیڑے مکوڑے داخل نہیں ہوں گے۔

☆ پرانے ناریل کو تازہ کرنے کے لیے نیم گرم دودھ یا پانی میں دو گھنٹے بھگوئے رکھیں اور فریج میں بھیگا ہوا ناریل رکھیں۔

☆ لیموں کے رس کو محفوظ کرنا چاہیں تو اس کو شیشے کی بوتل میں ڈال دیں اور تھوڑی مقدار میں کھانے کا کوئی سا تیل ٹپکا دیں۔ رس محفوظ ہو جائے گا۔

ڈبل روٹی کے ایک سلائس پر مایونیز لگائیں اور آملیٹ کے ٹکڑے رکھیں پھر دوسرا سلائس رکھ کر ہتھیلی سے دبا لیں۔ اسی طرح سینڈوچ بناتی جائیں اگر خواہش ہو تو یہ سینڈوچ میکر میں بھی بنا سکتی ہیں۔ ٹماٹو ساس کے ساتھ بہت مزہ دیں گے۔

مرسلہ: نکہت آصف، اسلام آباد

اسٹیمڈ فش (بھاپ میں تیار کردہ مچھلی)

اجزا: ایک پامفریٹ جسے عرفِ عام پاپلیٹ کہا جاتا ہے۔ پانچ سو گرام، ہری پیاز، ایک پاؤ۔ اجوائن، ایک چٹکی۔ کالی، لال مرچ و نمک، حسبِ ذائقہ۔ ادرک، پسی ہوئی۔ اجینوموتو، ایک چٹکی۔ ٹماٹر، ایک درمیانہ گول کاٹ لیں، سویا ساس، ایک کھانے کا چچ۔

ترکیب: ثابت مچھلی صاف کر کے اچھی طرح دھولیں پھر اس کی اوپری سطح پر تین کٹ لگائیں تاکہ مسالا اچھی طرح رچ جائے، اب ہری پیاز اور ٹماٹر کے علاوہ تمام اشیا مکس کر کے مچھلی میں ملا کر میرینیٹ کر کے فریج میں رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں کٹی ہوئی پیاز اور ٹماٹر دو قطرے تیل میں الٹ پلٹ کریں۔ اور مچھلی اس میں ڈال کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو ڈش میں نکال لیں اور گرین سلاد اور چٹنی یا کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

مرسلہ: زرینہ خان، بہارہ کہو

گولڈن چکن

اشیا: مرغی کا گوشت آدھا کلو، سفید لوبیا، (ابلا ہوا) آدھی پیالی۔ ادرک لہسن پیسٹ، ایک کھانے کا چچ۔ پیاز، ٹماٹر، دو درمیانے چوکور کاٹ لیں۔ کینو، ایک عدد۔ کالی مرچ اور نمک، حسبِ ذائقہ۔ سفید زیرہ، پسا ہوا ایک چائے کا چچ۔ پسا گرم مسالا، آدھا چائے کا چچ۔ کوکنگ آئل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: ایک برتن میں آئل ڈال کر تیز پات اور لہسن ادرک ڈال کر ہلکا سا فرائی کریں۔ پھر اس میں پیاز ڈال کر گولڈن فرائی کریں اب چکن ڈال کر فرائی کریں پھر اس میں نمک، کالی مرچ، ٹماٹر اور زیرہ شامل کر کے گلنے پر رکھ دیں۔ آخر میں کینو کا رس اور کینو کے باریک کٹے ہوئے چھلکے جو ایک کھانے کا چچ ہو...... ڈالیں پھر ابلا لوبیا ڈال کر دم پر رکھیں اور نکالنے سے پہلے پسا گرم مسالا ڈال کر سرو کریں۔ اوپر سے ہری مرچ، ہرا دھنیا بھی چھڑک سکتے ہیں۔

کوئیک چاکلیٹ کیک

اشیا: انڈے، دو عدد۔ آئل، آدھا کپ۔ پسی ہوئی چینی، آدھا کپ سے زائد۔ بیکنگ پاؤڈر، دو چائے کے چچ۔ میدہ، آدھا کپ۔ دودھ، آدھا کپ۔ ونیلا ایسنس، دو سے تین قطرے۔ کوکو پاؤڈر، تین ٹیبل اسپون۔

ترکیب: ایک برتن میں تمام اجزا ڈال کر خوب مکس کر لیں بیٹر میں یا چاپر میں بھی کر سکتی ہیں۔ خوب جھاگ سا بن جائے تو ایک شیشے کے برتن میں (سراکس کا ہو) ڈال کر آٹھ منٹ تک مائیکرو ویو میں رکھ دیں۔ مائیکرو ویو کا ٹمپریچر وہی ہو جو آپ کھانا گرم کرنے کے لیے فکس رکھتے ہیں۔ بس ٹائم اور اجزا کے تناسب کا خیال رکھیں۔ پلاسٹک کا برتن مائیکرو ویو میں رکھنے سے احتیاط کریں۔ ویسے تو عام طور پر وہی رکھے جاتے ہیں مگر جدید تحقیق کے مطابق یہ درست نہیں......

مرسلہ: بتینن، کراچی



حسن نکھار لے

مہ جبین

☆ جبیں نیاز......ملتان

میرے ناخن رفتہ رفتہ کھردرے ہوتے جارہے ہیں۔ یعنی کہ ناخنوں کی اوپری سطح جو ہموار اور چمکدار ہوتی ہے اب غیر ہموار ہو رہی ہے کوئی آسان ساحل بتائیں۔

☆ آپ کسی اچھے معالج سے بھی جلدی رجوع کیجیے اور اپنی خوراک میں دودھ سے تیار کردہ اشیا شامل کریں۔ علی الصباح سورج کی ٹھنڈی کرنوں کا فائدہ اٹھائیں۔ متوازن اور زود ہضم خوراک استعمال کریں۔ ویسے آپ دو ٹیبل اسپون کوکنگ آئل میں دو لہسن کے جوئے چھل کر چند سیکنڈ کے لیے گرم کریں اور ٹھنڈا کر کے ایک شیشے کی بوتل میں رکھ لیں اب دن میں دو تین مرتبہ اس آئل سے انگلیوں اور ناخن کا ہلکے، ہلکے مساج کریں اور ایک گھنٹے بعد کسی بھی صابن یا ہینڈ واش اور نیم گرم پانی سے دھولیں۔ اس کے علاوہ غیر معیاری ڈیٹرجنٹ بلیچ اور دیگر واشنگ پاؤڈر اور صابن سے براہ راست بچائیں......گلوز کا استعمال کریں۔

☆ ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک

باجی میں ایک مسئلہ لے کر آئی ہوں کہ چہرے کے دانوں کے بعد میں داغ دھبے کس طرح جاسکتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ سبزیوں کے رس سے بھی علاج ہو جاتا ہے، میں کسی اسکن ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتی۔

ج: اول تو آپ چہرے کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ غیر معیاری فیس واش اور کریموں سے اجتناب کریں۔ تلی ہوئی اور چٹپٹی چیزوں کو چھوڑ دیں۔ جہاں تک سبزیوں سے علاج کا تعلق ہے تو آپ ہری سلاد اور کچی سبزیوں کو غذا کا جز بنائے رکھیں۔ سفید میٹھی مولی کا رس چہرے پر لگائیں۔ کلینزنگ کے لیے مولی کو چھل کر بیس منٹ تک چہرے پر لگائیں پھر سادہ پانی سے دھولیں۔ مولی کے رس میں دہی ملا کر چہرے پر لگائیں اگر آپ مولی کھانے کے بعد ناگوار بو یا ڈکار سے پریشان ہیں تو مولی کے چھوٹے والے پتے کھائیں یا گڑ کا ڈلا کھالیں......آج کل تو موسم ہے مولی کے عرق سے فائدہ اٹھائیں۔

☆ نگہت اعوان......سرگودھا

باجی میں اپنی کہنی اور ہاتھ کی انگلیوں کے جوڑ کی سیاہی سے بہت پریشان ہوں۔ اس کا کوئی علاج بتائیں۔

جواب: پیاری بہن عام طور پر ہم چہرے کی صفائی کر کے سمجھتے ہیں کہ ہاتھ، پاؤں کی صفائی کی کیا ضرورت ہے مگر یہ بھی اتنی ہی اہمیت کے حامل ہیں جتنا کہ چہرہ......کہنی پر باقاعدگی سے لیموں کاٹ کر ملیں اگر استعمال شدہ لیموں بھی ہے تو کوئی بات نہیں......اس کے علاوہ کوئی بھی کولڈ کریم لگا کر تھوڑا سا مساج کر کے کاٹن سے صاف کریں اور کسی بھی بیوٹی سوپ سے دھولیں۔ ہر نسخے کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم تین مہینے تک عمل کیا جائے۔ کسی قسم کے ردعمل کی صورت میں فوراً ماہر حسن سے رابطہ کیجیے......یاد رکھیے اپنی جلد کی حفاظت اور نگہداشت آپ کا اپنا فریضہ ہے اسے بخیرو خوبی انجام دیجیے۔

چہرے کی جھریاں دور کرنا

1۔ رات کو سونے سے پہلے چہرہ دھو کر کوئی بھی لوشن یا کریم لگا کر سوئیں۔

2۔ موسمی اثرات سے جلد کھردری اور جھریوں والی ہو جائے تو کھیرے اور رس بھری کا رس چہرے پر لگائیں۔ پھر پانی سے دھولیں۔

3۔ خشک جلد پر جھریوں کے لیے کچا دودھ چہرے پر ملیں۔ بالائی یا دودھ کا مساج کرنے کے بعد دھوپ میں جانے سے پرہیز کریں اسی لیے اسے رات میں استعمال کرتے ہیں اور صبح ہی چہرہ اور گردن دھولیتے ہیں۔



بزمِ پاکیزہ پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆مس مونا وقار......لاہور

سوال: اپنا بچہ روئے تو دل میں درد ہوتا ہے اور دوسرے کا روئے تو؟

جواب: سر میں درد ہوتا ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆مسز قاسم......کراچی

سوال: کسی کو یہ بتانے کا بہترین طریقہ کیا ہوگا کہ انہوں نے اچھا نہیں کیا؟

جواب: خاموشی، خاموشی، صرف خاموشی۔

☆ناعمہ تحریم......ملیر ہالٹ کراچی

سوال: تعریفوں کے پل کون سے دریا پر باندھے جائیں؟

جواب: دریائے خوشامد زیادہ بہتر رہے گا۔

☆ایمن ....پنجاب

سوال: بچپن کے کھانے اور پچپن کے کھانے میں کیا فرق ہے؟

جواب: بچپن میں جو والدین کھلائیں وہ کھاتے ہیں اور پچپن میں تو جو دل چاہے اور جو ڈاکٹر منع کریں وہ سب کھاتے ہیں۔

☆مس روا اقبال......اوکاڑہ

سوال: اگر آنسو اور غصہ بیک وقت آجائیں تو آنسوؤں کو پہلے پینا چاہیے یا غصے کو؟

جواب: میرے خیال سے پہلے خوب ہنسنا چاہیے اور پھر اپنی ہنسی میں غصہ اور آنسو دونوں اڑا دینا چاہیے۔

☆ارم کمال......فیصل آباد

سوال: آہ سے واہ تک پہنچنے کے لیے کیا، کیا کرنا پڑتا ہے......؟

جواب: پہلے میر تقی کا کلام سمجھ کر پڑھیں اور پھر غالب کا ازبر کرلیں...... آہ سے واہ تک کا سفر طے ہوجائے گا۔

☆مسز فرح امجد......لاہور

سوال: ایک دلہن کی رخصتی دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، کیوں؟

جواب: وہ خوب دھوم دھام سے رو رہی تھی...... اپنے میک اپ کی پروا کیے بغیر......

☆شائلہ سہیل جاوید......کراچی

سوال: کیا اس سال میاں جی سدھر جائیں گے...... اگر وہ نہیں سدھرے تو پھر ہم کہاں جائیں گے؟

جواب: نہ میاں جی سدھر جائیں گے اور نہ ہی آپ کہیں جائیں گی اور یہ تُو تُو میں، میں اس سال بھی خوش اسلوبی سے چلتی رہے گی۔

☆رضوانہ سمیع......کراچی

سوال: ذرا ڈھولکی بجاؤ گوریو میرے سنگ سنگ گاؤ گوریو...... بھلا کیوں؟

جواب: آپ کے ہاں دال میں کچھ لال، لال ہونے والا ہے، ہے ناں......

☆گلناز گل......ملتان

سوال: میرے میاں جی کا موڈ ہر وقت آف ہی کیوں رہتا ہے؟

جواب: ناشکرے لوگ بدمزاج زیادہ ہوا کرتے

ہیں۔

☆ شہزادی......فیصل آباد

سوال: نئے سال نے ہمیں آتے ہی کیا دیا؟

جواب: خوب صورت امیدیں۔

☆ فرحانہ پروین......راول پنڈی

سوال: لوگ کہتے ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے......سچی میں؟

جواب: جھوٹ کہتے ہیں لوگ...... محبت کرنے والوں کو تو اتنا زیادہ نظر آتا ہے جتنا کہ ہوتا بھی نہیں ہے۔

☆ بہن س ش......اسلام آباد

سوال: ایک محترمہ کہہ رہی تھیں کہ شادی کے دس ماہ میں ان کے میاں نے ان کو ایک انگوٹھی تک کا گفٹ نہیں دیا......کیا واقعی؟

جواب: مگر وہ محترمہ تو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ بیوی کا اصل زیور اس کے شوہر کی شخصیت ہوا کرتی ہے۔

☆ فصیحہ آصف خان......ملتان

سوال: کبھی جی میں آیا تو بات کرلی
کبھی یہ ہوا کہ حال تک نہ پوچھا......ایسے لوگ کہاں پائے جاتے ہیں؟

جواب: یہ تو سرکاری اسکولز کی ان بدمزاج ہیڈ مسٹریس کی طرف اشارہ ہے جو اپنے چچوں کے سوا کسی سے بات تک نہیں کیا کرتی ہیں۔

☆ ساجدہ ظفر......کمالیہ

سوال: نادان مال کو اور عقل مند کمال کو ڈھونڈتا ہے......عام آدمی کیا ڈھونڈتا ہے؟

جواب: عام آدمی کو اگر شیر مال، قورمہ مل جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کی موج مستی ہوگئی۔

☆ نایاب کرن صدیقی......کمالیہ

سوال: میں نے مکان بدل لیا ہے، اب کیا کروں......؟

جواب: اب اسے گھر بنانے کی کوشش کرو۔

☆ ایمن زریاب ڈوگر......ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: دل کی عمارت کی ٹوٹ پھوٹ، مرمت اور جھاڑ پونچھ کی دکان کہاں ملے گی؟

جواب: ادارۂ قلب میں ایڈمٹ ہونا پڑے گا بھئی۔

☆ صائمہ سجاد بخش......کوہاٹ

سوال: دل کرتا ہے، سب اڑا دوں؟

جواب: ہاں ہنس کر اڑا دو......لوگوں کی تمام دل دکھانے والی باتیں۔

☆ نازگل......شکار پور

سوال: یہ رات بھر تارے کون گنتے ہیں؟

جواب: مردم شماری کے محکمے کے لوگ ہوں گے کہ کس علاقے میں کتنے نام ڈالنے ہیں۔

☆ مسز صنوبر......پنجاب

سوال: گھر میں داخل ہوکر میری شکل دیکھ کر انہیں غصہ کیوں آجاتا ہے؟

جواب: آپ کو میک اپ کرنا نہیں آتا اور اتنا زیادہ کرلیتی ہیں کہ سرکس والی لگتی ہیں تو ظاہر ہے کہ...

☆ اعیہ......کراچی

سوال: اگر اس سال بھی میرے سسرال کے ماحول میں کوئی مثبت اور نئی تبدیلی نہیں آسکی تو......؟

جواب: تو پھر......تو تمہیں کورٹ میں جانا ہوگا۔

☆ نورافشاں......شکار پور

سوال: دل دیتا ہے رو رو دہائی......؟ کیا دیتا ہے؟

جواب: یہی کہ......کسی سے کوئی نفرت نہ کرے
بڑی مہنگی پڑے گی ہر جدائی
کسی سے کوئی نفرت نہ کرے

☆ فریدہ بانو......راول پنڈی

سوال: باجی شعر کا جواب نثر میں دیں۔
ہمیں نظروں سے اس نے دور رکھا
نہ پوچھو کس قدر مجبور رکھا

جواب: بھئی دوسری بیوی عموماً زیادہ لاڈلی ہوا کرتی ہے اس لیے اُن کی مجبوری تھی کہ نئی دلہن آنے کے بعد پرانی والی سے دور ہی رہتے۔

☆☆☆



ادارہ

روحانی مشورے

فضائل سورۂ یٰسین

قرآن مجید کا دل جس سورت کو کہا جاتا ہے وہ سورۂ یٰسین ہے۔ اس کے پڑھنے کے بے پناہ فوائد ہیں۔ ہر طرح کی حاجت روائی اس کی تلاوت میں مضمر ہے اور خاص کر اسے پڑھنے سے اللہ بہت راضی ہوتا ہے۔ احادیث میں اس کے لیے بے پناہ فضائل بیان ہوئے ہیں......ان میں سے چند احادیث یہ ہیں۔

1۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جس نے رات کے وقت یٰسین شریف پڑھی اس حالت میں صبح کو اٹھے گا کہ وہ بخشا ہوا ہوگا۔

(ابن کثیر)

2۔ حضرت جندب بن عبداللہؓ سے روایت ہے جس نے رات میں اللہ کے لیے سورۂ یٰسین پڑھی اس کو بخش دیا جائے گا۔

(تفسیر ابن کثیر)

3۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا......قرآن میں ایک سورت ہے جو اللہ کے نزدیک بڑی عظمت والی ہے جو اسے پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کو شریف کے لقب سے نواز دے گا اور ربیعہ اور معنر کی تعداد سے بھی زیادہ افراد کے لیے اس سورت کے پڑھنے والے کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ (ربیعہ اور معنر عرب کے دو مشہور قبیلے تھے اور ان سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد بہت زیادہ تھی)

4۔ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص یٰسین شریف پڑھے اسے دس قرآن مجید پڑھنے کا ثواب ملے گا۔

5۔ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ہر ایک چیز کا ایک دل ہوتا ہے، قرآن پاک کا دل سورۂ یٰسین ہے جو یٰسین شریف پڑھے گا اسے اس کی قرات کی وجہ سے دس بار قرآن مجید پڑھنے کا ثواب ملے گا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا۔

(تفسیر خازن)

حضرت معقل بن یسارؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی رضامندی کے لیے جو شخص یٰسین پڑھے گا اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ لہٰذا اس سورت کو مرنے والوں کے پاس پڑھا کرو۔

(بیہقی، شعب الایمان)

7۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری یہ تمنا ہے کہ یہ سورۂ یٰسین ہر امتی کے دل میں ہو

(تفسیر ابن کثیر)

8۔ حضرت عطا بن رباح تابعی سے، مروی ہے کہ مجھے یہ حدیث پہنچی کہ جو آدمی دن کے آغاز میں سورۂ یٰسین شریف پڑھے گا اس کی تمام ضروریات پوری کردی جائیں گی۔

(داری)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ یٰسین پڑھنے سے دین و دنیا میں ہر قسم کی بھلائی حاصل ہوتی ہے۔

اگر کوئی شخص اس سورت کو بعد نمازِ فجر ایک مرتبہ پڑھنے کا معمول بنالے تو بہت جلد لوگوں میں مقبول ہوجائے گا۔ اس کی عزت میں بے پناہ اضافہ ہوگا، مال میں برکت ہوگی، ہر قسم کی برائی ختم ہو کر طبیعت

میں اچھائی کا رجحان پیدا ہوگا۔ شیاطین اور بلیات سے محفوظ رہے گا۔ بیماریوں سے شفا ملے گی۔ اگر اولاد کی خواہش کرے گا تو نیک اولاد ملے گی اگر کوئی قید میں ہے اسے کثرت سے پڑھے تو قید سے رہائی ملے گی۔ مختصر یہ کہ آپ کے دل میں جو بھی مثبت خواہش ہو وہ سورۂ یٰسین پڑھنے سے پروردگار اپنی رحمت سے پورا کرے گا۔ دشمنوں سے بچنے کے لیے بھی سورۂ یٰسین بے حد مفید ہے۔

خصوصی نفل

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی گھر سے نکلتے ہیں تو دو رکعت پڑھ کر نکلتے ہیں۔ لہٰذا دو رکعت کا اہتمام ہر مرد و عورت کو کرنا چاہیے، فرضوں کے اہتمام کے ساتھ، ساتھ ان نوافل کا اہتمام خیر و برکت کا سبب ہوگا اور گھروں سے جھگڑوں کے ختم ہونے کا ذریعہ ہوگا۔ شوہر اور والد کو چاہیے کہ گھر میں داخل ہوتے ہی سلام کر کے پہلے دو رکعت نفل پڑھے پھر کوئی بات وغیرہ کرے، اسی طرح گھر سے نکلتے ہوئے دو رکعت نفل پڑھ کر نکلے...... انشاء اللہ تعالیٰ اس کے اہتمام سے گھروں کی بہت سی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

انس و محبت کے لیے

1۔ منزل پڑھنے کا اہتمام کریں۔ اور گھر میں دم کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بھی بہت فائدہ ہوگا۔

2۔ آیت کریمہ سو مرتبہ پڑھ کر محبت کے لیے دعا مانگیں۔

3۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ 40 مرتبہ پڑھ کر دعا مانگیں۔

4۔ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ پانچ سو مرتبہ یا ستر مرتبہ یا سات مرتبہ پڑھ کر دعا مانگے، اے اللہ! ہم دونوں میاں بیوی میں محبت پیدا فرما۔

ان وظائف کے اہتمام سے بہت ہی فائدہ ہوگا۔ مستقل پابندی سے پڑھیں اور اہتمام سے گناہوں سے بچیں اور کوشش کریں کہ کسی طرح کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جس سے اللہ تبارک و تعالیٰ ناراض ہو جائے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ناراضی کے ساتھ دنیا و آخرت کی کوئی نعمت حاصل نہیں ہو سکتی اور بشری تقاضے سے اگر کبھی گناہ ہو بھی جائے تو آئندہ نہ کرنے کی نیت سے فوراً توبہ واستغفار کرے۔

ایک جامع دعا جس میں حضورؐ کی 23 سال کی دعائیں موجود ہیں

ہر مسلمان مرد و عورت کو چاہیے کہ ہر فرض نماز کے بعد اس دعا کو ایک مرتبہ پڑھ لے تو بہت ہی بہتر ہے۔ چھوٹے بچوں کو بھی بچپن سے یہ دعا یاد کروا دینی چاہیے۔ اس دعا میں تمام بھلائیاں اللہ تبارک و تعالیٰ سے مانگی گئی ہیں اور تمام برائیوں، مصیبتوں سے حفاظت کی دعا مانگی گئی ہے۔

حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت زیادہ دعا مانگی لیکن ہمیں اس میں سے کچھ یاد نہ رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کیا میں تمہیں ایسی جامع دعا نہ بتاؤں جس میں یہ سب کچھ آ جائے؟ تم یہ دعا مانگا کرو۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْاَلُکَ مِنْ خَیْرِ مَا سَاَلَکَ مِنْہُ نَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَ مِنْہُ نَبِیُّکَ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْکَ الْبَلَاغُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ

ترجمہ ”اے اللہ! ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں ان تمام بھلائیوں کا جن کا سوال کیا تجھ سے تیرے حبیب پاکؐ نے اور ہم تیری پناہ چاہتے ہیں ان تمام شرور سے جن سے پناہ چاہی حضرت محمدؐ نے اور تو ہی وہ ذات ہے جس سے مدد مانگی جاتی ہے اور تو ہی دعا قبول کرنے والا ہے۔ نہیں گناہوں سے بچنے کی طاقت مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی حفاظت سے اور نہیں ہے نیکی کی قوت مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد سے۔“



شوابے ہومیو کلینک

SCHWABE

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

چھینکوں کی الرجی

افشاں۔ کوہاٹ

مجھے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھنا ہے، اس کو چھینکوں کی الرجی ہے، ریشہ بھی حلق میں گرتا ہے اور ناک کے اندر خارش بھی ہوتی ہے۔ تین ماہ پہلے ناک کا آپریشن کروایا ہے جس سے پہلے سے تو بہتر ہے مگر ابھی تک مکمل آرام نہیں آیا۔ بعض وقت چھینکیں نہیں آتیں اور بعض وقت بہت زیادہ آتی ہیں پھر اینٹی الرجی دوا لینی پڑتی ہے۔

جواب: جب ناک کا گوشت یا ہڈی بڑھی ہوئی ہوتی ہے تب بھی اس طرح چھینکیں آتی ہیں۔ کولڈ ڈرنک، تیز ٹھنڈے پانی کا استعمال بند کریں۔ نہانے کے بعد سینے پہ ہوا نہ لگائیں، اے سی میں نہ آئیں یعنی گرم ٹھنڈا اور ٹھنڈا گرم نہ کریں۔ وضو کرتے وقت ناک میں پانی اوپر تک چڑھائیں۔ ایک دو مرتبہ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر اس کو ناک میں اوپر چڑھایا کریں ۔۔۔۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ تک استعمال کریں۔ پھر تفصیل کے ساتھ حال بتائیں

Natr.mur.30

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اپریل 2016

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

Teucrium Marum 30, Belladona 30, کے 7,7 قطرے ہر شیشی میں سے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔

کیلشیم اور خون کی کمی

فرح خان۔ کراچی

ڈاکٹر صاحب بہت امید سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ بہت عرصے سے آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں، بہت خوشی ہوتی ہے جس طرح آپ لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں، وہ بھی بلا معاوضہ میرے مسائل بہت بڑھ چکے ہیں، کئی ماہ پہلے میں نے خط لکھا تھا لیکن مجھے کلینک پر آنے کا کہا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میں کلینک پر نہیں آسکتی، پلیز مجھے میڈیسن بتا دیجیے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ مجھے 13 سال کی عمر سے لیکوریا ہے۔ 15 سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ پاؤں لٹکا کر بیٹھتی ہوں تو ایڑھی میں شدید تکلیف ہوتی ہے خاص طور پر سیدھے پاؤں میں۔ سبزی بناتے میں، لکھنے میں، کپڑے دھونے میں ہاتھوں میں درد ہوتا ہے۔ رگیں پھول گئی ہیں، گلٹیاں بھی ہو گئی ہیں ابھار کی طرح۔ ڈاکٹر نے کہا کیلشیم اور خون کی کمی ہے۔ پہلی بیٹی کے بعد تین بچے پری میچور ہوئے۔ جن میں سے ایک کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ 13 سال پہلے بچی کی پیدائش کے وقت بلڈ چڑھنے کے بعد سے میرے جسم پر تل ہونے شروع ہو گئے جو مسے بن جاتے ہیں۔ بلیک براؤن اور ریڈ کلر کے جو بہت برے لگتے ہیں۔ گرمیوں میں خارش ہوتی ہے۔ اب تو گردن کے بعد چہرے اور ہاتھوں پر بھی پھیل رہے ہیں۔ پلیز اس کے لیے کوئی اچھی سی دوا بتا دیں تاکہ یہ ختم ہو جائیں۔ بال بہت سفید ہو رہے ہیں، جھریاں پڑ رہی ہیں ہاتھوں پیروں میں۔ قبض رہتا ہے دو تین دن تک، پیٹ بہت زیادہ پھول رہا ہے، اٹھتے بیٹھتے ہڈیوں اور گھٹنے سے آوازیں آتی ہیں، یادداشت کمزور ہو گئی ہے، آنکھوں میں بلیک نقطے اور لکیریں نظر آتی ہیں کمر میں درد رہتا ہے اور الٹی طرف گردے میں درد ہوتا ہے۔ میں ہومیوپیتھک دوا لے رہی ہوں زیادہ فرق نہیں پڑا۔ آپ مجھے ایسی دوا بتا دیں جس سے میں ٹھیک ہو جاؤں۔ مجھے اپنے بچوں کو سنبھالنا ہے ان کا خیال نہیں رکھ پاتی، سارے گھر کے کام مجھے ہی دیکھنا ہوتے ہیں، بہت چڑچڑی ہو گئی ہوں۔

جواب: مریض کی بہتری و بھلائی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ معالج سے اپنا چیک اپ کرائے، اس کی تشخیص کے مطابق علاج کرائے۔ خطوط کب ملے، کب ان کا جواب ملتا ہے۔ اس دوران مرض کیا شکل اختیار کرتا ہے۔ آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ بہرحال آپ کی فرمائش پر آپ کو ادویات تجویز کر رہے ہیں۔ پھل، سبزیاں، گوشت اور دالوں کا استعمال مناسب مقدار میں کریں۔ ہلکی پھلکی ورزش بھی کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Borax30, Secale.cor30, Calc. Carb30, Thuja30 کے 7,7 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ڈال کر دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ Ferrum Pentarkan Ptk45 کی دو گولیاں تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ لیں۔ بچوں کا حال تفصیل سے لکھیں الگ الگ۔ ایک ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

لکنت، بلڈ پریشر، ناک کا گوشت

عظمیٰ منیر۔ کوئٹہ

ہومیو کلینک میں لوگوں کو آپ کے علاج سے فیض یاب ہوتے دیکھا تو آج میں بھی آپ کے پاس اپنے دو تین مسائل لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرا خط ضرور شامل کریں گے اور

میری مدد کریں گے۔ میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرا بیٹا جس کی عمر ڈھائی سال ہے اس نے بولنا شروع کیا تو اس کی زبان بالکل صاف تھی لیکن اب تین، چار ماہ سے وہ بولتے ہوئے ہکلاتا ہے اور ایک لفظ کو تین چار بار بولتا ہے۔ رال بہنے سے وہ نیند سے بیدار ہو جاتا ہے اور بہت روتا ہے۔ یہی مسئلہ میرے شوہر کو بھی بچپن سے ہے۔ اور میرے بیٹے کو اکثر پیٹ میں بھی درد ہوتا ہے۔ پیٹ کے کیڑوں والی دوائی بھی دی ہے اور ڈاکٹر نے اس کے کچھ ٹیسٹ بھی کرائے ہیں، شکر ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں آیا لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس کے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔

دوسرا مسئلہ میرے شوہر کا ہے۔ وہ بتاتے ہیں انہیں 17 سال کی عمر سے ہائی بلڈ پریشر کا مسئلہ ہے۔ اب اکثر ان کی رگیں کھنچ جاتی ہیں جسم کی اور ان کے گھٹنوں میں بھی بہت درد ہوتا ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے حلق میں ریشہ گرتا ہے اور ناک میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ ہے۔ سانس لینے میں مسئلہ ہوتا ہے اکثر سوتے میں ریشہ حلق میں گرنے سے میرا دل بھی خراب ہوتا ہے۔ میں سارا دن ریشہ تھوکتی رہتی ہوں۔ برائے مہربانی میرے ان مسائل کا حل ضرور بتایئے گا۔ مجھے انتظار رہے گا اور یہ بھی بتائیں کہ دوائی کتنا عرصہ استعمال کرنی ہے؟

جواب نمبر1: ایسا جب ہوتا ہے کہ جب بچے کو ڈانٹا، مارا یا ڈرایا یا خوف زدہ کیا جائے، بچے کو پیار و محبت دیں۔ اس کو کہیں کہ جلدی جلدی نہ بولے بلکہ آرام سے ٹھہر ٹھہر کر بولے۔ آپ کے شوہر بھی اور آپ بھی صبر اور حوصلے سے کام لیں۔ بچے کے سامنے لڑیں یا جھگڑیں مت، بچے کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ایک خوراک Ignatia200 کی دیں، اس کے 2 دن بعد Stramonium30 کے 5,5 قطرے دن میں 3 مرتبہ دیں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

جواب نمبر2: شوہر سے کہیں کہ Blood CP، Lipid Profile، ESR، HbA1C، Renal Function Test، Thyroid Profile کرائیں۔ 17 سال کی عمر میں بی پی ہرگز نہیں بڑھنا چاہیے، اس طرح یہ گردوں پر اثر ڈالے گا، شوگر بھی بڑھ سکتی ہے۔ اپنی فیملی ہسٹری بھی دیں تاکہ دوا صحیح تجویز ہو۔

جواب نمبر3: آپ کی ناک کا گوشت یا ہڈی بڑھے ہونے کا مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ دھول مٹی اور تیز خوشبو سے بچیں، ٹھنڈ اور ٹھنڈی چیزوں سے بچیں۔ 4/5 مرتبہ نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر اس کو ناک میں اوپر تک چڑھائیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل میڈیسن استعمال کریں Cinnabaris Pentarkan Ptk31 کی 3,3 گولیاں دن میں 3 مرتبہ چبا کر کھائیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

حالت بہتر ہے!

عروبہ شجاعت۔ اسلام آباد

پچھلے چار ماہ سے آپ کی بتائی ہوئی ادویات استعمال کر رہی ہوں۔ اللہ کے کرم سے چہرے کے بال کم ہو رہے ہیں۔ حافظہ بہتر ہو رہا ہے اور سر کا گمن ہونا بھی بہتر ہے۔ پچھلے 4 ماہ سے ماہانہ ایام بھی ریگولر ہوتے ہیں۔ مجھے گنج پن کا مسئلہ بھی ہے۔ سر کے بال سامنے سے بہت کم ہیں کہ جلد دکھائی دیتی ہے۔ بال دو منہ بھی ہیں۔

جواب: جو دوائیاں تجویز کی ہیں ان کو اب صرف صبح و شام لیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Kreosotum30, Graphite30 بھی لیں۔ ایک

ماہ بعد حال بتائیں۔ نمبر ڈائجسٹ والوں سے لے لیں۔

بچے حساس ہوتے ہیں

راحیلہ۔ لاہور

آپ کا یہ سلسلہ خدمتِ خلق بہت اچھا ہے، اسے میں شوق سے پڑھتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس خدمت کی جزائے خیر عطا فرمائے (آمین) میرا بیٹا جس کی عمر ساڑھے سات سال ہے اس کے کچھ پرابلمز ہیں جس کا میں آپ سے علاج چاہتی ہوں۔

بچے کا پیٹ باہر نکل آیا ہے اور وزن 4 کلو ہے۔ اگرچہ میں نے اسے جنک فوڈ کا عادی نہیں بنایا۔ گھر کا سادہ کھانا، روٹی اور چاول، سبزی، دال کا استعمال کرایا، گوشت نہیں کھاتا، چکن بھی پسند نہیں۔ فروٹس اور دودھ کا دن میں دو تین بار استعمال ہے۔ کوک یا جوسز بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کیونکہ ٹانسلو کا پرابلم ہے۔ گلا بہت حساس ہے، بہت زیادہ پرہیز کروائی ہوں ٹھنڈے اور کھٹے سے۔ 4 سال کی عمر میں ڈاکٹر نے آپریشن کے لیے کہا تھا لیکن نہیں کروایا۔ یہی چاہتی ہوں کہ اسے ہومیو یا قدرتی طریقہ علاج سے شفا مل جائے۔ جب موسم ٹھنڈا ہو تو گلا زیادہ خراب ہو جاتا ہے۔ پھر اینٹی بائیوٹک لینی پڑتی ہیں کیونکہ مسلسل کھانسی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر میڈیسن نہ دوں تو فیور بھی شروع ہو جاتا ہے۔ ٹانسلو کے ساتھ ناک بھی بند ہو جاتی ہے.... رات کو سانس ٹھیک سے نہیں آتی اور بہت بے چین رہتا ہے۔ ناک کے ایکسرے ہوئے تھے اس میں کوئی پرابلم نہیں ہے۔ سائیکلنگ یا واک نہیں کرتا۔ ٹانگوں میں درد کی شکایت کرتا ہے۔ رات کو سوتے میں بہت بے چین رہتا ہے۔ کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بھی چیک کروایا انہوں نے Calcium وغیرہ بھی دیا لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ پیشاب میں بدبو زیادہ ہے۔ پانی کم پیتا ہے۔ قبض رہتا ہے شروع سے۔

بچے کو... ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کرائیں۔ کوئی بھی کھٹی چیز کھلا کر پانی نہ پلائیں۔ حتیٰ کہ کلی بھی نہ کرائیں۔ دو تین نوالے خالی روٹی کھلا کر پھر کچھ بھی دے سکتی ہیں۔ بیٹے کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔

Calc.Carb30, Ferr.Phos30, Rhustox 30 کے 5، 5 قطرے آدھے کپ پانی میں 3 مرتبہ دیں۔ 2 ماہ بعد حال بتائیں۔

قد چھوٹا، وزن زیادہ

شازیہ۔ لاہور

میری بھانجی کا عمر کے لحاظ سے قد چھوٹا اور وزن زیادہ ہے۔ آپ اسے وزن کم کرنے اور قد بڑھانے کی دوا تجویز کر دیں۔

میرے دو بیٹوں کے قد کے لیے عمر کے لحاظ سے آپ نے جو دوا تجویز کی تھی اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ 3 ماہ دوائی کھلائی ہے۔ مگر قد بہت کم بڑھا ہے۔ پلیز بیٹوں کے لیے بھی کوئی دوسری دوا تجویز کر دیں۔ تاکہ ان کے قد بڑھ جائیں۔

میرا جسم روز بروز موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ جبکہ میں مرغن غذائیں اور پراٹھا بھی نہیں کھاتی۔ میرا پیٹ بہت بڑھا ہوا ہے اور کولہے بھی چہرے پر بہت زیادہ داغ، چھائیاں اور تل ہیں جو کہ براؤن اور بلیک ہیں۔ سارا چہرہ بھرا پڑا ہے۔ خاص طور پر ناک پوری سیاہ ہو گئی ہے۔ گول دائروں کی صورت میں چہرے پر بدنما داغ ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز ڈاکٹر صاحب میرے تمام مسائل کا حل ضرور بتایئے گا۔

جواب نمبر1: آپ کی بھانجی کا وزن اور قد

دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ اچھی متوازن خوراک دیں اور ورزش کرائیں، پیار و محبت سے پیش آئیں۔ کسی قسم کی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔

جواب نمبر ۲: بیٹوں کا قد پہلے کیا تھا؟ 3 ماہ میں کتنا قد بڑھا۔ کونسی ادویات دی تھیں یہ بھی لکھیں۔ قد آہستہ آہستہ بڑھتا ہے ایک دم نہیں۔۔۔ فی الحال جو دوا دی تھی اسے استعمال میں رکھیں۔ تفصیل معلوم ہونے کے بعد بتایا جائے گا کہ کیا کرنا ہے۔۔۔ متوازن غذا اور ورزش کا خیال رکھیں۔

جواب نمبر ۳: وزن بڑھنے کے اسباب میں روغن کھانا اور ایٹنگ، آرام طلب زندگی، نیند کم زیادہ لینا کے علاوہ ہارمونز ایک اہم سبب ہیں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ مینسز آپ کو کیسے ہوتے ہیں۔ لیکوریا کی شکایت کیسی ہے۔ نہ عمر لکھی، نہ وزن اور نہ قد لکھا جس سے اندازہ کیا جاتا کہ اگر وزن زیادہ ہے تو کتنا؟ (قارئین نوٹ کرلیں، نامکمل معلومات پر دوا تجویز نہیں کی جائے گی کیونکہ دوا اسی بنیاد پر تشخیص ہو گی۔ آپ کی دی گئی معلومات کے مطابق آپ کو رحم کا مسئلہ ہے اور Ringworm کا بھی۔

چہرے کے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Thuja30, Sepia30, Graphite30 کے 3,3 قطرے آدھا گلاس پانی میں، دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد تمام تفصیل کے ساتھ آگاہ کریں۔

بریسٹ کی گلٹی

تسنیم احمد، کوہاٹ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ پانچ چھ سال پہلے ایک دن نہانے کے دوران مجھے اپنے سیدھے بریسٹ میں گلٹی محسوس ہوئی، کبھی کبھی ایسے ہی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ مینسز شروع ہونے پر گلٹی نرم محسوس ہوتی ہے اور اردگرد کی جگہ تکلیف اور جلن محسوس ہوتی ہے۔

جواب:۔ ہمارے ڈاک کے سسٹم میں خرابی ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں۔ انشاء اللہ شکایت دور ہوجائے گی۔ ہم آپ کا جواب پہلے دے چکے ہیں۔ شاید آپ نے وہ شمارہ نہیں پڑھا۔ دوبارہ جواب پھر دے رہے ہیں۔ Ultra sound Both Breast کی رپورٹ کروا کر بھیجیں۔ گھر والوں کو اعتماد میں ضرور لینا چاہیے۔ اس دوران میں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی یہ دوائی استعمال کریں۔ Conium 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ 15 دن بعد الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ کے ساتھ دوبارہ اپنا حال بتائیں۔

2 سال کی بچی کے چہرے پر بال

میری بیٹی 1 سال 7 ماہ کی ہے اس کا وزن ساڑھے 10 کلو ہے، اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ماتھے، چہرے، بازوؤں اور ٹانگوں پر بال ہیں جو کہ پیدائشی ہیں۔ ناک کے نیچے یعنی اوپر والے ہونٹ کے اوپر بھی لڑکوں کی طرح مونچھوں کے بال ہیں جو نمایاں نظر آتے ہیں۔ برائے مہربانی اس کا بھی کوئی حل بتادیں۔

جواب: بچی کو ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc. Phos30, کے 3 قطرے ایک کھانے کے چمچ کے برابر پانی میں دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔

☆☆☆